خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

نومبر 2017



خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000 روپے

















نومبر 2017

جلد 45 شمارہ 7

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مُدیر

کہنی سُننی

خواتین ڈائجسٹ کا نومبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

کہانی سُننا اور سُنانا قدیم زمانوں سے انسان کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ کہانی کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی جب پہلے انسان نے زمین پر قدم رکھا۔ ہر کہانی زندگی سے جڑی ہوئی ہے۔ تمام کہانیاں زندگی سے ہی اخذ کی جاتی ہیں۔ ہر سانس لیتا وجود اپنی ذات میں خود ایک کہانی ہے۔ زندگی کو برتنے والے، اسے سمجھنے والے تو بہت ہیں مگر اسے کہانی کے روپ میں پیش کرنے والے معدودے چند لوگ ہیں۔ ایک تخلیق کار زندگی کے تضادات اور اس کی مختلف جہتوں کا شعور رکھتا ہے۔ وہ عام انسانوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے پاس وہ نظر ہوتی ہے جو ظاہر سے ہٹ کر باطن میں جھانک سکتی ہے۔ وہ اپنے اور دوسروں کے احساسات کو الفاظ میں بیان کرنے کا ہنر رکھتا ہے۔

یہ ہنر جو اللہ کی طرف سے ودیعت کیا جاتا ہے، بہت بڑا امتحان ہوتا ہے۔ اس ہنر کو مثبت اور منفی دونوں طریقوں سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سے خوش امیدی کے چراغ بھی روشن کیے جا سکتے ہیں اور زندگی کے تاریک اور منفی پہلوؤں کی عکاسی کر کے مایوسی اور بیزاری بھی پھیلائی جا سکتی ہے۔

زندگی کی مثبت قدروں کی پاسداری اور اندھیرے تاریک راستوں میں خوش امیدی کے چراغ روشن کرنا ہمارا مطمح نظر رہا ہے۔

کائنات کا سب سے روشن، تابناک اور طاقت ور جذبہ محبت ہے۔ محبت کے ہزار روپ ہیں۔ ان کو سامنے لانا دراصل زندگی کی خوبصورتی کو سامنے لانا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ اسی تابندہ روایت کا امین ہے۔ وقت کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اس میں کچھ تبدیلیاں ضرور آئی ہیں لیکن اس کے بنیادی کردار پر ہم نے سمجھوتا نہیں کیا۔ ہم زمانے کے ساتھ ضرور چلے لیکن اپنی روایات کو فراموش نہیں کیا۔ ہم اپنی مصنفین سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس مقصد میں ہمارا ساتھ دیں گی۔

رومی انشاء کی رحلت،

دُنیا ایک سرائے ہے۔ مسافر آتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن ہے نہ فرار۔ یہ طے ہے کہ جو دُنیا میں آئے ہیں، انہیں ایک دن واپس لوٹنا ہے۔ پھر بھی اپنے پیاروں کی جدائی کی تاب لانا مشکل ہوتا ہے۔

انشاجی کے صاحبزادے رومی انشا ایک ایسے سفر پر نکل گئے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون ؕ

ان کی اچانک وفات ہم سب کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعاگو ہیں کہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ان کی اہلیہ اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین۔

قارئین سے دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- نعیمہ ناز کا مکمل ناول۔ ادھوری، ، سائرہ رضا کا مکمل ناول ۔ حسن المآب ،
- نازیہ رزاق کا مکمل ناول ۔ پورب پچھم، ، قرۃ العین ہاشمی کا ناولٹ ۔
- عمرہ احمد اور آمنہ ریاض کے ناول، ، راشدہ رفعت، سیرا حمید، ناظمہ زیدی، سرور فاطمہ ہنی کے افسانے،
- معروف فنکارہ صبا فیصل سے ملاقات، ، باتیں احد رضا میر سے ،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ، ، نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا ہر شمارہ ہم پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ ہم اپنی محنت میں کس حد تک کامیاب ہیں۔ ہمیں ضرور بتائیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

اپنے آپ کو برتر سمجھنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب کوئی آدمی یہ کہے کہ لوگ تباہ ہو گئے تو وہ ان میں سب سے زیادہ تباہ ہونے والا ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ یہ کہنا کہ لوگ تباہ ہو گئے" اس شخص کے لیے منع ہے، جو اپنے آپ کو سب سے اچھا سمجھے، لوگوں کو حقیر گردانے اور ان پر اپنے آپ کو برتر خیال کرے، یہ حرام ہے۔ لیکن جو شخص یہ اس لیے کہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں میں دین داری کم ہو گئی ہے اور اس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے (دینی غیرت کی وجہ سے) یہ الفاظ اس کی زبان پر آجائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

2۔ اس میں اپنے آپ کو اچھا سمجھنے اور دوسروں کو حقیر گردانے کی ممانعت ہے۔

بول چال بند کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مومن تو بھائی بھائی ہیں، چنانچہ اپنے دو (لڑے ہوئے) بھائیوں میں صلح کرا دو۔" (الحجرات۔10)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "گناہ اور زیادتی (کے کاموں) میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔" (المائدہ۔2)

فائدہ آیات : لڑائی اور ترک تعلق، مقتضائے اخوت کے خلاف ہے، اس لیے مسلمانوں کو باہم لڑے ہوئے مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ مومنانہ اخوت برقرار رہے۔ بغیر کسی سبب شرعی کے بول چال بند رکھنا بھی گناہ اور زیادتی ہے، اس لیے اس کی حوصلہ افزائی بھی گناہ پر تعاون ہے جس سے مسلمانوں کو روک دیا گیا ہے۔ بلکہ ایسے موقعوں پر ضروری ہے کہ صلح کرادی جائے۔

تعلقات

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم ایک دوسرے سے تعلقات منقطع نہ کرو' نہ ایک دوسرے سے منہ موڑو (پیٹھ دکھاؤ) نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو' نہ آپس میں حسد کرو' اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال بند رکھے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : حدیث میں مذکورہ تمام باتیں ممنوع ہیں' اس لیے کہ یہ سب اخوت کے منافی ہیں' جب کہ مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ اخوت اسلامیہ کو برقرار رکھیں۔

فطری امور میں رعایت

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی سے تین راتوں سے زیادہ تعلق منقطع رکھے۔ دونوں کا آمنا سامنا ہو تو یہ اس سے اور وہ اس سے منہ پھیر لے۔ اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

اسلام چونکہ دین فطرت ہے' اس لیے اس میں فطری امور و معاملات کی مناسب حد تک رعایت رکھی گئی ہے۔ جب دو مسلمانوں میں کسی وجہ سے لڑائی جھگڑا ہو جائے تو طبیعت میں انقباض و تکدر کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے' جس کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے سے بولنا اور تعلق قائم رکھنا پسند نہیں کرتے۔ شریعت نے اس فطری انقباض کو تسلیم کیا اور تین دن تک بول چال بند رکھنے کی اجازت دے دی لیکن زیادہ دنوں تک ترک تعلق' شدید بغض و عداوت کا باعث بنتا ہے جس سے معاشرتی فساد میں اضافہ' رشتے داریوں میں مستقل رخنہ اور دوستانہ تعلقات میں شدید خلل پیدا ہوتا ہے' اس لیے عارضی تلخی و کشیدگی کو تین دن سے زیادہ برقرار رکھنے سے روک دیا گیا۔

2۔ سلام میں پہل کرنے کی فضیلت بیان کر کے دوبارہ تعلقات استوار کرنے کا ایک آسان طریقہ بھی تجویز فرمادیا' کیونکہ سلام سے محبت میں اضافہ اور بات چیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔

مشرک

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر سوموار اور جمعرات کو (بارگاہ الٰہی میں) اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کے گناہ معاف فرما دیتا ہے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو' سوائے اس شخص کے کہ اس کے اور اس کے بھائی کے درمیان دشمنی اور کینہ ہو تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ان دونوں کو چھوڑ دو' یہاں تک کہ یہ صلح کر لیں۔" (مسلم)

فائدہ : بغیر کسی سبب شرعی کے آپس میں دشمنی رکھنا مغفرت الٰہی سے محرومی کا باعث ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

فساد

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"شیطان یقیناً" اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ نمازی جزیرہ عرب میں اس کی عبادت کریں گے' مگر ان کے درمیان فساد ڈالنے میں (وہ کامیاب رہے گا۔)" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی کہ مسلمان

آپس میں لڑیں گے، جھگڑیں گے اور باہم تعلقات منقطع کرلیں گے اور یہ کام شیطان کی شرارت اس کی انگیخت اور وسوسہ اندازی کی وجہ سے ہوگا۔

2۔ نمازیوں سے مراد مسلمان ہیں۔

جہنمی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے تعلق منقطع رکھے۔ چنانچہ جو شخص تین دن سے اوپر تعلق منقطع کیے رکھے گا اور اسی حالت میں اسے موت آگئی تو وہ جہنم میں جائے گا۔" (اسے ابوداود نے ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو بخاری کی شرط پر ہے۔)

فائدہ : جہنم میں یہ دخول بطور سزا کے ہوگا، سزا بھگتنے کے بعد اسے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کردیا جائے گا کیونکہ ہمیشہ جہنم میں رہنا صرف کافروں کے لیے ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسلمان جو چاہے کرے، وہ بطور سزا بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ ایسا سمجھنا غلط ہے۔

تعلق توڑنا

حضرت ابو خراش حدرد بن ابی حدرد اسلمی اور بعض کے نزدیک سلمی، صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"جو شخص اپنے (مسلمان) بھائی سے ایک سال تک تعلق منقطع رکھے گا تو اس کا یہ عمل، اس کا خون بہانے کے برابر ہے۔" (اسے ابوداود نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ ترک تعلق بھی ایک طرح سے معنوی قتل ہے جس سے دوسرے مسلمان کو سخت ذہنی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے، اس لیے اسے قتل کے مترادف قرار دیا۔

2۔ بول چال یا ترک تعلق صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو، **مثلاً**: کوئی شخص بدعتی ہے، یا کھلم کھلا فسق و فجور کا ارتکاب کرتا ہو، سمجھانے کے باوجود وہ اپنی بدعت یا فسق و فجور سے باز نہ آئے تو ایسے شخص سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بول چال بند کردینا اور تعلق منقطع کرلینا جائز بلکہ مستحب ہے تاکہ اسے عبرت و نصیحت ہو اور اس طرح شاید وہ باز آجائے۔ لیکن محض دنیوی رنجشوں کی وجہ سے تین دن سے زیادہ تعلق منقطع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مومن سے تین دن سے اوپر تعلق منقطع کیے رکھے۔ چنانچہ اگر اسی حالت میں تین دن گزر جائیں تو چاہیے کہ اس سے ملاقات کرکے اسے سلام کرے، اگر اس نے سلام کا جواب دے دیا تو دونوں ثواب میں شریک ہوگئے اور اگر اس نے (کشیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے) سلام کا جواب نہ دیا تو وہ گناہ گار ہوا اور سلام کرنے والا ترک تعلق کے گناہ سے نکل گیا۔"

(اسے امام ابوداود نے حسن سند سے روایت کیا ہے، نیز انہوں نے فرمایا: اگر ترک تعلق اللہ کے لیے ہو تو پھر اس میں کوئی گناہ نہیں۔)

سرگوشی کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "سرگوشی کرنا تو شیطان کی طرف سے ہے۔" (المجادلہ۔10)

فائدہ آیت : چند افراد ایک ساتھ ہوں یا ہم سفر ہوں، ایسے مقام اور موقع پر دوسروں کو چھوڑ کر، صرف دو افراد کا باہم رازدارانہ انداز میں گفتگو کرنا نجوی (سرگوشی) ہے جس کی ممانعت ہے، کیونکہ اس سے دوسروں کی دل آزاری ہوتی ہے یا وہ بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ممانعت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تین آدمی ہوں تو تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں۔" (بخاری و مسلم)

اسے ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے اور اس میں ابوصالح (راوی) نے یہ زیادہ بیان کیا کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔

"اگر چار آدمی ہوں تو؟"

انہوں نے جواب دیا: "اس میں تیرے لیے کوئی حرج نہیں۔"

آداب مجلس

اور اسے امام مالک نے موطا میں عبداللہ بن دینار سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا:

میں اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ خالد بن عقبہ کے اس مکان کے پاس تھے جو بازار میں ہے۔ چنانچہ ایک آدمی آیا جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سرگوشی کرنا چاہتا تھا اور حضرت ابن عمر کے ساتھ میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ حضرت ابن عمر نے ایک دوسرے آدمی کو بلایا ' یہاں تک کہ ہم چار آدمی ہو گئے تو انہوں نے مجھ سے اور اس تیسرے آدمی سے ' جس کو انہوں نے بلایا تھا ' فرمایا: تھوڑا پیچھے ہٹ جاؤ ' اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

"ایک کو چھوڑ کر دو آدمی باہم سرگوشی نہ کریں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں بعض آداب مجلس کا بیان ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک چوتھے آدمی کو اس لیے بلایا تاکہ آپ اس شخص کی بات سن لیں جو آپ سے علیحدگی میں گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ آپ نے دو آدمیوں کو تھوڑا پیچھے کر دیا تاکہ سرگوشی کرنے والے کی کوئی بات وہ نہ سن سکیں۔

2۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ آدمیوں کی موجودگی میں دو آدمی آپس میں سرگوشی کر سکتے ہیں ' البتہ چار آدمی ہوں تو تین سرگوشی کریں اور چوتھے کو الگ رکھیں ' یہ ممنوع ہے۔ علاوہ ازیں یہ ممانعت جائز باتوں میں ہے۔ ورنہ شر کی باتوں میں تو سرے سے سرگوشی کی اجازت ہی نہیں ہے ' چاہے تیسرا آدمی نہ بھی ہو۔

قرآن کریم میں ہے:

"اے ایمان والو! جب تم آپس میں سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی کے کاموں اور رسول کی نافرمانی میں سرگوشی نہ کرو!" (المجادلہ 58:9)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب تم تین آدمی ہو تو تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی سرگوشی نہ کریں ' یہاں تک کہ تم لوگوں میں مل جل جاؤ۔ اس لیے کہ ایسا کرنا اس (تیسرے آدمی) کو غمگین کر دے گا۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں ممنوعہ سرگوشی کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے ایک مومن کو تکلیف ہوتی ہے اور مومن کو ایذا پہنچانا سخت گناہ ہے۔ اس بنا پر یہ سرگوشی حرام کے درجے میں ممنوع ہے۔ البتہ جب تینوں افراد لوگوں میں مل جل جائیں تو پھر دو شخص آپس میں جس طرح چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں۔

دین حنیف

شریعت محمدیہ کی یہ خوبی ہے کہ اس میں آسانیاں بہم پہنچائی گئی ہیں جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

"بلاشبہ مجھے آسان حنیفی دین دے کر بھیجا گیا ہے۔ (مسند احمد 116/6)" تاہم آسانی کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی حکم ایسا نہیں جو نفس پر شاق ہو۔ کیونکہ نفس امارہ تو ہر نیکی سے بدکتا اور ہر گناہ کی طرف بھاگتا ہے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ شریعت کے جس حکم پر عمل نہیں کرنا چاہتے ' اس کے بارے میں

کہہ دیتے ہیں کہ مجبوری ہے اور دین میں تنگی نہیں۔ یہ طرز عمل درست نہیں کیونکہ یہ شریعت کی پیروی نہیں' اپنے نفس کی پیروی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "کیا تم کچھ کتاب پر ایمان لاتے ہو اور کچھ کا انکار کردیتے ہو؟ تم میں سے جو کوئی ایسا کام کرے' اس کا بدلہ دنیا کی زندگی میں رسوائی ہے اور آخرت میں انہیں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیا جائے گا۔" (البقرة 2/85)

2۔ جب نیک دیانت دار آدمی کو اس کا جائز مقام نہ دیا جائے بلکہ جھوٹے بددیانت کی خوش نما باتوں پر اعتماد کرلیا جائے تو معاشرے کا کوئی شعبہ انحطاط سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

3۔ موجودہ معاشروں کے بے شمار مسائل کی وجہ سچ اور دیانت داری کا فقدان ہے۔ علماء کو چاہیے کہ ان کے فروغ کی کوشش کریں۔

مشکلات

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! دنیا ختم نہیں ہوگی حتیٰ کہ (یہ نوبت آجائے گی کہ) آدمی کسی قبر کے پاس سے گزرے گا تو اس پر گر پڑے گا اور کہے گا کاش! میں اس قبر والے کی جگہ (مر کر دفن ہو چکا) ہوتا۔ وہ دین (کے بارے میں پیش آنے والی مشکلات) کی وجہ سے ایسے نہیں کرے گا بلکہ (دنیوی) مشکلات کی وجہ سے کرے گا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ دنیاوی مشکلات میں اللہ سے مدد مانگنا اور حالات بہتر بنانے کی کوشش کرنا بہتر طریقہ ہے۔

2۔ دنیا کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا منع ہے۔

3۔ دین کی حفاظت کی فکر دنیا سے زیادہ ہونی چاہیے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم اس طرح چن لیے جاؤ گے جس طرح نکمی اور ردی کھجوروں میں سے (عمدہ) کھجوریں چن (کر اٹھا) لی جاتی ہیں۔ اچھے لوگ (دنیا سے) چلے جائیں گے اور برے لوگ رہ جائیں گے' پس اگر تم سے ہو سکے تو مرجانا۔" (حاکم)

فائدہ: نیک لوگ ہر دور میں رہیں گے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد کم ہوتی چلی جائے گی حتیٰ کہ جب قیامت آئے گی اس وقت کوئی نیک آدمی نہیں ہوگا۔

زمانے کی سختی کا بیان

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے۔

"دنیا میں صرف آزمائش اور فتنہ ہی باقی رہ گیا ہے۔"

فائدہ:

1۔ زندگی میں ہر موقع پر آزمائش آتی ہے۔ راحت بھی آزمائش ہے' مصیبت بھی آزمائش ہے۔ مومن کو چاہیے کہ ہر موقع پر یہ دیکھے کہ اللہ کی رضا کس چیز میں ہے' اس کے مطابق عمل کرے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عنقریب لوگوں پر دھوکے سے بھرپور سال آئیں گے۔ ان میں جھوٹے کو سچا سمجھا جائے گا اور سچے کو جھوٹا کہا جائے گا۔ بددیانت کو امانت دار سمجھا جائے گا اور دیانت دار کو بددیانت کہا جائے گا۔ اور رویبضہ باتیں کریں گے" کہا گیا۔

"رویبضہ (کا مطلب) کیا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حقیر آدمی عوام کے معاملات میں رائے دے گا۔"

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے رونق

انشا جی

پچھلے دنوں ہمارے دشمنوں کی یعنی ہماری اپنی طبیعت ناساز رہی تو یہ عقدہ کھلا کہ اب تک جو ہم خلق خدا کو تین قسموں میں تقسیم کرتے تھے' ڈاکٹر' بیمار اور تیمار دار' یہ ناحق کا پھیلاؤ تھا۔ دنیا کی آبادی کو دو حصوں میں بہ آسانی بانٹا جا سکتا ہے' ایک بیمار' ایک معالج کیونکہ تیمار دار کوئی علیحدہ طبقہ نہیں' ان میں آدھے بیمار ہوتے ہیں' آدھے معالج ہوتے ہیں بلکہ ان کی بڑی تعداد تو بیک وقت بیمار اور معالج ہوتی ہے۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر' خود گل کوزہ۔ ایک ذرا سی مثال دیتے چلیں' پچھلے دنوں حضرت طبا شیر الملت حکیم عبدالمنان اسمٰعیل دہلوی بکریوں والے مشہور ہیں کیونکہ ان کے اجداد بکریوں کا علاج کرتے تھے۔ اپنے پتے کے علاج کے لیے ایک کلینک میں داخل ہوئے۔ پتے میں کیا خرابی تھی' ہمیں معلوم نہیں۔ دراصل پتا مارتے بہت تھے۔ دن بھر مطب میں بیٹھتے' کام کرتے' نسخے اور غزلیں بناتے رہتے تھے۔ وہاں ان کا سابقہ ڈاکٹر ایم بی بی ایس بیگ ایم بی بی ایس سے پڑا' یہ ڈاکٹر صاحب اپنے سابقے اور لاحقے دونوں طرف سے ڈاکٹر معلوم ہوتے ہیں جس طرح دو موہی کے دو منہ ہوں' لیکن فی الواقع ایم بی بی ایس کا مطلب مرزا باقر بن سلطان ہے۔ ڈاکٹری فقط انہیں لاحق ہوئی ہے۔ خیر کلینک میں ڈاکٹر بیگ ابھی ہمارے حکیم صاحب کا اسٹیتھسکوپ سے امتحان کر رہے تھے کہ انہوں نے ان کی نبض پکڑ لی اور کہا۔

"آپ کو تو یرقان معلوم ہوتا ہے۔" مزید اطمینان کے لیے ڈاکٹر صاحب کا قارورہ حکیم صاحب نے لیا اور ڈاکٹر صاحب نے ان کے انجکشن لگایا' حکیم صاحب نے ان کی فصد کھولی' انہوں نے ان کو کیپسول کھلائے' انہوں نے معجون فلسفہ اور عرق گاؤ زبان سے تواضع کی' دونوں کو اللہ نے صحت دی۔ بل دونوں نے دیے۔ رقمیں برابر تھیں' لہٰذا یہ بھی خوش' وہ بھی خوش۔

خیر اس وقت بحث اپنی یا حکیم صاحب کی بیماری کی نہیں' تذکرہ تیمار داری کا تھا۔ ہوا یہ کہ پچھلے دنوں

ہمارے ایک دوست کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی' کس پھڈے میں اڑا کر انہوں نے تڑوائی اس کے ذکر کا یہ موقع نہیں' بہرحال اسپتال میں داخل ہوئے' ڈاکٹر نے پلستر چڑھایا اور پیر چرخی سے باندھ دیا' ہم بھی انہیں دیکھنے گئے۔ ہمیں تیمارداری اور عیادت کا زیادہ تجربہ نہیں' لہٰذا ان کا حال پوچھا اور یہ کہہ کر ان کے پاس بیٹھ گئے کہ "اچھا جس حال میں رہو' خوش رہو" لیکن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کئی اور لوگ ان سے ملنے آئے' جس سے کھلا کہ تیمار داری میں بھی باون بکسوئے لگتے ہیں' یہ بھی ایک طرح سے علم دریاؤ ہے۔

ایک تیمار دار ان میں داروغہ جی تھے۔ مونچھوں کو خضاب لگائے' کمبل اوڑھے ہائے ہائے کرتے ہوئے' تو وہ تو کیا ہمارے دوست کی خیریت پوچھتے' اس نے پوچھا۔

"داروغہ جی! کیسے ہیں آپ؟"

وہ ایک ہی کشتہ تیغ ستم نکلے بولے۔ "کچھ نہ پوچھو' یک بیمار و صد آزار' چار روٹی زیادہ کھالوں تو معدے میں گرانی ہو جاتی ہے۔ سوتے وقت دو پیالے چائے کے زیادہ پی لوں تو نیند آتی ہے' پر نہیں آتی۔ کان الگ سائیں سائیں کرتے ہیں' سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر' ان سب امراض شاقہ پر مستزاد' آنکھ پر گوہانجنی نکل آئی ہے' اس سے تو موت بھلی۔"

ہمارے دوست نے ان سے مناسب الفاظ میں ہمدردی کی۔ اتنے میں ایک اور غم خوار آنکلے' ہانپتے کانپتے' ہاتھ میز پر رکھتے ہوئے بولے۔

"میاں! تمہیں دیکھنے آگیا ہوں ورنہ زندگی حرام ہے۔ چار کوس پیدل چل لوں تو سانس پھول جاتا ہے۔ اس بہتر سال کی عمر میں یہ حال ہے تو بڑھاپے میں تو جانے کیا ہو گا۔"

ہمارے دوست نے ان کو بھی تسلی دی۔ اب ایک اور بزرگ وارد ہوئے' کھانستے ہوئے' آتے ہی آواز لگائی۔

"کہو میاں! ٹانگ ٹوٹ گئی کیا؟" پھر جواب کا بھی انتظار نہ کیا' اپنی کیفیت بیان کرنی شروع کر دی۔

"آج پانچواں دن ہے' زکام ہو رہا ہے' چھینکیں الگ آ رہی ہیں۔ گلا بھی خراب ہو رہا ہے۔ جوشاندہ پیا لیکن مرض بڑھتا گیا' جوں جوں دوا کی۔"

ہمارے دوست نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ "رب العزت! آپ کو جلد اچھا کرے۔"

انہوں نے ایک زور کی چھینک ماری اور آمین کہہ کر تیسری کرسی پر بیٹھ گئے' چوتھے صاحب نے آکر اپنی داڑھ کی تکلیف بتائی اور ہمارے دوست سے خراج ہمدردی وصول کر کے کہنے لگے۔

"اپنی نرس سے ایک پیالہ سوپ کا میرے لیے منگوا دیجیے کہ ڈاکٹر نے ٹھوس غذا سے منع کیا ہے۔"

غرض کہ لوگ آتے گئے اور اپنی اپنی تکلیفوں کی شرح کرتے گئے' ان ہی میں کچھ ایسے تھے کہ ہمارے دوست کی ٹانگ پہ آکر زور سے ہاتھ مارتے تھے اور جب ان کی چیخ نکلتی تو تعجب سے کہتے۔

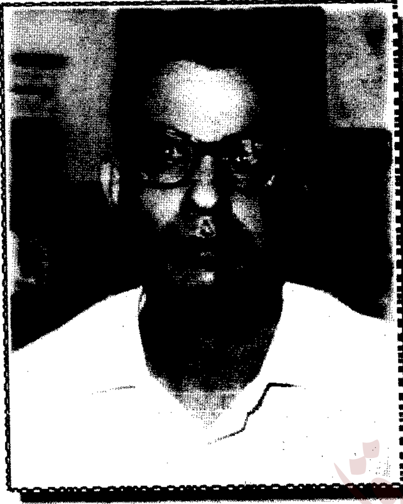
"اچھا تکلیف ہوتی ہے۔ پلستر اتار دو' اس پر سوجی کا حلوا باندھو' مجرب ہے۔"

ایک نے لونگ کے تیل کی مالش بتائی' ایک نے جناب رئیس امروہوی صاحب کے مضامین پڑھنے اور تزکیہ نفس کا مشورہ دیا اور کہا۔

"اس سے ٹانگ خود بخود جڑ جائے گی۔"

ایک اور صاحب بولے۔ "نمک سلیمانی کے غرارے کرو' سوزش دور ہو جائے گی۔"

ایک نے تو باقاعدہ ان کو اسپتال سے بھاگ جانے کا



مشورہ بھی دیا اور کہا کہ فلاں تکیے پر ایک اللہ والے درویش بیٹھتے ہیں' وہ راکھ کی چٹکی دیں گے' اس ٹانگ کے ٹوٹے ہوئے حصے پر چھڑک دینا' فوراً" شفا ہو گی۔ تھوڑا سا گوند اس راکھ کی چٹکی میں ملانے سے تو کٹی ہوئی ٹانگ بھی جڑ جاتی ہے۔"



یہی تو وہ مرحلہ ہے جہاں آکر بیمار' تیماردار اور معالج سب ہی ایک ذات میں جمع ہو جاتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ تصوف سے تو ہمیں ایک زمانہ سے لگاؤ تھا اور قوالی کی محفلوں میں سر دھنتے اور لنگر کھاتے بھی ایک عمر ہوئی تھی لیکن وحدت الوجود کے معنی اس روز پہلی بار آشکار ہوئے۔





آصف رضا میر کے صاحبزادے

باتیں احد میر سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"

"احد رضا میر۔"

2 "پیار کا نام؟"

"احد ہی کہتے ہیں۔یا پھر "بھیا بھائی"۔"

3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"

"29 ستمبر 1993ء/ کراچی۔"

4 "قد / ستارہ؟"

"پانچ فٹ نو انچ / لبرا۔"

5 "بہن بھائی؟"

"ایک چھوٹا بھائی ہے۔"

6 "تعلیم؟"

"بیچلر آف فائن آرٹ ان ڈراما، بی بی اے ان بزنس۔"

7 "بچپن کا خواب؟"

"بہت سے خواب ہوتے ہیں۔اعلا تعلیم کے ساتھ... آرٹسٹ بننے کا خواب دیکھتا تھا... اور اللہ نے اپنا کرم کر دیا۔"

8 "شادی؟"

"ابھی نہیں ہوئی... یہ اوپر والے کے فیصلے ہوتے ہیں۔"

9 "شوبز میں آمد؟"

"شوق... شاید دادا اور والد کی طرف سے ملا۔ڈراموں سے زیادہ فلم کا شوق تھا۔"

10 "ٹی وی پہ پہلا ڈراما؟"

"خاموشیاں۔"

11 "شہرت ملی؟"

"سمی" اور "یقین کا سفر" سے۔"

12 "اپنی کمائی کہاں خرچ کرتے ہیں؟"

"کھانے پینے میں.... اور جو نوجوانوں کے شوق ہوتے ہیں کہ الیکٹرونک چیزیں.... تھوڑا فضول خرچ ہوں۔"

13 "شوبز کیسی فیلڈ ہے؟"

"بہت اچھی.... بہت شہرت عزت ملتی ہے۔ مگر پرسنل لائف تھوڑی ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔"

14 "مارننگ پرسن ہیں؟"

"جی میں آٹھ بجے تک لازمی اٹھ جاتا ہوں۔"

15 "صبح کا پہلا کام؟"

"میں جم جاتا ہوں۔"

16 "گھر والوں کی کوئی بات جو بری لگتی ہو؟"

"چونکہ وہ ہر بات میرے فائدے کے لیے کہتے ہیں اس لیے بری بھی لگے تو سن لیتا ہوں۔"

17 "ایکسٹرا خوبی؟"

"جی.... میں بہت اچھا کک ہوں۔ کیونکہ جب ملک سے باہر تھا تو سارے کام خود کرتا تھا۔"

18 "پسندیدہ تہوار؟"

"مجھے تو اپنی برتھ ڈے پسند ہے اور سلیبریٹ بھی کرتا ہوں۔"

19 "اپنے آپ میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟"

"کچھ نہیں اللہ نے بہت اچھا بنایا ہے۔"

20 "بھوک میں کیا کھانا پسند کرتے ہیں؟"

"بھوک میں تو کچھ بھی مل جائے.... کھا لیتا ہوں۔"

21 "گھل مل کر کس کے ساتھ رہتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ یا رشتے داروں کے ساتھ؟"

"کبھی کبھی آپ کے دوست فیملی کی طرح بن جاتے ہیں، کبھی کبھی فیملی کے لوگوں سے ملاقات کا موقع ہی نہیں ملتا۔ منحصر ہے اس بات پہ کہ آپ سے کلوز کون ہے۔"

22 "فخر کا کوئی لمحہ؟"

"اپنے والد کو جب دیکھتا ہوں تو بہت فخر محسوس کرتا ہوں۔ اللہ نے بہت عزت دی ہے ان کو۔"

23 "تھکن میں کہاں جانے کے لیے تیار رہتے ہیں؟"



"کہیں نہیں.... میں سو جاتا ہوں۔ اپنے بستر سے اچھی کوئی جگہ نہیں۔"

24 "بچپن کی کوئی بری عادت جو ابھی بھی آپ میں ہو؟"

"سب کو مطمئن کرنا چاہتا ہوں۔ سب کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ خاص طور پہ اپنی فیملی کے ساتھ۔"

25 "طبیعت میں ضد ہے؟"

"ضد نہیں ہے.... میں ایک اچھا بچہ ہوں۔"

26 "ریلیکس کب ہوتے ہیں؟"

"جب میں گھر آجاتا ہوں۔"

27 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"انٹرنیٹ.... نالج آپ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔"

28 "غصہ کب آتا ہے؟"

"جب کوئی بدتمیزی کرے تو۔"

29 "غصے میں کیفیت؟"

"میں غصے میں "پریشر کوکر" کی طرح ہو جاتا ہوں۔ ایک دم سے "ٹھس ٹھا"۔"

30 "سات دنوں میں پسندیدہ دن؟"

”ہفتہ اور اتوار۔“
31 ”پسندیدہ مہینہ؟“
”ستمبر... میری برتھ ڈے ہوتی ہے۔“
32 ”لڑکیوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟“
”جب وہ ڈیسنٹ طریقے سے بات کرتی ہیں تو اچھی لگتی ہیں۔“
33 ”اور بری کب لگتی ہیں؟“
”جب بہت زیادہ بولتی ہیں تو کوفت ہوتی ہے۔ بری نہیں کہہ سکتا۔“
34 ”کوئی لڑکی مسلسل دیکھ رہی ہو آپ کو تو؟“
”تو جا کر پوچھ لیتا ہوں کہ کیا ہوا۔“
35 ”گھر میں کس کا غصہ تیز ہے؟“
”گھر میں جناب ”آصف رضا میر“ صاحب کا غصہ بہت تیز ہے اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے زمین ہل گئی ہے۔“
36 ”کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟“
”کوئی چیز وقت سے پہلے نہیں ملی۔ کافی انتظار اور صبر شکر کے بعد ملی ہے۔“
37 ”بچت کس انداز میں کرتے ہیں؟“
”مجھے میوزک کا شوق ہے۔ گانے کا شوق ہے تو میں انسٹرومنٹ لے لیتا ہوں تو بچت تو نہیں ہوتی۔“
38 ”کس ملک کی شہریت ہے آپ کے پاس؟“
”میں بہت خوش قسمت انسان ہوں کہ میرے پاس پاکستان کی شہریت ہے اور پھر میرے پاس ”کینیڈا“ کی شہریت ہے۔“
39 ”شاپنگ پہ پہلی ترجیح؟“
”اپنی اماں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور خریدتا ہوں۔ پہلی ترجیح وہی ہیں۔“
40 ”کبھی برا وقت گزارا؟“
”جی گزارہ ہے... کیا وضاحت کروں۔“
41 ”پاکستان آکر کون سے کھانے شوق سے کھاتے ہیں؟“
”اصل میں جب کینیڈا میں ہوتا ہوں تو پاکستان ”میٹھا“ بہت یاد آتا ہے اور بوٹ بیسن کی ”بلوچ“ آئس کریم بہت یاد آتی تھی۔“
42 ”موڈ کب اچھا ہو جاتا ہے؟“
”جب کوئی کام کی بات ــــ کرتا ہے۔“
43 ”پسندیدہ پروفیشن؟“
”یہی شوبز۔“
44 ”آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں؟“
”نہیں... آدھا گھنٹہ لگتا ہے کیونکہ سوچتا ہوں کہ آج کیا کیا کرنا ہے۔“
45 ”کسی کی سچی محبت کو کس طرح آزمانا چاہیے؟“
”اس کے ساتھ وقت گزاریں۔“
46 ”عورت کے لیے آپ کی سوچ‘ خوب صورت ہو یا ذہین ہو؟“
”ذہین... ذہین اور بس ذہین...“
47 ”مخلص کون ہوتے ہیں؟“
”سب ہی ہوتے ہیں... بس کسی کو آزمائیں نہیں۔“
48 ”چھٹی کا دن کہاں گزارنا چاہتے ہیں؟“
”صرف اور صرف گھر پر۔“
49 ”گھر میں کس جگہ بہت سکون ملتا ہے؟“
”اپنے کمرے میں۔“
50 ”چھٹیاں کس طرح گزارتے ہیں؟“
”مجھے ٹریولنگ کا بہت شوق ہے۔ چھٹیاں مل جائیں تو کہیں نہ کہیں ضرور جاتا ہوں۔“
51 ”ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟“
”اپنے والد آصف رضا میر کے ساتھ ابھی تک موقع نہیں ملا... دیکھیں کب ملتا ہے۔“
52 ”کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً“ دیتے ہیں؟“
”اپنی اماں“ کے جواب نہ دوں تو کالز آنی شروع ہو جاتی ہیں۔“
53 ”بوریت کس طرح دور کرتے ہیں؟“
”ویڈیو گیمز کھیلتا ہوں۔“

54 "ایک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟"
"ذہنی معذور کا کردار کرنا چاہتا ہوں۔"
55 "ایک کردار جو ہٹ ہوا؟"
"یقین کا سفر کے "ڈاکٹر اسفندیار" کا رول۔"
56 "بی پی کب ہائی ہوتا ہے؟"
"کسی بھی "سین" سے پہلے۔"
57 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"
"نہیں... کیونکہ اگر میں نہیں دوں گا تو وہ کہیں اور سے لے لیں گے۔ اب یہ کام مشکل نہیں رہا۔"
58 "آپ کے والٹ کی تلاشی لیں تو کیا کیا نکلے گا؟"
"کچھ نہیں نکلے گا۔ سوائے کارڈز کے اور دو تین "لو لیٹرز" کے" قہقہہ۔
59 "اگر پاور میں آجائیں تو؟"
"پاکستان کے امیج کو اچھا بنانے کے لیے کام کروں گا۔"
60 "کیسی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"کلون' پرفیومز۔"
61 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"نہیں ... بڑے اگر نصیحت کریں تو برا نہیں ماننا چاہیے۔"
62 "انسان کی زندگی کا بہترین دور؟"
"جو گزار رہا ہوں بہترین دور ہے... اور ان شاء اللہ آگے کا دور بھی اچھا ہو گا۔"
63 "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"
"جی بالکل ... دیئے ہوئے وقت سے پندرہ منٹ پہلے ہی پہنچ جاتا ہوں۔"
64 "کن پہ بے دریغ خرچ کرتے ہیں؟"
"اپنی امی اور بھائی پہ۔"
65 "اپنے لیے کتنا خرچ کرتے ہیں؟"
"مجھے اپنے آپ کو تحفہ دینا ہوتا ہے تو میں ٹریول کرتا ہوں۔"
66 "کھانے کے لیے بہترین جگہ ڈائننگ ٹیبل اپنا بیڈ یا چٹائی؟"
"ڈائننگ ٹیبل 'اپنے کمرے میں بھی کھا لیتا ہوں۔"
67 "کھانے کے لیے ہاتھ بہترین ہوتے ہیں یا چھری کانٹے؟"
"یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کھانے میں ہے کیا' روٹی اور چاول تو ہاتھ سے ہی کھاتے ہیں... خاص طور پر روٹی۔"
68 "ایک پسندیدہ کھانا جو کئی دن تک کھا سکتے ہیں؟"
"بھنڈی۔"
69 "ڈرامے کے کردار فنکار کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں؟"
"بالکل...۔"
70 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے لگاؤ؟"
"زیادہ نہیں ہے۔"
71 "دیس کے کھانے پسند ہیں یا پردیس کے؟"
"دونوں کے اور میں سب کچھ کھا لیتا ہوں۔ پردیس کے بہت سے کھانے پکانے بھی آتے ہیں مگر اپنے ملک کے نہیں۔"
72 "کون سا کھانا بہت اچھا پکا لیتے ہیں؟"
"تھائی کھانا۔"
73 "عشق کے بخار چڑھتے رہتے ہیں؟"
"قہقہہ...۔"
74 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"چھپکلی اور سانپ سے ڈر لگتا ہے۔"
75 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
"جی... بالکل۔"
76 "کس قسم کے رویے دکھ دیتے ہیں؟"
"جب لوگ دوسروں سے اپنے آپ کو اعلا سمجھتے ہیں اور دوسروں کو اہمیت نہیں دیتے۔"
77 "انٹرویو میں ایک سوال جو ہر کوئی پوچھتا ہے؟"
"دو تین سوال ہیں... ایک تو شادی کا... پھر "بابا" سے متعلق سوال اور پھر میری گلوکاری' یہ سوال پوچھتے ہیں۔"
78 "شادی کی پسندیدہ رسم؟"
"نکاح کی' جوتا چھپائی کی اور گانوں کے مقابلوں کی رسمیں۔"

79 ”گفٹ دیتے ہیں یا کیش؟“
”گفٹ دینا چاہیے۔“
80 ”ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟“
”اپنے ہاتھ کا۔“
81 ”کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟“
”یہاں اگر میں اپنے دادا کا نام لوں تو مجھے اچھا لگے گا۔“
82 ”فوبیا ہے؟“
”نہیں.... میرا نہیں خیال۔“
83 ”فون نمبر بدلتے رہتے ہیں؟“
”نہیں.... ابھی تک تو ایک ہی ہے۔“
84 ”کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟“
”سیل فون.... والٹ اور چابی کار کی۔“
85 ”آپ تبدیلی چاہتے ہیں؟“
”اپنی انڈسٹری میں کافی تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں۔ میں اس تبدیلی کا حصہ بننا چاہتا ہوں۔“
86 ”فیوچر پلاننگ؟“
”یہی ہے کہ اس فیلڈ کو بھرپور ٹائم دوں۔ بھرپور توجہ دوں۔“
87 ”ماں ناراض ہو جائے تو؟“
”تو معافی مانگ لیتا ہوں۔“
88 ”اپنی غلطی کا اعتراف آسانی سے کر لیتے ہیں؟“
”بالکل جی۔“
89 ”آپ کی کوئی اچھی اور بری عادت؟“
”اچھی تو آپ یہ کہہ لیں کہ لوگوں سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا‘ ان کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور بری یہ ہے کہ بہت جلد لوگوں کے بُرے رویے بھول جاتا ہوں۔“
90 ”دل کی سنتے ہیں یا دماغ؟“
”کوشش کرتا ہوں کہ دماغ کی سنوں مگر کبھی کبھی دل آڑے آجاتا ہے۔“
91 ”بچپن کا ایک کھلونا جو ابھی تک آپ کے پاس موجود ہے؟“
”نہیں جی کچھ نہیں ہے سوائے اچھی یادوں کے۔“

92 ”غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟“
”غصے میں زیادہ بھوک لگتی ہے اس لیے چھوڑ نہیں سکتا۔“
93 ”غصے میں پہلا لفظ؟“
”لفظ نہیں نکلتا.... بلکہ چلاتا ہوں۔“
94 ”مارننگ شو پسند ہیں؟“
”نہیں کوئی خاص نہیں۔“
95 ”بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتے رہتے ہیں؟“
”دو تین گھنٹے تو لگ ہی جاتے ہیں سوتے سوتے۔“
96 ”بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ لازمی چیزیں؟“
”چھوٹے چھوٹے دو ہاتھی“ ”ایک کینڈل۔“
97 ”زندگی کب بری لگتی ہے؟“
”کبھی کبھی جب کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہوتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کہاں پھنس گیا ہوں۔“
98 ”کھانے کی ٹیبل پہ کیا چیز ہونا بہت ضروری ہے؟“
”چیزوں سے تو فرق نہیں پڑتا.... بس میرا دل چاہتا ہے کہ میرے ساتھ کوئی نہ کوئی کھانے میں ضرور شامل ہو۔“
99 ”قسمت سے پیسہ ملتا ہے یا محنت سے؟“
”میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر آپ پیسے کے بارے میں نہ سوچیں تو پیسہ آپ کو خود بخود مل جاتا ہے۔“
100 ”کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟“
”تو بہت غصہ آتا ہے۔ اب ذرا بریک لے کر سو رہا ہوں اور کوئی جھنجھوڑ کر اٹھا دے تو بہت غصہ آتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی مجھے پیار سے اٹھائے۔“
101 ”اگر آپ کی شہرت زوال پذیر ہو جائے تو؟“
”جو قسمت میں ہے وہ ملنا ہی ملنا ہے.... مگر محنت کو زوال نہیں ہے‘ یہ میرا ایمان ہے۔“



سارہ عرفان..... کراچی

جب بھی انشاجی کو پڑھا۔ ایک شرماتی لجاتی گوری دھیان میں رہی۔ جو آٹا گوندھتے ہوئے نمک ملانا بھول جاتی تھی۔ آج اس گوری کے جانے کی خبر پڑھی تو انشاءجی بہت یاد آئے۔ اللہ ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

نور عبدالسلام..... نواب شاہ

بیسٹ از دا بیسٹ "حالم" تعریف کے الفاظ کم ہیں ۔ابھی تو نمرہ جی "نمل" کے سحر سے بھی نہیں نکل پائے۔ اور پھر آتے ہیں حسن الماب پر بہت زبردست پر حسنل کا رویہ بہت برا لگ رہا ہے اتنے نیک گھرانے کی فرد اور اس طرح کی سوچ 'صد افسوس اور آخری وار نایاب جیلانی ...نوں بعد آئیں اور چھا گئیں مجھے سب ہی لکھاری ...ند ہیں خاص کر عمیرہ احمد 'نایاب جی' سائرہ رضا' ...ر امید بہت زیادہ۔

ارے ارے دشت جنوں آمنہ ریاض بہت اچھا لکھ رہی ہیں پر پلیز پلیز خوش نصیب کو واقعی ہی خوش نصیب ...ائے گا اور کیف پر تو اتنا غصہ ہے حد نہیں۔ باقی بہت پرانا ساتھ ہے اپنے ان تینوں رسالوں کے ساتھ ۔میں نے ہر طرح کے رسالے پڑھے ہیں' ہر ہر چیز پر خواتین 'شعاع' کرن 'جیسا کوئی نہیں سچ یہ ممکن نہیں ہے۔

ج : پیاری نور! آپ کو کیف پر غصہ ہے اور ہمیں خوش نصیب پر غصہ آتا ہے۔ پہلے اتنی اوٹ پٹانگ حرکتیں کیں پھر جھوٹ بول کر کیف کا رشتہ طے کرا دیا۔ بے سوچے سمجھے اس طرح کی حرکتیں کرنے والی لڑکیوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ لڑکیوں کو بہت سمجھ داری سے پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔

جہاں تک ممکن کی بات ہے تو ہم آپ کے دلی جذبات کو سمجھتے ہیں۔ ویسے بھی اتنی مہنگائی کے دور میں مکھن لگانا کوئی آسان بات ہے کیا؟

ناہید اسماعیل..... کراچی

سمیرا حمید نے آخر کار ہمیں سالوں کی خاموشی توڑنے پر مجبور کر ہی دیا۔ "رہ نورد شوق" محنت اور جدوجہد کی لازوال داستان ۔یوں جیسے کسی نے مایوسیوں کے اندھیرے میں حوصلے اور امیدوں کی جگمگاتی شمع روشن کر دی ہو۔ اگلے کئی سالوں تک ایسی تحریر شاید ہی کوئی لکھ سکے اور اگر کوئی لکھ سکا تو وہ یقیناً "سمیرا ہی ہوں گی کہ ہمیں تو پہلے ہی یقین ہے کہ سمیرا کا ریکارڈ سمیرا ہی توڑ سکتی ہیں۔ "رہ نورد شوق" کے سحر سے نکلے نہیں کہ سمیرا "داج" لے آئیں۔ آپ یقین کریں کہ "داج" کے اختتام پر زبان سے بے ساختہ نکلا 'اف یہ کیا لکھ دیا سمیرا نے۔ یوں جیسے خنجر کی نوک سے لکھا ہو۔ جیسے کوئی سکتہ طاری کر دے 'وہی کیفیت ہماری تھی کیونکہ "داج" پڑھنے کے بعد مجھ سے دوسری کوئی تحریر پڑھی ہی نہیں جا سکی۔ ان کا انداز تحریر 'الفاظ کا چناؤ' اور قلم کی روانی اس بات کا ثبوت ہے کہ ان پر اللہ کا خاص کرم ہے۔ ان کی تحریریں دل کو چھوتی نہیں ہیں بلکہ دل میں اتر جاتی ہیں۔ اللہ انہیں نظر بد سے بچائے' آمین۔

نمرا کا "حالم" بے حد منفرد ہے۔ بہت زبردست چل رہا ہے۔ "دشت جنوں" میں خوش نصیب بیچاری اب تک تو بد نصیبیاں ہی بھگت رہی ہے۔ سائرہ رضا ہماری پسندیدہ





خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

ترین رائٹر ہیں مگر "حسن المآب" میں حسنل ہمیں شروع ہی سے ناپسند ہے کیونکہ خود غرض جو ہے' بہرحال سائرہ رضا کی بہترین تحریروں میں "حسن الماب" ایک اور اضافہ ہے۔ سائرہ پلیز "دل موم کا دیا" جیسا کچھ لکھیں۔ نایاب جیلانی نے بھی اچھا لکھا۔ آسیہ رزاقی صاحبہ کا افسانہ ہمیشہ کی طرح بہترین بلکہ افسانہ نہیں اسے حقیقت کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ نادیہ عمر کا خط پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ لوگ بھی کتنے ظالم ہیں اپنے عجیب وغریب تبصروں سے دل دکھا جاتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ "دکھوں" کو ہر گھر اور ہر دل کا رستہ ازبر ہے۔ کب کس کو مل جائے یہ کون جانتا ہے۔

ج: نمرہ احمد' آمنہ ریاض' سائرہ رضا اور سمیرا حمید کے بارے میں آپ نے جو لکھا' ہم اس سے متفق ہیں اور سمیرا حمید تو اپنی ہر تحریر میں پچھلی تحریر سے ایک قدم آگے ہی نظر آتی ہیں۔ اس شمارے میں ان کا ایک افسانہ شامل ہے۔ پڑھ کر اپنی رائے ضرور دیجئے گا۔ ہمیں تو بہت اچھا لگا ہے۔

نادیہ عمر جس دکھ سے گزری ہیں' اسے سہنا آسان نہیں۔ عمر سعد جیسے لوگ بھلائے نہیں جاسکتے۔ ہم ان کے لیے دعا ہی کرسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے زندگی کو آسان بنائے۔

نبیلہ ساجد..... عارف والا

ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے تو ہمارے نام کو پڑھا اور اپنا خط دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ بائنڈنگ کی غلطی کی وجہ سے دشت جنوں کافی کاپیوں میں چھپا نہیں تھا اور جو شمارہ ہم نے خریدا اس میں دشت جنوں نہیں تھا سو صبر کرکے رہ گئے۔ آپ پلیز پچھلا شمارہ بھجوا دیں۔ حسن الماب کی تو ہر قسط پچھلی سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

سائرہ جی کا انداز تحریر تو دل میں اتر جاتا ہے۔ حالم نمرہ جی کے پہلے ناولوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ پتا نہیں نمرہ جی کو اتنے اچھے آئیڈیاز کہاں سے آتے ہیں۔ سمیرا حمید کی داج بہت اچھی تحریر تھی۔ نایاب جیلانی کا آخری وار اور فرح بخاری کا پس دیوار بہت اچھی اسٹوریز تھیں۔

ج: پیاری نبیلہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ پرچا آپ کو پوسٹ کررہے ہیں۔

نادیہ اشرف..... راولپنڈی

اکتوبر کا شمارہ' ٹائیٹل سمیت ہر لحاظ سے شاندار رہا۔ "کرن کرن روشنی" بہت اعلیٰ' انتہائی مددگار کیونکہ باہمی نفاق + بغض کا خواتین ہی زیادہ شکار ہیں۔ "وہاج علی" "مسٹر چارمنگ" 32 کے ہرگز نہیں لگتے۔ سہیل اصغر شوبز شخصیت ہوکر بھی انتہائی سادہ مزاج اور روایتی لگے گھر کے مردوں کی طرح (ہاہاہا)

"آپ کا باورچی خانہ" سمیرا کاجل صدیقی کا انداز بیان دلچسپ تھا۔ سید کاظمی شاہ آپ بھیڑیوں سے مکالمہ نہیں کرسکتے' بہت پراثر تھا "میری بیاض سے" رضوانہ شکیل کا شعر بہتر لگا۔ بیوٹی بکس میں عابدہ کوثر کو دیا جانے والا مشورہ تمام "ڈمل چن ز" کو دے دیا۔ افسانوں میں "ہجرت" سنیعہ عمیر منفرد تحریر و "داج" (رلانے والی' چونکا دینے والی) سمیرا کچھ ہلکا پھلکا بھی لکھ دیں پلیز۔

مکمل ناول میں سارہ عرفان کا اکتوبر کا بہترین ناول جو کہ وقتی طور پر ہمیں گردوپیش سے بے گانہ کرگیا۔ ہر وقت سبق نہیں "تفریح" بھی چاہیے ناں ہم نے پرجوش ہوکر اپنے نیو برینڈ بھتیجے کا نام بھی "فلک شیر" رکھ ڈالا۔ "حسن الماب" سائرہ جی۔ (ویل ڈن' ڈفرنٹ + امیزنگ) اب رسالے کی جان "حالم" Dreamer بہت زبردست حالم کی فاتح سے ٹیلی فونک گفتگو تو ملاکہ کی سرزمین پر "تاریخ اور سچائی" کا تصادم ہے اور یہ بھی "نمرہ ساحرہ" کا ہی کمال کہ وہ ٹینس (Tense) سچویشن میں بھی ہنسا دیتی ہیں۔

ج: پیاری نادیہ! بہت عمدہ اور جامع تبصرہ کیا آپ نے' بہت اچھا لگا پڑھ کر۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

ارم کمال..... فیصل آباد

ہمارے نام میں نادیہ عمر کا خط دل میں کہیں دور جاکر گڑ سا گیا۔ ہر سطر عمر کے دکھ میں ڈوبی ہوئی' ہر حرف عمر کی محبت سے لبریز' دکھ کی اس قیامت خیز گھڑی میں' میں آپ کے ساتھ ہوں نادیہ جی! بس اپنے حوصلے اور برداشت کو بلند رکھیں۔ ان شاء اللہ آپ کی ساری پریشانیاں اور مشکلات ہوا کی طرح ہلکی پھلکی ہوجائیں گی۔

ماڈل کا اسٹائل غضب کا تھا' سب سے پہلے آمنہ ریاض کا "دشت جنوں" پڑھا اور خوش نصیب پر بے انتہا ترس آیا

جبکہ شامیر تو حقیقتاً "ہی شیطان کا ساتھی نکلا۔ اب ماہ نور کا اللہ ہی حافظ' لیکن خوش نصیب کے ساتھ برا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ پھوہڑ ہے' بدتمیز ہے' منہ پھٹ ہے' لیکن ہمیں عزیز ہے۔ "ہجرت" میں اگر ساجدہ بولڈ اسٹیپ نہ لیتی تو زندگی میں بھی خوشی کے رنگ نہ پکڑپاتی۔ جس طرح برائی سے بچنا پڑتا ہے اسی طرح خوشی کو بھی دوڑ کر پکڑنا پڑتا ہے۔ "یار میرا وسدا رہوے" نے دل کو گویا ہاتھوں میں لے لیا۔ "موسم سرخ گلابوں کا" اینڈ نے دل شاد کیا۔ "آخری وار" نے آخر تک بے چین اور بے قرار رکھا۔ اسود کو کم از کم عائشہ کو تسلی دلاسے کے جگنو تو تھمانے چاہیے تھے نا۔ "داج" سمیرا حمید کی تحریر نے سر میں درد کر دیا۔ "حسن المآب" میں موسیٰ کی دین کی طرف واپسی ایک شہید سنگر کی یاد دلا گئی۔ نمرہ احمد کا "حالم" ادبی دنیا میں ایک شاہکار ناول ثابت ہو رہا ہے۔ مستقل سلسلوں میں عدنان بھائی کا سلسلہ اے ون جا رہا ہے۔ اس دفعہ مظلوم بھائی کا پڑھ کر دل بہت دکھا۔ واقعی کافی جگہ مظلوم ہمارے مرد بھی ہیں۔

ج : پیاری ارم! کئی ماہ بعد آپ کا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اتنے عرصے سے کہاں غائب تھیں۔ شامیر شیطان کا ساتھی نکلا لیکن خوش نصیب کو دیکھیں' پھوہڑ' بدتمیز اور منہ پھٹ ہونے کے ساتھ ساتھ عقل سے بھی فارغ ہے۔ جو حرکتیں اس نے کی ہیں' وہ ایک لڑکی کو زیب دیتی ہیں؟

فائزہ بھٹی...... پتوکی

بلیک ڈریس میں لڑکی سرورق کی رونق بڑھا گئی۔ ٹائٹل متاثر کرنے میں پوری طرح کامیاب۔ بلاشبہ پچھلی دفعہ سمیرا حمید نے محنت و ہمت کا ایک شاندار نسخہ ہاتھ میں پکڑا دیا۔ سائرہ رضا اور قانتہ رابعہ کا سمیرا حمید کو مبارکباد دینا سمیرا کے ساتھ ہمیں بھی خوشی دے گیا۔ اگر کوئی بڑا رائٹر کسی دوسرے کی حوصلہ افزائی کر دے تو بہت بڑی بات ہے۔ نادیہ عمر آپ کے دکھ میں دکھی ہوئے۔ نادیہ' یہ دنیا ہے جو کسی حال میں جینے نہیں دیتی۔ حوصلہ پکڑو۔ تمہارا نقصان ایسا ہے جس کا کوئی مداوا نہیں۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

"دشت جنوں" آمنہ ریاض آپ نے خوش نصیب پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ بھئی رحم کریں۔ کیف کیسی محبت ہے تمہاری؟ ہم تو ایسی محبت کو نہیں مانتے۔ معاویہ بڑے فاسٹ جا رہے ہو' پلیز اب پھر "بھوت گھر" میں قدم نہ رکھنا۔ تمہیں اپنی خوشیاں عزیز نہیں ہیں کیا؟
موسیٰ تم بس اپنے قدم مضبوط رکھنا۔ "حالم" نمرہ احمد کو پڑھتے ہوئے اپنی تمام حسیات کو یکجا رکھنا پڑتا ہے۔ جانے کس پل کیا ہو جائے۔ ایسے ذہین و فطین کردار تو ہماری زندگی میں کم ہی پائے جاتے ہیں۔ اب اس دعا کے ساتھ اجازت کے اللہ پاک آپ سب پر رحم کرے۔ (آمین)

ج : پیاری فائزہ! ہمیں تو کیف میں کوئی برائی نظر نہیں آ رہی۔ آخر عزت نفس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہم تو ایسی محبت کو نہیں مانتے جس میں سوائے ذلیل و خوار ہونے کے کچھ نہیں ملتا۔ عزت' محبت سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ محبت کے نام پر بندہ کب تک بلیک میل ہو؟
آپ نے دیکھے نہ ہوں مگر دنیا میں ایسے ایسے ذہین و فطین لوگ پائے جاتے ہیں جن کے آگے تالیہ بھی پانی بھرتی ہے۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ اور اللہ کے عجائبات سے بھری ہے۔

تبسم بشیر عروسی...... شاسوار ڈنگہ

ہمیں رسالے بہت لیٹ ملتے ہیں۔ آپ لوگوں کی بھی مجبوری ہے میں نے اکثر لیٹرز میں پڑھا ہے کہ آپ لوگوں کو اکثر قسط لیٹ ملتی ہیں' پلیز پیاری رائٹرز' ہمیں بے قرار نہ کیا کریں۔ اس ماہ کا خواتین کافی انتظار کے بعد ملا' ٹائیٹل پیارا تھا' سادہ سا' پلیز کبھی صبا قمر کا برائیڈل ٹائٹل دیں! سب سے پہلے بات ہو جائے اس تحریر کی جس پر تبصرہ پچھلے ماہ چاہ کر بھی بیماری کی وجہ سے نہ کر سکی...... سمیرا آپی آپ کی پچھلے ماہ کی تحریر بہت بہت زبردست تھی۔ مختلف ٹاپک پر لکھی گئی تحریر' ہر جملہ' بہت پیارا خاص اور سبق آموز ویل ڈن۔ پھر سے کوئی ایسی تحریر لے کر ضرور آئیے گا۔ سب سے پہلے وہ کہانی پڑھی جس کا ہر ماہ بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ "حالم" نمرہ آپی آپ تو جادوگرنی ہیں۔ آپ کو قارئین کو اپنے سحر میں جکڑنا خوب آتا ہے۔ تالیہ اور داتن مجھے بہت پسند ہیں۔ ایش ایسا کیوں ہو گیا؟ پہلے تو وہ بہت اچھا تھا' آریانہ کا ذکر اس بار کیوں نہ تھا؟ نہ سمیع کا؟ عصرہ نے غلط کیا...... پلیز ایڈم کی الجھنیں سلجھا دیں۔ اس کے بعد ناولٹ پڑھا' حیا کا صبر اور سمجھ داری بہت اچھی

لگی۔ بہت اچھا ناولٹ تھا' ایسی کہانی ضرور شائع کیا کریں۔
"دشت جنوں" معذرت کے ساتھ مجھے بالکل پسند نہیں آ رہا ہے۔ مکمل ناول دونوں ہی پسند نہیں آئے۔ (سچ سچ بتا رہی ہوں۔ اگر برا لگے تو سوری۔ حسن المآب.... سائرہ آپی کی کہانی بھی اچھی ہے۔ موضوع بھی اچھا ہے۔ افسانے خواتین کے ہمیشہ ہی اچھے ہوتے ہیں۔ اس —— دفعہ افسانہ ٹاپ پہ رہا۔ وہ ہے انعام یافتہ.... تین دفعہ پڑھا میں نے یہ افسانہ 'خاص کر وہاں سے جہاں وہ گلوکارہ کو تانگے والے کی ماں کہتے ہیں۔ فریش ہو گئی... اس کے بعد اف یہ زندگی 'سادہ سی تحریر بہت پسند آئی۔ ہجرت بھی خوب رہی۔ داج .... سمیرا آپی برامت مانیے گا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ دو دفعہ پڑھی لیکن سر سے گزر گئی۔ "پس دیوار" بھی بس ٹھیک ہی لگا۔ "نظمیں غزلیں" عبیداللہ 'قتیل کی غزلیں پسند آئیں "رنگا رنگ سلسلہ" میں "محبت" عوام کی امانت ' بے نیام قوم کیا کھویا کیا پایا۔ دلچسپ و عجیب 'فراخ دلی بہت پسند آئے۔ خاتون کی ڈائری سے نوال اور سحر کا انتخاب پسند آئے۔ "میری بیاض" سب انتخاب اچھا تھا۔ آپ کا باورچی خانہ سمیرا کے جواب پسند آئے۔ آپی کیا میں بھی اس میں شامل ہو سکتی ہوں؟ موسم کے پکوان کوئی اچھی سی ویجیٹیبل بریانی کی ریسپی دیں۔ عدنان بھائی کو تو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ ہمارے نام میں پہلا خط پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ نادیہ آپی کے شوہر کے لیے دعائے مغفرت کی۔ انٹرویوز سب ویسے ہی لگے 'کیونکہ ہیروز میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ ہاں اگر ہیروئین ہوتی تو ضرور شوق سے پڑھتی۔

ج : پیاری تبسم! یہ مختلف سلسلے آپ لوگوں کی شمولیت ہی کے لیے ہیں۔ آپ کا باورچی خانہ میں آپ ضرور اس میں شامل ہو سکتی ہیں اور یہ برائیڈل ماڈلز سے تو ہمارا دل بھر گیا ہے۔ خیر آپ نے فرمائش کی ہے تو اپنے دل پر جبر کر لیں گے۔ مکمل ناول آپ کو کیوں اچھے نہیں لگے۔ اگر وجہ بھی لکھ دیتیں تو بہتر ہوتا۔

مسرت الطاف..... کراچی

اس بار ناولز کچھ خاص متاثر نہ کر سکے۔ افسانے بھی بس ایویں لگے البتہ سمیرا حمید کا افسانہ تو سرے سے سمجھ میں آیا' ہی نہیں سر کے اوپر سے گزر گیا۔ خواتین ڈائجسٹ کا ٹائٹل بھی اتنا پسند نہیں آیا۔ میک اپ بالکل پسند نہیں آیا۔

"دشت جنوں" کی یہ ایپی سوڈ مائنڈ بلوئنگ تھا۔ وہ سین تو سب سے زیادہ زیادہ اوسم لگا جب معاویہ منفرا کو دل سے بھرپور انداز میں پرپوز کرتا ہے معاویہ کا اقرار مسمرائز کر دینے والا تھا خوش نصیب کے لیے بہت افسوس ہوتا ہے خاص طور پر روشن امی کا رویہ سب سے زیادہ برا لگا۔ "حالم" کی یہ قسط اچھی لگی۔ فاتح کا بارعب کا کردار پسند آیا۔ تالیہ کا ایکٹو مائنڈ ایک کے بعد ایک پلان کے ساتھ دل کو بھا رہا ہے۔ بس شکوہ ہے تو ایڈم کے کردار سے.... جو ابھی کھل کر سامنے نہیں آ رہا ہے ایڈم کا اپنا کوئی اسٹرونگ سین نہیں ہے۔ اس کردار کو بہت کارنر کر دیا ہے۔

"حسن المآب" میں حسنل کا رویہ فطرت کے خلاف نہیں۔ حسنل موسیٰ کو دیکھنا چاہتی ہے۔ موسیٰ اس کی محبت ہے سمیع الدین نہیں۔ "یار وسدار ہوئے" موضوع میں نیا پن نہیں تھا۔ تحریر اٹریکٹو نہیں لگی لیکن طرز تحریر پسند آئی۔ "موسم سرخ گلابوں کا" ٹاپک بہت جان دار تھا۔ حقیقت کے قریب تر محسوس ہوئی۔ حیا کی ثابت قدمی اچھی لگی۔ "آخری وار" روایتی سی اسٹوری لگی لیکن اسود کا مزاج سمجھ سے بالا تر تھا۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ 'اپنی بچیوں سے بھی اس کی ناپسندیدگی اچھی نہیں لگی۔ افسانے سب بورنگ تھے۔ البتہ رنگا رنگ سلسلہ پسند آیا۔

ج : پیاری مسرت! تعریف اور تنقید کے ساتھ آپ کا تبصرہ حسب معمول جامع اور مکمل ہے۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف و تنقید پہنچا رہے ہیں۔

نعیمہ اینڈ سونیا لیٹین..... خیرپور ٹامیوالی

خواتین کی اتنی تاخیر پر ہم تو جھنجلا جاتے ہیں۔ اب سوچیں کہ خط ہم لکھیں بھی تو کب؟ ہم "جادو کی چھڑی" یعنی نمرہ احمد کا حالم بہت خوب مگر.... اس بار جیسے رک سا گیا ہے پھر "دشت جنوں" میں آمنہ ریاض خوش نصیب کو گھر سے بھگا دیں گی۔ عرفات ماموں شاید کیف کو ساتھ دینے کو بولیں۔ یہ نہ ہو کہ آمنہ ریاض کہہ دیں کہ جن بھوت آیو شمنتی سب مفروضے ہیں اور یہ ادھر معاویہ کو کیا ہو گیا ہے؟ ایسی بھی کیا دیوانگی 'اوور ایکٹنگ لگ رہی ہے۔ بہرحال

کچھ گڑبڑ ہے۔ "حسن المآب" میں بذات خود حسنل کو اصلاح کی ضرورت ہے۔ سمیرا حمید کا "داج" اتنا ظلم اور جہالت.....! اف اللہ اور اینڈ میں کیا ہوا تھا بھلا؟ باقی کہانیاں اتنی روایتی ہوتی ہیں کہ پڑھنے پر بے زاری ہوتی ہے۔ "کرن کرن روشنی" یہاں ایک سائنس دان کا' نفسیاتی ازدواجی الجھنیں' بیوٹی بکس کے مشورے' موسم کے پکوان' آپ کا باورچی خانہ اور "رنگ رنگ پھول" سب سلسلے دل سے پسند آئے۔ خاتون کی ڈائری میں "حمدہ واجد" سحر سہیل اور دانیہ عقیل کی ڈائری کی غزلیں پسند آئیں۔ مجھے نمرہ احمد کی کہانیاں پسند ہیں جو انسانی ذہن کو حیرانی سے دوچار کریں اور انسان متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ کہانی میں کریکٹر ویل ایجوکیٹڈ ہوں' اسٹوڈنٹ لائف کی انجوائے منٹ بھی ہو۔ اچھی اور سلجھی ہوئی کہانیاں ہوں۔ میرا حمید کی کہانی "رہ نورد شوق" پر لیٹ تبصرہ کر رہی ہوں۔ بہت دنوں بعد ان کی یارم کے بعد کوئی کہانی اچھی لگی۔

ج : نعیمہ اور سونیا! آپ کو کس قسم کی کہانیاں پسند ہیں' یہ تو ہمیں پتا چل گیا اور ہم ایسی کہانیاں آپ اور آپ جیسے بہت سے قارئین کے لیے ہی شامل کرتے ہیں لیکن پیاری بہن' آپ یہ تو سوچیں کہ لاکھوں قارئین یہ پرچا پڑھتی ہیں بلکہ بہت سارے مرد حضرات بھی خواتین ڈائجسٹ پڑھتے ہیں۔ کچھ قارئین گھریلو کہانیاں پسند کرتی ہیں۔ کچھ کو روایتی کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ ہم پرچا ترتیب دیتے وقت اپنی تمام قارئین کی پسند کو مد نظر رکھتے ہیں۔ ویسے بھی اگر پرچے میں ایک ہی ٹائپ کی کہانیاں شامل ہوں گی تو پرچا یکسانیت کا شکار ہو جائے گا۔

سیما آصف..... صوبہ کے پی کے ضلع ٹانک

خواتین ڈائجسٹ کا اجراء 1972ء میں ہوا لیکن میں نے مسلسل پڑھنا 1977ء سے کیا اور اگست 2017ء تک کے تمام شمارے میں نے پڑھے ہیں۔ کبھی مانگ کر۔ کبھی خرید کر اور کبھی کرایہ پر۔ میں نے پرانی نئی تمام رائٹرز کو پڑھا ہے جن میں کچھ اب اس دنیا میں نہیں اور کچھ نے لکھنا چھوڑ دیا اور کچھ میری پسندیدہ رائٹرز ٹی وی کے لیے لکھ رہی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ میں شائع کیے گئے تمام افسانے ناول ناولٹ اور بے شمار سلسلے میں پڑھتی رہتی ہوں

۔ آپ سے رشتہ تعلق اس لیے استوار نہیں ہوا کہ یہ شمارے ہمارے علاقے میں بہت دیر سے ملتے ہیں۔ اس لیے ہرماہ چاہتے ہوئے بھی اپنی رائے نہیں دے سکتی۔

میرے علاقے کی بے شمار لڑکیاں عورتیں آپ کے یہ رسائل پڑھتی ہیں۔ اور پھر مل بیٹھ کر تبصرہ بھی کرتی ہیں لیکن آواز آپ تک نہیں پہنچ پاتی۔ پچھلے دنوں ایک بہن نے شاید کوہاٹ سے لکھا کہ وہ باسی روٹی کے ٹکڑے بیچ کر رسالہ اپنے ابو سے منگواتی ہیں۔ میرا بیٹا خوشنود علی جو کہ جی سی کالج لاہور کا اسٹوڈنٹ ہے 'اپنے جیب خرچ سے پیسے بچا کر خواتین، شعاع میں شائع ہونے والے سلسلے وار ناول جو کہ کتابی شکل میں ہیں۔ میرے لیے خریدتا ہے اور اس کا یہ جملہ مجھے بہت پسند ہے جو وہ ہر ناول پر ضرور لکھتا ہے "اپنی پیاری امی کے لیے" مجھے تمام رائٹرز بے حد پسند

عمر کے اس دور میں ہوں کہ کہانیوں کو یاد رکھنا اور کرداروں میں تسلسل و ربط یاد رکھنا میرے لیے اب مشکل ہے۔ بہت سے جاننے والے اپنے پرائے میرے دوست احباب اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ عمر کے اس دور میں جب گوڈے گوڈے قبر میں دھنس چکی ہوں۔ آپ کے رسائل سے ناتا نہیں توڑ سکی۔ زندگی کے تپتے صحرا میں جب لوگ 'معاشرہ' آپ کے گرد زندگی کا دائرہ تنگ کردیں تو آپ کے رسائل میرے لیے بہار کا خوشگوار جھونکا ہیں جو کہ کچھ دیر کے لیے دل و دماغ کو دنیا ومافیہا سے بے خبر کردیتے ہیں۔ ان رسالوں میں شائع ہونے والے دینی سلسلے "کرن کرن روشنی" "پیاری نبی کی پیاری باتیں" اور ایسے بہت سے سلسلے احادیث مبارک پاکستانی بہنوں کے لیے راہبر و رہنما ہیں۔ آپ کے لیے یہ بات حیرت کا باعث ہوگی کہ میرے بیٹے معاذ علی اور خوشنود علی خواتین، شعاع کے تمام ناولز پڑھ کر میرے ساتھ بھرپور تبصرہ کرتے ہیں۔

ج : پیاری بہن! یہ جان کر بہت اچھا لگا کہ آپ ہماری دیرینہ قاری ہیں۔ اللہ آپ کا سایہ آپ کے بچوں کے سر پر سلامت رکھے۔ دیر سویر کوئی مسئلہ نہیں "آپ کا جب دل چاہے بلا تکلف ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرسکتی ہیں۔ تبصرہ کرسکتی ہیں۔ لوگوں کی حیرت جان کر بہت برا لگا۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک اس دنیا میں ہیں صحت و طاقت ہے تو زندگی کو بھرپور انداز میں گزارا جائے۔ اور آپ کے تو ماشاء اللہ اتنے اچھے محبت کرنے والے بچے ہیں پھر دنیا کی اور معاشرے کی پروا کیوں کرتی ہیں۔ خوش رہا کریں۔ اپنے لیے 'اپنے بچوں کے لیے۔ لوگوں کا کیا ہے۔ ان کا تو کام ہی تنقید کرنا ہے۔

انعمتہ صدیقی..... کراچی

میں نے پانچ سال میں ایک ناول لکھا ہے۔ اور چاہتی ہوں کہ خواتین ڈائجسٹ کی زینت بنے۔ ایک بار آپ کو خط لکھا تھا کسی اور نام سے تب شہرت نہیں چاہتی تھی' چاہتی تو اب بھی نہیں۔ بس لکھنا چاہتی ہوں کیونکہ سکون سا ملتا ہے۔ آپ نے خط پڑھ کر کہا تھا کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے آپ لکھیں۔ لکھتی تو میں بچپن سے ہوں۔ بچوں کی کہانیوں سے ابتدا کی تھی۔ پھر آرٹیکلز لکھتی رہی۔ کالج میگزین کے لیے افسانے لکھے۔

خواتین پڑھتے ہوئے گیارہ سال ہو گئے۔ جب انٹرمیڈیٹ میں تھی۔ مجھے بشریٰ سعید کی "سفال گر" رفعت ناہید سجاد کی "چراغ آخر شب" اور عمیرہ احمد اور نمرہ احمد کے سارے کے سارے ناولز بے حد پسند ہیں۔ نمرہ احمد میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ وہ مختلف لکھتی ہیں۔

ج : پیاری انعمتہ! طویل عرصے بعد آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی جہاں اپنی مصروفیت کا احوال لکھا تھا وہیں تھوڑا سا حالیہ شمارے پر بھی تبصرہ کردیتیں۔ آپ ناول بھجوادیں' قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔

مسز فریحہ دلاور..... کراچی

ستمبر کا شمارہ ہمیں عید کی وجہ سے کافی لیٹ ملا اور حسب عادت "حسن الماب" اور اس کے بعد "حالم" پڑھ کر کچھ دنوں کے لیے ہم ڈائجسٹ کو بھول گئے۔ حیران مت ہوں اکثر ہم ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ مہینے کے آخری دنوں میں جب پڑھنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو پھر ہم ڈائجسٹ ڈھونڈ کے نکالتے ہیں اور وہ کہانیاں پڑھتے ہیں جو شروع میں چھوڑ دی تھیں۔ ستمبر کے شمارے میں جس کہانی نے قلم اٹھانے پر مجبور کرہی دیا وہ سمیرا حمید کی کہانی "رہ نورد شوق" ہے جس نے شروع سے آخر تک اپنے سحر میں ایسے جکڑا کہ دوسرے دن میں نے دوبارہ اسے پڑھا اور دل نے بہت داد دی سمیرا حمید کو کہ انہوں نے اتنی عرق ریزی کے بعد کردار

لا اس سے متعلقہ تمام امور کو اس طرح بیان کیا کہ کہیں بھی اس کی گرفت کمزور نہیں پڑی۔ اور پھر یادوں کی پٹاری سے ایک اور کردار شاید "نانبائی کی بیٹی" اس کا عنوان تھا نکل کر سامنے آیا۔ جس میں دینا کا کچھ حلیہ اس لڑکی سے ملتا جلتا تھا۔ یہ یاد نہیں آرہا کہ اس کی مصنفہ کون تھیں۔

باقی سلسلے تو روٹین کا حصہ ہیں چاہیں نفسیاتی الجھنیں ہوں یا بیوٹی بکس وغیرہ) کچھ بہنوں نے شاید پہلے بھی گزارش کی ہے کہ حالم اور نمل کی مصنفہ نمرہ احمد کا تفصیلی انٹرویو شائع کیجیے۔ وہ ہر دفعہ ہمیں اپنے موضوع کے حوالے سے حیران کردیتی ہیں۔

ج : پیاری فریحہ! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ صحت مند اور خوش و خرم رکھے۔ آمین سمیرا حمید کا ناول بلاشبہ ایک یاد رہنے والی تحریر ہے۔ "نان بائی کی بیٹی" عنیزہ سید نے لکھا تھا۔ دینا کا حلیہ ممکن ہے اس لڑکی سے ملتا جلتا ہو لیکن وہ بالکل مختلف موضوع پر مختلف تحریر تھی۔

ج آپ تیس سال سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہیں۔ جان کر خوشی ہوئی لیکن ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوا کہ اس سے پہلے کسی بھی تحریر نے آپ کو اتنا متاثر نہیں کیا کہ آپ ہمیں یاد کرلیتیں۔ اب آپ باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

نمرہ احمد نے انٹرویو دیا تو آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔

گڑیا راجپوت..... موڑ کھنڈا

آپ نے تو قسم اٹھا رکھی ہے۔ گڑیا کو کسی بھی سلسلے میں شامل نہ کرنے کی... پاکستان کا پوسٹ سسٹم اتنا بھی گیا گزرا نہیں... کہ آپ کو بھیجی گئی کوئی چیز بھی نہ ملے۔ نمرہ احمد بہت اچھا تو لکھ رہی ہیں لیکن ان کی اسٹوریز میں تضاد بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یعنی وہ مذہب اور دنیا کو ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ نماز پڑھو قرآن کو تفسیر کے ساتھ پڑھو اور سب سے زیادہ "انصاف" کی بات کرتی ہیں لیکن گھونگھریالے بال کھولے ہیں تو خیر ہے... میں نے ان کی دونوں اسٹوریز پڑھی ہیں۔ "جنت کے پتے" اور "نمل" دونوں ایک دوسرے کے آپوزٹ... ایک پردے کا الارم بجاتی ہے اور دوسری فیشن میں سر کھلا بھی ہو جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لی بیب... ان کی کہانیاں پڑھ کر انسان ملا ٹائپ بن تو سکتا ہے لیکن صرف "ماڈرن ملا" خیر...! چونکہ میں نے کافی مہینے کچھ بھی لکھا نہیں اس لیے کچھ اختتام شدہ اسٹوریز کا ذکر بھی کروں گی... سب سے پہلے "رقص بسمل" اس کا اینڈ تو حقیقت کی طرح لگا۔ ایسا کچھ مطلب اس سے ملتا جلتا ہمارے قصبے موڑ کھنڈا میں بھی ہو چکا ہے۔ یہاں کا سب سے مشہور اور اچھا ڈاکٹر کسی کی بات ہی نہیں سنتا تھا۔ لیکن اس کا اپنا ہی بیٹا جب روڈ حادثے کا شکار ہو کر باپ کے ہاسپٹل پہنچا تو ڈاکٹر صاحب کو تو پہلے پیسے چاہیے تھے... بس بیٹا سننے میں آیا ہے فوت ہو گیا اور باپ پتا چلنے پر پاگل... کافی سال جنگلوں میں گزار کر اب کچھ سالوں سے واپس آیا ہے اور اب تو کسی مریض کی چھینک کی آواز بھی سن لے تو اس کی طرف بھاگتا ہے... سمیرا حمید لکھتی تو بہت اچھا ہے لیکن حقیقت سے بہت دور... اور ہاں باغ میں... دن ہو یا رات گھومو پھرو... نا بھئی نہ... ہم تو اپنے باغ میں دن کے وقت جاتے ڈرتے ہیں... خوشبو نہیں لگا کر جاتے تو پھر رات... اور ہاں امپورٹنٹ بات آپ لڑکیاں (قاری) بات بے بات ایک دوسرے پر تنقید کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہر انسان کی اپنی مرضی اور پسند ہے۔ کسی دوسرے کو اعتراض کرکے پاٹے خان بننے کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی کو کسی کی کہانی پڑھ کر مزا نہیں آرہا... تو یہ اس کا مزاج اس کی پسند...

ج : ہاہاہا... پیاری گڑیا! تم تو اتنی پیاری گڑیا ہو، تمہیں خوار کرنے کا سوچ سکتے ہیں بھلا! پاکستان کا پوسٹ سسٹم تو واقعی اچھا ہے لیکن گڑیا سے ان کی کوئی دشمنی ہے تو کہہ نہیں سکتے۔ اب یہ تمہاری پاٹے خان والی بات شامل کر دیں تو پھر اس پر تبصرے تو ہوں گے نا... ہم نے ہر ایک کو اظہار رائے کی آزادی دے رکھی ہے اور ہم ان آرا کا احترام بھی کرتے ہیں اس لیے اسے تو تو میں میں کرانے والی قبیح حرکت نہ سمجھا جائے۔ "بدلتے موسم کے ساتھ" پڑھا نہیں۔ "بس اک احساس" اور "حی علی الفلاح" کے لیے معذرت۔

ثروت نعیم..... چارسدہ

میں چارسدہ کی رہنے والی ہوں۔ ضلع چارسدہ پشاور کے قریب واقع ہے اور ایک خوب صورت اور سر سبز علاقہ ہے۔ یہاں بہت سے گاؤں بھی ہیں۔ ہسپتال، سکول اور کالجز بھی بہت ہیں۔ اس کے علاوہ ایک یونیورسٹی بھی ہے۔ اب اپنے بارے میں بتادوں۔ میں ایم اے اردو ادب میں

کر رہی ہوں (دعا کریں میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤں)۔ میں خواتین ڈائجسٹ کی دیوانی ہوں۔ اسی سے تو مجھے لکھنے کا شوق ہوا۔ عمیرہ احمد، نمرہ، سمیرا حمید میری فیورٹ رائٹرز ہیں۔ عمیرہ احمد کا آب حیات، ایمان امید اور محبت اور تقریباً سب ہی ناول بیسٹ ہیں۔ نمرہ احمد کے "نمل" اور اب "حالم" کو پڑھ کے کسی اور کو پڑھنے کا دل ہی نہیں کرتا۔ نمرہ جی سے ایک سوال پوچھنا تھا کہ آپ اپنے ناولز میں جب فارن ملکوں کا ذکر کرتی ہیں تو آپ وہاں کا وزٹ کرتی ہیں یا کسی اور ذریعے سے ریسرچ کرتی ہیں؟ مجھے ضرور بتائیے گا اور اس کے علاوہ آپ کا کردار فارس غازی حقیقت میں کہاں ملے گا؟ سمیرا حمید کا بورشے پڑھ کے آئرلینڈ سے محبت ہو گئی تھی اور جگنوؤں سے بھی پیار ہونے لگا تھا۔ اور یارم پڑھ کر تو بس مانچسٹر یونی میں ایڈمیشن لینے کو دل مچلنے لگا۔ بورشے تو اتنا پسند آیا تھا کہ میں نے اسے انگریزی میں کنورٹ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کا پورا ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔

ج: پیاری ثروت! فارس غازی آپ کو کہاں ملے گا۔ یہ تو نمرہ بھی نہیں جانتیں۔ اسے آپ کو خود ہی کھوجنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے آپ کے اردگرد ہی کوئی فارس غازی ہو لیکن آپ نے اسے پہچانا ہی نہ ہو۔ ہر انسان کی نظر مختلف ہوتی ہے اور ایک تخلیق کار کی نظر عام انسانوں سے بہت مختلف، بہت گہری ہوتی ہے۔ یہ نمرہ احمد کی نظر تھی جس نے فارس غازی کو دیکھا اور اتنے خوب صورت انداز میں اس کو ڈھالا کہ آپ اسے تلاش کر رہی ہیں۔

کچھ ملکوں میں نمرہ گئی ہیں لیکن جہاں وہ جا نہیں سکیں ان کے بارے میں جاننے کے لیے وہ نیٹ اور کتابوں سے مدد لیتی ہیں۔

یاسمین ساجد، روزینہ نعیم...... کھیالی گوجرانوالہ

ٹائٹل میں لڑکی کا آئی میک اپ بالکل اچھا نہیں ہوا۔

دہاج علی سے ملاقات اچھی رہی۔

سب سے پہلے "دشت جنون" کو پڑھا۔ کہانی میں جو ایک خوف، تجسس سا وہ تھوڑا کم ہوتا جا رہا ہے۔ صیام اور ماہ نور کو تو لازمی سزا ملنی چاہیے روشن امی کا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ کم از کم بات تو سن لیتیں۔ ماہ نور تو ہے ہی بے وقوف اور کیف کی تو بات ہی نہ کریں۔ دل کرتا ہے کہ سولی پر لٹکا دوں۔ معاویہ کا رویہ بہت عجیب لگ رہا ہے ایک دم اتنا پیار شو کرنا شروع ہو گیا ہے۔ سمجھ سے باہر کردار۔

"موسم سرخ گلابوں کا" میانہ روی تو اعزاز صاحب انسان میں نام کو نہیں تھی۔ ماں، بہن کے لیے اتنا خرچ اور بیوی کے لیے ہاتھ تنگ ہے۔ شکر ہے کہ نایاب جیلانی بھی اپنے اصل روپ میں واپس آئیں۔ وہی منظر وہی مکالمے جو ان کی کہانی کا خاصہ ہیں، پڑھ کر مزا ہی آ گیا۔ ایک اچھی ہلکی پھلکی لو اسٹوری تھی۔ ایوارڈ کی حق دار افسانوں میں نمبرون سمیرا حمید دل کو چھو لینے والا افسانہ اس پر تو فلم بننی چاہیے۔

"حسن المآب" کو پڑھا کہانی آہستہ آہستہ ہی آگے بڑھ رہی ہے۔ نفسیاتی الجھنیں بہت افسوس ہوا شاہدہ نورین آپ کے بھائی کے متعلق پڑھ کر، آپ لوگوں نے رشتہ کرنے کے بعد بھی ان کے گھر کا چکر نہیں لگایا جو آپ کو لڑکی کے بارے میں پتا ہی نہ چل سکا۔

ج: پیاری روزینہ اور یاسمین! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ خوش نصیب کا ہمیں بھی اتنا ہی صدمہ ہے جتنا آپ کو۔ مگر خود کو عقل کل سمجھنے والوں کو ٹھوکر بھی زور کی لگتی ہے۔ کیف نے محبت کی تھی حماقتوں کو سدھارنے کا ٹھیکہ نہیں لیا تھا۔ اور پھر محبت کرنے والے ایسے ہی حساس ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات ان کے دل پر جا لگتی ہے یہاں تو خوش نصیب نے صیام کو ہی پیچھے لگا دیا۔ اب وہ بیچارا غصہ بھی نہ دکھائے۔



آمنہ ریاض

وحشتِ جنوں

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی.... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔

معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔

فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ' وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ' معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔

کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔

صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔

شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہ جہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔

باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں' جس کی وجہ سے وہ تنگ مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی





ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور ٹیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

ایک حادثے میں آئے کت اپنے بچے سے محروم ہوجاتی ہے اور اس کا ذمہ دار معاویہ کو سمجھتی ہے۔ معاویہ اس سے شادی کا فیصلہ کرتا ہے، مگر وہ انکار کرکے اپنے وطن لوٹ جاتی ہے۔ معاویہ اپنے گھر آجاتا ہے۔ کچھ سالوں بعد صاعقہ ممانی کے بھتیجے کی شادی میں دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ جہاں معاویہ آئے کت سے اپنی شادی کا اعلان کرتا ہے۔ صاعقہ ممانی، ماموں، معاویہ کے والد سب اس رشتے سے ناخوش ہیں، مگر معاویہ اپنے دلائل سے انہیں قائل کرلیتا ہے۔ کچھ رد و کد کے بعد آئے کت بھی راضی ہوجاتی ہے۔

شاہ میر کچھ شعبدے دکھا کر پورے گھر کو متاثر کرتا ہے، مگر خوش نصیب اس کی باتوں میں نہیں آتی البتہ اس کے دل و دماغ پر ضرور ان باتوں کا اثر ہوتا ہے۔

منفرا کے والد مسٹر جمال پاکستان جانے کے لیے بضد ہیں، مگر ان کا بیٹا آدم تیار نہیں۔

معاویہ کی آئے کت سے شادی کو وادی کے تمام لوگ نیکی سمجھ کر سراہتے ہیں۔ اردشیر ازی ناراضی بھول کر اپنی دوسری بیوی اور تینوں بچوں سمیت فلک بوس پہنچ جاتے ہیں اور شادی کے انتظامات انتہائی اعلا پیمانے پر کرواتے ہیں۔ مہندی کی رات آئے کت کو فلک بوس کی عمارت پر ایک ہیولہ نظر آتا ہے۔

مٹھو بھائی خوش نصیب کو خودکشی کرتا دیکھ کر بچا لیتے ہیں۔ پورے خاندان میں اس بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ خوش نصیب اپنے اس فعل سے خود بھی حیران ہوتی ہے، اسے خود نہیں معلوم کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ صباحت بیگم کو فضیلہ چچی کی اس معاملے میں نکتہ چینی بری لگتی ہے۔ وہ فہمینہ کو روشن امی کی بھری جوانی میں بیوگی اور مشکلات کا بتاتی ہیں جنہوں نے روشن امی کے شوخ مزاج کو بدل کے رکھ دیا تھا۔

آدم کا خیال ہے کہ اس کے والد منفرا کی شادی اس کے بچپن کے دوست شاہ میر سے کریں گے۔ مگر وہ اس خیال کو رد کردیتی ہے۔ وہ اسے صرف دوست سمجھتی ہے۔

خوش نصیب کی خودکشی کی خبر کیف کو بھی مل جاتی ہے۔ وہ اسے فون پر تنگ کرتا ہے تو وہ غصے میں شاہ میر کے جبران سے ملنے کی ضد کرتی ہے اور اگلے روز شاہ میر ایک زیر تعمیر بنگلے پر اس کی ملاقات جبران سے کراتا ہے۔ جبران روایتی جن نہیں بلکہ غیر معمولی حسن کا حامل پراسرار سا شخص ہے۔ شاہ میر خوش نصیب کو کمرے میں بند کرکے چلا جاتا ہے۔

آئے کت کسی بھی آسیب کو ماننے سے انکار کردیتی ہے اس کے خیال میں کوئی انہیں ڈرا رہا ہے۔ مگر معاویہ اسے آسیب ہی سمجھتا ہے۔ کسی بھی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کے لیے وہ نکاح کا انتظام کرتا ہے۔ مگر عین نکاح کے وقت آئے کت پراسرار انداز میں غائب ہوجاتی ہے۔

خوش نصیب تھوڑی کوشش کرکے باہر آجاتی ہے۔ ایک دوسرے کمرے میں اسے شاہ میر بیری والے ملنگ بابا کے ساتھ شیطانی عملیات میں مصروف نظر آتا ہے، وہیں جبران ہوتا ہے جو اسے دیکھ لیتا ہے۔ جبران، خوش نصیب کو وہاں سے نکال دیتا ہے فراڈیے شاہ میر کی اصلیت سے آگاہ کرتا ہے۔ جبران درحقیقت معاویہ ہے جو کسی روح کی تلاش میں شاہ میر سے ٹکرایا ہے۔

شاہ میر کے دھمکانے پر خوش نصیب گھر میں کسی کو بھی اس کی اصلیت سے آگاہ نہیں کرتی۔ فضیلہ چچی صیام کا رشتہ شاہ میر اور کیف کے لیے منہا کا عندیہ دیتی ہیں۔ کیف گھر آتا ہے۔ جہاں خوش نصیب اسے شاہ میر کے بارے میں بتانا چاہتی ہے مگر صباحت تائی کے آنے سے بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

شامیر کو شیطان کی بھینٹ چڑھانے کے لیے ایسی لڑکی کی ضرورت تھی۔ جس کی پیشانی پہ تل ہو۔ خوش نصیب اس کے خیالات اور دھمکیاں سن کر بہت پریشان ہوتی ہے اور اس کی حقیقت کیف کو بتاتی ہے مگر کیف اس بات کو ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔

شامیر اور صیام کی منگنی ہوتی ہے تو خوش نصیب کیف کی پسند کا بتاتی ہے' یوں صیام کی منگنی شامیر کے بجائے کیف سے ہو جاتی ہے۔ کیف خوب غصہ کرتا ہے' مگر خوش نصیب نے یہ سب صیام کو بچانے کے لیے کیا ہے کیوں کہ اس کی پیشانی پہ بھی تل ہے۔

شامیر خوش نصیب کو نئے سرے سے دھمکاتا ہے۔ اپنے والدین کی شادی کی سالگرہ پر منفرا کی اتفاقی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے وہ اسے سب سے ملواتی ہے۔ سب اس کے حسن اور دولت سے متاثر ہوتے ہیں۔

بشام کے جنگل سے ایک عورت کی مسخ لاش ملتی ہے۔ اس کے جسم پر آئے کت کا عروسی جوڑا تھا' مگر معاویہ نے اسے آئے کت ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ اس کی تلاش کا ارادہ رکھتا تھا' مگر اردشیر ازی نے اس سلسلے میں اس کی کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ آئے کت کے تمام اکاؤنٹس خالی پڑے تھے اور اس کا فریب کھل گیا تھا' مگر ان سب باتوں کے باوجود معاویہ اس کی تلاش کا ہر ذریعہ اپناتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ اس ناکامی نے اسے تلخ اور بد مزاج بنا دیا ہے۔

مونٹوک میں اس کی منفرا اور آدم سے ملاقات رہتی ہے۔

خوش نصیب' عرفات ماموں کو شامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ مخمصے میں پڑ جاتے ہیں۔ کیف کو اس کی باتوں پر ذرا یقین نہیں آتا۔ عرفات ماموں کو فالج ہو جاتا ہے۔

شامیر خوش نصیب کو دھمکاتا ہے کہ ماموں کو یہ سزا اس نے دی ہے اور آئندہ اس کے حمایتیوں کا اور وہ برا حشر کرے گا۔

ماہ نور' شامیر سے محبت کا اعتراف کرتی ہے۔ خوش نصیب اسے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ ناراض ہو جاتی ہے۔

فضیلہ چچی خوش نصیب کو بہو نہیں بنانا چاہتیں مگر شفیق چچا کے سمجھانے پر راضی ہو جاتی ہیں۔ خوش نصیب' طوطے بھائی سے شادی پر معترض ہے مگر روشن امی اسے لفٹ نہیں کراتیں۔ خوش نصیب تمام سچائی عرفات ماموں کو بتاتی ہے' انہیں یقین آجاتا ہے۔ کیف بھی سن لیتا ہے مگر شش و پنج کا شکار ہوتا ہے۔

صیام' کیف کی بے رخی سے تنگ آکر شامیر کو خود سے شادی کرنے کا عندیہ دیتی ہے۔ شامیر انکار کر دیتا ہے۔

معاویہ' منفرا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ بات اپنے والد کو بتاتا ہے۔ وہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور چاہتے کہ یہ شادی فلک بوس میں ہو۔ معاویہ راضی ہو جاتا ہے۔

اکیسویں قسط

"گڈ ایوننگ۔۔۔"

کوئی اس کے کان کے پاس گنگنایا تھا اور وہ جو اپنے ہی کسی خیال میں گم، چائے کی دیگچی پر نظر جمائے کھڑی تھی، بری طرح ڈر کر پلٹی تھی۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ آج صبح سے ہی موسم میں کچھ گرمی تھی، عجیب حبس تھا، جس نے گرد و پیش کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ہوا رکی ہوئی تھی اور کل ملا کر یہ گرمی اور حبس سب کے موڈ پر اثر جمائے ہوئے تھے۔ ناشتے کے بعد سب ہی اپنے اپنے کمروں میں گھسے بیٹھے تھے۔

چھت پر پھیلی دھوپ نے کمرے کو خوب ہی گرم کر رکھا تھا۔ چونکہ آج کل گیلری پر مکمل طور پر خوش نصیب کا قبضہ تھا سو مجبوراً اسے کمرے میں بیٹھنا پڑ رہا تھا۔ نانی حسب معمول اونگھنے میں مشغول تھیں۔ فاطمہ آنٹی کو کسی رشتے دار کے گھر شادی کا بلاوا دینے جانا تھا تو وہ جاتے جاتے روشن امی اور فضیلہ چچی کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔

ماہ نور کا موڈ بہت خراب تھا۔ اول تو گرمی نے دماغ خراب کر رکھا تھا۔ دوم دل ابھی تک خوش نصیب کی

حرکت سے ہی خفا تھا کہ کل شام شامیر اور صیام کی گفتگو سننے کو مل گئی۔ دل تو چاہا تھا کہ صیام کو خوب ہی کھری کھری سنائے مگر جانے کیا سوچ کر اس نے صبر کر لیا تھا۔ ہاں دل ہی دل میں وہ شامیر سے بہت شرمندہ تھی کہ پہلے بہن اور پھر کزن نے کس قسم کی بے راہ روی کا مظاہرہ کیا تھا۔

یہ سوچتے ہوئے وہ یقیناً یہ بھول گئی تھی کہ شامیر اور اس کی شادی بھی ایک افیئر کا ہی نتیجہ تھی۔ جانے کیوں دوسروں کے رویے اور عمل کو جانچتے وقت ہم خود اپنے عمل کو بھول جاتے ہیں یا شاید یہ ایک فطری عمل ہے کہ ہم اپنے بارے میں کبھی بھی غیر جانب دار ہو کر نہیں سوچ پاتے۔

خیر تو بات ہو رہی تھی حبس اور گرمی کی جس نے دوپہر کے قریب پلٹا کھایا تھا۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے کہ شدید گرمی اور حبس، بارش اور ٹھنڈی ہوا کا سبب بن جاتے ہیں تو آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تین بجے کا وقت تھا جب کالے سیاہ بادلوں نے تیزی سے آسمان پر ڈیرے ڈالے تھے اور یک دم ہی ٹھنڈی ہوا چل پڑی تھی۔ باہر گلیاں جو کچھ دیر پہلے تک سنسان پڑی تھیں، یک دم جاگ اٹھیں۔ بچے جنہیں ماؤں نے گرمی سے پریشان ہو کر گھر میں زبردستی روک رکھا تھا، موسم کے بدلتے تیور دیکھتے ہی گھر سے نکل آئے تھے اور اب گلیوں میں اودھم مچاتے ہوئے مختلف کھیل کھیلنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ زیادہ دیر نہ لگی تھی کہ بارش بھی شروع ہو گئی۔ آسمان نے خوب ہی ترس کھایا تھا گرمی سے اکتائی ہوئی خلقت پر۔۔۔ بارش جو شروع ہوئی تو پھر اگلے دو گھنٹوں تک برستی ہی رہی۔ موسم بے حد خوشگوار ہو گیا۔ پھول پودے دھل گئے۔ ہوا میں موجود حبس اپنی موت آپ مر گیا۔ بارش رکنے کے بعد بھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی رہی۔

فضل منزل کے مکین بھی کون سا کوئی روبوٹ تھے۔ گھر میں جو بھی حالات چل رہے ہوں بہرحال ینگ جنریشن کا موڈ اس موسم نے ضرور خوش گوار کر ڈالا تھا اور سب نے ہی کمرے کو اللہ حافظ بول کر باہر آ جانے کو ترجیح دی تھی۔ پھر گھر میں اس وقت بزرگوں کے نام پر صرف تائی اماں موجود تھیں جنہوں نے کمرے میں کچھ دیر آرام کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

ماہ نور کے موڈ پر بھی موسم نے اچھے اثرات مرتب تھے۔ اس نے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھول دیا اور دہلیز پر ہی دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے دل کا موسم تروتازہ کر رہے تھے۔ خیال کے تانے بانے خود بخود شامیر اور اپنے رشتے کی طرف مڑ گئے۔ وہ جو ذہن میں خوش نصیب اور صیام کی حرکت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے، جب سوچ کا رخ شامیر کی طرف مڑا تو ان کا خیال خود بہ خود دماغ سے اڑنچھو ہو گیا۔

اپنے خیالات سے وہ چونکی تب تھی جب اس نے اپنے نام کی پکار سنی۔ یقیناً وہ منہا تھی جو نیچے سیڑھیوں کے پاس کھڑی اونچی آواز میں پکار رہی تھی۔ بارش تو رک ہی چکی تھی سو وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور چھت کو پار کر کے سیڑھیوں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''کیا ہو گیا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ شامیر کو سوچتی رہی تھی وہ، یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ ہوتی۔

''کیا کر رہی ہو؟ نیچے آ جاؤ یار۔۔۔'' منہا نے کہا تھا۔

کچھ سوچ کر وہ سیڑھیاں اترتی چلی گئی تھی۔

''ہم لوگ عرفات ماموں کے پورشن میں جا رہے ہیں۔ تمہیں بلانے آئی تھی کہ تم بھی آ جاؤ۔۔۔'' منہا نے خوش نصیب کے بارے میں استفسار کرنے یا اسے دعوت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

''باقی سب کدھر ہیں؟'' ماہ نور نے پوچھا۔

''وہ لوگ چلے گئے ہیں پہلے ہی۔۔۔صیام، فہمینہ، کیف بھائی سب ادھر ہی ہیں۔ چلو آجاؤ تم بھی۔۔۔''
''ہاں ٹھیک ہیں۔۔۔ مگر یار! مجھے بھوک لگی ہے۔ چائے اور پکوڑوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' ماہ نور نے کہا تھا۔
''ہائے ے ے۔۔۔ بڑا ہی نیک خیال ہے ماہ نور۔۔۔ جگ جگ جیو، سدا خوش رہو۔۔۔'' منیہا نے پکوڑوں کے نام پر بڑی بوڑھیوں کی طرح ماہ نور کی بلائیں ہی لے ڈالی تھیں اور ماہ نور کی ہنسی چھوٹ گئی تھی اس کے انداز پر۔
''چلو تم جاؤ۔۔۔ میں لے کر آتی ہوں چائے اور پکوڑے۔۔۔'' وہ مسکراتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔
جلدی جلدی پکوڑے اور چٹنی تیار کی، ساتھ ہی کچھ چپس بھی تل لیے۔ ایک طرف چائے کی دیگچی بھی چڑھا رکھی تھی مگر دل کا موسم اداس ہو گیا تھا۔ پورے گھر میں ایک خوش نصیب تھی جسے پکوڑوں میں ذرّہ برابر بھی دلچسپی نہیں تھی اور وہی تھی جس کے لیے ماہ نور ہمیشہ الگ سے چپس بناتی تھی۔ لاشعوری طور پر اس نے آج بھی یہ کام کیا تھا مگر حالات یاد آنے پر دل پر بوجھ آ پڑا تھا۔
''کاش خوش نصیب! تم یہ سب نہ کرتیں۔۔۔'' اپنے ہی خیالات میں گم، چائے کی دیگچی پر نظر جمائے وہ بڑبڑائی تھی۔
''گڈ ایوننگ۔۔۔''
اسی وقت کوئی اس کے دائیں کان کے پاس گنگنایا تھا اور وہ جو اپنے آپ میں گم کھڑی تھی، بری طرح ڈر کر اپنی جگہ سے پلٹی تھی۔ دوسری طرف شامیر شرارت سے بائیں طرف ہو گیا تھا۔ ماہ نور نے جو دائیں طرف کسی کو بھی نہ پایا تو وہ سٹپٹا کر پیچھے ہٹی مگر جب اسے بائیں طرف کھڑے شامیر کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ ایک گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ بلاشبہ وہ ڈر گئی تھی کیونکہ جہاں تک اسے معلوم تھا، گھر میں اس وقت صرف تائی اماں موجود تھیں جو کہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں۔ دوسرے اسے شامیر سے ایسی کسی شرارت اور ملاقات کی امید نہ تھی۔
ماہ نور کی شامیر سے بات پکی ہونے کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کا ڈر کم ہوا تو فطری طور پر اسے ایک جھجک نے گھیر لیا۔ شامیر بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلتے شرم کے رنگ اسے بہت بھلے معلوم ہوئے تھے۔ مغربی معاشرے کی پیداوار کے لیے یہ مشرقی رنگ بہت انوکھے سے تھے۔ دل یک دم ہی کچھ مزید شرارت پر آمادہ ہو گیا تھا سو وہ کچھ مزید پھیل کر شیلف سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔
''کیسی ہیں محترمہ۔۔۔؟''
''ٹھیک۔۔۔ آپ کو کچھ چاہیے تھا؟'' اپنی جھجک کے زیرِ اثر وہ جلد از جلد شامیر کو یہاں سے بھیج دینا چاہتی تھی۔

''چچ چچ چچ۔۔۔ بہت بری بات ہے۔۔۔ اخلاقی طور پر آپ کو میری ضرورت سے پہلے میرا حال پوچھنا چاہیے تھا۔'' اس کی آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت بھری ہوئی تھی اور یہی شرارت ماہ نور کو مزید کنفیوز کر رہی تھی۔
''ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ کیسے ہیں آپ؟'' ماہ نور سمجھ گئی تھی کہ وہ آسانی سے ٹلنے والا نہیں ہے۔
''تمہیں کیسا لگتا ہوں؟'' بات سے بات نکالنا کوئی شامیر سے سیکھتا۔
''بہت اچھے۔۔۔ بہت پیارے۔۔۔'' ماہ نور کے دل نے گواہی دی تھی مگر کچھ سوچ کر وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''انسانوں جیسے۔۔۔''
شامیر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ ''بہت تیز ہو تم۔۔۔''
ماہ نور بھی مسکرادی تھی۔ ٹھنڈی میٹھی چاندنی جیسی مسکراہٹ۔ شامیر مزید مبہوت ہوا تھا۔ وہ بے شک اپنے دعوے کے خلاف ماہ نور کے عشق میں گرفتار نہیں تھا لیکن اس کی خوبصورتی کسی بھی انسان کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی تو پھر وہ کون سا کوئی زاہد خشک بندہ تھا۔ جہاں سے وہ آیا تھا خوبصورتی وہاں بھی بہت تھی لیکن ایسی خوبصورتی کہ جس سے نور پھوٹے۔۔۔ ایسی خوبصورتی سے اسے پہلے بار واسطہ پڑا تھا۔
''کچھ چاہیے تھا آپ کو؟'' ماہ نور نے جو اسے مسلسل خود کو دیکھتا پایا تو دھیان بٹانے کو بول اٹھی۔
''ہاں۔۔۔ ''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
ماہ نور کچھ نہیں بولی تھی بس سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔
''کافی۔۔۔ مل سکتی ہے؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔
''ضرور۔۔۔ بس پانچ منٹ رکیں۔۔۔ آپ بیٹھیں، میں ابھی آئی۔''
کچن میں پڑی ڈائننگ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ باہر نکل گئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس لوٹی تو اس کے ساتھ شیرو بھی تھا۔ شیرو کے ہاتھ چائے اور پکوڑے روانہ کر کے اس نے تیزی سے کافی بنانے کا سامان نکال لیا تھا۔ مگ میں کافی، چینی اور پانی کے چند قطرے لے کر اس نے تیزی سے پھینٹنا شروع کر دی تھی۔ شامیر کی نظریں اس پر جمی تھیں اور اسے اچھی طرح ان نظروں کا احساس تھا۔
''یہ کام تم یہاں بیٹھ کر بھی کر سکتی ہو ماہ نور۔۔۔'' شامیر جیسے اکتا کر بولا تھا۔
ماہ نور نے چند لمحوں کے لیے سوچا پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شامیر کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔
شامیر نے چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کیا پھر بولا ''اے۔۔۔ کیا سوچ رہی ہو؟ کوئی بات کرو نا۔۔۔''
''میں کچھ سوچ رہی تھی شامیر۔۔۔'' ماہ نور شادی سے پہلے شامیر سے خوش نصیب اور صیام کے حوالے سے معذرت کرنا چاہتی تھی۔
''اچھا۔۔۔ کیا بات ہے جناب آپ کی۔۔۔ میں سامنے بیٹھا ہوں اور آپ کچھ سوچ رہی تھیں۔ بہر حال بتاؤ کیا سوچ رہی تھیں۔''
ماہ نور نے چند لمحے سوچا اور پھر بولی۔ ''میں آپ کو سوری کہنا چاہتی تھی۔۔۔''
''سوری؟؟ مگر کس لیے؟ کیا بات ہے ماہ نور؟'' اس کے چہرے پر دنیا جہان کی حیرت ابھر آئی۔
''خوش نصیب اور صیام کی حرکت کے بارے میں۔۔۔'' وہ اتنا کہہ کر پھر سے چپ ہو گئی۔
''یا اللہ۔۔۔! ماہ نور تم نے ڈرا دیا مجھے۔۔۔ مجھے لگا تم اس رشتے کے لیے سوری بولنے والی ہو۔۔۔''
شامیر نے جیسے سکھ کا سانس لیا۔ ماہ نور گڑبڑا کر رہ گئی۔
''نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ دراصل کل میں نے آپ کی اور صیام کی باتیں سن لی تھیں۔ میں اس وقت کچن میں تھی۔'' اس نے جھجکتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔ شامیر کے ناراض ہونے کا بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ یہ نہ

سمجھے کہ ماہ نور نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے۔
شامیر کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی تھی اور اس کی جگہ تاسف نے لے لی۔ بلاشبہ وہ ایک بہترین اداکار تھا۔
"مجھے افسوس ہے کہ تم یہ سب جان گئیں ماہ نور۔۔۔! میں نہیں چاہتا تھا کہ تم یہ سب جان جاؤ۔۔۔ جو کچھ ہوا اس میں تمہاری کوئی غلطی بھی نہیں ہے۔ پھر تم معافی کیوں مانگنا چاہتی ہو۔"
"میں جانتی ہوں میری غلطی نہیں ہے مگر جن کی غلطی ہے وہ دونوں ہی مجھ سے قریبی تعلق رکھتی ہیں، ایسا تعلق جو تاعمر قائم رہنے والا ہے۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن ہوگا شامیر کہ آپ کے دل میں ان کے لیے غصہ ہو اور آپ اس رشتے کو نبھانے میں میرا ساتھ بھی دیں۔ یہ تو بہت مشکل ہو جائے گا شامیر۔۔۔" وہ بے چارگی سے بولی تھی۔
"اوہ۔۔۔ ماہ نور۔۔۔! میری بات سنو۔۔۔" شامیر نے تھوڑا آگے ہوتے ہوئے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ماہ نور نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کامیاب اداکاری کر رہا تھا۔ "ماہ نور۔۔۔ میرے لیے صرف اور صرف تم اہم ہو۔۔۔ تمہاری خوشی اہم ہے۔۔۔ کوئی خوش نصیب، کوئی صیام یا کوئی بھی اور انسان مجھے تم سے دور نہیں کر سکتا ہے، مجھے تم سے چھین نہیں سکتا۔۔۔ میں تمہارے لیے اپنا قتل بھی معاف کر دوں یہ تو بہت معمولی سی باتیں ہیں۔ جہاں تک بات ہے تمہارے ساتھ تم سے تعلق رکھنے والوں سے رشتہ نبھانے کی تو ماہ نور یہ مشکل ہے، ناممکن نہیں۔۔۔ اور اگر تم میرے ساتھ ہو تو میرے لیے ناممکن بھی ممکن ہے۔۔۔"
وہ باتوں سے بہلانے کا فن خوب جانتا تھا۔ ماہ نور بھی بہلتی چلی گئی تھی اس کے لفظوں میں۔۔۔ وہ ابھی تک بول رہا تھا۔۔۔ اور ماہ نور۔۔۔ وہ چپ چاپ، بالکل خاموشی بلکہ کسی حد تک عقیدت سے، بغور اسے تکتے ہوئے اس کے ایک ایک لفظ کو اپنے حافظے میں محفوظ کر رہی تھی۔

☆☆☆

آج تو خوب ہی مزہ رہا تھا۔ پہلے پورا دن گرمی برداشت کرنے کے بعد موسم خوشگوار ہو گیا پھر ماہ نور کے ہاتھ کے بنے ہوئے چائے پکوڑے۔۔۔ واہ واہ۔۔۔ موسم کا مزہ دوبالا ہو گیا تھا۔
کچھ دیر پہلے ہی سب لڑکیاں اٹھ کر رخصت ہوئی تھیں۔ ارادہ تو کیف کا بھی اٹھنے کا تھا مگر عرفات ماموں کے موڈ کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ بہت چپ چپ تھے وہ اور یہی خاموشی کیف سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ لڑکیوں کے سامنے بھی وہ کیف کو نظر انداز کرتے رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ سب کے جانے کے بعد ماموں سے کھل کر بات کرے گا۔ وہ ان کی ناراضی کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔ جانے کیوں دل میں یہ خدشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں خوش نصیب نے ماموں کے کان نہ بھر دیے ہوں۔
لڑکیاں اٹھ کر گئیں تو وہ ماموں کو سہارا دے کر گھر کے پچھلے حصے کی طرف لے آیا۔
گھر کے پچھلے حصے میں ایک چھوٹے سے قطعے پر ماموں نے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے پودے لگا رکھے تھے۔ بارش میں نہائے ہوئے سرسبز پودے آنکھوں کو سکون بخش رہے تھے۔
اس نے شیرو سے کہہ کر دو کرسیاں وہاں رکھوا دی تھیں۔ ماموں کو ایک کرسی پر بٹھا کر اس نے دوسری کرسی ان کے سامنے رکھی اور خود بھی پاؤں پھیلا کر ایسے بیٹھ گیا جیسے دیر تک اٹھنے کا ارادہ نہ ہو۔
"ہاں جی۔۔۔ اب بتائیں کیا بات ہے؟" اس نے جو عرفات ماموں کو ابھی تک سامنے تکتا پایا تو خود ہی بات کا آغاز کر دیا۔
ماموں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس ابرو اچکا کر اس کی طرف دیکھا۔
"کوئی ناراضی ہے؟" اس نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔
"نہیں یار۔۔۔ تم سے کیسی ناراضی۔۔۔" ان کا لہجہ حد درجہ اکتایا ہوا تھا۔

''تو پھر یہ محبوبہ والے نخرے کیوں دکھا رہے ہیں؟''
وہ شرارت سے بولا تھا مگر ماموں کی طرف سے جوابی حملہ نہیں ہوا۔
''کیا بات ہے ماموں یار۔۔۔ موڈ کیوں آف ہے؟ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ موڈ میرا خراب ہو۔۔۔ آخر ایک ہفتے بعد میرے ماں باپ میری قربانی کرنے والے ہیں۔'' بات کی شروعات تو عام سے لہجے میں کی گئی تھی مگر اختتام ہوتے ہوتے لہجہ خود ہی زہر خند ہو گیا تھا۔
''انکار کر دو پھر قربانی سے۔۔۔'' انہوں نے گھور کر دیکھا تھا۔ ''تم اتنے شریف تو نہیں ہو کیف! کہ اتنی آسانی سے اپنی مرضی کے خلاف بات مان لو۔۔۔'' ان کا لہجہ سخت خفگی لیے ہوئے تھا۔
کیف نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ ''صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔ اتنا اچھا نہیں ہوں میں۔۔۔ لیکن اتنا برا بھی نہیں ہوں کہ بلاوجہ کسی کا دل دکھاؤں۔'' اس نے منہ پھلا کر کہا تھا۔
''بلاوجہ؟ کیف! بلاوجہ انکار کرو گے تم؟'' وہ جھنجلا کر رہ گئے تھے۔
''تو کیا جواز دوں انکار کا؟ آپ بتائیں۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''صیام کو تو وجہ بتانے سے رہا میں۔۔۔ کوئی بھی اس عذر کو قبول نہیں کرے گا۔''
''اور اس محبت کا کیا ہوا جس کے تم دعوے دار تھے؟'' ان کا لہجہ ابھی بھی سختی لیے ہوئے تھا۔
''آگ لگے ایسی محبت کو جس کے بعد میرے حصے میں صیام آ جائے۔۔۔'' وہ بچوں کی طرح منہ پھلائے ہوئے تھا۔ ''پھر کون سی محبت، کاہے کی محبت؟ اسی محبت نے پھنسایا ہے مجھے۔۔۔ آپ بتائیں ماموں! ایسی کون سی غلطی کی تھی میں نے کہ اس نے صیام کو میرے ساتھ نتھی کر دیا۔ سب جانتی تھی وہ۔۔۔ اچھی طرح جانتی تھی میری فیلنگز کے بارے میں۔۔۔ پھر بھی اس نے ایسا کیا۔ وہ ایک بار مجھ سے کہہ دیتی کہ وہ شامیر کو پسند کرتی ہے تو میں خود ہی ہٹ جاتا راستے سے۔۔۔ شامیر کو بچانے کے لیے۔۔۔ صیام سے بچانے کے لیے اس نے مجھے اس مصیبت میں پھنسا دیا۔ آپ بتائیں، صیام سے شادی کرنا اور اسے ساری عمر برداشت کرنا کوئی آسان کام ہے؟'' وہ عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولا۔
عرفات ماموں چپ رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک بار کیف اپنی بھڑاس نکال لے تاکہ وہ اچھے سے اسے اپنی بات سمجھا سکیں۔ دوسری طرف کیف کو بھی پہلی بار اس حوالے سے سامع میسر آیا تھا سو وہ بھی بولتا چلا گیا۔
''پھر اس نے میرے ساتھ جو کیا سو کیا، اپنی بہن کے ساتھ کوئی کیسے برا کر سکتا ہے؟ اور بہن بھی ماہ نور جیسی جو جان دیتی تھی اس پر۔۔۔ کیوں گئی تھی وہ رات کو شامیر کے پاس؟ کیا مقصد تھا۔۔۔ جب میں صیام پر صبر کر گیا تھا تو پھر خود بھی صبر کر لیتی۔ سب کے سامنے تماشا بنا ڈالا ہے اپنی ذات کو۔۔۔'' اب اس کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا۔
اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھاما اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔
''تمہیں خوش نصیب غلط لگتی ہے؟'' جذبات سے عاری لہجے میں سوال آیا تھا۔
''کیا مطلب؟''
''ایک عام سا سوال پوچھ رہا ہوں کیف۔۔۔ کیا تمہیں لگتا ہے کہ اس نے تمہیں صیام کے لیے اس لیے منتخب کیا کیونکہ وہ شامیر میں انٹرسٹڈ تھی؟ اور کیا تمہیں لگتا ہے کہ وہ شامیر کے پاس اسی سلسلے میں گئی تھی جو سب کو بتایا گیا ہے؟''
کیف خاموشی سے ان کی شکل دیکھنے لگا۔
''میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے۔۔۔''
''نہیں۔۔۔'' کیف بے چارگی سے بولا۔ ''مجھے وہ غلط نہیں لگتی۔۔۔ میرا دل ہمیشہ اس کے حق میں ہی

گواہی دیتا ہے۔" اس نے تھک کر اعتراف کر ہی لیا تھا۔
"تم پھر بھی اسے اکیلا چھوڑ رہے ہو؟" حیرانی سے پوچھا گیا۔
"میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ رہا' وہ خود جان بوجھ کر خود کو اکیلا کر رہی ہے۔"
"کیف۔۔۔تم پاگل ہو؟ کیا تم نے ایک بار بھی اسے بتایا کہ تم اس پر یقین کرتے ہو؟ اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ کیا اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ شامیر اچھا آدمی نہیں ہے یا وہ اسے کسی حوالے سے تنگ کر رہا ہے؟"
کیف نے جھٹکے سے سر اٹھایا تھا۔ "وہ ایک دن میرے پاس آئی تھی۔ کچھ بتانا چاہتی تھی مگر امی کو کہیں جانا تھا تو میں سن ہی نہیں سکا کہ وہ کیا بتا رہی ہے۔"
"وہ میرے پاس بھی آئی تھی۔ اس کے کچھ تحفظات تھے شامیر کے حوالے سے۔ تمہیں یاد ہی ہوگا۔ میں نے اسے اور تمہیں کھانے پر بلایا تھا مگر۔۔۔ میری بیماری نے موقع نہیں دیا۔" وہ چند لمحے خاموش رہے تھے پھر فیصلہ کن انداز میں بولے تھے۔ "مجھے شامیر پسند نہیں ہے کیف! اس میں لاکھ خوبیاں سہی لیکن میری چھٹی حس کہتی ہے کہ کچھ ہے جو غلط ہے۔"
"اب کیا ہوسکتا ہے ماموں۔۔۔ اگلے ہفتے شادی ہے۔۔۔ آپ جانتے ہی ہیں۔۔۔"
"یہ ماہ نور کا اپنا فیصلہ ہے کیف۔۔۔ ہمیں اس معاملے میں کچھ کرنا بھی نہیں ہے۔ مجھے صرف خوش نصیب کی اور تمہاری فکر ہے۔"
"اس معاملے میں بھی اب کیا ہوسکتا ہے۔ فضیلہ چچی کو کون سنبھالے گا ان کی اولاد کے معاملے میں۔۔۔ کم از کم میری اماں اور ابا تو ایسا کچھ نہیں سمجھنے والے۔۔۔ آپ بتائیں' کیا کروں میں۔۔۔؟" وہ جھنجلا گیا تھا۔
"تو تمہارا خیال ہے کہ خوش نصیب کے ساتھ جو ہو رہا ہے' بالکل ٹھیک ہے؟ جو ہو رہا ہے اسے ہوتا رہنا چاہیے۔" وہ غصے میں آگئے۔
"میں یہ نہیں کہہ رہا ماموں۔۔۔ خوش نصیب کم از کم طوطا بھائی کو ڈیزرو نہیں کرتی۔۔۔ اور آپ مانیں نہ مانیں میں بھی صیام کو ڈیزرو نہیں کرتا۔۔۔" اس نے پھر سے اپنا رونا رویا تو ماموں چڑ گئے۔
"یار! تم ابھی ذرا اپنا معاملہ ایک سائیڈ پر کردو۔۔۔ ابھی صرف خوش نصیب کے بارے میں سوچو۔ کیا پتا اس کا مسئلہ حل ہونے سے تمہارا مسئلہ خود ہی حل ہوجائے۔" ان کے لفظوں کی معنی خیزی نے کیف کو چونکایا تھا۔
"کیا مطلب؟ کہنا کیا چاہ رہے ہیں آپ؟"
وہ آگے ہوکر بیٹھے اور اپنا ہاتھ بڑھا کر کیف کے کندھے پر رکھ دیا۔ جب بولے تو ان کے لہجے میں مان تھا۔
"دیکھو یار۔۔۔! میں تمہیں کسی کام کے لیے مجبور نہیں کرسکتا ہوں۔ بلاشبہ خوش نصیب نے تمہارے ساتھ کیا تو غلط ہے سو میں اس کی سائیڈ نہیں لوں گا لیکن پھر بھی کیف اگر دل راضی ہوتا ہے تو اس کی مدد کرو۔۔۔ اسے یہاں سے نکالو۔۔۔ اسے اس مسئلے سے نکال لو۔ تم دونوں ہی مجھے بہت عزیز ہو اور میں تم دونوں کو یوں ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"
کچھ نہ کہتے ہوئے بھی انہوں نے بہت کچھ بول دیا تھا۔ کیف کو ایک نیا راستہ دکھا دیا تھا۔
کیف آنکھوں میں بے تحاشہ حیرت لیے، ماتھے پر بل ڈالے، پُرسوچ انداز میں انہیں دیکھتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"میری پیاری بہنیا' بنے گی دلہنیا
سج کے آئیں گے دولہا راجا
بھیا راجا بجائے گا باجا۔۔۔"

ایڈم نے خدا جانے کہاں یہ گانا سنا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے یہی گانا فل والیوم کے ساتھ بار بار چلا رہا تھا اور چھوٹے موٹے کام نبٹاتی منفرا کو تنگ کرنے میں پوری طرح کامیاب تھا۔

منفرا اور معاویہ کل شام ہی نیو یارک سے واپس مونٹوک پہنچے تھے اور آج اردشیرازی منفرا اور اس کے والدین سے ملنے مونٹوک آنے والے تھے۔

کچھ وجوہات کی بنا پر اردشیرازی نیو یارک نہیں آسکے تھے۔ معاویہ اور منفرا دونوں ہی اس بات سے مایوس ہوئے تھے۔

اردشیرازی نے جب معاویہ کو مایوس دیکھا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بزنس سے پہلے اپنے بیٹے کی خوشی کو پورا کریں گے۔ سارا پلان دوبارہ سے ترتیب دیا گیا اور فیصلہ ہوا کہ ویک اینڈ پر اردشیرازی نیو یارک سٹی کے بجائے مونٹوک آئیں گے اور مسٹر جمال اینڈ فیملی سے ملاقات کریں گے۔ اسی پلان کے تحت معاویہ اور منفرا ایک دن پہلے ہی مونٹوک آگئے تھے۔

صبح سے گھر میں تیاریاں جاری تھیں۔

مسز جمال آج کچھ خاص قسم کا کھانا تیار کر رہی تھیں۔ ان کی بیٹی کے متوقع سسرال والے پہلی بار ان کے گھر آرہے تھے۔ وہ اپنی پاکستانی یادیں تازہ کر رہی تھیں

مسٹر جمال اپنے گارڈن کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ وہ منفرا کے فیصلے سے بے حد مطمئن تھے اور جب سے انہیں پتا چلا تھا کہ معاویہ اور منفرا مستقبل میں پاکستان میں رہائش اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ اب ایڈم کو اس کی بہن کی مثال دے دے کر اسے پاکستان چلنے پر راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

منفرا گھر کو نئے سرے سے صاف کرنے میں مصروف تھی۔

اور رہا ایڈم۔۔۔

تو ایڈم صبح سے صرف اپنی بہن کو تنگ کرنے میں مصروف تھا۔ وہ چُن چُن کر۔ یوٹیوب پر وہ گانے لگا رہا تھا جو عموماً شادیوں پر چلائے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے ناشتے کے وقت اس نے منفرا کو بتا دیا تھا کہ اس کی شادی کے فوراً بعد وہ اس کے کمرے اور چیزوں پر قبضہ کرنے والا ہے اور یہ کہ وہ بہت خوش ہے۔۔۔ اس لیے نہیں کہ منفرا کی شادی ہو رہی ہے بلکہ اس لیے کہ منفرا شادی کے بعد یہاں سے دور چلی جائے گی اور اب مام، ڈیڈ اسے سگی اولاد کی طرح چاہنے لگیں گے۔

''ایڈم بس کردو۔ جان چھوڑ دو اس گانے کی۔۔۔''

ایڈم نے جب ایک بار پھر سے وہی گانا چلایا تو منفرا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ڈسٹر کو ایک طرف پٹختے ہوئے وہ لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ لٹکا کر ایڈم کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

''ارے کیا ہوا؟'' ایڈم نے فوراً چہرے پر معصومانہ تاثرات پیدا کیے تھے۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کیا ہوا ہے۔ اٹھو اس لیپ ٹاپ کی جان چھوڑو اور میری کچھ ہیلپ کرواؤ۔۔۔''

''اوہ پلیز۔۔۔ اب یہ نہ کہنا کہ میں تمہارے لیے لنچ پر پہننے کو ڈریس ڈیسائیڈ کروں۔۔۔ مجھے معاف رکھو۔۔۔'' ایڈم نے ڈرنے کی اداکاری کی۔

''منفرا نے ڈسٹر ایڈم کے منہ پر مارا اور خفگی سے بولی۔

''جتنی بری تمہاری چوائس ہے، میں تم سے ڈریس سلیکٹ کروانے کا خطرہ مول نہیں لینے والی۔ اٹھو اور یہاں کی ڈسٹنگ کرو۔ میں تیار ہونے جارہی ہوں۔''

''تیار تو مجھے بھی ہونا ہے۔۔۔ ایسا کرو، تم ڈسٹنگ کرو، میں تیار ہو کر آتا ہوں۔'' ایڈم چھلانگ لگا کر صوفے سے اترا تھا۔

''اوئے رکو۔۔۔ فادر ان لاء میرے آ رہے ہیں تو تیار مجھے ہونا ہے تمہیں نہیں۔۔۔ سمجھے۔۔۔ پکڑو یہ ڈسٹر اور ڈسٹنگ کرو۔''

''اوئے ہوئے اب ہمارا ٹام بوائے اپنے فادر ان لاء سے ملنے کے لیے تیار بھی ہوگا۔۔۔ ویسے تم نے تیار معاویہ کے لیے ہونا ہے یا اس کے فادر سے ملنے کے لیے۔۔۔''

''ممی! ایڈم کو منع کریں۔۔۔'' منفرا نے اکتا کر ماں کو جھگڑے میں گھسیٹا تھا۔

اور کچن سے نکلتی ہوئی مسز جمال مسکرا دی تھیں۔

''ایڈم تم باز آ جاؤ۔۔۔ اور منفرا! وہ لوگ آنے والے ہوں گے۔۔۔ جاؤ تم تیار ہو جاؤ۔۔۔''

ایڈم کو منہ چڑا کر وہ ٹی وی لاؤنج سے نکلتی چلی تھی۔

کچھ دیر بعد معزز مہمان تشریف لے آئے تھے۔

اردشیرازی کی شخصیت نے مسٹر اور مسز جمال کو متاثر کیا تھا۔ تھری پیس سوٹ زیب تن کیے، ہاتھ میں سگار پکڑے اردشیرازی کو دیکھتے ہی احساس ہوتا تھا کہ معاویہ ان کا پرتو ہے۔

دوسری طرف اردشیرازی نے بھی منفرا اور اس کے گھر والوں کو دل ہی دل میں اوکے کر دیا تھا۔ وہ بڑی خوش دلی سے منفرا اور باقی سب سے ملے تھے منفرا پسند آئی تھی انہیں اپنے بیٹے کے لیے۔

کھانا بے حد خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ اس کے بعد مسٹر جمال نے منفرا سے کافی کی فرمائش کر دی تو وہ اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اردشیرازی نے رشتے کی بات چھیڑ دی تھی۔ بڑی سلیقے اور سبھاؤ سے انہوں نے منفرا کے لیے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے معاویہ اور اس کے رشتے کی بات کر ڈالی تھی۔ مسٹر اور مسز جمال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کے چہرے پر اطمینان تھا۔ مسٹر جمال نے مسکراتے ہوئے رخ پھیرا تھا اور اردشیرازی کو اثبات میں جواب دے دیا تھا۔

معاویہ کا دل جو ابھی تک کسی خدشے کے زیر اثر تھا وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔

خوشی، اطمینان، سکون۔۔۔ دکھ اور تکلیف سے دور وہ کون سی کیفیت تھی جو اس لمحے اس کے دل پر وارد نہیں ہوئی تھی۔

اس کی نظروں نے منفرا کو تلاشا تھا اور اسی وقت منفرا ٹرے اٹھائے کچن سے برآمد ہوئی تھی۔ یہاں ہوتی تمام باتیں اس نے کچن میں کھڑے ہو کر سنی تھیں اور خوشی اس کے چہرے سے ہی ظاہر ہوتی تھی۔ معاویہ اسے دیکھتا چلا گیا تھا۔ منفرا نے سب کو کافی کے کپ پکڑائے تھے۔ معاویہ اور اس کی نظریں ایک لمحے کے لیے ٹکرائی تھیں اور اس نے لمحوں میں نظر کا زاویہ بدل لیا تھا۔ اسے مشکل لگ رہا تھا معاویہ کی طرف دیکھنا۔

وہ اپنا کپ اٹھا کر صوفے کی طرف بڑھی تھی جب اردشیرازی نے اسے پکارا تھا۔

''منفرا بچے ادھر نہیں، تم ادھر بیٹھو ہمارے پاس۔۔۔'' انہوں نے اسے بیٹھنے کے لیے اپنے اور معاویہ کے درمیان جگہ دی تھی۔

منفرا ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی اور پھر سر جھکا کر ان دونوں کے درمیان آ بیٹھی تھی۔ اسے معاویہ سے اس وقت بہت شرم آ رہی تھی اور اسے خود ہی اپنی اس شرم سے الجھن ہو رہی تھی۔ آزاد ماحول میں پلی بڑھی منفرا کے لیے اپنی ہی کیفیت بڑی حیران کن تھی۔

''مسٹر جمال! اگر آپ اجازت دیں تو میں چاہتا ہوں کہ معاویہ یہ رنگ، منفرا کو پہنائے۔'' انہوں نے

کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک مخملی ڈبیہ برآمد کی تو معاویہ نے حیرت سے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ منفرا کے لیے منگنی کی انگوٹھی لے کر آئے ہیں، یہ بات وہ بھی نہیں جانتا تھا۔

''ضرور مسٹر شیرازی۔۔۔! ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔''

اردشیرازی نے ڈبیہ کھولی اور ایک نازک سی ہیرے کی انگوٹھی نکال کر معاویہ کی طرف بڑھا دی۔ معاویہ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ منفرا کی طرف بڑھا دیا اور اگلے چند لمحوں میں وہ انگوٹھی منفرا کے ہاتھ میں تھی۔

اردشیرازی نے رخ دوبارہ سے مسٹر جمال کی طرف موڑا تھا۔

''مسٹر جمال! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے بزنس کی وجہ سے مصروف ہوتا ہوں۔ مگر اب میرے لیے سب سنبھالنا مشکل ہوتا جا رہا ہے، میں چاہتا ہوں کہ پاکستان میں میرے بزنس کو اب معاویہ ہی سنبھالے۔ ویسے تو میرا سارا بزنس ہی معاویہ کا ہے اور اس نے بڑے اچھے سے سب سنبھالا بھی ہوا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اگلے چند سال معاویہ پاکستان میں رہے وہاں کچھ ادھورے کام مکمل کرے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم جلد از جلد ان دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دیں۔''

انہوں نے کہہ کر جمال صاحب کو دیکھا تھا۔

''مسٹر شیرازی! مجھے اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے مگر تیاری میں کچھ نہ کچھ وقت تو لگے گا ہی۔۔۔''

''دیکھیے جمال صاحب! میں اسی طرف آ رہا تھا۔ دراصل میں اور معاویہ چاہتے ہیں کہ یہ شادی پاکستان میں ہو اور اسی مہینے ہو۔ آپ کو منفرا نے بتا ہی دیا ہوگا کہ کچھ سال پہلے معاویہ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میرے بیٹے نے اس کے بعد ایک مشکل وقت گزارا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس پوائنٹ پر میرے بیٹے کی زندگی کو بریک لگا تھا وہ وہاں سے ہی ایک نئی شروعات کرے۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم اس نئے رشتے کو قلعہ فلک بوس میں ہی قائم کریں۔''

''اتنی جلدی۔۔۔ کیسے ہوگا سب؟'' مسٹر اینڈ مسز جمال دونوں ہی تھوڑا پریشان ہو گئے تھے ان کی فرمائش پر۔

''دیکھیے' آپ کو اس بارے میں ذرا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انتظامات سب میری ذمہ داری ہیں۔ آپ لوگ بس اس شادی کی اجازت دے دیں اور جانے کی تیاری کر لیں۔ باقی سب انتظامات میں خود کروا لوں گا۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

حیران کن طور پر اردشیرازی کا لہجہ انکساری لیے ہوئے تھا۔ شاید انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس بار اپنے بیٹے کے لیے تمام خوشیاں اکٹھی کر کے ہی چھوڑیں گے۔

جمال صاحب نے فکر مندی سے بیوی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اتنا بڑا فیصلہ تن تنہا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

دوسری طرف مسز جمال بھی کچھ کنفیوز سی نظر آ رہی تھیں۔

''ڈیڈ! میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھا آئیڈیا ہے۔۔۔'' ایڈم نے پہلی بار زبان کھولی تھی۔

مسٹر جمال حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ اردشیرازی کی بات پر ان کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ ایڈم کبھی بھی پاکستان جانے کو نہیں مانے گا لیکن اب ایڈم خود ایک مختلف بات کر رہا تھا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو ایڈم؟'' جمال صاحب نے اسے بولنے کا موقع دیا تھا۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں ڈیڈ! کہ یہ شادی پاکستان میں ہو اس سے اچھی بات کیا ہوگی۔ آپ کتنے عرصے سے پاکستان جانا چاہ رہے تھے نا تو اچھا ہے اسی بہانے ہم پاکستان گھوم لیں گے۔ آپ سب ریلیٹوز سے مل لیجیے گا۔ اور لگے ہاتھوں منفرا سے بھی جان چھڑا لیں گے۔'' بات کے آغاز میں وہ جس قدر ذمہ دار بھائی کی طرح بول رہا تھا، آخر میں منفرا کو چھیڑنا نہیں بھولا۔ جواباً منفرا نے اسے گھور کر دیکھا تھا اور باقی سب ہنس دیے تھے۔

''ٹھیک ہے شیرازی صاحب! جب آپ اور بچے یہی چاہتے ہیں۔۔۔تو پھر ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' جمال صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
اردشیرازی نے نے اطمینان بھرا گہرا سانس لیا اور جمال صاحب کے ساتھ باقی تفصیلات طے کرنے لگے۔

☆☆☆

آج فضل منزل کے رنگ ڈھنگ نرالے تھے۔ ایک نہ دو اکٹھی تین شادیاں تھیں وہ بھی سب گھر کے بچوں کی سو خوب ہی رونق لگی ہوئی تھی۔ پورے گھر کو لائٹوں سے سجایا گیا تھا۔ جسے دیکھو تیزی میں تھا۔ لڑکیوں کو اپنی تیاری کی فکر تھی تو مرد حضرات باہر کے کام نبٹانے کے لیے بھاگے پھر رہے تھے۔
بارات تو خیر تین دن بعد تھی لیکن لڑکیوں کے مطالبے پر آج مایوں کی رسم ادا کی جانی تھی۔ کیف نے خوب ہی شور مچایا تھا۔ وہ کسی طور اس رسم کے لیے راضی نہیں تھا لیکن نقار خانے میں طوطی۔۔۔اوہ معاف کیجیے گا، کیف کی کون سنتا۔ تو بس اس کے تمام اعتراضات کو قابل اعتنا نہ جانتے ہوئے آج رسم ادا کی جانی تھی۔
پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ مایوں کی رسم چونکہ گھر میں ہی ہونی تھی اس لیے لڑکیوں نے خود ہی صحن میں انتظامات کیے تھے۔ زمین پر دریاں بچھا کر بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک طرف دلہنوں کے بیٹھنے کو جھولا رکھا گیا تھا تو دوسری طرف ایک جھولا دولہوں کے بیٹھنے کو بھی رکھا گیا تھا۔ بزرگوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ درمیان میں ایک حصے پر دریاں بچھا کر وہاں ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ اب گھر کی پانچ لڑکیوں میں سے تین کی تو شادی تھی، سو باقی دونوں تیار ہو کر ڈھولک لے کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ڈھولک بج رہی تھی۔ گانے گائے جا رہے تھے۔ منہا اور تہمینہ نے تو لڈی بھی ڈالی تھی۔
جہاں تک دلہنوں کی بات تھی تو تینوں ایک جیسے سبز لباس میں غضب ڈھا رہی تھیں۔ خوبصورتی تو خیر اس خاندان میں موجود ہی تھی مگر آج خوش نصیب نے صیام اور ماہ نور دونوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ جہاں ایک طرف ماہ نور اور صیام کے چہرے خوشی لیے چمک رہے تھے وہاں اس کے چہرے پر موجود اداسی، اس کے چہرے کی خوبصورتی کو اور بڑھا رہی تھی۔ سوگوار، روئی روئی آنکھیں، جھکا ہوا میک اپ سے پاک چہرہ۔۔۔
کیف نے دور بیٹھے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ پھر نظر پھیر لی تھی۔
سفید رنگ کی شلوار قمیض پر گلے میں پیلے رنگ کا پٹکا ڈالے وہ اداس بلبل بنا بیٹھا تھا۔
بڑھی ہوئی شیو، آنکھوں میں سرخ ڈورے جو شب بیداری کی چغلی کھا رہے تھے۔۔۔ ''اللہ نظر بد سے بچائے'' اس حلیے میں بھی ایسا پیارا لگ رہا تھا۔ تائی امی جب جب اسے دیکھتیں، بے ساختہ بلائیں لے ڈالتی تھیں۔
لڑکیوں میں بحث چھڑ گئی تھی۔ ہر گانا یا آدھا گایا جا رہا تھا یا سب کو آتا ہی نہیں تھا۔ اب نیا گانا کون سا گایا جائے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہر کوئی اپنی اپنی بات بول رہا تھا۔
''یہ گاؤ۔۔۔''
''ارے نہیں یار، وہ دوسرے والا۔۔۔''
''نہیں نہیں یہ پھر کمپلیٹ نہیں ہو پاتا۔۔۔''
یعنی جتنے منہ اتنی باتیں۔ خوش نصیب نے بے چارگی سے کنپٹی کو سہلایا۔ سخت درد تھا سر میں۔
آخر کار تائی اماں اکتا کر بولی تھیں۔
''بس کرو لڑکیوں۔۔۔تم لوگوں پر چھوڑا تو تم لوگ بس لڑتی ہی رہو گی۔ ارے کوئی پرانا گانا گاؤ۔۔۔کوئی رونق لگے۔۔۔یہ کیا تم لوگ اپنے زمانے کے الٹے سیدھے گانے گائے جا رہی ہو۔ نہ سر ہے نہ پیر۔۔۔''
تہمینہ نے خفگی سے ماں کو دیکھا اور بولی۔ ''پھر آپ لوگ ہی کچھ سنا دیں نا۔۔۔آ جائیں مقابلہ کر لیتے ہیں۔۔۔''

فہمینہ نے لڑکیوں کو نئی راہ دکھائی تھی۔ سب مل کر تائی اماں کے پیچھے پڑ گئیں۔ جان چھڑانا مشکل ہو گیا' آخر انہیں ہامی بھرنی ہی پڑی۔ انہوں نے دیورانی کو ساتھ ملایا اور لڑکیوں کے پاس آ بیٹھیں۔ منہا نے جھٹ سے ڈھولک سنبھال لی۔

فضیلہ چچی نے گانا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ بیٹی کی بلائیں بھی لے ڈالیں۔ بہو سے تو خیر انہیں دلچسپی ہی نہ تھی۔

''چٹا ککڑ بنیرے تے۔۔۔

کاسنی ڈوپٹے والیے۔۔۔

منڈا عاشق تیرے تے۔۔۔''

''استغفر اللہ۔۔۔'' کیف چڑ کر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا تھا۔ نظریں ایک بار پھر سے خوش نصیب کا طواف کرنے لگی تھیں۔

''ساری کھیڈ لکیراں دی۔۔۔

ساری کھیڈ لکیراں دی۔۔۔''

کیف دل مسوس کر رہ گیا تھا تو دوسری طرف خوش نصیب کے دماغ میں چچی کی آواز دھماکوں کی طرح گونج رہی تھی۔ برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا یہ درد۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔ نہ کسی کو بتا سکتی تھی نہ چپ رہ پا رہی تھی۔ اور بتاتی بھی تو کس کو۔۔۔ بہن ساتھ ہی دلہن بنی بیٹھی تھی اور ماں کا سارا دھیان بس ماہ نور پر تھا۔ اس لمحے اس نے خود کو بہت اکیلا محسوس کیا تھا۔ ایک آنسو آنکھ سے ٹوٹ کر ہاتھوں پر جا گرا۔

لڑکیوں نے اب کوئی اور گانا شروع کر دیا تھا۔

کیف نے دور بیٹھے بھی محسوس کیا تھا کہ خوش نصیب رو رہی تھی۔ اس کا دل کچھ مزید اداس ہو گیا۔ خوش نصیب کے لیے شکوے کچھ مزید بڑھ گئے۔ پھر اس نے دیکھا کہ خوش نصیب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ فہمینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کچھ پوچھا تھا۔ خوش نصیب نے اس کے کان میں کچھ کہا تھا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تھی جب کہ فہمینہ پھر سے ڈھولک کی طرف متوجہ ہو گئی۔

کیف نے چند منٹ سوچا تھا پھر آہستہ سے وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کسی ایک کا دھیان بھی اس کی طرف نہیں تھا۔ وہ تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

کیف تیزی سے سیڑھیاں طے کر کے اوپر آیا تھا۔ خوش نصیب سے بات کرنے کا اس سے بہتر موقع اسے نہیں مل سکتا تھا۔ نیچے سب اپنے کھیل تماشوں میں مصروف تھے' ایسے میں امید کی جا سکتی تھی کہ کسی کا دھیان ان دونوں کی غیر موجودگی پر نہیں جائے گا۔ (ہائے رے خوش فہمی۔۔۔)

پورا ایک ہفتہ وہ سوچتا رہا تھا۔ عرفات ماموں کے گھر سے واپس آنے کے بعد اس نے اس موضوع پر سوچنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا تھا۔ عرفات ماموں نے اس سے کچھ بھی صاف صاف نہیں کہا تھا لیکن اسے ایک نئی راہ ضرور سجھا دی تھی۔ اس نے سب سوچا تھا۔ صحیح اور غلط کا موازنہ بھی کیا تھا مگر وہ کیا کرتا کہ بہت ساری چیزیں غلط ہونے کے باوجود بھی اس کا دل خوش نصیب کی طرف ہمکتا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اسے اپنی سوچ سے نکال نہیں پایا تھا اور کوشش کے باوجود بھی صیام کو خوش نصیب کی جگہ نہیں دے پایا تھا۔ اس شادی کو رکوانے کا اور کوئی طریقہ اس کے پاس نہیں تھا۔ ایک ہی راستہ تھا اور اب اسے کسی بھی حال میں خوش نصیب کو اس راستے پر اپنے ساتھ چلانا تھا۔

وہ تیز تیز چلتا ہوا کمرے کی طرف آیا تھا۔ دروازے سے اندر جھانکا تو سامنے ہی شیلف کے پاس سر پکڑ کر کچھ ڈھونڈتی ہوئی خوش نصیب نظر آ گئی۔ تیزی سے اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے مڑ کر پیچھے دروازہ بند کر دیا تھا۔

دروازہ بند ہونے کی آواز پر خوش نصیب پیچھے مڑی تھی اور سامنے کھڑے کیف کو دیکھ کر اس کی چہرے پر

ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ یقیناً دروازہ بند کرنے سے اس نے کوئی غلط مطلب نکالا تھا۔ کیف اس کی طرف بڑھا تو وہ کچھ مزید ڈر گئی۔

''ک۔۔۔ کک۔۔۔ کیا کر رہے ہو؟ کیوں آئے ہو یہاں؟''

''دیکھنے آیا تھا کہ تم کتنی خوش ہو۔۔۔'' اس نے طنزیہ کہا تھا۔

خوش نصیب کا خراب موڈ کچھ مزید خراب ہو گیا۔

''دیکھ لیا؟ اب مہربانی فرماؤ اور یہاں سے تشریف لے جاؤ۔۔۔ کسی نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو ایک نیا تماشا شروع ہو جائے گا۔''

''ارے واہ۔۔۔ بڑی فکر ہے تمہیں میرے دیکھ لیے جانے کی۔۔۔ شامیر کی بار یہ فکر کہاں چلی گئی تھی۔'' کیف چیخ کر بولا تھا۔

خوش نصیب نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔'' بکواس بند کرو اپنی۔۔۔ تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم مجھے ایسی باتیں سناؤ۔۔۔''

''ہاں۔ سب حق تو تم نے شامیر کو سونپ دیے۔۔۔ باقی کے حق طوطا بھائی کو سونپنے والی ہو۔۔۔ میں تو یہاں جھک مارنے آیا ہوں۔۔۔'' سارا زور طوطا بھائی پر تھا۔

''تم نے بول لیا جو بولنا تھا۔۔۔ ٹھنڈ پڑ گئی۔ سکون مل گیا طعنے دے کر۔۔۔ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔''

''خوش نصیب بی بی۔۔۔ تمہاری شادی طوطا بھائی سے ہو رہی ہے۔۔۔'' کیف نے خوش نصیب کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا۔ ''تم جانتی ہو یا تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے جو اس رشتے پر راضی ہو گئی ہو۔ تم اپنے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہو؟''

''کیف! یہ وقت اب ان سب باتوں کا نہیں ہے۔'' خوش نصیب نے اس کے ہاتھ جھٹک کر اپنے کندھے چھڑائے تھے۔ اس نے دروازے کی طرف بڑھنا چاہا تھا لیکن کیف نے ایک جھٹکے سے ہاتھ پکڑ کر واپس کھینچ لیا تھا۔

''سکون سے یہاں بیٹھو اور میری بات سنو۔۔۔''

''کون سی بات؟'' وہ جھنجھلا کر بولی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو تم اپنے ساتھ؟ انکار کیوں نہیں کر دیتیں اس شادی سے۔۔۔''

''کیف! تم پاگل ہو گئے ہو؟ یہ کون سا وقت ہے یہ سوال کرنے کا؟ اور اگر اتنی ہی بات ہے تو تم کیوں نہیں انکار کر دیتے صیام سے شادی کرنے سے۔۔۔ تم تو مرد ہو نا' جب تمہاری کوئی نہیں سن رہا تو میری کون سنے گا۔'' وہ چیخ کر بولی تھی۔

''خوش نصیب! میری بات مانو۔۔۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔۔۔ اب ہم اپنی زندگی ایک غلطی کی نذر نہیں کر سکتے۔۔۔''

''کیا چاہتے ہو تم کیف؟ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔''

''سب ہو سکتا ہے بے وقوف لڑکی۔۔۔'' کیف نے دانت کچکچائے تھے۔ ''ہم ابھی بھی اس مسئلے سے نکل سکتے ہیں۔ جب یہاں کسی نے ہمارا نہیں سوچا تو ہم بھی پرواہ کیوں کریں۔۔۔''

''کیف۔۔۔ تم کیا کرنے والے ہو؟'' خوش نصیب کی آواز میں اندیشے بول رہے تھے۔

''شادی۔۔۔'' کیف نے سر جھٹکا۔ ''شادی ہی کرنے والا ہوں میں۔۔۔ مگر صیام سے نہیں۔۔۔ تم سے۔۔۔ اور تمہیں اس معاملے میں میرا ساتھ دینا ہو گا۔'' اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

''ایسے خواب نہ دیکھو جو پورے نہ ہو سکیں کیف۔۔۔ اب ایسا ہونا ناممکن ہے۔۔۔ اور نہ ہی میں ایسا کچھ کرنے میں تمہارا ساتھ دوں گی۔''

''ساتھ تو میرا اب تمہارے فرشتے بھی دیں گے۔۔۔تم نے اس معاملے کو جتنا بگاڑنا تھا، بگاڑ لیا۔اب میں تمہیں اپنی زندگی مزید تباہ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

خوش نصیب نے سر ہاتھوں میں گرا لیا۔سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیف کو کیسے سمجھائے۔اور سمجھانے کی کوشش کرے بھی یا خود ہی چپ چاپ اس کی بات مان لے۔

کیف نے جو اسے اس طرح سر جھکائے دیکھا تو گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔

''اپنے اور میرے ساتھ اتنا برا مت کرو خوش نصیب!تم کیوں چاہتی ہو کہ تم اور میں ساری عمر پچھتاوے میں گزار دیں۔بھول جاؤ سب کچھ۔۔۔بھول جاؤ شامیر، ماہ نور اور باقی سارے مسئلے کو۔۔۔میری بات مانو۔۔۔ابھی بھی وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔تھام لو میرے ہاتھ کو۔۔۔''اس نے اپنا دایاں ہاتھ خوش نصیب کے چہرے کے سامنے پھیلا دیا تھا۔''تھام لو اس ہاتھ کو اور چلو میرے ساتھ۔۔۔ چلو بھاگ جاتے ہیں یہاں سے۔''

خوش نصیب کی نظریں کیف کے ہاتھ پر جمی تھیں۔وہ ہاں اور ناں کے درمیان جھول رہی تھی۔کیف منتظر نظریں اس کے چہرے پر جمائے ہوئے تھا۔

''روشن۔۔۔روشن امی کا کیا ہوگا کیف؟وہ مر جائیں گی اگر میں نے کچھ ایسا کیا تو۔۔۔''خوش نصیب گھٹی گھٹی آواز میں بولی تھی۔''باقی سب لوگ بھی ناراض ہو جائیں گے۔۔۔پھر کیا کریں گے ہم لوگ۔۔۔''

''کم آن خوش نصیب!تم نے کب سے لوگوں کی پرواہ کرنا شروع کر دی۔۔۔پھر ہمارے ماں باپ کب تک ہم سے خفا رہ سکتے ہیں۔۔۔ایک بار نکاح ہو گیا تو کوئی کچھ نہیں کر پائے گا اور یقین کرو اس وقت سب لوگ نا صرف ٹھنڈے دل سے ہماری بات سنیں گے بلکہ سمجھ بھی لیں گے۔سب لوگ معاف کر دیں گے ہمیں۔۔۔تم اس بارے میں مت سوچو۔''

کیف اسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا اور اسے سمجھانا پتھر سے سر پھوڑنے کے مترادف تھا۔
خوش نصیب کے چہرے پر ابھی تک کشمکش کے آثار تھے۔

''میں آخری بار تم سے پوچھ رہا ہوں۔۔۔تم میرے ساتھ چلو گی یا نہیں۔۔۔؟''کیف نے فیصلہ کن لہجے میں پوچھتے ہوئے اپنا ہاتھ ایک بار پھر اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

خوش نصیب کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔اس کی نظریں کیف کے ہاتھ پر تھیں۔

یہ ہاتھ تھام لوں۔۔۔

یا نہ تھاموں۔۔۔

دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا کہ لگتا تھا ابھی حلق کے راستے باہر آجائے گا۔

پھر جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔

''آئی ایم سوری روشن امی۔۔۔''

بدنام تو وہ ہو ہی چکی تھی تو کیوں نہ زندگی بچانے کی ایک کوشش کر لی جاتی۔۔۔اس نے اپنا ہاتھ کیف کے ہاتھ کی طرف بڑھایا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ کیف کا ہاتھ تھامتی، دروازہ دھاڑ کی آواز کے ساتھ کھلا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے یہ۔۔۔؟''

''کیا کر رہے ہو تم لوگ یہاں؟''

اندر آنے والے حلق کے بل دھاڑے تھے۔

خوش نصیب نے محسوس کیا کہ موت کا فرشتہ اس کے سر پر آ کھڑا ہوا ہے۔

☆☆☆

''متھے تے چمکن بال میرے بنڑے دے۔۔۔

متھے تے چمکن بال میرے بنڑے دے۔۔۔''

تائی اور چچی سمدھن بننے والی تھیں۔ لڑکیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اکٹھی تو ہوگئی تھیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے سے بھی مقابلہ جاری تھا۔ فضیلہ چچی نے اپنی اولاد کی شان میں ایک گانا گایا تھا، تائی نے پیچھے رہنا مناسب نہ سمجھا اور باری آنے پر فوراً ہی اپنے بیٹے کے لیے ایک گانا شروع کر دیا۔

سب ہی اس سچویشن کو انجوائے کر رہے تھے۔

ہنسی، مذاق، خوشی، مسکراہٹیں، رنگ۔۔۔۔

صیام بھی تالیاں بجاتے ہوئے شرمانے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ اس نے سر اٹھایا تاکہ ایک نظر اپنے ''بنڑے'' کو دیکھ سکے لیکن بنڑے صاحب سامنے سے غائب تھے۔ اس نے کیف کو تلاش کرنے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن وہ وہاں موجود ہوتا تو دکھائی دیتا۔ اس نے کچھ دیر پہلے خوش نصیب کو یہاں سے اٹھ کر جاتے دیکھا تھا لیکن اسے چنداں پرواہ نہیں ہوئی تھی لیکن اب کیف کا وہاں سے غائب ہونا اسے حیرانی میں مبتلا کر رہا تھا۔

کسی خیال کے تحت اس نے مڑ کر دیکھا تھا اور اس کے اندیشے کے عین مطابق کیف اسے اوپر جاتا ہوا دکھائی دیا تھا۔

صیام دانت کچکچا کر رہ گئی تھی۔ کیف خوش نصیب سے ملنے گیا ہے۔۔۔ یہ خیال ہی اسے آگ لگانے کے لیے کافی تھا۔ اگلے دس منٹ تک وہ پہلو بدلتی رہی تھی مگر کیف واپس نہیں آیا تھا۔ اب مزید صبر اس کے بس میں نہیں تھا۔

''بیڑہ غرق ہو تمہارا خوش نصیب۔۔۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' ساتھ بیٹھی ماہ نور نے حیرانی سے اس کی غصیلی صورت پر نظر دوڑائی تھی۔

''کچھ نہیں۔۔۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ بات کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کدھر جا رہی ہو؟'' ماہ نور نے صیام کا ہاتھ تھام کر اسے روکا تھا۔

''ایک کام یاد آگیا ہے۔۔۔ بس ابھی آئی۔'' ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

''اگر آج یہ دونوں پکڑے گئے تو ان کی خیر نہیں۔۔۔ خوش نصیب تو نہیں بچے گی میرے ہاتھوں سے۔۔۔'' سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے سوچا تھا اور یہی سب سوچتے ہوئے وہ اپنی جھونک میں آگے بڑھ گئی تھی کہ۔۔۔

ڈھپ۔۔۔۔

کوئی پوری طاقت سے آکر اس سے ٹکرایا تھا۔ صیام ناک پکڑ کر دہری ہوگئی۔ چند لمحوں بعد غصے کی شدت سے کانپتے ہوئے سر اٹھایا تو سامنے طوطا بھائی بھی اپنی ٹیڑھی ناک کو، جو کہ کچھ مزید ٹیڑھی ہوگئی تھی، تھامے دہائی دیتے نظر آئے۔

''کیا کر رہے ہیں طوطا بھائی آپ؟ اندھے ہوگئے ہیں۔۔۔ دیکھ کر نہیں چل سکتے۔۔۔'' وہ چیخی تھی۔

سبز رنگ کے کرتے میں سچ مچ کے طوطے بنے ہوئے طوطا بھائی نے ناک سے پھسلتی عینک کو سنبھالا تھا اور چڑ کر بولے تھے۔

''اندھی ہوگی تم خود۔۔۔ تمہارے اگلے پچھلے۔۔۔'' شاید بھول گئے تھے کہ اس کے اگلے پچھلوں میں وہ خود بھی شامل ہیں۔ ''اندھوں کی طرح خود چل رہی ہے اور باتیں مجھے سنا رہی ہے۔''

''طوطا بھائی! مجھ سے فی الحال الجھنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔۔۔ میرا موڈ پہلے ہی بہت خراب ہے۔ آپ مہربانی فرما کر بس اپنی عینک اور ہونے والی بیوی کو سنبھالیں۔ کیف کے پیچھے پڑ گئی ہے اب وہ۔۔۔''

''کون؟ خوش نصیب؟ کیا ہوا اسے۔۔۔'' طوطا بھائی تکلیف بھول کر حیرانی سے بہن کی شکل دیکھنے لگے۔
''ہوا کچھ نہیں ہے۔۔۔ مگر آج کچھ نہ کچھ ہو ضرور جائے گا میرے ہاتھوں۔۔۔''
''اے خبردار جو تم نے خوش نصیب کو کچھ کہا تو۔۔۔'' طوطا بھائی نے آنکھیں دکھائیں۔
صیام نے غصے سے بھائی کو گھورا پھر تنک کر بولی۔ ''آپ میرے ساتھ چلیں ذرا۔۔۔ پھر فیصلہ کریں کہ کچھ کہنا ہے یا نہیں۔''
اس نے بھائی کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹ کر اپنے ساتھ اوپر لے جانے لگی۔ طوطا بھائی ''ارے ارے'' کرتے رہ گئے۔
اوپر پہنچ کر صیام نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے بھائی کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور دبے پاؤں کمرے کی طرف بڑھی۔ طوطا بھائی اس کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔
کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر سے بات کرنے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ دونوں بہن بھائیوں نے دروازے کے پاس پہنچ کر کان باتوں پر لگا دیے۔۔۔
وہ خوش نصیب کی آواز تھی۔
''روشن۔۔۔ روشن امی کا کیا ہوگا کیف؟ وہ مر جائیں گی اگر میں نے کچھ ایسا کیا تو۔۔۔ باقی سب لوگ بھی ناراض ہو جائیں گے۔۔۔ پھر کیا کریں گے ہم لوگ۔۔۔''
پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی اور اس آواز نے صیام کو آگ لگا دی تھی۔ اس کے سارے اندیشے درست ثابت ہوئے تھے کیونکہ وہ آواز سو فیصد کیف کی ہی تھی۔
طوطا بھائی ہونق سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے طوطا بھائی کو سر کے اشارے سے بات سننے کو کہا۔
''کم آن خوش نصیب! تم نے کب سے لوگوں کی پرواہ کرنا شروع کر دی۔۔۔ پھر ہمارے ماں باپ کب تک ہم سے خفا رہ سکتے ہیں۔۔۔ ایک بار نکاح ہو گیا تو کوئی کچھ نہیں کر پائے گا اور یقین کرو اس وقت سب لوگ نہ صرف ٹھنڈے دل سے ہماری بات سنیں گے بلکہ سمجھ بھی لیں گے۔ سب لوگ معاف کر دیں گے ہمیں۔۔۔ تم اس بارے میں مت سوچو۔''
چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولا تھا۔
''میں آخری بار تم سے پوچھ رہا ہوں۔۔۔ تم میرے ساتھ چلو گی یا نہیں۔۔۔؟''
مزید سننے کی نہ ہمت تھی نہ ہی ضرورت۔۔۔ دونوں بہن بھائی دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر آگئے تھے۔
''کیا ہو رہا ہے یہ۔۔۔؟'' صیام چلائی تھی۔
''کیا کر رہے ہو تم لوگ یہاں؟'' طوطا بھائی نے اپنی پھسلتی ہوئی عینک کو سنبھالتے ہوئے صیام سے زیادہ چیخ کر پوچھا تھا۔
خوش نصیب نے محسوس کیا کہ موت کا فرشتہ اس کے سر پر آکھڑا ہوا ہے۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔
دوسری طرف ایک لمحے کے لیے کیف بھی گڑبڑا گیا تھا۔ ایسی صورتحال کے بارے میں اس نے سوچا نہیں تھا نہ ہی امید تھی کہ اس طرح پکڑے جائیں گے لیکن پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔
''کچھ نہیں کر رہے۔۔۔ مجھے خوش نصیب سے کچھ کام تھا۔۔۔ بس اس کے لیے ہی آیا تھا۔''
''ایسا کیا کام تھا جو تمہیں سب سے چھپ کر یہاں آنا پڑا کیف۔۔۔'' صیام پھر چیخی تھی۔ ''یہ کیوں نہیں کہتے کہ شامیر سے مایوس ہو کر اب یہ تمہیں پھنسا رہی ہے۔۔۔''
''آہستہ بولو صیام۔۔۔ بہرے نہیں ہیں ہم لوگ۔۔۔'' کیف دانت پیس کر بولا تھا۔ ''گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔ کوئی تماشا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تماشا؟ میں کر رہی ہوں تماشا۔۔۔اور جو تماشا تم دونوں پلان کر رہے ہو بند کمرے میں۔۔۔اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''بکواس بند کرو صیام۔۔۔'' خوش نصیب بولی تو اس کے الفاظ سخت لیکن انداز سراسر التجائیہ تھا۔''جو تم سمجھ رہی ہو ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔'' وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ صیام کو کیسے چپ کرائے۔

''چپ۔۔۔بالکل چپ۔۔۔خبردار جو تم نے کچھ بھی کہا تو۔۔۔تمہاری دال شامیر کے سامنے نہیں گلی تو تم دوبارہ کیف کے پیچھے پڑ گئیں۔ارے کچھ تو سوچا ہوتا۔۔۔میرے معصوم بھائی کو پاگل بناتے تمہیں شرم نہیں آئی۔۔۔ذرا خیال نہیں آیا کہ آج شادی ہے تمہاری اور تمہارے اس نام نہاد عاشق کی بھی۔'' وہ غصے میں جو منہ میں آ رہا تھا جاہلانہ انداز میں بولتی چلی جا رہی تھی۔

''خدا کا کچھ تو خوف کرو صیام۔۔۔تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ شامیر والے معاملے میں مجھے پھنسانے والی تم خود ہو۔۔۔اس کے باوجود مجھ پر تہمت لگا رہی ہو۔۔۔''

''میں الزام لگا رہی ہوں۔۔۔ یا تم دونوں اپنی سچائی چھپا رہے ہو۔۔۔'' وہ طوطا بھائی کی طرف مڑی تھی۔''بھائی جا کر نیچے سے سب کو بلا کر لاؤ۔سب کو پتا چلنی چاہیے ان دونوں کی حقیقت۔۔۔''

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی کیف کا ہاتھ گھوما تھا اور صیام کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا تھا۔ غصہ انسان کو ایسے ہی بے قابو کر دیتا ہے۔

طوطا بھائی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور خوش نصیب کا چہرہ فق ہو گیا۔

''بس۔۔۔اب ایک لفظ اور نہیں۔۔۔خبردار جو تم نے کوئی ایسی حرکت کی تو صیام۔۔۔مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' کیف سرخ چہرے کے ساتھ صیام کو پیچھے دھکا دیتے ہوئے بولا تھا۔

صیام شاک کی کیفیت میں کھڑی رہ گئی تھی۔پھر جیسے اس کا سکتہ ٹوٹا تھا اور وہ بپھر گئی تھی۔''تم۔۔تم۔۔۔تمہاری اتنی ہمت کہ مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ۔۔۔میں چھوڑوں گی نہیں تمہیں۔۔۔''

اونچی آواز میں چلاتے ہوئے صیام نے باقاعدہ کیف پر حملہ کیا تھا اور اپنے لمبے ناخنوں سے اس کے چہرے کو نوچ لینا چاہا تھا۔کیف نے اس کے حملے سے بچنے کے لیے تیزی سے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔اب وہ اپنے ہاتھوں کو چھڑانے کے لیے مچلتی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ چلا رہی تھی۔

طوطا بھائی اور خوش نصیب ہکا بکا ان دونوں کو لڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

صیام کے گلے نے کسی اسپیکر کا سا کام دیا تھا تو اگلے چند لمحوں میں گھر کے سب بڑے اوپر پہنچ چکے تھے۔

صابر تایا اور شفیق چچا تیزی سے آگے بڑھے تھے اور اپنے اپنے نمونے کو تھام کر پیچھے کیا تھا۔

''کیا کر رہے ہو تم دونوں۔۔۔پاگل ہو گئے ہو کیا۔۔۔'' صابر چچا چنگھاڑے تھے۔اتنے مہمانوں کے سامنے اس نئے تماشے نے ان کے غصے کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

خوش نصیب نے جو سب کو سامنے دیکھا تو گرنے کے سے انداز میں پیچھے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔وہ گم صم نگاہوں سے سب کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''صیام یہ سب کیا ہے؟'' شفیق چچا نے اپنی بیٹی کے بازو کو پکڑ کر اسے جھنجھوڑا تھا۔

''ابا آپ مجھ سے نہیں۔۔۔اس سے پوچھیں یہ یہاں کیا کر رہا تھا۔۔۔بلکہ یہ بات ان دونوں سے پوچھیں۔۔۔''

سب کی نظریں کیف اور خوش نصیب کی طرف اٹھ گئیں۔

''یہ دونوں کیا بتائیں گے آپ کو۔۔۔میں بتاتی ہوں۔۔۔یہ دونوں ادھر کمرے میں بیٹھے گھر سے بھاگ

کر نکاح کی پلاننگ کر رہے تھے۔۔۔'' صیام کی آواز اتنی اونچی ضرور تھی کہ باہر کھڑے مہمان بھی سن سکیں۔
''صیام! کیا بول رہی ہو تم؟'' تایا کو ذرا بھی یقین نہیں آیا کہ ان کا بیٹا ایسا کر سکتا ہے۔
''آپ کو میری بات پر یقین نہیں آ رہا تو یہ طوطا بھائی سے پوچھ لیں۔۔۔ انہوں نے بھی میرے ساتھ سب کچھ سنا ہے۔ میں آپ کو ساری بات بتاتی ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے میں اور طوطا بھائی کسی کام سے اوپر آئے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور یہ دونوں اندر۔۔۔'' وہ ایک کو چار سے ضرب دے کر سب بتاتی چلی گئی تھی۔
''کیف۔۔۔'' تایا کا پر جلال لہجہ خوش نصیب کی جان نکال رہا تھا۔ ''کیا سب سچ ہے؟'' انہیں یقین نہ آتا تھا کہ کیف یہ سب کر سکتا ہے۔
کیف نے ایک لمحے کے لیے سوچا تھا۔ جب صیام کی بدولت سب کو پتا چل ہی گیا ہے، نام خراب ہو ہی گیا ہے تو جھوٹ بولنے کا فائدہ۔۔۔ اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کیا۔
''جی ابا! یہ سچ کہہ رہی ہے۔۔۔ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔۔۔ میں خوش نصیب سے شادی کرنا۔۔۔''
اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑی تھی کیونکہ صابر صاحب نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔
''بے غیرت۔۔۔ تمہیں شرم نہیں آئی یہ سب سوچتے ہوئے بھی۔۔۔''
کیف سن رہ گیا تھا۔ اسے اتنے سخت ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ اکلوتا بیٹا ہونے کے ناتے وہ ہمیشہ ماں باپ کا لاڈلا رہا تھا اور اسی لیے اسے لگا تھا کہ ابا آسانی سے اس کی بات مان جائیں گے مگر ابا کی اس تھپڑ نے اس کی ساری امیدوں پر ٹھنڈا پانی پھینک دیا تھا۔ منہ پر ہاتھ رکھے وہ حیرانی سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔
''بہت دیکھ چکا میں تم سب کی حرکتیں۔۔۔ تمہارا نکاح آج ہی ہوگا اور ابھی ہوگا۔۔۔ اور صیام سے ہی ہوگا۔'' ابا نے حکم جاری کیا تھا۔
''میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔۔۔ یہ بات آپ لوگ بھول جائیں کہ میں صیام سے اب شادی کروں گا۔ میری شادی ہوگی تو خوش نصیب سے ہی ہوگی۔۔۔ ورنہ نہیں ہوگی۔'' باپ کے تھپڑ نے اسے مزید نڈر بنا دیا تھا۔
آر یا پار۔۔۔ آج فیصلہ ہو جانا تھا اور پھر ابا نے فیصلہ سنا دیا۔
''دور ہو جاؤ تم میری نظروں کے سامنے سے۔۔۔ تم جیسے نافرمان بیٹے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم صیام سے نکاح نہیں کرو گے تو اس گھر میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔۔۔''
وہ چند لمحے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا اور پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا لیکن خوش نصیب کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ وہ خوش نصیب کی طرف مڑا تھا اور پھر اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر لیا تھا۔ ''چلو خوش نصیب، ہمیں یہاں نہیں رہنا ہے۔'' کیف نے خوش نصیب کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھنا چاہا تھا لیکن اسے ٹھٹک کر رکنا پڑا تھا۔ خوش نصیب اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تھی بلکہ اس نے اپنا ہاتھ بھی پیچھے کھینچ لیا تھا۔
''نہیں کیف۔۔۔'' سہمی ہوئی آواز میں وہ اتنا ہی بول پائی تھی۔ کیف چند لمحے سرخ آنکھوں سے اسے گھورتا رہا تھا پھر اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں تھی۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اس لمحے خوش نصیب کی جان نکال دیتا۔
''بھاڑ میں جاؤ تم۔۔۔'' وہ حلق کے بل چلایا تھا اس پر۔
تیزی سے مڑتے ہوئے وہ باہر کی طرف بڑھا تھا۔ دھپ دھپ کر کے سیڑھیاں عبور کیں اور گھر سے باہر نکلتا چلا گیا۔ تائی اماں اور فہمینہ تیزی سے اس کے پیچھے بھاگی تھیں لیکن ان کے روکنے سے پہلے ہی وہ گھر سے باہر نکل چکا تھا۔
خوش نصیب اپنی جگہ پر جمی کھڑی تھی۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہاں سے ہل بھی پاتی۔ زمین پہ نظریں گاڑے وہ سزا سنائے جانے کی منتظر تھی۔ سزا تو سنائی نہ دی تھی لیکن ایک عجیب سی آواز ضرور سنائی دی تھی۔

دھپ۔۔۔
خوش نصیب نے تیزی سے سر اٹھایا تھا اور اسے لگا اس کی جان نکل گئی ہے۔
روشن امی سامنے زمین پر گری پڑی تھیں۔ ماہ نوران کے سرہانے بیٹھی روتے ہوئے انہیں آوازیں دے رہی تھی۔

☆☆☆

آج کی رات فلک بوس میں ستاروں کے جھرمٹ کی رات تھی۔
اتنے رنگ' اتنے قہقہے فلک بوس میں سمٹ آئے تھے کہ ان درو دیوار نے ایسی رونق شاید ہی کبھی دیکھی ہو۔ موسیقی، کھٹا کھٹ تصویریں کھینچتے کیمرے، مشروبات، مہمانوں کی تواضع کا ہر انتظام موجود تھا۔ اردشیرازی نے جیسا کہا تھا بڑے بیٹے کی شادی کو اتنا ہی یادگار بنا رہے تھے۔ غرض سب کچھ ویسے ہی ترتیب دیا گیا تھا جو چند سال پہلے ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا۔
اگر کچھ مختلف تھا تو وہ تھی دلہن۔۔۔
اردشیرازی اور معاویہ تو خیر ایک ہفتہ پہلے ہی پاکستان آگئے تھے لیکن مسٹر اینڈ مسز جمال اپنے بچوں کے ساتھ صرف تین دن پہلے پاکستان پہنچے تھے۔ معاویہ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ آئے کت نے اسے بے وقوف بنایا تھا، ایک بار پھر سے فلک بوس کے درو دیوار کو چھانا تھا۔ ایک ایک کمرہ، ایک ایک کونا خود چیک کیا تھا۔
بشام کے رہنے والوں نے جو آٹھ سال بعد فلک بوس کے مالکوں کو لوٹتے دیکھا تو سب کو ہی خوشی ہوئی تھی، لیکن جیسے جیسے لوگوں کو معلوم ہوتا گیا کہ ان لوگوں کے واپس آنے کا مقصد کیا ہے، سب ہی حیران رہ گئے تھے۔
کچھ لوگوں نے معاویہ کے دوبارہ اسی جگہ آکر شادی کرنے کو بے وقوفی قرار دیا تو کسی نے اسے دیوانے کا خواب قرار دیا۔
لوگوں کا کہنا تھا کہ فلک بوس کا بھوت کبھی بھی یہاں کسی کو خوشی حاصل نہیں کرنے دے گا۔ تو پھر دوبارہ سے اپنی خوشیوں کو اپنے ہاتھوں آگ لگانے کا کیا جواز تھا۔
یہاں تک کہ کچھ بزرگوں نے فلک بوس آکر معاویہ کو سمجھانے کی کوشش بھی کی۔۔۔ اردشیرازی سے یہاں سب لوگ ہی ڈرتے تھے لیکن اس کا بیٹا ان کی نسبت رحم دل اور خوش اخلاق تھا۔ معاویہ نے ان لوگوں سے ملاقات کی، ان کی خاطر مدارت بھی کی، مسکراتے ہوئے ان لوگوں کے مشورے بھی سنے لیکن ان پر واضح کر دیا کہ اس کا شادی اسی جگہ ہوگی۔
اب کی بار کوئی آسیب کوئی بدروح اس کی خوشیوں میں حائل نہیں ہوسکتی۔۔۔ اس نے پختہ ارادہ کرلیا تھا۔
میں سب پر ثابت کر کے رہوں گا کہ فلک بوس میں ایسا کچھ نہیں ہے جیسا بتایا جاتا ہے۔۔۔
اب کی بار سب ویسا ہی ہوگا جیسا کہ میں چاہتا ہوں۔۔۔
اس نے سیکیورٹی کا ـــــ انتظام اپنی نگرانی میں کروایا تھا۔ اس کی موجودگی کے بغیر کسی چڑیا کو بھی اجازت نہیں تھی کہ فلک بوس کی عمارت میں داخل ہوسکے۔
اس نے سختی سے کبیر بابا کو بول دیا تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اندرونی حصے میں نہیں جاسکتا۔ اور اگر جانا ناگزیر ہو تو کبیر بابا ساتھ اندر جائیں تاکہ کسی قسم کی بدمزگی سے بچا جاسکے۔۔۔ کبیر بابا نے اس کی ہر ہدایت پر عمل کیا تھا۔
منفرا اور اس کی فیملی کو اسلام آباد ایرپورٹ سے معاویہ نے خود جاکر ریسیو کیا تھا۔ وہ کسی قسم کا رسک لینے کے لیے راضی نہیں تھا۔ اگر اس نے سوچا تھا کہ اس بار اس کی خوشیوں کو کوئی چھین نہیں پائے گا تو وہ خود سے کیے اس وعدے کو نبھانے کے لیے ہر ممکن حد تک کوشش کر رہا تھا۔

مسٹر اینڈ مسز جمال کے بے حد اختلاف کے باوجود اردشیرازی اور معاویہ نے انہیں فلک بوس میں اپنے ساتھ ٹھہرنے پر راضی کرلیا تھا۔

بس انہیں فلک بوس پہنچا کر وہ ماموں مامی کو لینے چلا گیا تھا۔ ان کے بغیر اس کی ہر خوشی ادھوری تھی۔ اور اپنی خوشیوں کے لیے آج کل وہ اس قدر حساس ہو رہا تھا کہ کسی پر بھی بھروسا کرنے کو تیار نہیں تھا۔

اردشیرازی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ ماموں مامی کو لینے ڈرائیور کو بھیجے اور خود یہاں رہ کر اپنے سسرال والوں کو ٹائم دے یا شادی کے انتظامات میں ان کا ہاتھ بٹائے لیکن معاویہ کوئی بھی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس قدر حساس ہو رہا تھا کہ اس نے ڈرائیور پر بھی بھروسا کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور خود ان لوگوں کو لینے کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔

منزل پر پہنچتے ہی اس نے واپس جانے کا شور مچا دیا تھا۔ بڑی مشکل سے مامی نے اسے کھانا کھانے پر راضی کیا تھا ویسے بھی وہ اس سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتی تھیں۔ معاویہ کے کھانا کھانے کی ہامی بھرنے کے بعد انہوں نے جلدی جلدی کھانا چن دیا تھا۔

''واہ۔۔۔'' پہلا نوالہ منہ میں لیتے ہی معاویہ بولا تھا۔ ''مامی! باہر اور کچھ مس کروں نہ کروں مگر آپ کے بنائے کھانے کو ضرور ترس جاتا ہوں۔''

وہ مسکرادی تھیں۔

''معاویہ! یہ فلک بوس میں شادی کا فیصلہ تمہارا ہے؟'' ماموں نے پوچھا تھا۔

''ہم م م۔۔۔ مشورہ بابا کا تھا مگر فیصلہ میں نے ہی کیا ہے کہ شادی فلک بوس میں ہی کروں گا۔''

''کیوں؟'' مامی خفگی سے بولیں۔ ''سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی دوبارہ یہ فیصلہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔'' وہ اس فیصلے سے سخت خفا معلوم ہوتی تھیں۔

''مامی! آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔۔۔ اللہ پر بھروسا رکھیں۔۔۔ اس بار کچھ غلط نہیں ہوگا۔''

''معاویہ۔۔۔ تم کیوں بھول رہے ہو کہ اس جگہ نے تمہارے بھائی کی جان لے لی تھی۔ وہاں سے ہی تو آئے کت غائب ہوئی تھی۔۔۔ آج تک اس کا سراغ نہیں مل پایا۔۔۔ وہ جگہ ہے ہی منحوس۔۔۔ کوئی خوشی نہیں مل سکتی ہمیں اس جگہ سے۔۔۔''

''اسی لیے۔۔۔ صرف اسی لیے میں نے وہاں شادی کا فیصلہ کیا ہے۔۔۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں قلعہ فلک بوس کے بارے میں سب کے خیالات کو بدل سکوں مامی۔۔۔ میں سب وہاں سے ہی شروع کرنا چاہتا ہوں جہاں سے ادھورا چھوڑا تھا۔۔۔ آپ دیکھیے گا کہ اس بار آپ کے بیٹے کو اس جگہ سے ہی سب خوشیاں مل جائیں گی۔۔۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''نجمہ! میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا۔۔۔ کیوں خواہ مخواہ وہم دل میں لاتی ہو۔۔۔ تمہیں اتنا ڈر ہے نا تو بس چار قل پڑھ کر اپنے بیٹے پر پھونکتی رہنا۔۔۔ اب اللہ سے زیادہ حفاظت تو کوئی نہیں کرسکتا نا معاویہ کی۔۔۔'' ماموں نے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

مامی کی تسلی ہوئی یا نہیں، مگر وہ دل پر پتھر رکھ کر معاویہ کے ساتھ قلعہ فلک بوس آگئے تھے۔

یوں کل رات معاویہ اور منفرا کی مہندی کی رسم بڑے پیمانے پر ادا کردی گئی تھی اور آج بارات کا دن تھا۔

دلہن کو پالکی میں بٹھا کر اسٹیج تک لایا گیا۔ وہ اتنی دلکش لگتی تھی کہ آسمان کے چاند کو بھی شاید اس سے حسد محسوس ہوتا ہوگا۔

دولہا اتنا خوش تھا ایسی روشنیاں پھیلی تھیں اس کے چہرے پر کہ محبت اسے دیکھ دیکھ کے خود پر فخر کرتی

تھی۔ روئے زمین پر اگر آج کی تاریخ میں کوئی خوش قسمت تھا تو بس وہی تھا۔ ممکن ہے آج کی رات کوئی اور بھی نوازا گیا ہو لیکن اسے تو بس خود پر ناز تھا۔

وہ اپنی ہی قسمت پر اترا رہا تھا۔ ہوگا کوئی ایسا۔۔۔ اس زمین پر۔۔۔ جو محبت کرے اور ایسے ہی اسے پالے جیسے خواب میں ہر ناممکن چیز ممکن ہو جاتی ہے۔

آسمان کی بلندیاں پیروں تلے محسوس ہوتی ہیں۔

تو وہ اتنا ہی خوش تھا جیسے محبت کی معراج حاصل کر کے انسان خوش ہو سکتا ہے۔ اس کی آنکھیں منفرا کو دیکھتی نہ تھیں، اس کی پرستش کرتی تھیں۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ محبت تو اس نے اب ہی کی تھی، اس سے پہلے اس کے ساتھ جو بھی گزرا وہ ایک سراب تھا۔ ایک سازش تھی۔

معاویہ نے سر جھٹک دیا۔ وہ آٹھ سال پہلے کی ایک ایسی ہی رات کو یاد کر کے اپنے آج کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ فی الحال صرف منفرا کو دیکھنا چاہتا تھا، اسے سوچنا چاہتا تھا اور اسے پالینا چاہتا تھا۔

جب منفرا پالکی سے اتری اور اس نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ شہزادوں کی سی آن بان والا اس کے استقبال کے لیے ہاتھ باندھے، مسکراہٹ لبوں کے کناروں میں سمیٹے دلہن کے استھان کے قریب کھڑا اسے ایسے دیکھتا تھا جیسے وہ کوئی دیوی ہو اور عشق کے منبر پر اس کی مورتی سجائی جا رہی ہو۔

خوش باش، پرسکون، اور پور پور محبت میں ڈوبا ہوا۔

وہ سہج سہج کر قدم دھرتی اس کی طرف بڑھی جب قریب پہنچی تو وہ اردگرد کی پرواہ کیے بنا اس کے کان کے قریب جھک کر سرگوشی کرنے لگا۔

''مجھ سے زیادہ اس روئے زمین پر خوش قسمت کون ہوگا منفرا۔۔۔ میں نے جسے چاہا اسے پا بھی لیا۔۔۔!''

سب طرف شور مچ گیا' خوب ہوا ہوئی کہ دولہا نے دلہن کے کان میں کیا کہا ہے۔ لیکن وہ مسکراتا رہا اور غلطی سے بھی اپنے اس راز کا پتا کسی کو نہ دیا۔

دلہن نے شرما کر نظروں کو کچھ اور جھکا لیا۔

نکاح کی کارروائی شروع ہو گئی تھی۔

دولہا اور دلہن ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ مگر دونوں کے درمیان سرخ جالی کا پردہ لگا دیا گیا تھا۔ معاویہ نے منہ موڑ کر منفرا کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔۔۔ عکس واضح نہیں تھا۔ وہ اس کے تاثرات دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو پایا۔

مولوی صاحب نے کلمے پڑھا کر پوچھنا شروع کیا تھا۔

''منفرا جمال ولد محمد جمال آپ کو معاویہ اردشیر ازی ولد اردشیر ازی بعوض حق مہر۔۔۔۔ قبول ہے؟''

مولوی صاحب کی آواز گونج رہی تھی۔

منفرا نے چند لمحے توقف کیا تھا۔ اور یہ چند لمحے معاویہ کے لیے گھنٹوں کے برابر ثابت ہوئے تھے۔ اس نے کچھ پریشانی سے پردے کے اس پار منفرا کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

''قبول ہے۔۔۔'' نسوانی آواز گونجی۔

معاویہ نے محسوس کیا کہ یہ آواز اس کے وجود میں دوبارہ زندگی پھونک گئی۔

مولوی صاحب اپنا سوال دہرا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

''خوش نصیب! لو چائے پی لو۔۔۔'' عرفات ماموں خود اس کے لیے چائے بنا کر لائے تھے۔

خوش نصیب نے سر اٹھایا اور کھوئی کھوئی نگاہوں سے ماموں کو دیکھا۔

عرفات ماموں نے کپ اس کی طرف بڑھایا تھا جو اس نے آہستہ سے تھام لیا۔
''امی یاد آرہی ہیں؟'' وہ اس کے ساتھ ہی دیوار سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ان کے لہجے میں نرمی ہی نرمی تھی۔
''یاد کرنے کے علاوہ اب کر ہی کیا سکتی ہوں؟'' اس کے لہجے کا ملال کم نہ ہوتا تھا۔
آج پندرہ دن ہوگئے تھے روشن امی کی وفات کو لیکن اس کی آنکھیں خشک نہ ہوتی تھیں۔
اس نے کہیں پڑھا تھا کہ۔۔۔
''اور پھر ایک وقت آتا ہے جب آپ کو تنہائی سے ڈر نہیں لگتا۔۔۔
اکیلے بیٹھے رہنا برا نہیں لگتا۔۔۔
آنکھوں سے آنسو بھی نہیں گرتے۔۔۔
ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی رہتی ہے۔۔۔
کیوں کہ ہم اتنے عادی ہوجاتے ہیں کہ کوئی بات کرے تو بھی ٹھیک۔۔۔
نہ بھی کرے تو بھی ٹھیک۔۔۔''
آج کل وہ بھی کسی ایسے ہی وقت میں آ پھنسی تھی۔
وہ کس کس غم پر روتی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
ماں کی موت پر۔۔۔
یا ماں کی موت کے لیے خود کو مورد الزام ٹھہرائے جانے پر۔۔۔
یا بہن کے اسے تنہا چھوڑ جانے پر۔۔۔
یا اس کی قطع تعلقی پر۔۔۔
اپنا سب کچھ کھو دینے پر۔۔۔
اس کے پاس ایک وجہ نہیں تھی غم منانے کے لیے۔۔۔ بہت ساری وجوہات تھیں کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کس بات پر روئے۔
پندرہ دن پہلے جو کچھ بھی ہوا، اس میں اس کی غلطی نہ ہونے کے برابر تھی، اس کے باوجود تمام کوتاہیاں اس کے کھاتے میں لکھ دی گئیں۔
کیف جو اس رات گھر سے نکلا تو مڑ کر کسی کی بھی خبر نہیں لی۔تائی اماں کا غم کم نہ ہوتا تھا۔وہ دن رات بیٹے کو یاد کرتی تھیں اور ٹھنڈی آہیں بھرتی تھیں۔
فضیلہ چچی کے دونوں بچوں کی شادیاں ہوتے ہوتے رہ گئی تھیں۔انہوں نے وہ واویلا مچایا کہ خدا کی پناہ۔۔۔
انہیں نہ تو روشن امی کی حالت پر ترس آیا تھا، نہ تائی کے آنسوؤں پر۔۔۔ وہ سب کی طرف سے منہ موڑے بیٹھی تھیں۔
خوش نصیب کی بدنصیبی نے یہیں پہ بس نہیں کیا تھا۔
روشن امی جو اس رات بے ہوش ہوئیں تو دوبارہ ہوش میں ہی نہ آسکیں۔وہ یہ دکھ برداشت نہ کر پائی تھیں۔
دو دن ہاسپٹل میں رہنے کے بعد انہوں نے چپ چاپ زندگی سے منہ موڑ لیا تھا۔خوش نصیب کو ان سے معافی مانگنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔وہ خفا ہی دنیا سے چلی گئی تھیں تمام تکالیف اور پریشانیوں سے جان چھڑا کر۔۔۔
ماہ نور جو پہلے ہی خوش نصیب سے متنفر تھی، ماں کی موت نے اسے بالکل ہی خوش نصیب سے لاتعلق کر دیا تھا۔ماں کی میت کے سرہانے بیٹھ کر اس نے خوش نصیب کو ماں کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اس نے باقاعدہ خوش نصیب کو کوسا تھا۔اسے بددعائیں دی تھیں۔

خوش نصیب نے سب کچھ سر جھکا کر سنا تھا اور برداشت بھی کر لیا تھا۔اس کے پاس کسی بھی بات کا جواب نہیں تھا۔ذہن میں صرف ایک بات تھی کہ اس کی ماں اس سے ناراض ہو کر چلی گئی۔۔۔معافی مانگنے کا موقع بھی نہیں ملا۔

آج روشن امی کی وفات کو دو ہفتے گزر چکے تھے۔اور اس کی پوری دنیا اندھیر تھی۔

فاطمہ اور شامیر کو واپس جانے کی جلدی تھی۔خدا جانے انہوں نے کیا کہہ کر تایا کو راضی کیا تھا کہ آج صبح سادگی سے شامیر اور ماہ نور کا نکاح اور رخصتی کر دی گئی تھی۔گھر سے نکلنے سے پہلے ماہ نور خوش نصیب کے پاس آئی تھی اور بس اتنا ہی کہا تھا۔

''خوش نصیب! تم نے بہت برا کیا۔۔۔جو کچھ تم نے کیا میرا عہد ہے خود سے کہ تمہیں اس سب کے لیے کبھی معاف نہیں کروں گی۔۔۔کبھی بھی نہیں۔۔۔تم نے شامیر پر الزام لگایا۔۔۔ہمارا رشتہ ختم کروانا چاہا اور جب یہ سب نہ کر پائیں تو روشن امی کی جان لے لی۔۔۔تمہیں میں تو کیا، اللہ بھی کبھی معاف نہیں کرے گا۔میں جارہی ہوں خوش نصیب۔۔۔!زندگی نے اگر کہیں دوبارہ ہمارا سامنا کروایا تو مجھے پہچاننے کی غلطی مت کرنا۔۔۔میں نے پندرہ دن پہلے ہی ماں کے ساتھ بہن کو بھی دفنا دیا ہے۔''

وہ مڑی تھی اور چلی گئی تھی۔۔۔شاید ہمیشہ کے لیے۔۔۔

خوش نصیب میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے روکنے کی کوشش کرتی۔۔۔

عرفات ماموں اسے زبردستی اپنے ساتھ اپنے پورشن میں لے آئے تھے۔اور تب سے وہ ایسے ہی پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔

''خوش نصیب!صبر سے کام لو۔۔۔اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔۔۔''

''مجھے کیوں لگتا ہے ماموں کہ اللہ میرے ساتھ نہیں ہے۔۔۔اگر وہ میرے ساتھ ہوتا تو کسی ایک کو تو میرے لیے میرے پاس چھوڑ دیتا۔۔۔سب مجھے ایسے تنہا تو نہ کرتے نا۔۔۔''وہ معصومیت سے بولی تھی۔

عرفات ماموں کا دل دکھ سے بھر گیا۔''میرے بچے اللہ کبھی کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا۔۔۔تم بدگمان مت ہو خوش نصیب۔۔۔یقیناً اس میں بھی کوئی بہتری ہے۔۔۔اور پھر میں ہوں نا تمہارے لیے یہاں موجود۔۔۔تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے کیا۔۔۔؟''

وہ چپ چاپ ان کی شکل دیکھتی رہی۔۔۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا میرے بچے۔۔۔''ان کا بھاری ہاتھ کسی چھاؤں کی طرح اس کے سر پر آٹھہرا تھا۔''آج سے تم میری بیٹی ہو۔۔۔اور میرا وعدہ ہے کہ میں جب تک زندہ ہوں'تمہیں باپ کی کمی محسوس ہونے نہیں دوں گا۔''

ان کے پاس خوش نصیب کو تسلی دینے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اس کا غم بہت بڑا تھا۔۔۔اگر ان کے چند ہمدردی بھرے لفظ اسے سکون دیتے تو وہ خوشی خوشی بولتے رہتے۔۔۔

خوش نصیب کا دل پگھلنے لگا۔اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔۔۔پھر ان قطروں نے اپنے مسکن کو چھوڑا اور گالوں پر پھسلتے ہوئے ہمیشہ کے لیے فنا ہو گئے۔۔۔

عرفات ماموں کے کندھے پر سر ٹکائے۔۔۔وہ زار و قطار روتی چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ اس سے اگلے دن کی بات ہے۔خوش نصیب کی حالت نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔وہ یا تو چپ چاپ خلا میں گھورتی رہتی تھی یا روتی رہتی تھی۔

ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ خوش نصیب کو ان حالات سے کیسے نکالیں۔

انہیں ڈر تھا کہ کہیں اس کی مایوسی اس حد پر نہ جا پہنچے جہاں انسان خود کو نقصان پہنچانے سے بھی باز نہیں رہتا۔

بہت سوچنے اور غور کرنے کے بعد انہیں یہی حل سمجھ میں آیا تھا کہ وہ خوش نصیب کو فضل منزل، بلکہ اس شہر سے بھی کہیں دور بھیج دیں۔۔۔ مگر کہاں۔۔۔؟

اس کی ننھیال میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے اپنے پاس رکھ لیتا اور ویسے بھی وہ پورے خاندان میں جس حد تک بدنام ہو چکی تھی، یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی اسے رکھنے پر راضی ہو جاتا۔

بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے خوش نصیب کو یہاں سے بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ فیصلہ مشکل تھا اور اس پر عمل درآمد کرنا بے حد مشکل۔۔۔ مگر انہیں ہر حال میں اب یہ کام کرنا تھا۔

اسی مقصد کے لیے وہ صبح صبح صابر صاحب کے پاس آئے تھے۔

نو بجے کا وقت تھا۔ صابر صاحب ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اخبار کا مطالعہ بھی جاری تھا۔ تائی اماں اور فہمینہ بھی وہاں موجود تھیں۔ لیکن تین افراد کی موجودگی میں بھی وہاں بالکل خاموشی تھی۔ عرفات نے اندر داخل ہوتے ہوئے شدت سے اس خاموشی کو محسوس کیا۔ جانے والا اپنے ساتھ ساری رونق لے گیا تھا۔ پیچھے سناٹے رہ گئے تھے۔

''السلام علیکم۔۔۔'' انہوں نے اندر داخل ہوتے ہوئے بہ آوازِ بلند سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام۔۔۔'' صابر صاحب نے انہیں اندر آتے دیکھا تو اخبار لپیٹ کر ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔

''آؤ۔۔۔ آؤ عرفات۔۔۔ ناشتہ کر لو۔۔۔'' انہوں نے دعوت دی۔۔۔

انہوں نے بہن کی کرسی کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی سنبھال لی۔

''آپ کی کیسی طبیعت ہے اب آپا۔۔۔؟'' انہوں نے بڑی محبت سے بہن کو ساتھ لگایا تھا۔

''بس کچھ مت پوچھ عرفات۔۔۔ میرا دل درد سے پھٹ رہا ہے۔۔۔ پتا نہیں کس حال میں ہو گا میرا بچہ۔۔۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔۔۔ ''عرفات! یہ تو میری نہیں سنتے تو ہی پتا کر کیف کا۔۔۔ اسے ڈھونڈ کر لے آ میرے بھائی۔۔۔ اسے بتانا کہ اس کی ماں کا کیا حال ہوا پڑا ہے۔۔۔'' ان کی تکلیف کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ عرفات منہ سے کچھ نہیں بولے لیکن بہن کو ساتھ لگائے رکھا۔

بیوی کی آخری بات پر صابر صاحب کا پارہ پھر آسمان پر جا پہنچا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس ٹیبل پر پٹخا اور غصے سے بولے۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے عرفات! اس ناہنجار کو ڈھونڈنے یا واپس لانے کی۔۔۔ میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے ایسی ناہنجار اولاد کے لیے جو ماں باپ کو اس طرح سب کے سامنے ذلیل کروائے۔۔۔

تائی اماں کے رونے میں تیزی آ گئی۔۔۔

''جن کی غلطی ہے، وہ سکون سے بیٹھے ہیں گھروں میں اور میرے بیٹے کو آپ نے رلنے کے لیے گھر سے نکال دیا ہے۔'' وہ چڑ کر روتے روتے بولی تھیں۔ ''بچہ آ گیا ہو گا باتوں میں۔۔۔ ورنہ ایسا نہیں ہے وہ۔۔۔''

''دودھ پیتا بچہ نہیں ہے تمہارا بیٹا بیگم۔۔۔! ساری عقل ہے اسے۔۔۔ تب ہی ایسے دھمکیاں دے کر گیا ہے گھر سے۔۔۔'' وہ دانت پیس کر بولے۔

نتیجتاً تائی اماں واک آؤٹ کر گئی تھیں۔

فہمینہ نے سر پکڑ لیا۔۔۔

''ابا! آپ کو پتا ہے اماں کا۔۔۔ پھر بھی آپ۔۔۔ اب وہ پھر اپنا بی پی ہائی کر لیں گی رو رو کر۔۔۔'' اس کے لہجے میں خفگی ہی خفگی تھی۔

''تم نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا۔۔۔'' وہ ذرا غصے سے بولے تھے۔

فہمینہ نے بھی ناشتا ادھورا چھوڑا اور اٹھ کر ماں کے پیچھے چلی گئی۔
''بھائی صاحب! باجی تو کچھ نہیں سمجھتیں۔۔۔ آپ ہی سمجھداری سے کام لے لیں۔۔۔''
''عرفات! تمہارے سامنے ہی ہیں سب حالات۔۔۔ تمہاری بہن کو کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔۔۔ ہر وقت بس یہی ضد ہے کہ اس ناہنجار کو ڈھونڈ کر واپس لاؤ۔۔۔'' وہ اکتا کر بولے تھے۔
''بتاؤ کس منہ سے واپس لاؤں اسے۔۔۔ اس قابل چھوڑا ہے اس نے مجھے کہ اس کی خاطر کسی سے بحث کروں۔۔۔ جوتا مار کر گیا ہے میرے منہ پر وہ۔۔۔ کس منہ سے کہوں شفیق سے میں کہ کیف کو واپس لانا چاہتا ہوں۔۔۔'' ان کے لہجے میں بھرا تاسف عرفات کو شرمندہ کر گیا۔
''کوئی بات ہوئی ہے گھر میں۔۔۔؟''
''شفیق آیا تھا رات۔۔۔ حصہ مانگ رہا ہے اپنا۔۔۔ دیوار کرنا چاہتا ہے گھر میں۔۔۔'' وہ دکھی انداز میں بولے۔
عرفات نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔۔۔ بہر حال جو کچھ ہوا تھا اس میں کیف کی حرکت کا ذمہ دار وہ خود کو ہی سمجھتے تھے۔ انہیں احساس ہی نہیں تھا کہ وہ ان کی باتوں کا یہ مطلب لے گا۔
''خیر تم بتاؤ۔۔۔ تم خیریت سے آئے تھے؟'' صابر صاحب نے اپنے مسئلے کو ایک طرف کرتے ہوئے پوچھا تھا۔
''ہاں جی بھائی صاحب! سب خیریت ہے۔۔۔''
وہ خاموش ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنا مدّعا کیسے بیان کریں جبکہ صابر صاحب منتظر نگاہوں سے ان کی شکل دیکھ رہے تھے۔
''آپ سے ایک اجازت لینی تھی مجھے۔۔۔''
''اجازت؟ کیسی اجازت؟''
''بھائی صاحب! آپ کو شاید میری بات غلط لگے مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ خوش نصیب کے ساتھ رویّہ ذرا بہتر کر لیں۔۔۔ پندرہ دن پہلے اس نے ماں کو کھویا ہے۔۔۔ بہن بھی چلی گئی ہے۔۔۔ اس بچی کی حالت اچھی نہیں ہے۔۔۔''
وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے لیکن صابر صاحب نے بات قطع کر دی۔۔۔
''عرفات۔۔۔ ایسی بات مت کرو جو میرے بس میں نہ ہو۔۔۔ اس لڑکی نے ہمارا بہت نقصان کیا ہے۔۔۔ شروع سے اس کے رویّے اور حرکتوں کو برداشت کرتے آئے ہیں لیکن اب سب میری برداشت سے باہر ہے۔۔۔ میرا بس چلے تو میں اسے بھی گھر سے نکال باہر کروں بس مرے ہوئے بھائی کا خیال آ جاتا ہے۔۔۔'' ان کے انداز زہر خند تھا۔
''بچی ہے بھائی صاحب۔۔۔''
''کاش وہ بچی ہی ہوتی عرفات۔۔۔ مگر مسئلہ یہی ہے کہ بچی نہیں رہی ہے وہ۔۔۔''
''آپ اسے گھر سے بھیجنا چاہتے ہیں۔۔۔؟''
''ہاں مگر بھیج نہیں سکتا۔۔۔ بھیجوں تو کہاں بھیجوں۔۔۔''
''بھائی صاحب! میں نے اسے اپنی بیٹی کہا ہے۔۔۔ آپ مجھے اجازت دیں۔۔۔ میں اسے اسلام آباد بھجوا دیتا ہوں۔۔۔''
''اسلام آباد میں کس کے پاس؟'' وہ حیران ہوئے تھے ان کی بات سے۔
''ہاسٹل میں۔۔۔ میں اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلوانا چاہتا ہوں۔۔۔'' وہ متانت سے بولے۔ ''ایک طرف آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا دوسرا مجھے امید ہے کہ اس ماحول سے نکل کر وہ بھی اچھا محسوس کرے گی۔۔۔

آپ بتائیں آپ کیا کہتے ہیں؟"
وہ منتظر نظروں سے ان کی شکل دیکھنے لگے۔
صابر صاحب چند لمحے سوچتے رہے تھے پھر سنجیدگی سے بولے۔
"دیکھو عرفات۔۔۔! میرا اب اس لڑکی سے کوئی واسطہ نہیں۔۔۔ تم اسے بیٹی کہتے ہو۔۔۔ شوق سے کہو۔۔۔ اسے اپنے پاس رکھو۔۔۔ مجھے اعتراض نہیں۔۔۔ تم اسے بھیجنا چاہتے ہو تو ضرور بھیجو۔۔۔ لیکن یہ سوچ لینا کہ اگر وہاں جاکر بھی اس کی حرکتیں ایسی ہی رہیں تو تم کیا کرو گے۔۔۔؟ جو لڑکی گھر کے لڑکوں کو نہیں بخشتی وہ باہر جاکر کیا کیا گل نہ کھلائے گی۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کریں گے۔
عرفات ماموں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی آنکھوں سے ناپسندیدگی ظاہر تھی۔ "آپ بے فکر رہیں بھائی صاحب! میں ذمہ داری لے رہا ہوں خوش نصیب کی۔۔۔ آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"
"ٹھیک ہے۔۔۔ جیسے تم مناسب سمجھو۔۔۔" انہوں نے عرفات کا کندھا تھپتھپایا تھا اور اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے تھے۔
عرفات خاموشی سے وہیں کھڑے رہے اور اندر کی طرف جاتے صابر صاحب کی پشت کو تکتے رہے۔
پھر انہوں نے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے ایک نمبر ڈائل کیا تھا اور باہر کی جانب قدم بڑھائے تھے۔
چند لمحوں کے انتظار کے بعد دوسری طرف سے فون اٹھالیا گیا تھا۔
"ہیلو۔۔۔"
"ہاں بھئی مجنوں۔۔۔ کیا حال ہے؟"
"دعائیں ہیں لیلیٰ کی۔۔۔" آگے سے جواب آیا تھا۔
"لیلیٰ کا رو رو کر برا حال ہے۔۔۔" انہوں نے بتانا مناسب سمجھا۔ "اور لیلیٰ کی متوقع ساس کا بھی۔۔۔"
"دونوں کو سمجھائیں۔۔۔"
"کیف! میری مانو۔ گھر واپس آؤ اور ماں باپ سے معافی مانگ لو۔۔۔ باقی مسئلہ بھی سلجھ جائے گا۔" انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
"آپ جانتے ہیں' ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔۔۔ ابا ضد کے پکے ہیں۔ وہ معافی بھی اسی شرط پر دیں گے کہ صیام سے شادی کرلوں۔"
عرفات ماموں خاموش رہے۔۔۔
"خوش نصیب کیسی ہے؟ اسے سمجھائیں کہ خود کو سنبھالے۔۔۔ اللہ کی مرضی کے آگے کس کی چلتی ہے۔" اس کا لہجہ تاسف زدہ تھا۔
"سمجھاتا ہوں یار۔۔۔! مگر ابھی اس کی حالت نہیں سمجھنے والی۔۔۔ خیر میں نے صابر بھائی سے بات کرلی ہے۔۔۔ تم اس کا یونیورسٹی میں ایڈمیشن کا انتظام کرو۔۔۔ میں جلد از جلد اسے اس ماحول سے باہر نکالنا چاہتا ہوں ورنہ یہ سب اسے طعنے دے دے کر ماردیں گے۔"
"آپ بے فکر رہیں۔۔۔ مجھے بس ضروری کاغذات بھجوادیں۔ باقی سب میں دیکھ لوں گا۔"
"ہاں ٹھیک ہے' وہ میں بھجوادیتا ہوں۔۔۔ چلو میں بند کرتا ہوں فون۔ تم ذرا غور کرو' واپس آنے والی بات پر۔۔۔"
"ٹھیک ہے ماموں۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔"
"اپنا خیال رکھنا کیف۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔"

اپنے پورشن میں داخل ہونے سے پہلے وہ فون بند کر چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

تین سال بعد۔۔۔

☆ ☆ ☆

''واؤ۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔ یہ ٹوپی کتنا کیوٹ ہے۔۔۔ ہم پلیز یہ ایک لے لیتے ہیں۔۔۔ دیکھو کتنا پیارا ہے نا یہ۔۔۔'' اس دراز قد آدمی نے اپنے ساتھ موجود لڑکی کے آگے ایک ٹوپی کرتے ہوئے کہا تھا۔

اس لڑکی نے خفگی سے اس آدمی کو دیکھا اور ٹوپی کو اس کے ہاتھ سے لے کر واپس رکھ دیا۔''ہم یہاں کن چیزوں کی شاپنگ کے لیے آئے تھے معاویہ۔۔۔؟''منفرا نے اسے ٹوکا تھا۔

جی ہاں۔۔۔ وہ جو سامنے ایک پیارا سا جوڑا شاپنگ کرتا نظر آرہا تھا۔ وہ معاویہ اور منفرا ہی تھے۔ کتنے مکمل لگ رہے تھے ایک ساتھ کھڑے۔۔۔

معاویہ نے ٹرالی پکڑ رکھی تھی تو منفرا پرام کو گھسیٹ رہی تھی جس میں دو بے حد پیارے بچے محوِ خواب تھے۔

معاویہ نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا تھا۔ اس نے سارے زمانے سے اپنی خوشیاں چرالی تھیں۔ اپنے کہے کے عین مطابق اس کی شادی فلک بوس میں ہی ہوئی تھی اور فلک بوس کا بھوت اس بار اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکا تھا۔

اور اب وہ دونوں ایک ساتھ تھے۔۔۔

وہ دونوں ساتھ کھڑے اس قدر مکمل لگتے تھے کہ جو بھی دیکھتا دل ہی دل میں سراہے بنا نہ رہ پاتا۔

دو ماہ پہلے ہی اللہ نے ان پر کرم کرتے ہوئے انہیں جڑواں بچوں سے نوازا تھا۔ اور اب وہ دونوں شاپنگ مال میں کھڑے بحث کر رہے تھے۔

موضوع یہ تھا کہ معاویہ ہر دوسرے سوفٹ ٹوائے کو ہاتھ میں لے کر اس کی تعریف کرتا اور خریدنے کی کوشش کرتا جب کہ منفرا اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی کہ ان سوفٹ ٹوائے سے بچوں کو کھلانے کے لیے اسے کم از کم دو سال انتظار کرنا ہوگا۔ وہ اپنے بچوں کے لیے دنیا کی ہر خوشی ہر آسائش خرید لینا چاہتا تھا۔

''ہم یہاں کن چیزوں کی شاپنگ کے لیے آئے تھے معاویہ۔۔۔؟''منفرا نے اسے ٹوکا تھا۔

''ایک سوفٹ ٹوائے سے کیا ہو جائے گا منفرا۔۔۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔''دیکھو یہ کتنا پیارا ہے۔۔۔''

''معاویہ یہ آٹھواں ٹوائے ہے جو تم صرف اس لیے لینا چاہتے ہو کہ یہ کیوٹ ہے۔۔۔ بس اب اور بالکل نہیں۔۔۔''

معاویہ نے اس طرح منہ لٹکا لیا جیسے یہ سوفٹ ٹوائے وہ خود اپنے لیے لینا چاہتا تھا۔

''چلو نا۔۔۔''منفرا نے معاویہ کا بازو پکڑا اور اسے کھینچنے لگی۔

وہ بھی ہنس دیا اور آگے بڑھا۔۔۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتے، ایک نسوانی ہاتھ آگے آیا تھا اور اس نے معاویہ کی جیکٹ کے کالر کو پکڑ کر اسے پیچھے گھسیٹنے کی کوشش کی تھی۔

''تم۔۔۔ تم معاویہ ہو نا؟ معاویہ اردشیر ازی؟''

وہ ایک سیلز گرل تھی جس نے نقاب کر رکھا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس کا لہجہ ہیجان خیزی سے لبریز تھا اور اس کی پھولی ہوئی سانسیں گواہی دیتی تھیں کہ وہ بھاگتی ہوئی معاویہ کے پاس آئی ہے۔ منفرا اور معاویہ الجھی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



راشدہ رفعت

سکندر کا مقدر

محض نام رکھ لینے سے ہر سکندر، مقدر کا سکندر نہیں بن جاتا۔ اس دنیا کا ہر سکندر الگ مقدر لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جس سکندر کا یہاں ذکر ہے وہ یونان جیسی عظیم الشان سلطنت کے بجائے مملکت خداداد کے ملتان شہر میں پیدا ہوا۔ یونان سے اس کا تعلق محض اتنا تھا کہ اس کے دادا ایک یونانی دواخانے میں ملازم تھے۔ دادا کی رحلت کے بعد یونان سے یہ تھوڑا سا تعلق بھی اپنی موت آپ مر گیا۔

پانچ بہنوں کی پیدائش کے بعد سکندر نے دنیا میں آنکھ کھولی تو ماں، باپ خوشی سے نہال ہو گئے۔ ابا کا نام

اعظم تھا انہوں نے اکلوتے بیٹے کا نام سکندر رکھ دیا یوں پیدائشی سرٹیفکیٹ پر اس کا نام سکندر اعظم ولد محمد اعظم درج ہو گیا۔ پڑوس میں بسنے والے ماسٹر جی ابا کو بیٹے کی مبارکباد دینے گھر تشریف لائے تو ساتھ مفت مشورے سے بھی نواز دیا۔

"اعظم بھائی! اگر بیٹے کے نام کے ساتھ اضافت لگا دیں تو نام مزید بامعنی اور خوب صورت ہو جائے گا۔ سکندر اعظم کا صوتی تاثر وہ نہیں پڑتا جو سکندرِ اعظم کا پڑتا ہے۔" ابا اس مشورے پر کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

"ماسٹر جی، مجھے بتائیں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ یہ تو چھوٹی سی بات سوچتے ہوئے بھی گھنٹوں لگا دیتے ہیں۔ یہ موئی اضافت کس بلا کا نام ہے۔" اماں گفتگو میں از خود شامل ہو گئیں۔

ماسٹر جی نے مزید تشریح کر کے بتا دیا کہ سکندر نام کے نیچے چھوٹی سی زیر لگانے سے نام بہت بھاری بھرکم اور خوب صورت ہو جائے گا۔

"بالکل ٹھیک ماسٹر جی۔ میرا بیٹا آج سے سکندرِ اعظم ہی کہلائے گا۔" اماں کو مشورہ بہت پسند آیا تھا۔ فوراً ہی تجویز کی تائید کی۔

"لیکن نیک بخت ....." ابا مشورہ ماننے میں کچھ متذبذب تھے انہوں نے اہلیہ کو کچھ سمجھانا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں سکندر کے ابا۔ میرا بیٹا ہے۔ میں اس کے نام کے ساتھ چھوٹی زیر لگاؤں یا الٹا پیش تمہارا اعتراض کرنا بنتا نہیں ہے۔" اماں نے ابا کو قطعیت سے باور کروایا۔

پانچ بیٹیوں کے بعد بیٹے کی ماں بننے کے ساتھ ہی ان کے مزاج میں عجیب سا طنطنہ آ گیا تھا۔ وہ اعتراض جو ابا کر ہی نہ پائے تھے، انہوں نے خوشدلی سے واپس بھی لے لیا۔

سکندرِ اعظم ماں، باپ کا پیارا تھا تو بہنوں کا راج دلارا۔ ماں، بہنیں اسے خوب بنا سنوار کر رکھتیں تو سرخ و سپید رنگت والے اس گول مٹول سے بچے پر راہ چلتوں کو بھی پیار آ جاتا۔ وہ ڈھائی برس کا تھا کہ اماں کی لاڈلی ترین چھوٹی بہن کے ہاں بھی سنہری رنگت والی بہت پیاری سی صحت مند بچی نے جنم لیا۔

"بس نجمہ میں نے کہہ دیا، یہ گڑیا میرے سکندر کی ہی دلہن بنے گی۔" اماں نے بھانجی کے چٹاچٹ گال چومتے ہوئے اعلان کیا۔ نہ صرف اعلان کیا بلکہ اسی وقت مٹھائی منگوا کر ہسپتال کے وارڈ میں بھی تقسیم کرا دی۔ نجمہ خالہ اور شہاب خالو مسکراتے رہے۔ ان کی بچی کو پیدا ہوتے کے ساتھ ہی ایسا اچھا "بر" مل گیا تھا، وہ کاہے کو انکار یا اعتراض کرتے مگر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ وہ گول مٹول صحت مند سی بچی جو پیدائش کے وقت بالکل صحت مند تھی "نمونیا" میں مبتلا ہو کر چار دن کے اندر اندر چل بسی۔ اگلے برس اللہ نے خالہ خالو کو ایک اور رحمت سے نواز دیا تھا۔ یہ بچی اپنی مرحومہ بہن سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ اماں اس بار بھی بھانجی کو گود میں لے کر جذباتی ہو گئیں۔

"بھئی نجمہ، ہماری پہلی بیٹی تو بہت کم عمر لکھوا کر لائی تھی لیکن میں کہے دے رہی ہوں، یہ ننھی پری میرے سکندر کے مقدر ہی کی ہے۔" اماں نے نومولود بھانجی کو چوم کر اعلان کیا۔ خالہ، خالو نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں اماں کا بہت احترام کرتے تھے۔ نجمہ خالہ کو سکندر بھی بہت پیارا تھا۔ لیکن اب معاملہ اپنی سگی اولاد کا تھا جس کے آگے دوسری محبتیں ہیچ پڑ گئی تھیں۔ خالہ نے بہت رسانیت سے اماں کو مخاطب کیا۔

"آپا! فی الحال یہ ذکر رہنے دیں۔ اللہ میری بچی کو

سجا دیں۔ اس بار قرعہ فال منجھلے ماموں کی زویا کے نام نکلا۔ من موہنی سی زویا کا سکندر کے ساتھ کیا خوب جوڑ تھا۔ ماموں ممانی نے بھی فوراً سکندر کے رشتے کو سند قبولیت بخش دی۔ ایک بار پھر رشتہ داروں کو مٹھائیاں بھجوا دی گئیں۔ اب کی بار منگنی تین مہینے تک چلی تھی۔ ٹوٹنے کی وجہ کچھ یوں بنی کہ منجھلے ماموں اور چھوٹے ماموں نے پارٹنرشپ کی بنیاد پر مشترکہ کاروبار شروع کیا۔ کچھ عرصے بعد منجھلے ماموں کو علم ہوا

کہ چھوٹا بھائی کاروبار میں ہیر پھیر کر رہا ہے۔ معمولی سا جھگڑا بڑھ کر سنگین نوعیت اختیار کر گیا۔ ساجھے کے کاروبار کی ہانڈی عین چوراہے پر پھوٹی سو پھوٹی، سگے بھائی ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ رہے۔ رشتہ داروں میں بھی کچھ لوگ فریق اول کو حق بجانب قرار دیتے تھے تو کچھ فریق ثانی کے حامی تھے۔ منجھلے ماموں اماں' ابا کو بھی اپنے حامی کیمپ میں دیکھنا چاہتے تھے جب انہیں پتا چلا کہ بہن کے ہاں چھوٹے بھائی کی بھی آمدورفت جاری و ساری ہے تو وہ اماں سے سخت خفا ہوئے۔

"آپا! آپ فیصلہ کرلیں چھوٹے سے تعلق رکھنا ہے یا میرے ساتھ۔" وہ تن فن کرتے اماں سے مخاطب تھے۔ اماں کو ان کے انداز پر تاؤ چڑھ گیا۔

"تم دونوں میرے ماں جائے ہو۔ میں ایک کے پیچھے دوسرے سے تعلق نہیں توڑ سکتی۔ اپنے اختلافات کے بیچ مجھے مت گھسیٹو۔"

"ٹھیک ہے آپا! اگر آپ چھوٹے سے تعلق نہیں توڑنا چاہتیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا' ہاں میری طرف سے زویا کے رشتے کے لیے انکار ہے۔" سدا کے جذباتی منجھلے ماموں "آناً" فاناً" نسبت توڑنے کا اعلان کر گئے۔

بھائی کی بدلحاظی پر اماں کا صدمے سے برا حال تھا لیکن انہیں اصل صدمہ اپنے سکندر کے مقدر کو سوچ کر پہنچا تھا۔ کیا مقدر پایا تھا ان کے بیٹے نے کوئی کمی یا خامی نہ ہوتے ہوئے بھی آج تیسری بار اس کی نسبت ٹوٹی تھی۔ تیسری نسبت ٹوٹنے کے ساتھ ہی انہیں اس کی پچھلی دو نسبتیں ٹوٹنے کا خیال آیا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کا ملال بھی بڑھتا گیا اور تشویش بھی۔

منجھلے' چھوٹے ماموں میں آٹھ مہینے بعد معافی تلافی کے بعد صلح صفائی ہو گئی لیکن اس عرصے میں زویا کا رشتہ کہیں اور طے پا گیا تھا اور اس دوسرے شخص کا نصیب سکندر کی طرح ماٹھا تھوڑی تھا کہ اس کی منگنی ٹوٹتی' زویا اسی کے سنگ رخصت ہوئی تھی۔

✿ ✿ ✿

چوتھی بار اماں نے بہت دیکھ بھال کر کے سکندر کا رشتہ جوڑا تھا۔ اس بار رشتہ داروں پر اعتبار کرنے کے بجائے محلے دار گھرانے کو ترجیح دی تھی۔ فاخرہ کے گھر والوں نے خوشی خوشی سکندر کا رشتہ قبول کیا تھا۔ خوبرو' پڑھے لکھے' شریف النفس اور برسرروزگار لڑکے کے رشتے کو وہ کیونکر ٹھکراتے لیکن بات پکی ہونے کے بعد ان کی برادری والوں نے غیر برادری میں رشتہ جوڑنے پر ان سے قطع تعلق کر لیا۔ فاخرہ کی بہنیں تایا' چچا کے بیٹوں سے بیاہی گئی تھیں۔ ان کے سسرال والوں نے ہی زیادہ فتور مچایا یوں برادری والوں کی بلیک میلنگ کے آگے فاخرہ کے گھر والوں کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور یہ رشتہ بھی اپنے انجام کو پہنچا۔

"سکندر کے ابا! اللہ جانے میرے سکندر کے مقدر میں کیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے میں اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی حسرت لیے ہی دنیا سے گزر جاؤں گی۔" اماں اٹھتے بیٹھتے سرد آہیں بھر کر یہ ہی فقرہ دہراتیں۔

"حوصلہ کر نیک بخت! جو بیٹے کے مقدر میں ہے اسے مل کر رہے گا۔" ابا بیوی کو تسلی دیتے۔

"آپ کو تو ڈھنگ کی تسلی بھی نہ دینی آئی سکندر کے ابا! کم از کم یوں ہی کہہ دیتے کہ جو اس کے مقدر میں ہے وہ مل کر رہے گی۔ اللہ ہی جانے اس کے مقدر میں کچھ ہے بھی یا نہیں۔" اماں کی مایوسی عروج پر تھی۔

اس بار بھائی کا رشتہ کروانے کے لیے بہنیں میدان عمل میں آئیں۔ رشتہ کروانے والی آنٹی کی خدمت صحت و سلامتی دے۔ یہ باتیں طے کرنے کے لیے بہتیری عمر پڑی ہے۔"

خالہ کے اس بالواسطہ انکار پر اماں کا چہرہ اُتر گیا تھا لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جب وہ اپنے سکندر کے مقدر کے حوالے سے کسی قسم کی تشویش میں مبتلا ہوتیں۔ تشویش میں تو وہ جب بھی مبتلا نہ ہوئیں جب سولہ برس کی عمر میں سکندر کی دوسری بار نسبت

ٹھہرنے کے ساتھ ہی ٹوٹ بھی گئی۔ اماں کی بڑی نند یعنی سکندر کی پھوپھو کئی سالوں بعد ملائشیا سے پاکستان لوٹیں تو ان کی تیرہ سالہ چینی گڑیا جیسی بیٹی اماں کے من کو بھا گئی۔ نندوں سے ان کے مثالی تعلقات تھے اور شمسہ آپا تو چونکہ عرصہ دراز سے بیرون ملک مقیم تھیں تو ان کے ساتھ تعلقات سدا مثالی ہی رہے تھے اور کبھی کسی اتار چڑھاؤ کا شکار تک نہ ہوئے تھے۔ بہت مان سے انہوں نے بڑی نند کے سامنے اپنے سکندر کا رشتہ پیش کیا تھا۔

"آپا! آپ ملائشیا واپس جاؤ گی تو پاکستان سات سال سے پہلے تو آپ کا چکر لگنے کا نہیں۔ اگر آپ اور بھائی صاحب اجازت دو تو سونیا کی انگلی میں اپنے سکندر کے نام کی انگوٹھی پہنا دوں۔ وقت گزرتے کوئی دیر تھوڑی لگتی ہے مناسب وقت آنے پر شادی کے فریضے سے نمٹ لیں گے۔"

"سن رہے ہیں فرقان صاحب، یہ نگہت کیا کہہ رہی ہے۔" پھوپھو نے مسکرا کر شوہر کو متوجہ کیا۔

"بھئی شمسہ! تم سونیا کی ماں ہو۔ میری طرف سے اولاد کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار تمہارے پاس ہی ہے۔ اپنی بھاوج کو جو چاہے جواب دو۔" فرقان پھوپھا نے بشاشت سے مسکراتے ہوئے بیوی کو ایک طرح کا گرین سگنل دے دیا۔

"ہاں تو ٹھیک ہے پھر، مجھے اپنے بھتیجے سے پیارا کوئی اور تھوڑی ہو سکتا ہے۔" پھوپھو مسکرائیں۔

اماں ان کے اقرار پر نہال ہو گئیں۔ طے یہ پایا کہ منگنی چند دن بعد دھوم دھام سے ہو گی لیکن اماں نے قریبی رشتہ داروں کے ہاں سکندر کی بات پکی ہونے کی

مٹھائی فوراً" بھجوا دی۔ میٹرک کے رزلٹ کا منتظر سکندر اتنی چھوٹی عمر میں بات پکی ہونے کے سبب شرم کے مارے گھر والوں سے بھی منہ چھپاتا رہا۔ پھوپھو میانوالی اپنے سسرال سدھاریں تو اماں نے منگنی کی تیاری شروع کر دی۔ میانوالی جا کر ہی سونیا کو انگوٹھی پہنانے کا پروگرام تھا لیکن چار دن بعد اماں کے

سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ میانوالی سے پھوپھو کا معذرت بھرا فون آ گیا۔

"دیکھو نگہت! برا مت ماننا۔ یہاں فرقان کے بڑے بھائی نے سونیا اور سبحان دونوں کے لیے اپنے بچوں کے رشتے پیش کر دیے ہیں۔ میں تو وٹے سٹے کے خلاف ہوں لیکن فرقان راضی ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی ان کی بھتیجی ایم بی بی ایس کر رہی ہے اور میرے سبحان کا تو تمہیں علم ہے کتنا لاابالی سا ہے اسے ڈاکٹر بیوی مل جائے گی تو اس کی لائف سیٹ ہو جائے گی۔ یہ ہی سوچ کر میں سونیا کا بھی جیٹھ کے ہاں رشتہ کرنے پر راضی ہو گئی ہوں۔" پھوپھو نے رسانیت سے اماں کو ساری بات سمجھائی۔

"لیکن آپا میں نے تو جیولر کو انگوٹھی کا آرڈر تک دے دیا۔" اماں صدمے سے چور لہجے میں بولیں۔

"تو آرڈر کینسل کر دو۔ ابھی کون سی منگنی ہوئی تھی۔ زبانی بات چیت ہی تو تھی۔" پھوپھو اطمینان سے بولیں۔

اماں نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ نند سے مثالی تعلقات میں دراڑ پڑی سو پڑی' قرب و جوار میں بسنے والے رشتہ داروں کے سامنے الگ خفت اٹھانا پڑی' جن کو نسبت ٹھہرائے جانے کی مٹھائی بھجوا دی گئی تھی۔ اس خفت کے باوجود اماں اب بھی اپنے سکندر کے مقدر کے حوالے سے کسی قسم کی تشویش میں مبتلا نہ ہوئی تھیں۔ تشویش تو تب ہوئی جب سکندر کی تیسری بار بات ٹوٹی۔

اب سکندر بھرپور جوان تھا۔ بہنیں کب کی اپنے اپنے گھربار کی ہو چکی تھیں۔ ماں بہنوں کے دل میں ایک ہی ارمان دبا تھا کہ جلد از جلد سکندر کے سر پر سہرا

حاصل کر کے سکندر کے لیے رشتہ ڈھونڈا گیا۔ عروج پہلی نگاہ میں ہی اماں کے دل کو بھا گئی تو عروج کے گھر والوں نے بھی سکندر کو فوراً" پسند کر لیا۔ سکندر کے منع کرنے کے باوجود اس بار بہت دھوم دھام سے منگنی کی تقریب منعقد کی گئی۔ تقریب بخیر و خوبی نمٹی۔

شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ اماں کے خدشات سے دھڑکتے دل کو بھی قدرے قرار آگیا لیکن قرار آنے کے کچھ دن بعد شرمندہ شرمندہ سے عروج کے والدین بھی آگئے۔ وہ منگنی کا سامان لوٹانے آئے تھے۔ شرمندگی کے عالم میں انہوں نے انکشاف فرمایا کہ عروج اپنے کسی کلاس فیلو کو پسند کرتی ہے چھوٹی بہن کی مخبری کے نتیجے میں یہ بات پتا چلی کہ وہ گھر سے بھاگ کر کورٹ میرج کرنے کے چکر میں ہے۔ شریف مگر مجبور والدین نے مناسب جانا کہ رسوائی کا طوق گلے میں ڈالنے کے بجائے بیٹی کو عزت کے ساتھ اسی نکھٹو اور آوارہ لڑکے کے ساتھ رخصت کردیں جس کے ساتھ وہ کورٹ میرج کا پلان بنا چکی ہے۔ آگے ان کی کم عقل بیٹی کا نصیب۔

عروج کی ماں نے ہاتھ جوڑ کر اماں سے معافی مانگتے ہوئے صورت حال سے آگاہ کیا۔ اماں کو اب ان کی کم عقل بیٹی کے نصیب سے کیا غرض تھی' ان کا دماغ تو اپنے سکندر کے مقدر میں ہونے والے ہیر پھیر پر ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ اب انہیں واقعی لگنے لگا تھا کہ وہ سکندر کا مقدر کھلنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جائیں گی۔ سکندر ماں کی حالت دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتا تو دوسری طرف یار دوستوں نے باقاعدہ مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ سکندر کو دیکھتے کے ساتھ ہی وہ میرے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پر برس گئیں۔" گنگنانے لگتے۔



وہ دوستوں کی چھیڑ چھاڑ تو نظر انداز کر دیتا لیکن ماں کی ٹینشن اور ڈپریشن سے کس طرح نگاہیں چراتا۔ اماں ڈپریشن کی مریضہ بن کر رہ گئی تھیں۔ سکندر کو دیکھ

دیکھ کر اٹھتے بیٹھتے سرد آہیں بھرتیں اور جب قرب و جوار سے کسی شادی کا کارڈ آتا تو اماں کا ڈپریشن سوا ہو جاتا۔

یہ شادیوں کا سیزن تھا۔ سکندر گھر میں شادی کارڈوں کا داخلہ کس طرح بند کرتا۔ کہیں نہ کہیں سے کسی شادی کا بلاوہ آ ہی جاتا۔ اس روز بھی اماں' ابا میں اسی بات پر جھڑپ ہو گئی۔ ابا کی فیکٹری کے مسجد کے پیش امام کی بیٹی کی شادی تھی۔ ابا خیر سے نمازی' پرہیز گار تھے۔ پیش امام صاحب سے ان کے اچھے تعلقات تھے اور عبدالغفور صاحب نے انہیں بیٹی کی شادی میں بمع اہل و عیال مدعو کیا تھا۔ ابا اہلیہ کو ساتھ لے جانا چاہ رہے تھے لیکن اماں ساتھ جانے پر راضی نہیں ہو رہی تھیں۔

"اس غریب نے بہت مان اور اصرار سے بلایا ہے نیک بخت! بہت بھلا مانس اور شریف بندہ ہے۔ ذرا سی دیر کو چلتے ہیں۔ میں تحفہ دے دوں گا۔ تم بچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دے دینا بس پھر لوٹ آئیں گے۔" ابا نے چوتھی بار اماں کو مخاطب کر کے یہ ہی بات دہرائی۔

"کہہ دیا نا میرے سر میں درد ہے۔ تحفہ اور دعائیں خود ہی دے کر آجائیں' مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں۔" اماں نے بیزاری سے جواب دیا۔

اس بار ابا کو بھی شدید تاؤ چڑھ گیا۔ اب انہوں نے اماں کے سر اور اس میں رہنے والے مستقل درد کی شان میں قصیدے پڑھنا شروع کر دیے۔ سکندر ابھی تھکا ہارا آفس سے لوٹا تھا۔ سیز فائر اسی کو کروانا پڑا۔

"چلیں ابا! میں آپ کو بائیک پر لے چلتا ہوں۔ کہاں رکشہ ٹیکسی میں دھکے کھائیں گے۔ اماں کو گھر پر آرام کرنے دیں۔" ابا بیوی کو قہر بار نگاہوں سے گھورتے ہوئے بیٹے کے ساتھ شادی میں شریک ہونے چل پڑے۔

درمیانے درجے کے شادی ہال میں بارات مقررہ وقت پر پہنچ گئی تھی۔ سکندر نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ فنکشن جلدی نمٹ جائے گا لیکن خوشگوار ماحول

میں بارات کا استقبال ہونے کے کچھ دیر بعد ہی ناخوشگوار صورت حال رونما ہو گئی۔ نکاح سے پہلے دولہا کی ماں نے سمدھن سے تصدیق کرنا مناسب سمجھا

کہ وعدے کے مطابق وہ سلامی میں دولہا کو موٹر سائیکل دے رہے ہیں نا۔ بیگم عبدالغفور نے بہت لجاجت سے سمدھن کو بتایا کہ پندرہ' بیس دن کے اندر موٹر سائیکل کی چابی داماد کو دے دی جائے گی فی الوقت موٹر سائیکل کا انتظام نہیں ہو سکا۔ اس وعدہ خلافی پر دولہے کی ماں نے غیظ و غضب کے عالم میں بولنا شروع کر دیا۔

"تم لوگوں نے پہلے ہی جہیز برائے نام دیا ہے۔ موٹر سائیکل کا وعدہ تھا' اس سے بھی مکر گئے۔ پہلے بتانے کی زحمت بھی نہیں کی۔ عین شادی والے دن ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا۔" دولہا کی ماں غصے سے آگ بگولا ہو رہی تھی۔ لڑکی والوں کے کسی رشتے دار نے اس لالچی پن پر انہیں شرم دلانا چاہی تو معاملہ مزید بگڑ گیا۔

عبدالغفور صاحب سراسیمہ حالت میں باراتیوں کو رام کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس باریش بزرگ کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر سکندر کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ ابا اور ان کے دوسرے کولیگز کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سب ہی بہت افسوس سے صورت حال کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ جب باراتیوں نے عبدالغفور صاحب کو زیادہ ہی ذلیل کرنا شروع کیا تو سکندر کی برداشت جواب دے گئی۔

"ابا! یہ لیں بائیک کی چابی۔ عبدالغفور صاحب کو دیں کہ یہ چابی ان لوگوں کے منہ پر ماریں اور نکاح کی کارروائی شروع کریں۔ میں عبدالغفور صاحب کی ذلت کا مزید تماشا نہیں دیکھ سکتا۔" سکندر نے ابھی کچھ دن پہلی خریدی گئی بائیک کی چابی ابا کو تھمائی۔

ابا صرف چند لمحوں کو متذبذب ہوئے لیکن پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

انہوں نے باراتیوں کے نرغے میں گھرے عبدالغفور کو چابی تھمائی۔ اور ان سے دھیرے سے کچھ کہا۔ عبدالغفور نے انتہائی ممنونیت سے ابا کو دیکھا' ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب کپکپا رہے تھے۔

یہ چابی انہوں نے اپنے سمدھی کی خدمت میں پیش کرنا چاہی لیکن اتنے ہنگامے کے بعد ان لوگوں کو اپنی یہ ہتک گوارا نہ تھی۔

"ہم کوئی موٹر سائیکل کے لالچی نہیں ہیں' غصہ ہمیں تمہاری وعدہ خلافی پر آیا ہے۔ اتنی بڑی سفید داڑھی رکھ کر تمہیں ہمارے ساتھ دھوکا کرتے شرم نہ آئی۔ یہ مانگے تانگے کی موٹر سائیکل ہمیں نہیں چاہیے۔ چلو بھئی چلو' واپس چلو بارات واپس جائے گی۔" وہ شاید صرف دھمکی دے رہے تھے۔ ان کا ارادہ مزید منت سماجت کروانے کا تھا۔

عبدالغفور صاحب اس مزید منت سماجت پر آمادہ بھی تھے لیکن ابا نے ان کا ہاتھ دبا کر انہیں مزید بولنے سے روکا۔۔۔۔ دفتر کے دوسرے ساتھی بھی اٹھ کر قریب آگئے۔

"بارات واپس جائے گی بھئی۔" سسر صاحب نے کوئی رد عمل نہ پا کر دوسری بڑھک لگائی۔ عبدالغفور صاحب تڑپ کر آگے بڑھے لیکن ابا نے اس بار بھی انہیں روک دیا۔

"ان کمینہ خصلت لوگوں میں بیٹی دے کر اپنی جان کو ہمیشہ کا روگ مت لگاؤ عبدالغفور! شکر کرو بیٹی کی جان چھوٹ رہی ہے۔ جانے دو انہیں۔" ابا کے ساتھ دوسروں نے بھی انہیں یہی سمجھایا۔

"کیسے جانے دوں اعظم بھائی! بیٹی کی بارات دہلیز سے لوٹ جائے تو بیٹی ہمیشہ کے لیے ماں باپ کی دہلیز پر ہی بیٹھی رہ جاتی ہے۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولے۔

"تمہاری بیٹی آج ہی رخصت ہو گی۔" ابا نے ان کا شانہ تھپکا پھر سکندر کے پاس آئے۔

"تمہاری ماں نے پانچ بار تمہاری بات پکی کرنے کی کوشش کی' معیار خوب صورتی کو رکھا۔ آج میں تمہاری بات پکی نہیں کر رہا۔ بلکہ ڈائریکٹ شادی کر رہا ہوں۔ اٹھارہ برسوں سے میں عبدالغفور کو جانتا ہوں۔ دین دار اور متقی شخص ہے۔ مالی حیثیت میں ہمارے ہم پلہ نہیں لیکن اولاد کو زیور تعلیم سے ضرور آراستہ کیا

ہے۔ بچی خوب صورت ہے یا نہیں میں نہیں جانتا مگر تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ ضرور ہے۔ فوری نکاح پر دل مانتا ہے تو اٹھو' آؤ میرے ساتھ۔" ابا نے بیٹے کو بھرپور سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

موٹر سائیکل کی چابی لیتے وقت جتنے لمحوں کا تذبذب ابا کے چہرے پر چھایا تھا' کم و بیش سکندر نے بھی سوچنے کا اتنا ہی وقت لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ نکاح کے بعد جب ابا اور سکندر نئی دلہن کو رخصت کروانے کے لیے کھڑے تھے اور ابا کسی دفتر کے ساتھی کو بھیج کر ٹیکسی منگوانے والے تھے تب ابا کے فیکٹری اونر کی بیوی اپنی بہو کے ساتھ ان کے پاس آئیں۔

بیگم جہانگیر بہت نیک نفس اور غریب پرور خاتون تھیں۔ فیکٹری ورکرز کی فلاح و بہبود کے لیے ہمہ وقت مستعد اور متحرک رہتیں۔ عبدالغفور صاحب چونکہ ان کے پوتے' پوتیوں کو ناظرہ پڑھانے روز ان کے بنگلے پر جاتے تھے' اس تعلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اور ان کی بہو آج کی تقریب کو رونق بخشنے آئی تھیں۔ وہ سارے واقعے کی عینی شاہد تھیں۔ وہ تو ہنگامہ شروع ہوتے ہی دولہا والوں کو خطیر رقم دے کر معاملہ رفع دفع کرنا چاہتی تھیں لیکن ان کی بہو نئی نسل کی نمائندہ تھی۔ اس نے ساس کو سمجھایا کہ ایسے بدطینت لوگوں سے رشتہ ٹوٹنا ہی بھلا۔

پھر سکندر کے ابا نے پہلے بائیک کی چابی اور پھر اپنا بیٹا پیش کر دیا تو ساس' بہو کی آنکھیں انسانیت کے اس مظاہرے پر نم ہو گئیں۔ بیگم صاحبہ نے فوراً" صاحب کو فون کیا اور ان کی اجازت پا کر ڈرائیور کو فون کیا۔ ان کی فیملی کے زیر تصرف درجنوں قیمتی گاڑیاں تھیں اور وہ اللہ کے فضل سے درجنوں قیمتی گاڑیاں کھڑے کھڑے خرید بھی سکتے تھے۔ ذرا سی دیر میں ڈرائیور ان کی ہدایت کے مطابق گاڑی لے کر آ گیا تھا اور اب وہ سکندر کے سر پر ہاتھ پھیر کر بہت اصرار سے اسے چابی تھما رہی تھیں۔ سکندر مسلسل انکاری تھا۔

"یہ ہماری طرف سے شادی کا تحفہ سمجھ کر قبول کرو بیٹے! تمہاری روشن پیشانی سے تمہاری خوش بختی کا اظہار ہو رہا ہے۔ اللہ یقیناً" تمہیں زندگی میں اتنا نوازے گا کہ تم اپنے بل پر اس سے بھی بڑی گاڑی خریدو گے لیکن ابھی انکار کر کے ہمارا مان مت توڑو۔"

وہ شفقت بھرے انداز میں مصر تھیں۔

سکندر کو مزید انکار بدتہذیبی لگا۔ جس وقت بڑی سی چمچماتی گاڑی میں دلہن کو لے کر ابا اور سکندر گھر پہنچے تو اماں اب بھی سر پر دوپٹا لپیٹے لیٹی تھیں۔ ابا نے انہیں مختصر الفاظ میں ساری کتھا سنائی۔ اماں نے اپنے سر پر لپیٹا دوپٹا کھولا اور خود مسرت سے دلہن کا گھونگٹ اٹھایا۔ پورے گھر میں چاندنی سی پھیل گئی۔

سکندر بھی یہ حسین مکھڑا دیکھ کر زیر لب مسکرایا۔ آج اسے پتا چل گیا کہ اس کے نصیب کی بارشیں اوروں کی چھت پر کیوں برس گئی تھیں۔ اس کے مقدر میں بارشوں کے بجائے چاندنی لکھی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ مہ جبیں کو چاندنی کے نام سے ہی پکارا۔

مہ جبیں اتنی وفاشعار اور خدمت گزار بیوی اور بہو ثابت ہوئی کہ سب سکندر کے نصیب پر رشک کرتے۔ بعد کے برسوں میں بیگم صاحبہ کی پیش گوئی کے مطابق سکندر مزید ترقی کر کے بڑا افسر بن گیا تھا۔ بڑے شہر میں تبادلہ ہوا تو خاندان سمیت ہجرت بھی کر گیا لیکن ملتان شہر کے اندرون اس قدیم محلے کے باسی آج بھی سکندر کو یاد رکھے ہوئے ہیں اور اس کے مقدر پر آج بھی رشک کرتے ہیں۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل	فرینہ اعجاز
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

نعیمہ ناز

ادھوری



"ڈیڈ...." زائر اتنا ہیجان زدہ ہو رہا تھا کہ ڈیڈ کو مخاطب کرنے کے بعد اس کی آواز ہی نہیں نکلی۔ اسے یوں لگا کہ جیسے وہ ایک دم گونگا ہو گیا ہو۔

"کیا بات ہے زائر' ایوری تھنگ از آل رائٹ؟" عالم حسین چونکے۔

"نو...." یک لفظی جواب بھی بڑی مشکل سے اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"ٹھیک سے بتاؤ' شروع سے آخر تک' کیا بات ہے؟" وہ کچھ بے زار سے ہوئے۔ ان کا بیٹا کافی مچیور اور باشعور تھا' اس کا یہ بچگانہ سا رویہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔

"ممی شادی کر رہی ہیں۔" وہ بہت تیزی سے بولا۔ دریا کو کوزے میں سمیٹ دیا۔ پوری بات یہی تھی' شروع سے آخر تک کہ وہ....

"کیا؟" ایک لمحے کو تو وہ خود بھی گڑبڑا گئے تھے۔

"آر یو شیور؟" پہلا سوال ان کی زبان پہ یہی آیا تھا۔

خاموشی کا مطلب ہمیشہ ہاں نہیں ہوتا مگر اس وقت زائر کی خاموشی کا مطلب یہی تھا۔

"کوئی رے مور تو نہیں ہے؟" وہ اصل میں یہ سوال نہیں کرنا چاہ رہے تھے بلکہ زائر کو تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ یقیناً "یہ ایک افواہ ہے" مگر زائر نے ایسے ہی تو بات منہ سے نہیں نکالی تھی۔ جب شک کے سارے راستے مسدود ہو گئے اور یقین نے اپنے پنجے گاڑ کر اسے ڈسنا شروع کیا تب اس نے گھبرا کر باپ کو مدد کے لیے پکارا تھا۔

"کسی بھی قسم کے الزامات لگانے کے لیے' افواہ پھیلانے کے لیے پاکستان میں پالیٹکس اور شوبز فیورٹ شعبے ہیں۔ تمہاری ماں شوبز سے ہے۔ کس نے یونہی تو نہیں اڑادی؟" عالم حسین خود بھی بڑے بے یقین سے تھے یا پھر وہ یقین کرنا ہی نہیں چاہ رہے تھے۔

"کوئی رے مور نہیں ہے ڈیڈ' کسی نے کوئی بات نہیں اڑائی' ابھی میڈیا میں اسکینڈل آیا ہی نہیں' معاملہ گھر کے اندر ہے ابھی۔" زائر کراہا۔ اسے ڈیڈ کی

مکمل ناول



ہیزیٹیشن (تذبذب) بری لگ رہی تھی۔ آخر یقین کیوں نہیں کررہے وہ۔

"ہے کون وہ الو کا پٹھا؟" بالآخر وہ خود کو باور کرانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ اسی لیے اب یہ سوال آیا تھا۔

"یو ڈونٹ بلیو' (آپ کو یقین نہیں آئے گا) مجھے بھی نہیں آرہا۔" زائر نے جیسے سرگوشی سی کی تھی۔

"آجائے گا یار' بڑی ان بلیو ایبل ویمن ہے تمہاری ممی' کوئی بھی ہو سکتا ہے وہ' کوئی ایکٹر' منسٹر' ٹائر' ڈائریکٹر یا کوئی ڈفر' کون ہے؟"

"مائی فرینڈ۔"

"وہاٹ؟" ان کی سچ مچ سٹی گم ہوئی تھی۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس عورت کا' یہ خود بھی تماشا بنے گی اور میرے بچوں کو بھی بنوائے گی۔" وہ دہاڑے اور پھر تند و تیز لفظوں پہ مشتمل ان کی تقریر شروع ہوئی جو ان کی سابقہ بیوی کی شان میں تھی اور زائر اپنی ماں کی شان میں یہ تقریر سن رہا تھا۔



چھٹی بار کال آئی تو وہ بھنا گئی۔ غیر شناسا نمبر وہ عموماً کاٹ دیتی تھی۔ اٹینڈ نہیں کرتی تھی۔ ویسے تو وہ بہت سے شناسا نمبر بھی نظرانداز کر دیتی تھی' کال نہیں لیتی تھی۔ ایسے جان پہچان کے لوگ جو یا تو بورنگ ہوتے یا خود غرض یا وہ جن سے ہما صادق کا کوئی مفاد نہ اٹکا ہوتا' ایسے نمبرز اکثر اسکرین پر چمک چمک کر خود ہی بجھ جاتے پر یہ اجنبی نمبر خدا جانے کس کا تھا' مگر جس کا بھی تھا' کوئی بہت ڈھیٹ یا مستقل مزاج شخص تھا۔ آٹھویں بار پھر موبائل کی رنگ ٹون بجی تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"ہیلو۔" دانت کچکچا کے بڑا پتھر مار کہ ہیلو کہا تھا اس نے' دوسری طرف تھوڑی سی بھی عزت نفس رکھنے والا بندہ ہوتا تو بات کرنے سے پہلے سوچتا ضرور اور دوسری طرف یقیناً" ایسا ہی بندہ تھا' عزت نفس رکھنے والا' مگر ہما صادق سے بات کرنے میں اسے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی تھی۔

"یہ تم کیا کرتی پھر رہی ہو؟" بغیر کسی تمہید کے عالم حسین غرایا تھا۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ یہ آواز پہچان گئی تھی۔ یہ آواز' یہ انداز' اس کی اولین چاہت تھی' پھر دس برس اس شخص کے ساتھ گزارے تھے۔ علیحدگی ہوئی تو محبت کی خوشبو درمیان سے اڑ گئی مگر اس پر اثر منفرد آواز و انداز کا جادو جوں کا توں جسم و جاں میں کہیں نہاں تھا' تب ہی تو کئی سالوں بعد بھی اس آواز نے ہما صادق کے رگ و پے میں ایک لہر سی دوڑا دی تھی۔

"تم سے مطلب؟" لمحوں میں خود کو سنبھال کر وہ بھی جواباً" غرائی تھی۔ یہی تو سب سے بڑی خوبی تھی اس میں' بڑے سے بڑے بحران میں بھی لمحوں میں خود کو سنبھال لینا اور مخاطب کو اسی کے انداز میں پچھاڑنا۔

"مجھے مطلب ہے تب ہی پوچھ رہا ہوں۔"

"تم ہوتے کون ہو پوچھنے والے؟" اس سوال پر عالم حسین کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی تھی۔

"میں' ان دو بچوں کا باپ ہوں جو تمہارے پاس ہیں۔ جن کی فنانشلی ذمہ داری ایک عرصے سے نبھا رہا ہوں۔ جن سے دور رہتے ہوئے بھی باپ کا فرض ادا کیا ہے میں نے' میرے ان بچوں کو اپنی اسٹوپڈ حرکتوں کی وجہ سے ذلیل و رسوا نہیں کرو گی تم' سمجھیں۔" وہ حلق کے بل چلایا۔ عالم حسین کو سوچ سوچ کر طیش آرہا تھا' آخر یہ عورت اس طرح کی حرکت کر بھی کیسے سکتی ہے؟

"اپنی آواز اور لہجے پہ قابو رکھو عالم حسین' تمہاری بیوی نہیں ہوں میں جو یوں چیخ رہے ہو۔" ہما صادق کا طیش اس کے لب و لہجے سے واضح تھا۔

"تمہارا شادیاں کرنے کا شوق ابھی پورا نہیں ہوا۔" خود پہ قابو پا کر نئے انداز سے زبانی حملہ کیا۔

"تمہارا ہو گیا؟" پینترا بدل کر ہما نے بھی پرسکون لہجے میں سوال کیا تھا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو' میری دوسری بیوی کی ڈیتھ ہو گئی تھی اسی لیے۔۔۔" وہ اس اچانک وار پہ چیں بہ جبیں ہو گیا۔

"تمہاری دوسری بیوی مرگئی اس لیے تم نے تیسری شادی کرلی۔ میرے لیے بھی میرا دوسرا شوہر مرچکا ہے، میں کیوں نہیں کرسکتی تیسری شادی؟"

"شوق سے کرو شادی مگر تماشا تو نہ کرو۔ کچھ تو شرم کرو، خود سے آدھی عمر کا بچہ چوز کیا ہے تم نے لائف پارٹنر بنانے کے لیے؟" عالم حسین چیخ رہے تھے۔

"تمہاری معلومات ادھوری ہیں، مجھ سے آدھی عمر کا نہیں ہے وہ۔" ہما صادق نے اپنے اندر ابلتے آتش فشاں کو فی الحال اندر ہی رکھا اور پرسکون لہجے میں گویا ہوئی۔

"بائی دا وے تمہاری وہ نئی نویلی مصری بیوی اپنے فیس بک پروفائل کے مطابق چوبیس برس کی ہے، اب تم خود حساب لگالو، کس کا لائف پارٹنر اس سے آدھی عمر کا ہے۔"

"وہ چاہے سولہ برس کی ہو مگر کم از کم میری بیٹی کی سہیلی تو نہیں۔" عالم حسین نے ناک کے وار کیا۔

"وہ بھی پہلے میرا دوست تھا۔ میرے بیٹے کا دوست بعد میں بنا تھا۔" ہما نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تم نے ایک لمحے کے لیے یہ بھی سوچا کہ تمہاری اس شادی سے تمہارے بچوں پہ کیا اثر پڑے گا؟ پاکستان میں رہتی ہو تم یورپ میں نہیں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر میں یہ حرکت لندن میں آکر کر لیتی ہوں، وہاں تو اس طرح کی حرکتوں کی معافی ہے نا؟" ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی تھی وہ۔

"تم....." عالم حسین نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس عالم حسین، اب ایک لفظ اور نہیں۔" آتش فشاں پھٹ پڑا۔

"میں جب تمہاری بیوی تھی، تب بھی اپنی مرضی کی مالک تھی اور اب تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ تم مجھے ڈکٹیشن دو، آج تو اتنی بات سن لی ہے تمہاری۔ آئندہ مجھ سے رابطے کی کوشش مت کرنا، بہت برا ہوگا، سمجھے تم۔" لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ اس نے فون بند کیا تو اس کے اندر لاوا ابل رہا تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ گہرے گہرے سانس لے کر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر جسم تو تب پرسکون ہو جب ذہن میں سکون ہو۔ دل و دماغ میں اب بھی عالم حسین کی باتیں گونج رہی تھیں۔ یہ شخص قبر تک بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ منتشر ذہن لیے جھلا کر وہ گاڑی لے کر باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

یہ ایک سال خوردہ سی بلڈنگ تھی جس میں نیچے دکانیں بنی ہوئی تھیں اور تین منزلوں میں فلیٹس بنے ہوئے تھے۔ سب کچھ پرانے دور اور پرانے انداز کا تھا۔ باہر سے رنگ اڑی عمارت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے در و دیوار کو رنگ و روغن کا منہ دیکھے طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ تنگ و تاریک سیڑھیوں پہ بلب لگے تو تھے مگر شاید سارے خراب تھے تب ہی وہاں اندھیرے کا راج تھا۔

"توبہ توبہ اتنی خوفناک سیڑھیاں، مجھے تو دیکھ کر ہی ہول آرہا ہے۔" بصیرہ تقی نے اپنے مخصوص اتراتے ہوئے انداز میں بولتے ہوئے جھرجھری لی۔

"حد ہے، عمر ہو گئی مگر اس عورت کا پھوہڑپن ابھی تک وہی ہے۔" ہما صادق نے ناگواری سے اپنی ساتھی فنکارہ کو دیکھا۔ اس ڈرامے میں وہ دونوں دیورانی جٹھانی کے کردار کر رہی تھیں، جس کی شوٹنگ کے لیے دبیر مرزا نے اس عمارت کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے ایک فلیٹ میں ڈرامے کی کہانی کے حساب سے سیٹ لگایا گیا تھا۔ آج شوٹنگ کا پہلا روز تھا۔ اپنے کردار کے حساب سے گیٹ اپ کیے سارے کردار موجود تھے سوائے نئی نئی مقبول ہونے والی اداکارہ ساشا ابراہیم کے جو ہما صادق کی بیٹی کا کردار ادا کر رہی تھی، کچھ دیر پہلے اس نے کال کر کے بتایا تھا کہ وہ اگلے دس منٹ میں پہنچنے والی ہے، جس میں سے تقریباً پانچ منٹ تو گزر چکے تھے۔

"ہم لوگ اوپر چلتے ہیں، یہاں کیا کریں گے، ویسے ہی اتنی گرمی لگ رہی ہے۔" بصیرہ تقی ٹشو سے چہرہ تھپتھپاتے ہوئے ہما سے مخاطب تھی۔

"دبیر سے پوچھو' وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شاید شوٹنگ کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا۔ میں بھی اسی کے انتظار میں کھڑی ہوں یہاں۔" ہما صادق نے اسے جواب دیتے ہوئے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔

عمارت کے سامنے ایک وسیع خالی میدان تھا جہاں دوپہر کے اس وقت صرف دھوپ کا راج تھا۔ کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ میدان کے دوسری طرف رہائشی مکانات بنے ہوئے تھے۔ ہما کو یہ منظر کچھ جانا پہچانا سا محسوس ہو رہا تھا' وہیں کھڑے کھڑے وہ اس گزرے وقت میں پہنچ رہی تھی۔

"ہما...." کسی نے اسے آواز دی تھی۔ وہ اک دم چونک کر پیچھے پلٹی "خیریت' آپ یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہیں؟" دبیر اس کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔

"ہاں...." وہ ایک دم حال کی دنیا میں واپس آئی تھی۔

"سب لوگ اوپر چلے گئے ہیں۔" دبیر نے اسے اطلاع دی۔

"اچھا۔" ہما نے چونک کر سامنے دیکھا' کوئی بھی نہیں تھا۔

"اوپر چلیں۔" دبیر نے پیچھے ہٹ کر اسے چلنے کا اشارہ دیا۔

"تم سیڑھیوں پہ شوٹنگ کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے۔" ہما اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کل کروں گا۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو ایک چھوٹا سا کاریڈور تھا جس کے دونوں طرف چار چار فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ دو اور تین کمروں کے چھوٹے چھوٹے سے پرانے بوسیدہ فلیٹ' ان ہی میں سے ایک میں شوٹنگ تھی۔ کہانی کے مطابق فلیٹ کے دونوں کمروں میں سامان کی سیٹنگ ہو چکی تھی۔

ساشا ابراہیم بھی شوٹنگ پر پہنچ چکی تھی اور اوپر موجود تھی۔

تو کیا میں نیچے کھڑی اردگرد سے اتنی بے خبر ہو گئی تھی کہ مجھے کسی کے بھی آنے اور سب کے اوپر جانے کا علم ہی نہیں ہوا؟ ہما صادق تشویش میں مبتلا ہونے لگی مگر وہ بہت مضبوط اور گہری عورت تھی۔ اپنے اندرونی تاثرات اپنے اندر ہی چھپائے' دبیر سے سین ڈسکس کرنے لگی۔ سب کو سین سمجھانے کے بعد دبیر' ساشا کی طرف متوجہ ہوا۔

"ساشا بی بی! آپ سب سے پہلے منہ دھو کر آئیں' لوئر مڈل کلاس کی ایک غریب اور دکھی سی لڑکی گھر میں اتنا میک اپ کر کے نہیں رہتی۔"

"اتنا لائٹ میک اپ تو ہے' پتا بھی نہیں چلے گا اسکرین پر۔" ساشا نے منہ بنایا۔

"اسکرین پر اتنا لائٹ سا میک اپ بھی پتا چل جاتا ہے' چلو شاباش منہ دھو کر آؤ اور بلیو می تم بغیر میک اپ کے بھی انتہائی خوب صورت لگتی ہو۔" دبیر نے اپنے مخصوص انداز میں بولتے ہوئے کیمرہ مین کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"سچی تعریف ہے یا ایویں....؟" ساشا نے ٹیڑھی نظروں سے دبیر مرزا کو دیکھا۔

"میں' آپ سے فلرٹ تو کر نہیں رہا جو جھوٹی تعریف کروں گا' کم چہرے ایسے ہوتے ہیں جو بغیر میک اپ کے بھی اسکرین پر بے حد خوب صورت نظر آتے ہیں۔ آپ ان نایاب چہروں میں سے ایک ہو۔ ماضی میں ہما صادق بھی ایک ایسا ہی چہرہ تھا۔" دبیر اپنے مخصوص صاف گو لہجے میں بول رہا تھا جو اس کی شخصیت کا خاصا تھا۔

"ہما جی کی کیا بات ہے' یہ تو اب بھی اتنی ہی پیاری ہیں۔" ساشا نے مسکرا کر ہما صادق کو دیکھا۔

ساشا ابراہیم نئی نئی مشہور ہو رہی تھی' لہٰذا ابھی شہرت کا نشہ اس کے سر پر سوار نہیں ہوا تھا' نہ ہی اس بخار نے ابھی اس کے دماغ کو متاثر کیا تھا۔ سو وہ ابھی اپنے سینئرز کی عزت کرتی تھی اور صحافیوں سے بھی تمیز سے پیش آتی تھی۔ میڈیا میں وہ ایک بااخلاق اور ذہین ایکٹریس کی حیثیت سے معروف تھی۔

"سو نائس آف یو۔" ہما اسے دیکھ کر مسکرائی۔

ساشا اپنا میک اپ صاف کرنے لگی' ہما اور بصیرہ

دوسرے کمرے میں جا کر اپنا اسکرپٹ دہرا رہی تھیں جو انہیں سیٹ پر ہی دیا گیا تھا۔

"جب زندگی بار بار ہر ہر قدم پہ اپنا خراج وصول کرنے لگتی ہے تو پھر یہ بری لگنے لگتی ہے۔۔۔ تو پھر یہ بری لگنے لگتی ہے 'اتنی زیادہ کہ اس سے چھٹکارا پانے کو جی چاہتا ہے۔"

ہما 'بصیرہ کے ساتھ 'ڈائیلاگز کی پریکٹس کر رہی تھی۔ جب انہیں دوسرے کمرے سے کسی عورت کی آواز آئی۔ جو بول رہی تھی۔

"معاف کرنا بیٹا 'یہاں لوگوں کا آنا جانا اور سامان کی سیٹنگ دیکھی تو میں سمجھی کوئی نئی فیملی شفٹ ہوئی ہے اس لیے پوچھنے آئی تھی کہ کسی شے کی ضرورت تو نہیں 'یہاں آکر معلوم ہوا کہ شوٹنگ ہو رہی ہے کسی ڈرامے کی 'دخل اندازی کی معذرت چاہتی ہوں۔"

"یہ آواز؟" ہما صادق یوں چونکی تھی جیسے کسی گہری نیند سے اچانک بیدار ہوئی ہو۔ وہ پھر سے برسوں پیچھے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اسکرپٹ ہاتھ میں پکڑے پکڑے وہ دوسرے کمرے میں آئی جہاں سے اسے اس عورت کی آواز آئی تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے سے باہر جھانکا 'وہ عورت برابر والے فلیٹ کا دروازہ کھول رہی تھی۔ ہما باہر کاریڈور میں آگئی۔

"فرحت!" ہما نے آواز دی۔

وہ عورت جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے مڑی تھی اس کی آنکھوں اور چہرے پہ شدید حیرانی تھی۔

"ہما....."

دو قدم کا تو فاصلہ تھا دونوں کے درمیان 'وہ عورت اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے کی حیرانی مسکراہٹ میں بدل گئی۔

"تم یہاں کیسے؟" دونوں نے تقریباً" بیک وقت یہ سوال ایک دوسرے سے کیا تھا۔

"میں یہاں رہتی ہوں 'اس فلیٹ میں۔" فرحت نے اپنے پیچھے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "اور تم شوٹنگ کے لیے یہاں آئی ہو 'ہے نا!"

"ہاں۔" ہما مسکرائی۔

"اچھا۔" فرحت نے ایک گہری سانس لی' کچھ دیر کے لیے دونوں کے درمیان ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی میں ایک پرانی کہانی 'ایک پرانی زندگی اور ایک پرانا دور اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے جسے وہ دونوں چپ چاپ سن رہی تھیں۔

"میں شوٹنگ سے فارغ ہو کر تمہارے پاس آتی ہوں۔" ہمانے ہی بولنے میں پہل کی۔

"ٹھیک ہے 'میں انتظار کروں گی۔"



تھکی ہاری گھر واپس آئی تو سب سے پہلے شاور لیا' جسمانی طور پہ تو وہ فریش ہو گئی مگر ذہنی تھکن ابھی باقی تھی۔ موبائل اٹھا کر اس نے کال ملائی۔

"ہیلو۔" دبیر اس کی کال ہمیشہ پہلی گھنٹی پر ہی ریسیو کر لیتا تھا۔ ابتدا میں ہما کو بہت حیرت ہوتی تھی۔

"تم کیا موبائل ہاتھ میں لے کر ہی بیٹھے ہوتے ہو کہ بیل بجے اور فون اٹینڈ کرو۔" وہ حیرانی سے سوال کرتی۔

"بس کچھ یوں ہی سمجھ لیں۔" دبیر نے کبھی یہ راز بتایا نہیں 'ہنس کر ٹال جاتا اور اب ہما بھی اس بات کی عادی ہو چکی تھی کہ حیرانی ختم ہو گئی تھی۔

"ہیلو۔" ہمانے جوابی ہیلو کیا۔

"جی میم۔"

"دبیر 'تم نے زائر سے بات کی تھی ہماری ریلیشن شپ کے متعلق؟" بغیر کسی تمہید کے اس نے سوال کیا۔

"ہاں 'میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ میں اس کے متعلق زائر سے بات کرنے والا ہوں۔"

"میرا خیال تھا کہ تم شاید اتنی جلدی نہیں کرو گے بات کرنے میں 'کچھ وقت کے بعد۔"

"مجھے جلدی ہے 'اسی لیے میں نے بات کر لی 'آپ کیوں ڈلے کرنا چاہتی ہیں؟"

"مجھے کبھی کبھی خود بھی پتا نہیں چلتا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں یا کیا چاہ رہی ہوں۔" ہمانے سوچا پھر اپنی یہ سوچ اس نے دبیر سے بھی شیئر کر لی۔

"آپ کنفیوز ہو رہی ہیں۔ ایک بار فیصلہ کر کے اس پہ جم جائیں تاکہ یہ ہیزی ٹیشن نہ ہو۔" دبیر میں شاید سب سے بڑی خوبی یہی تھی وہ اسے نہ صرف بہت اچھی طرح سمجھنے لگا تھا بلکہ اس کی وہ الجھنیں بھی سمجھ جاتا تھا جو کبھی وہ خود بھی نہیں سمجھ پاتی تھی۔

"فیصلہ تو شاید میں نے کر لیا ہے۔"

"شاید" کے ساتھ کبھی کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔"

"مگر......"

"اگر مگر کے ساتھ بھی کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔"

"بات یہ ہے کہ میں اتنی جلدی اپنے بچوں کو فیس کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔" ہمانے سچ بولتے ہوئے اسے اصل حقیقت سے آگاہ کیا۔

"جب کسی کو تیرنا سکھاتے ہیں ناتو اسے اٹھا کر پانی میں پھینک دیتے ہیں 'کنارے پہ کھڑے کھڑے کوئی تیرنا نہیں سیکھ سکتا' میں نے آپ کو اٹھا کر پانی میں پھینک دیا ہے۔ اب آپ لہروں کا سامنا کریں 'ان کا مقابلہ کریں اور ساحل مراد تک پہنچ جائیں۔"

"دبیر!"

"اب خدا کے واسطے یہ مت کہیے گا کہ دبیر! ایک بار پھر سوچ لو۔ آپ سے وابستہ مجھے صرف محبت نظر آتی ہے مگر اس جملے سے سچ مچ نفرت محسوس ہونے لگی ہے۔" دبیر اپنے جذبات میں انتہا پسند تھا تو ان کے اظہار میں صاف گو۔

ہما دنگ رہ گئی۔ وہ اس وقت یہی تو کہنا چاہتی تھی۔

"میرے دل میں اتنی گہرائی تک کوئی نہیں اترا آج تک 'وہ بھی نہیں جو برسوں شریک سفر رہے۔" ہما آہستہ سے بولی۔

"آپ نے اپنے آپ کو اور اپنے دل کو بھول بھلیاں جو بنا رکھا ہے۔ دو چار قدم کے بعد ہی لوگ بھٹکنے لگتے ہیں۔"

"تم کیسے پہنچ گئے؟"

"محبت کی چابی سے ہر قفل کھل جاتا ہے۔"

"اس محبت کا دعوا تو اوروں نے بھی کیا تھا۔"

"فقط خوبیوں کو پسند کرنا محبت نہیں' وہ سودے بازی تھی۔ میں آپ کی خامیوں کو بھی ایسے ہی چاہتا ہوں جیسے خوبیوں کو۔"

"آج تک میرے منہ پہ کسی نے میری خامیوں کے متعلق نہیں جتایا۔" ہما مسکرادی۔

"اس لیے کہ لوگ عموماً" خامیوں کو برا سمجھتے ہیں' میں نہیں سمجھتا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ ہر انسان' دنیا کا ہر انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ کسی میں خوبیاں زیادہ ہوتی ہیں' کسی میں خامیاں اور کسی میں دونوں برابر' یہ ایک فطری شے ہے۔ اس سے نہ کوئی انکار کرسکتا ہے نہ اسے جھٹلا سکتا ہے۔"

"مجھ میں یہ تناسب کتنا ہے؟" ہما مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"آپ کو معلوم ہے۔"

"مگر میں تمہاری رائے جاننا چاہتی ہوں۔"

"نہ جانیں' آپ کو علم ہے کہ میں جھوٹی تعریف کسی کی بھی نہیں کرسکتا۔"

"معلوم ہے۔" وہ زور سے ہنس پڑی۔

"تم سے بات کرکے میری ساری ٹینشن دور ہو جاتی ہے۔" ہما نے اس سے کہا۔

"میرے ساتھ زندگی گزاریں گی تو باقی کی ٹینشن بھی دور ہوجائے گی۔"

"خوابوں کے بار بار ٹوٹنے سے ڈر لگتا ہے دبیر!" ہما صادق اک دم سنجیدہ ہوگئی۔ اس کی زندگی بھی تو ایسے ہی گزری تھی' ہنستے ہنستے اک دم سنجیدہ ہوجاتی تھی۔

"میں خود سے متعلق خوابوں کو نہ ٹوٹنے دوں گا نہ بکھرنے دوں گا۔ بلیو می۔" دبیر نے اتنے ہی یقین سے یہ الفاظ کہے تھے جتنا یقین ہما صادق کو اطمینان دلانے کے لیے کافی تھا۔

موبائل بند کرکے وہ کچھ دیر دبیر مرزا کے بارے میں سوچتی رہی پھر اس کے خیالات کی رو آج ہونے والی اس ملاقات کی طرف مڑگئی۔ جس نے اسے ماضی میں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں دہرانے لگی جب وہ شوٹنگ کے بعد فرحت کے فلیٹ میں داخل ہوئی۔

دو کمروں اور مختصر سے لاؤنج پر مشتمل چھوٹا سا تنگ و تاریک فلیٹ جس میں روشنی اور ہوا کا ذریعہ ایک پتلی سی گیلری تھی جسے ازراہ نوازش بالکنی کا نام دیا گیا تھا۔

"آؤ' یہاں آجاؤ' ادھر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

فرحت اس کے انتظار میں ہی بیٹھی تھی۔ اسے لے کر اسی گیلری نما بالکنی میں آگئی جہاں دیوار کے ساتھ دو موڑھے پڑے ہوئے تھے۔

"بیٹھو۔" ایک موڑھا فرحت نے اسے پیش کیا اور دوسرا خود سنبھال کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"شوٹنگ ختم ہوگئی؟"

"نہیں' میں اپنا سین شوٹ کرواکر آئی ہوں' باقی کے لیے میں نے دبیر سے کہہ دیا ہے' کل کمپلیٹ کرواؤں گی۔ اس وقت تو بس مجھے تم سے ملنے کی جلدی ہو رہی تھی۔" ہما بولتی جارہی تھی اور فرحت کا جائزہ لیتی جارہی تھی' اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ پی ٹی وی کے دور کی اس کی ساتھی فنکارہ' اس کی سہیلی و ہمراز بیس بائیس سال بعد اسے ملے گی تو یہاں' اس حال میں۔

"آنکھوں پہ یقین نہ آنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔" ہما' فرحت کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وقت نے شاید نہیں بلکہ یقیناً" اس چہرے کے ساتھ بڑی بے رحمی کا برتاؤ کیا تھا۔ اس کے صبیح چہرے پہ شام کا ملگجا پن اتر آیا تھا۔ آنکھوں کے ستارے مانند پڑ کر بجھ گئے تھے۔ بدن کا سونا پگھل کر بہہ گیا تھا اور بالوں میں چمکتے چاند کے تار مصنوعی رنگوں سے بے نیاز نظر آتے تھے۔

"تم کتنی تر و تازہ اور شاداب ہوا کرتی تھیں فرحت!" ہما صادق نے انتہائی صدمے سے یہ الفاظ کہے تھے۔

"ہاں' کبھی ہم بھی خوب صورت تھے۔" فرحت کی مسکراہٹ بڑی اداس تھی۔

"مگر تم تو اب بھی ویسی ہی ہو' وقت بڑی نرمی سے

چھو کر گزرا ہے۔ تمہیں" فرحت اپنی حسین مگر کملائی ہوئی آنکھوں سے ہما کو دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں سے جن میں کبھی بڑے بڑے خواب سجائے وہ پی ٹی وی کی خواب نگری میں داخل ہوئی تھی۔ ان دونوں کی آگے پیچھے ہی آمد ہوئی تھی زیادہ فرق نہیں تھا۔ اداکاری کا اعلا معیار اور پھر ہما صادق کو عالم حسین سے محبت ہو گئی تھی۔

وہ ریڈیو سے مشہور ہوا ' ٹی وی پہ آکر اور بھی کامیاب اور مشہور ہو گیا تھا۔ بے حد خوب صورت گمبھیر آواز اور منفرد لب و لہجے کا مالک ' انگریزی یوں بولتا جیسے۔۔ جیسے آکسفورڈ یا کیمبرج سے سیدھا یہیں آیا ہو ' انگلش میں خبریں پڑھتے پڑھتے وہ ڈراموں میں ہیرو آگیا اور پھر ہما صادق کی زندگی میں بھی۔ دونوں کی شادی ہو گئی اور پھر دو بچے بھی ' اسی عرصے میں ہما نے ڈراموں میں کام بہت کم کرتے کرتے بالآخر ختم ہی کر دیا تھا۔

اسی دوران فرحت پروین بھی شادی کر کے فرحت اظہار بن چکی تھی۔ پیا دیس سدھارنے کے بعد ٹی وی ڈراما ' اداکاری اور ان سے متعلق دوستیاں ' شناسائی سب سے ناتا چھوٹ گیا تھا۔ دونوں تقریباً" چار سال تک گہری دوستی کے دائرے میں رہیں ' شادی کے بعد دونوں اس دائرے سے نکل کر ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔

"تو یہ بائیس سال کیسے گزرے؟"

"پچھلے بائیس سال؟" ہما سوچ میں پڑ گئی۔

ویسے تو وہ خاصی حد تک پرائیویٹ پرسن کی حیثیت سے مشہور تھی ' اسے مغرور کہا جاتا کبھی خود پسند۔ وہ عموماً" صحافیوں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ انٹرویو نہیں دیتی تھی ' اس کی نجی زندگی کے متعلق افواہیں اڑتیں ' قیاس آرائیاں کی جاتیں ' جن میں سے کچھ باتیں کبھی سچ نکلتیں اور کچھ جھوٹ۔ اسے ذاتیات میں جھانکنے اور اس سے متعلق سوال کرنے والے صحافی ناپسند تھے مگر یہ تو فرحت اظہار تھی ' اس کی بہترین دوست ' ہمراز جس سے ملاقات نے اسے کیا کیا کچھ یاد دلا دیا تھا۔

"کتنے بچے ہیں تمہارے؟ بڑے ہو گئے ہوں گے۔" فرحت نے جواب کا زیادہ انتظار کرنا شاید مناسب نہیں سمجھا اس لیے اگلا سوال کر دیا۔

"ایک بیٹا ہے ایک بیٹی ' زائر عالم ایکٹر ہے اور سبوینہ عالم ڈریس ڈیزائنر ہے۔"

"اچھا ' اچھا۔۔۔ دراصل بہت عرصے سے شوبز کی دنیا سے لاعلم ہوں۔ کچھ خبر ہی نہیں کہ کون کیا کر رہا ہے۔" فرحت معذرت خواہانہ لہجے میں بول رہی تھی۔

ہما نے کوئی توجہ نہیں دی وہ اپنی دھن میں آگے بتا رہی تھی۔ "دونوں نے لندن سے ڈگری حاصل کی ہے۔ عالم نے اپنے بچوں کو بہت سپورٹ کیا ہے۔"

"عالم بھائی اچھے انسان تھے یقیناً" باپ بھی بہت اچھے رہے ہوں گے۔" فرحت تو ان دونوں کے درمیان سب کچھ تھی اس وقت ' رازدار بھی ہمراز بھی واسطہ بھی اور پل بھی۔ گزرے وقت کے سائے ان کے چہرے پہ لہرانے لگے۔ فرحت کی بات سن کر ہما کا چہرہ تن گیا۔ بالکنی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر ایک گہری سانس لے کر فرحت سے مخاطب ہوئی۔

"اپنی سناؤ ' تم یہاں تک کیسے پہنچیں ' مجھے سچ میں بڑی تکلیف ہو رہی ہے تمہیں اس برے حال میں دیکھ کر۔" ہما صادق اپنی فیلڈ میں بہت سے لوگوں سے بناوٹی باتیں کرتی تھی۔ رسمی ہمدردیاں اور دکھاوے کی اپنائیت جتاتی تھی مگر اس وقت اس نے جو کچھ کہا ' اس میں کوئی بناوٹ ' کوئی جھوٹ ' کوئی دکھاوا نہیں تھا۔ اندر سے سچ مچ اس کا دل دکھ رہا تھا اس کی خستہ حالی اور بے سرو سامانی کو دیکھ کر۔

"اتنے برے حال بھی نہیں ہیں ہمارے ' اللہ کا شکر ہے عزت کے ساتھ گزر رہی ہے۔"

"اور غربت کے ساتھ بھی۔" ہما نے کھلے دروازے سے کمرے کے اندر دیکھتے ہوئے سوچا ' جہاں ایک سنگل بیڈ بچھا ہوا تھا اور دیوار کے ساتھ ایک گدا کھڑا کر کے رکھا تھا۔ دوپٹ کی لوہے کی الماری اور دیوار میں لگے دو ریک ' جن میں کچھ کتابیں تھیں شاید

"جب میری شادی ہوئی تو حالات بہت اچھے تھے۔ اظہار کا اپنا الیکٹرونکس کا بزنس تھا۔ تین بچے ہوئے ہمارے' پہلی بیٹی پھر دو بیٹے' گھرداری اور بچوں میں الجھ کر اداکاری چھوڑ دی تھی پھر اظہار کو بھی شادی اور بچوں کے بعد میرا ڈراموں میں کام کرنا پسند نہیں تھا۔ سو شوبز کو بالکل ہی خیرباد کہہ دیا۔ شادی کی آٹھویں سالگرہ کے بعد اظہار کو زبردست فالج کا اٹیک ہوا۔ وہ چلنے پھرنے سے حتیٰ کہ بولنے تک سے معذور ہو گئے اور اسی حال میں دو سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی زندگی میں ہی ان کے بھائی بھتیجوں نے کاروبار پہ قبضہ کر لیا تھا۔ ہم کچھ نہیں کر سکے ان کے خلاف' جو کچھ جمع پونجی تھی' علاج معالجے میں خرچ ہو گئی۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔ خرچے بہت کم کرنے کے باوجود بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ گاڑی بکی' زیور بکا' میں ہمیشہ یہی سوچتی رہی کہ اظہار ٹھیک ہو جائیں گے' حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ اظہار کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور ہمارے حالات بھی۔" فرحت چند لمحوں کے لیے چپ ہوئی۔

"جب میری عدت ختم ہوئی تو پتا چلا کہ جس چھت کے نیچے ہم رہ رہے ہیں وہ بھی ہماری نہیں' میرے جیٹھ اور ان کے لڑکوں نے کاروبار کے بعد گھر پر بھی قبضہ کر لیا۔ جعلی کاغذات بنوا لیے کہ یہ گھر اظہار نے انہیں فروخت کر دیا تھا۔ بڑی بہن بے اولاد تھیں' انہوں نے مجھے اور میرے بچوں کو اپنے پروں میں سمیٹ لیا۔ یہ ان ہی کا فلیٹ ہے' اپنے انتقال سے پہلے سب بہن بھائیوں کی رضامندی سے میرے نام کر گئی تھیں۔"

ہما صادق یہ المیہ کہانی سن کر گنگ تھی۔ اس نے ڈراموں میں اس طرح کے المیہ کردار ادا کیے تھے مگر اس کی عزیز سہیلی اور اس کی زندگی ایک المیہ کردار بن کر رہ جائے گی' یہ تو کبھی ذہن کے کسی گوشے میں بھی نہیں آیا تھا۔

"مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے یہ سب سن کر۔" یہ رسمی اظہار نہیں تھا' فرحت کے لیے اس کے احساسات سچے اور خالص تھے خود فرحت کی طرح۔

"چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ تم نے کیسے سروائیو کیا؟"

"شوق شوق میں جو ایم۔ اے کیا تھا وہی کام آ گیا۔ کالج میں پڑھانے لگی تھی' آپا نے بہت ساتھ دیا۔ گزر ہی گیا وہ وقت بھی۔" فرحت نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"ٹی وی میں کیوں نہیں گئیں دوبارہ؟ تمہارے جیسی فن کارائیں تو بس اس وقت بھی چار چھ ہی تھیں' اب تو دو چار ہی رہ گئی ہیں۔" ہما نے اپنے مخصوص تیکھے لہجے میں سوال اور تبصرہ ایک ساتھ کیا۔

"اظہار نے اپنی زندگی میں ہی اس کام سے منع کر دیا تھا مجھے' ان کے بعد ان کی خواہش کے احترام میں دوبارہ ٹی۔ وی کا رخ نہیں کیا۔" فرحت دھیرے سے بولی۔

"اور وہاں سے بھی کبھی کسی نے نہیں پوچھا کہ فرحت پروین کہاں ہے' کس حال میں ہے؟"

"تم سے زیادہ کون جانتا ہے اس فیلڈ کی حقیقت' یاد اس کو رکھا جاتا ہے جو اپنی شکل دکھاتا رہے ورنہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔" فرحت نے بالکنی کی گرل سے ٹیک لگا لی۔

"بچے کیا کرتے ہیں؟" ہما نے موضوع بدلا۔

"بیٹی پڑھاتی ہے یونیورسٹی میں۔"

"گڈ' اور لڑکے؟"

"وہ کچھ نہیں کرتے' آرام کرتے ہیں۔" فرحت کی نگاہیں کسی غیر مرئی نکتے پہ جمی ہوئی تھیں۔

"اوہ۔ نکمے بیٹوں سے بڑھ کر اور کوئی عذاب نہیں ایک ماں کے لیے۔" ہما نے دل میں سوچا۔

"شرجیل اٹھارہ برس کا تھا جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں..." فرحت کی آواز حلق میں ہی پھنس گئی۔ تھوک نگل کر اس نے حلق صاف کیا اور ہما کی طرف دیکھے بغیر آگے بتانے لگی۔

"چھوٹا' عدیل پندرہ برس کا تھا' پتا چلا کہ اسے کینسر

ہو گیا ہے۔ دو سال بیماری سے لڑتا رہا پھر زندگی کی بازی ہار گیا ہم بھی ہمت ہار گئے۔ دونوں بیٹے کیا ختم ہوئے ہم دونوں ماں بیٹی بھی جیسے ختم ہو گئے۔" فرحت کی داستان بھی ختم ہو گئی تھی۔

ہما ساکت بیٹھی تھی زندگی میں کئی بار کئی لوگوں سے اظہار افسوس کیا تھا' کسی سے دلی' کسی سے رسمی۔ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اس کے پاس بہترین لفظوں کی کوئی کمی نہیں تھی مگر اس وقت تو اسے الفاظ مل ہی نہیں رہے تھے کچھ کہنے کے لیے۔ ذہن ایک دم خالی ہو گیا تھا۔ ہما نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور فرحت کی گود میں دھرے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

کبھی الفاظ گونگے ہو جاتے ہیں مگر لمس بولتا ہے۔



"غریب کے خواب کی کوئی وقعت نہیں ہوتی' کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ دیمک لگا دیتے ہیں' کھو کھلا کر دیتے ہیں اندر سے' مت دیکھو ایسے خواب۔" وہ چیخ پڑی۔

"یہ خواب تو میری زندگی ہے' اس کے بغیر میں مر جاؤں گی امی' میں مر جاؤں گی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"کٹ۔" دبیر چلایا۔

"امپریسو' ہمیشہ کی طرح۔" وہ ہما صادق سے مخاطب ہوا پھر وہ ساشا ابراہیم کی طرف بڑھا۔

"کمال کر دیا تم نے' بغیر گلیسرین کے اتنا اچھا شاٹ دیا۔" دبیر کے انداز میں ستائش تھی' تحسین تھی۔

"آپ نے کہا تھا نا کہ کردار کو خود پہ طاری کر لو' ڈوب جاؤ اس کے اندر' پھر آنسو بھی بے ساختہ نکلیں گے اور ہنسی بھی۔" ساشا نے اس کے الفاظ ہو بہو دہرائے۔

"گڈ' تم ایک اچھی اور ذہین پرفارمر ہو' اسی طرح چلتی رہو۔ بہت آگے تک جاؤ گی۔" دبیر مسکرایا۔

"ویسے حیرت ہے تمہیں میری نصیحت لفظ بہ لفظ یاد ہے۔"

"کچھ لفظ صرف یاد رکھنے کے لیے ہوتے ہیں بھولنے کے لیے نہیں اور کبھی کوئی انسان بھی۔" ساشا ابراہیم بول کر ٹھہری نہیں' آگے بڑھ گئی۔

ہما سب کچھ سن چکی تھی۔ بڑی مشکل سے خود پہ قابو پا کر اس نے بے تاثر چہرے کے ساتھ دبیر مرزا کو دیکھا۔ جو مسکرا کر کندھے اچکا کر آگے بڑھ گیا۔

اسی رات پی سی میں وہ دبیر مرزا کے ساتھ ڈنر کر رہی تھی۔

"ساشا ابراہیم کچھ زیادہ ہی متاثر ہو رہی ہے تم سے۔" زیتون کا ٹکڑا کانٹے میں پھنساتے ہوئے وہ منہ میں لے گئی۔

"ڈونٹ وری' میں تو نہیں ہو رہا نا۔" وہ مٹن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے نبرد آزما تھا۔

"امپریس ہوتے بھلا دیر کتنی لگتی ہے؟" ہما صادق کے لہجے میں بے نیازی تھی۔

"آپ بتائیں' آپ کو کتنا وقت لگا مجھ سے امپریس ہونے میں؟"

"کس نے کہا کہ میں تم سے امپریس ہوں؟" ہما نے مسکراہٹ دباتے ہوئے الٹا سوال کیا۔

"آپ کے اس "دلیں" نے جو میرے پرپوزل کے جواب میں کہا تھا۔" دبیر بڑے اطمینان سے کھا رہا تھا اور بے حد سکون سے باتیں کر رہا تھا۔

ہما صادق لاجواب ہو گئی۔ "تمہاری عمر کے لڑکوں کو عموماً ینگ لڑکیاں اٹریکٹ کرتی ہیں۔ تم کچھ ڈفرنٹ ہو' اچھی بھلی خوب صورت لڑکیاں تمہیں لائن دیتی ہیں' لفٹ کراتی ہیں اور تم اگنور کر دیتے ہو۔" ہما نے بڑی رغبت سے سلاد کھاتے ہوئے موضوع بدلا۔

"زیادہ تر خوب صورت لڑکیوں کے دماغ میں بھیجا نہیں ہوتا' ہوتا بھی ہے تو استعمال نہیں کرتیں۔ فیشن کپڑے' جوتے' میک اپ اور جیولری جیسی سطحی باتوں سے میں فوراً بور ہو جاتا ہوں۔ حسین اور ذہین کا کامبینیشن ذرا مشکل سے ہی ملتا ہے' جو حسین ہوتا ہے وہ ذہین نہیں ہوتا' جو ذہین ہوتا ہے وہ حسین نہیں ہوتا۔" دبیر نے خاصا تفصیلی جواب دیا تھا۔

"حسن پرست ہو؟" ہما نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"حسن کسے متاثر نہیں کرتا؟" دبیر نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کندھے اچکائے۔

"اگر حسن واقعی انسانوں اور اشیا کے بجائے دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے تو آپ کے معاملے میں میری آنکھیں بہت حسین ہیں۔ مجھے آپ آج بھی اتنی ہی خوب صورت اور پرکشش لگتی ہیں جتنی اس وقت لگتی تھیں جب میں بچپن اور لڑکپن میں آپ کے ڈرامے دیکھا کرتا تھا۔" دبیر بڑی لاپروائی کے ساتھ بول رہا تھا اور ہما اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"تم مجھے آپ کیوں کہتے ہو؟ اس لیے کہ میں تم سے بڑی ہوں۔" اس کا لہجہ بڑا عجیب سا تھا۔

"میں تو اپنے سے چھوٹوں کو بھی آپ کہتا ہوں' عادت ہے۔ بس رہی بات عمر کے فرق کی تو مجھے ایسی اسٹوپڈ باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" دبیر نے اس کی پلیٹ میں مٹن پیس ڈالے۔

"یہ بھی کھائیں بہت ٹیسٹی ہیں۔"

"ارے بس' میں کھا چکی ہوں کھانا اور یہ بھی چکھ لیے تھے بس اب اور نہیں۔" وہ بوکھلا گئی۔

وہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت محتاط تھی' پھر باقاعدگی سے ایکسرسائز' یہی وجہ ہے کہ وہ صرف خوب صورت اور پرکشش ہی نہیں بلکہ بہت فٹ بھی تھی۔ نوعمر لڑکیوں جیسے بے حد متناسب سراپے کی مالک۔

"ایک دو کھالیں' دس منٹ ایکسرسائز زیادہ کر لیجئے گا۔"

"بہت ضدی ہو دبیر۔" ہما نے ہتھیار ڈال دیے اور چھوٹا سا ایک ٹکڑا اٹھا کر کترنے لگی۔

"ضد ابھی کی ہی کہاں ہے؟" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

چند لمحے خاموشی چھائی رہی' دبیر کولڈ ڈرنک کے گھونٹ لے رہا تھا۔ ہما ٹشو سے ہونٹ صاف کر رہی تھی۔

"تو پھر ہم شادی کب کر رہے ہیں؟" چند لمحوں بعد وہ اچانک ہی بول اٹھا تھا۔

"کچھ وقت دو مجھے۔" وہ پتا نہیں کیا سوچ رہی تھی۔

"کس لیے؟ کیا اپنے بچوں کی پرمیشن چاہیے آپ کو؟"

"ان کا باپ انہیں میرے خلاف بھڑکا رہا ہے۔" ہما بے بسی سے بولی۔

"کسی کے بھڑکانے سے یا کسی کے بھڑکنے سے ہم پیچھے تو نہیں ہٹ سکتے۔" دبیر نے کولڈ ڈرنک ختم کر کے گلاس میز پر رکھا اور ویٹر کو اشارہ کیا۔

"نہیں' میں اب پیچھے نہیں ہٹ سکتی' چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" ہما نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں بھی نہیں۔" دبیر نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر یقین دلایا۔



ڈرامے کی شوٹنگ جاری تھی اور ہما صادق کا معمول بن گیا تھا کہ شوٹنگ سے فارغ ہو کر وہ فرحت کے فلیٹ میں چلی جاتی۔ جہاں کے مکینوں اور ساز و سامان سے بھی وہ مانوس ہو چلی تھی جو پہلے پہل اسے بہت اجنبی سے لگے تھے' حتیٰ کہ اب فرحت کی بیٹی سے بھی مانوس ہو گئی تھی جسے پہلی بار دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی تھی' چونک گئی تھی۔ پہلے دن جب وہ واپسی کے لیے نکلنے ہی والی تھی۔ تو فرحت کی بیٹی اندر داخل ہوئی تھی۔

"یہ میری بیٹی ہے کرن۔" فرحت نے بتایا تو وہ اک دم ٹھٹک سی گئی سیاہ عبایا میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی نے اسے سلام کیا اور اسکارف اتارنے لگی۔ ایک سیلیبریٹی کو اپنے گھر دیکھ کر وہ نہ تو حیران تھی نہ ہی پرجوش' نہ ہی پریشان' وہ تو بس یوں نارمل تھی جیسے ہما صادق اس کی روزانہ آنے والی پڑوسن ہو۔

"تم نے اپنی بیٹی کو کیا بنا دیا ہے؟" اگلی ملاقات پر اس نے فرحت سے پوچھ ہی لیا۔

"میں نے تو کچھ نہیں بتایا۔" فرحت تریاں چھیل رہی تھی' بے نیازی سے بولی۔

"تم ٹی۔وی کی ایک نامور ایکٹریس تھیں' یاد ہے کسی زمانے میں ہم لوگ بیل باٹم کتنے شوق سے پہنا کرتے تھے۔"

"ہاں وہ بھی ایک دور تھا گزر گیا۔" فرحت نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"تمہاری بیٹی تو بالکل الگ ہے تم سے۔"

"اس نے اپنی مرضی کی زندگی اور انداز زندگی منتخب کیا ہے۔ میں نے اس کی مرضی پہ اعتراض نہیں کیا۔" فرحت تریاں کاٹ کر اب پیاز کاٹ رہی تھی۔

"مگر....." ہما کچھ کہنے والی تھی مگر اسے احساس ہوا کہ وہ بہت پرسنل ہو رہی ہے تو خاموش ہو گئی۔

"بات یہ ہے ہما کہ دونوں بیٹوں کی وفات کے بعد مجھے زندگی کی بے ثباتی اور کھوکھلے پن کا جیسا احساس ہوا' وہ شاید اسی کو ہو سکتا ہے جو اس تجربے سے گزرا ہو۔ میری بیٹی نے بھی شاید کچھ ایسا ہی سوچا اور محسوس کیا مگر وہ مجھ سے ایک قدم آگے نکلی۔ اس نے اس فانی زندگی کو ابدی کرنے کا فیصلہ کیا اور قرآن حفظ کرنے کا اور دینی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا' دن میں ایک پرائیویٹ یونی ورسٹی میں پڑھاتی ہے۔ شام میں مدرسے چلی جاتی ہے۔"

"خیر' سب کو اپنی لائف کے لیے اپنی سوچ کے مطابق ڈسیژن لینے کا حق ہے۔ آئم سوری' میں کچھ زیادہ ہی پرسنل ہو گئی۔" ہما صادق فوراً" سنبل بن گئی اور معذرت کرنے لگی۔

"کوئی بات نہیں' تمہاری حیرانی بجا ہے۔" فرحت اٹھتے ہوئے بولی۔ "اگر تم دس منٹ بیٹھ جاؤ تو میں ذرا یہ سبزی بگھار لوں؟"

"شیور' تم جاؤ میں جب تک اپنی بیٹی سے بات کر لوں۔" ہما اپنا مہنگا ترین اسٹائلش موبائل ہاتھ میں لے کر بالکنی میں آ گئی۔

"ہائے موم' ہاؤ آر یو؟" سبرینہ لائن پر تھی۔

"فائن۔" ہما ایک لمحے کو چپ ہوئی۔

"ایک بات کہنی تھی تم سے۔" ہما صادق نے انگریزی زبان کا سہارا لیا۔

"جی۔"

"میں شادی کر رہی ہوں۔" اپنی عادت کے مطابق اس نے ٹو دی پوائنٹ بات کی۔

"آئی نو۔"

"پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ کون ہے۔"

"یس۔"

"ناراض ہو؟"

"پتا نہیں مجھے کیا ہونا چاہیے' ناراض' خوش یا نارمل' مجھے سچ میں ابھی خود بھی نہیں معلوم۔" سبرینہ کی آواز میں الجھن تھی۔

"تمہارے باپ کا خیال ہے کہ میں یہ قدم اٹھا کے" اس نے رک کر ایک گہری سانس لی۔ "میں اپنے بچوں کو دنیا کے سامنے شرمندہ کروں گی۔"

"ان کی اپنی سوچ ہے' آپ کی اپنی لائف ہے' ہم تو کسی کو بھی نہ صحیح کہہ سکتے ہیں نہ غلط اور جہاں تک شرمندگی کا تعلق ہے تو میں تیرہ سال کی تھی جب ڈیڈ سے آپ کی علیحدگی ہوئی تھی۔ میں بہت سمجھ دار بھی نہیں تھی اور بالکل ناسمجھ بھی نہیں تھی۔ تب لوگوں کی باتیں سن کر مجھے شرمندگی ہوتی تھی۔ میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔ اس دور سے نکل آئی ہوں اور ویسے بھی آپ نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ کبھی دنیا کی پرواہ مت کرو' وہی کرو جو دل چاہے۔ تو جب ہم اپنے معاملات میں لوگوں کی پرواہ نہیں کرتے تو کسی اور کے معاملات میں کیوں کریں' چاہے وہ ہمارے والدین ہی کیوں نہ ہوں۔" سبرینہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئی تھی شاید۔

"میرے مقابلے میں اپنے باپ کو سپورٹ کرنے کا بہت شکریہ۔" ہما نے بے حد تلخی سے بولتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

"کوئی خود کو میری جگہ رکھ کر بھی تو سوچے' کیا زندگی کی خوشیوں پہ میرا کوئی حق نہیں۔" سر جھٹک کر وہ

بے مقصد سامنے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔

☆ ☆ ☆

جہاں شاہ نے اپنی فلم کے ہٹ ہونے کی خوشی میں پارٹی دی تھی۔ ہما صادق نے بھی اس فلم میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ دبیر مرزا اور ساشا ابراہیم بھی مدعو تھے۔ فلم کے پورے یونٹ کے علاوہ شوبز کے کافی چمکتے دمکتے ستارے اس پارٹی میں اپنی چمک دکھلا رہے تھے۔

ہما بغیر آستین کے ایوننگ گاؤن میں ملبوس تھی۔ اس کا ہیئر اسٹائل، میک اپ، جیولری اور پراعتماد انداز اسے اس عمر میں بھی کافی پرکشش بنا رہے تھے۔

ساشا ابراہیم نے اپنا ہیئر اسٹائل اور ہیئر کلر تبدیل کر رکھا تھا۔ یہ تبدیلی اس پہ کافی سوٹ کر رہی تھی وہ منزہ خلیل کے ساتھ بیٹھی تھی، منزہ خلیل اس کی خالہ اور ایک معروف پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تھیں۔ ساشا ان سے کافی قریب تھی۔ اپنی انگوٹھی کو اضطراری طور پر انگلی میں گھماتے ہوئے وہ بہت دیر سے ہما صادق کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ دونوں آج کل کچھ زیادہ ہی کلوز ہو رہے ہیں۔" لہجے میں کڑواہٹ بھر کر وہ بڑبڑائی۔

"کون دونوں؟" اپنے موبائل میں مصروف منزہ نے ایک ذرا کی ذرا نظر اٹھائی۔

"دبیر کو اس "آنٹی" میں ایسا کیا نظر آگیا جو ہر وقت اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔"

"کس کی بات کر رہی ہو' کون کس کے آگے پیچھے پھر رہا ہے؟" منزہ فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اور ساشا کی نظروں کا تعاقب کرنے لگیں۔

"دبیر کی بات کر رہی ہو؟"

"ہوں۔" ساشا خاصی مضطرب لگ رہی تھی۔

"ویسے دبیر ہے بہت کول' آج بھی کتنا ڈشنگ لگ رہا ہے۔"

"آپ کی بھانجی کسی سے کم ہے کیا؟" ساشا نے ترچھی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"آں..." خالہ نے اب اسے غور سے دیکھا۔

"تم خود کو اس سے کیوں کمپیئر کرنے لگیں؟"

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ دبیر کے دماغ یا آنکھوں میں ضرور کوئی خلل ہے۔ اچھی بھلی خوب صورت' ینگ لڑکیوں کو چھوڑ کر اسے 'اس عورت میں کیا نظر آ رہا ہے؟" ساشا نے ان کا سوال نظر انداز کیا۔

"بائی دا وے' تمہیں دبیر میں کیا نظر آ رہا ہے۔ جو کسی کو اس کے ساتھ نظر آنے پہ اس طرح ری ایکٹ کر رہی ہو؟" منزہ خلیل نے اس بار خاصی سنجیدگی کے ساتھ بھانجی کو دیکھا تھا۔

"آنٹی... مجھے آج کل دبیر کے علاوہ نہ کچھ نظر آتا ہے نہ کچھ سوجھتا ہے۔" ساشا نے دھیمی آواز میں ان کے سامنے اعتراف کیا۔ اتنے ہفتوں سے اپنے راز کو اکیلے سنبھالتے سنبھالتے تھک گئی تھی۔ کوئی راز دار تو اسے بھی چاہیے تھا۔

"ڈارلنگ تم اس فیلڈ میں نام کمانے آئی تھیں یا اپنے دل کا کام تمام کرنے؟" منزہ خلیل نے آنکھیں سکیڑ کر بھانجی کو دیکھا۔

"پتا نہیں' خود بخود ہی کچھ ہو گیا۔" ساشا نے مضطرب ہو کر پھر سے انگلی میں موجود انگوٹھی گھمانا شروع کر دی۔

"ہوں..." انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر کہنا شروع کیا۔ "ویسے تو عرصہ ہوا میں نے ینگ جنریشن کو نصیحت کرنا چھوڑ دی ہے مگر آج تمہارے لیے اپنا یہ اصول توڑ رہی ہوں۔ تمہارے لیے میری ایڈوائز ہے کہ کبھی اس فرد کے پیچھے مت بھاگو جو تم سے دور بھاگے۔"

"یہ بھی تو دیکھیں کہ وہ کس کے پیچھے بھاگ رہا ہے' ایک ادھیڑ عمر عورت جو..."

"تم کسی بھی فرد کو اس طرح کیسے جج کر سکتی ہو اور کیسے کمنٹس کر سکتی ہو؟ تمہاری مورل ویلیوز کو کیا ہو گیا ہے بچے۔" منزہ نے آنکھیں پھاڑ کر اسے حیرت سے دیکھا۔

"آئم سوری آنٹی بٹ آئی ڈونٹ نو... میں بہت ڈسٹرب ہوں آج کل۔"

”کچھ دنوں کے لیے بریک لے لو اور آرام کرو۔“
”کیا اس سے میری فیلنگز ختم ہو جائیں گی جو دبیر کے لیے ہیں؟“ ساشا نے بے بس نگاہوں سے پہلے دور کھڑے دبیر کو پھر قریب بیٹھی آنٹی کو دیکھا۔
”ہماری ساری فیلنگز نہ خود بہ خود پیدا ہوتی ہیں نہ خود بخود ختم ہوتی ہیں۔ ہم انہیں خود ہی ڈیولپ کرتے ہیں تو خود ہی ختم بھی کر سکتے ہیں۔“
”محبت خود بخود ہوتی ہے آنٹ۔“ ساشا نے ناراض لہجے میں کہا۔
”ہوتی ہوگی، کبھی کسی زمانے میں۔“ انہوں نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ ”اب تو ہر کام سوچ سمجھ کر ہوتا ہے۔ دل لگانے سے پہلے انسان دماغ لگاتا ہے کہ اس میں میرا نفع ہے یا نقصان۔“
”آپ کی لو میرج تو بہت سکسیس فل ہے، بیس سال گزار لیے آپ نے، پھر اتنی پریکٹیکل کیوں ہو رہی ہیں؟“
”ہر کامیابی کا ایک راز ہوتا ہے۔“ بے پناہ میک اپ اور کوشش کے باوجود منزہ خلیل کا چہرہ اور مسکراہٹ ماند پڑ رہے تھے۔
”ہم اپنے اپنے کاموں میں بزی رہتے ہیں، ہفتوں ہماری ملاقات نہیں ہوتی اور کئی کئی دن ہماری بات نہیں ہوتی۔ ہم نے ایک دوسرے کو بہت اسپیس دی ہوئی ہے۔ دیٹس وہائے وی آر اسپینڈنگ ہیپی میریڈ لائف۔“ وہ ایک لمحے کو رک کر پھر مسکرائیں۔ ”اینڈ آف کورس ودھ لو۔“
ساشا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اپنے پیچھے ہما صادق کی آواز سن کر بری طرح چونک اٹھی۔
”کتنی دیر سے تمہیں واچ کر رہی ہوں، دونوں خالہ بھانجی کی ڈسکشن ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی۔“ ہما کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔
”اوہ، تم نے کچھ سنا تو نہیں؟“ منزہ نے گھبرانے کی ایکٹنگ کی۔
”از دیئر اینی سیکریٹ؟“ ہما نے جھک کر رازدارانہ انداز میں پوچھا۔
”بتا دیا تو پھر سیکریٹ کہاں رہ جائے گا۔“ منزہ نے ایک قہقہہ لگایا جس میں ہما بھی اس کے ساتھ شامل تھی۔
”کانگریچولیشن ساشا۔“ ہما اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
”تمہاری ایکٹنگ بہت پسند کی جا رہی ہے۔ کافی اچھے ریویو آ رہے ہیں تمہارے متعلق۔“
”تھینکس۔“ ساشا زبردستی مسکرائی۔
دبیر درمیان میں نہ ہوتا تو وہ بھی ہما کی دو چار تعریفیں کر دیتی مگر اس وقت بات کرنا تو دور کی بات اس کا دل ہما صادق کو دیکھنے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔
”ایکسکیوز می۔“ مصنوعی مسکراہٹ اپنے چہرے پہ چپکائے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں ذرا اپنی فرینڈز سے مل لوں۔“
”وائے ناٹ۔“ منزہ نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور ہما کی طرف متوجہ ہوئی۔
”ایک ٹیلی فلم بنا رہی ہوں، تمہارے لیے بہت اسپیشل رول ہے، انکار مت کرنا۔“ منزہ اب سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔
”کیا یار، تمہیں منع کر سکتی ہوں بھلا میں۔“ ہما نے اسے گویا شکایتی نظروں سے دیکھا۔
”ویسے بھی دو تین مہینے کے لیے میں فری ہوں۔“ ہما نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔
”پھر اس کے بعد؟“ منزہ نے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔
”دبیر اپنا نیا پروجیکٹ شروع کر رہا ہے، اس میں بزی ہو جاؤں گی۔“ ہما مسکرائی۔
”دبیر اچھے ڈرامے بنا رہا ہے، کافی ٹیلنٹڈ لڑکا ہے۔“
یوں تو اوروں کی طرح منزہ خلیل کی بھی اپنی لابی اور اپنا گروپ تھا شوبز میں، جو بہت طاقتور تھا۔ خود سے آگے نکلتے کسی بھی فرد کو دھکے مار کے پیچھے کرنا، اوپر جاتے فرد کی ٹانگیں کھینچنا ان کا وتیرہ تھا مگر دبیر کا کام اسے سچ مچ بہت پسند آیا تھا۔ اس سے مقابلے کے

بجائے وہ اسے اپنے ساتھ ملانے کی خواہش مند تھی۔
"تم لوگوں کا نیا ڈرامہ ریٹنگ میں سب سے اوپر جا رہا ہے۔ کچھ بات تو ہے دبیر مرزا میں۔" منزہ نے سر ہلایا۔
"یہ تو ہے۔" ہما کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔



شوٹنگ ختم ہو گئی۔ ڈراما بن کر آن ایئر بھی ہو گیا تھا مگر ہما صادق نے فرحت کے گھر کا رستہ پکڑ لیا تھا۔ ہر تیسرے، چوتھے ہفتے وہ وہاں چلی ہی جاتی اور اپنا کتھارسس کر آتی۔ فرحت کی صورت میں اسے بھولی بسری دوست ہی نہیں بلکہ ایک رازدار اور ایک سامع بھی مل گئی تھی۔ جو کچھ وہ کسی سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی، فرحت سے شیئر کر لیتی۔
"میرے اردگرد لوگوں کا ہجوم ہے، شناسا بھی، اجنبی بھی مگر دوست کوئی نہیں مجھے اب تجربہ ہوا ہے کہ انسان بھیڑ میں کیسے تنہا ہوتا ہے۔" فرحت کے چھوٹے سے فلیٹ کے چھوٹے سے لاؤنج میں بیٹھی وہ فرحت کو بتا رہی تھی۔
فرحت نے گہری سانس لے کر بے حد ہمدردی سے اپنے سامنے بیٹھی عورت کو دیکھا۔ قیمتی برانڈڈ لباس، جوتے اور جیولری نے بھی اس کی بے کلی کم نہیں کی تھی۔ خود کو جوان، پرکشش اور فریش رکھنے کے لیے بوٹاکس سمیت ہر حربہ اور کاسمیٹکس سرجری کروا کر قیمتی میک اپ پروڈکٹ جو ماہرانہ ہاتھوں نے اس کے چہرے پہ استعمال کی تھیں، سب کچھ مل کر اس چہرے کا اضطراب اور پریشانی ختم نہیں کر پا رہے تھے۔
"میں اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہہ سکتی، اپنی پریشانیاں، اپنے پرابلمز کسی سے شیئر نہیں کر سکتی۔" ہما کے لہجے میں عجب لاچاری تھی۔
"میرے آس پاس جو لوگ مجھ سے زیادہ کامیاب ہیں، وہ میری کمزوریوں کی تلاش میں رہتے ہیں، مجھے نیچا دکھانے کے لیے۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ میں اس فیلڈ میں کیریئر بنانے کے لیے یا آگے بڑھنے کے لیے ان کی مدد کروں۔ کسی کو مجھ سے خبر چاہیے ہوتی ہے۔ نئی اور چٹ پٹی۔" فرحت کے سامنے وہ بول رہی تھی اور بولتی ہی چلی جا رہی تھی۔
"ہر فیلڈ میں کامیابی کی شہرت کی ایک قیمت ہوتی ہے جو لازمی ادا کرنی پڑتی ہے۔" فرحت کا لہجہ دھیما تھا۔
"قیمت ہی تو چکا رہی ہوں میں اس زندگی کی، جو اصل سے زیادہ سود ہے، زندگی تمام ہو جائے گی مگر یہ سود ختم نہیں ہو گا۔" ہما عجیب سے لہجے میں بولی۔
"سود تو تباہی ہے، جس کے ساتھ بھی شامل ہو گا اسے تباہ کر دے گا چاہے زندگی ہو یا دولت۔"
"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے اپنے بچے میرے مقابل آئیں گے۔" وہ بڑبڑائی۔
فرحت کی سمجھ میں نہ اس کی بڑبڑاہٹ آئی نہ اس کی بات۔
"تمہیں یاد ہے میرا ایک ڈراما تھا اس دور کا، جب ہم ساتھ کام کرتے تھے میں نے ایک پاگل لڑکی کا رول ادا کیا تھا۔" ہما کھوئے کھوئے لہجے میں بول رہی تھی۔
"دلگی۔" فرحت نے اس ڈرامے کا نام لیا۔
"تمہیں یاد ہے؟" ہما کی حیرانی میں خوشی بھی شامل تھی۔
"جس ڈرامے پہ تمہیں ایوارڈ ملا تھا اسے کیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ ڈراما تو ناقدین کو بھی یاد ہے۔ اس میں تمہاری پرفارمنس غیر معمولی تھی۔"
"ہاں اس میں میری اداکاری پر تو سرور صاحب نے بھی دو چار تعریفی جملے لکھ مارے تھے ورنہ تو وہ تقریباً ہر فنکار کے کیسے لتے لیتے تھے، یاد ہے؟" ہما پرانی یادوں میں کھو گئی۔
"اور جب کبھی وہ چند تعریفی الفاظ لکھتے ہمیں ایسا لگتا جیسے آسکر جیت لیا ہو۔" فرحت نے فراموش تو کچھ نہیں کیا تھا بس خود پہ حاوی نہیں کیا تھا۔
"اس ڈرامے میں ایک ڈائیلاگ تھا جو مجھے آج بھی اکثر یاد آتا ہے۔ دنیا والے پاگل بناتے ہیں تو پتھر

مارتے ہیں۔ انسان خود اپنے آپ کو پاگل بناتا ہے تو دنیا کو لات مارتا ہے۔" ہما نے ایک گہری سانس لی۔

"کبھی سوچتی ہوں کہ اس سے پہلے کہ یہ دنیا پاگل کر دے میں خود ہی اپنے آپ کو پاگل بنالوں۔"

"اتنی فرسٹریٹ کیوں ہو؟" فرحت نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں یار! یا تو زندگی فرسٹریشن کا دوسرا نام ہے یا پھر عورت۔" ہما نے بے زاری سے بولتے ہوئے اپنے ہینڈ بیگ سے موبائل نکالا جو بجنے لگا تھا۔ نمبر دیکھ کر اس نے بجنے دیا۔ فون اٹینڈ نہیں کیا۔

"عرفان بخاری یاد ہے تمہارے ساتھ بھی ایک دو ڈرامے کیے تھے۔" ہما بجتے ہوئے موبائل کو دوبارہ بیگ میں ڈالتے ہوئے گویا ہوئی۔

"اچھی طرح یاد ہے۔" فرحت کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ عرفان بخاری کافی وجیہہ تھا اور ہر خوب صورت لڑکی سے فلرٹ کرنا اس کا حق اور اپنا فرض سمجھتا تھا۔ فرحت کے لیے بھی اس نے اپنے داؤ پیچ دکھائے مگر اس کی منگنی ہونے والی تھی اس لیے نظر انداز کر گئی۔

"اچھا اداکار تھا۔" فرحت کو گھنگھریالے بالوں والا وہ طرح دار لڑکا یاد آیا' جس نے افیئر تو اپنی ساتھی فنکاراؤں کے ساتھ چلائے اور شادی کے لیے اپنی فیملی کی سب سے خوب صورت مگر گھریلو لڑکی کو منتخب کیا تھا۔

"ڈائریکٹر بن گیا ہے' اپنے ہر ڈرامے کے لیے میرے پاس آجاتا ہے کہ آپ کے لیے اسپیشل رول ہے۔ چار ڈراموں میں کام کر چکی ہوں اس کے۔" ہما اپنے مخصوص تیکھے انداز میں بول رہی تھی۔ "تمہارے ہی ساتھ کام کرتا تھا اور آپا آپا کرتا رہتا ہے جیسے پتا نہیں کتنا چھوٹا ہے مجھ سے' ننھا کاکا کہیں کا۔" اس نے منہ بنایا۔

"مسئلہ کیا ہے؟" فرحت نے مسکراہٹ دبائی۔

"مسئلہ یہ ہے کہ ایک سے بڑھ کر ایک فلاپ ڈرامے بنا رہے ہیں موصوف' اب پھر ایک نئے فلاپ کی تیاری میں مصروف ہیں۔ مجھے فون کھڑکا دیتا ہے دن میں کئی بار' میں نے تو توبہ کرلی اب اس کے ڈراموں میں کام کرنے سے۔ یہ تو میری مارکیٹ بھی ڈاؤن کروائے گا۔"

"اداکار تو اچھا تھا پھر۔۔۔" فرحت نے کچھ سوچتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ضروری تھوڑی ہے کہ ایک اچھا اداکار اچھا ڈائریکٹر بھی ہو۔" ہما نے بیگ کھول کر موبائل نکالا اور فالتو چیزیں ڈیلیٹ کرنے لگی۔

"مسئلہ کیا ہے؟ سارے ہی ڈرامے فلاپ ہوگئے' کہانی اچھی نہیں ہوتی یا ڈائریکشن یا اداکاری؟"

"قسمت۔" ہما نے یک لفظی جواب دیا۔

"قسمت اچھی ہو تو برے سے برے ڈرامے' کہانیاں اور فنکار بھی ہٹ ہوجاتے ہیں۔"

"تو کیا اب صلاحیت اور محنت محض قسمت کی مرہون منت ہو کر رہ گئی؟" فرحت نے سوال کیا۔

"صرف قسمت ہی کی نہیں بلکہ گروپنگ اور لابیز کی بھی۔" ہما نے موبائل بند کرکے بیگ میں واپس رکھا۔

"دنیا میں بہت کچھ' بہت زیادہ بدل گیا۔" فرحت نے سوال سے زیادہ خود کلامی کی تھی۔

"پوری دنیا ہی بدل گئی ہے۔" ہما نے ایک گہری سانس لی۔

"گزرا وقت فقط ایک خواب لگتا ہے۔ ایسا خواب جو کبھی حقیقت نہیں تھا۔"

"حالانکہ وہ حقیقت تھا۔" فرحت نے اسے دیکھا۔

"ایک بات کہنی تھی تم سے۔" ہما نے موضوع بدلا۔ "برا تو نہیں مانوگی؟"

"ایسی کیا بات ہے جس کے لیے اتنی تمہید باندھ رہی ہو۔" فرحت کی مسکراہٹ میں سنجیدگی در آئی۔

"وہ۔۔۔" ہما نے جیسے بڑی مشکل سے بات شروع کی۔ "دراصل کچھ پرانے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی تھی میری جنھوں نے تمہارے ساتھ کام کیا ہے یا۔۔۔

ایٹ لیسٹ تمہیں جانتے ہیں۔" ہما خاموش ہو گئی جیسے آگے بات کرنے کے لیے ہمت یا الفاظ جمع کر رہی ہو۔

"تو؟"

"تو یہ کہ وہ سب بلکہ ہم سب تمہارے لیے کچھ فنڈنگ کرنا چاہتے ہیں اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو۔" ہما نے جلدی جلدی بات ختم کر کے منتظر نظروں سے اسے دیکھا۔ جو ہما کو دیکھتے دیکھتے اب نیچے دیکھ رہی تھی یا شاید کچھ سوچ رہی تھی۔

"آئم سوری فرحت اگر تمہیں برا لگا تو بلیو می سب نے بہت محبت اور خلوص کے ساتھ....."

"مجھے تمہاری یا کسی کی بھی محبت اور خلوص پر شک نہیں ہے۔" وہ اچانک ہی ہما کی بات کاٹ کر بولنے لگی۔ "دراصل میں اس طرح کی کسی بھی ہیلپ کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔"

"مگر کیوں؟ تم تھوڑی بہتر جگہ شفٹ ہو سکتی ہو، اپنے حالات کچھ بہتر کر سکتی ہو۔" ہما نے اس کے گریز کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے ہما کہ ہم نے اپنی خواہشات ختم کر دی ہیں اور ضروریات محدود، ہماری زندگیاں سادہ ہیں مگر آسان۔ تمہاری آفر کے لیے میں ممنون ہوں مگر اس کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔" فرحت نے مختصر مگر مدلل جواب دیا تھا۔ ہما سے آگے کوئی بات نہ بن پڑی۔

"اگر دوبارہ کام کرنا چاہو تو ملوا دوں کسی سے، دو چار ڈائریکٹر تمہارا نام سن کر انٹرسٹڈ ہیں؟"

"اب دل نہیں چاہتا۔"

"اپنا ٹیلنٹ کیوں ضائع کر رہی ہو۔" ہما نے اصرار کیا۔

"زندگی ضائع کرنے سے ٹیلنٹ ضائع کرنا بہتر ہے۔"

"بہت عجیب ہو گئی ہو تم، اس سے زیادہ عجیب تمہاری باتیں۔" ہما کی واپسی کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔

"چلو چھوڑو ان سب باتوں کو، اب کے جلدی آنا' انتظار رہنے لگا ہے تمہارا۔"

"اتنی بڑی دنیا میں ایک دو انسان ہیں جنہیں میرے آنے اور مجھ سے ملنے کا انتظار رہتا ہے۔ تم ان میں سب سے پہلی ہو، اسی لیے تو آتی ہوں تمہارے پاس، اب کے کوشش کروں گی جلدی آنے کی۔"

٭ ٭ ٭

ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی کئی کئی دن ہو جاتے تھے ان دونوں کو بات کیے ہوئے، زائر صبح صبح ہی جانے کہاں نکل جاتا۔ رات میں کب آتا تھا ہما کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ آج خلاف توقع وہ ناشتے کی میز پر تھا۔ ہما ڈائننگ روم میں آئی تو اسے دیکھ کر چونک پڑی۔

"وری ہیپی اینڈ لکی ڈے از ٹوڈے۔" کرسی گھسیٹ کر بیٹھتی ہوئی وہ مسکرائی۔

"گڈ مارننگ۔" نظریں اٹھائے بغیر زائر نے کہا۔

"کہاں ہو تم اتنے دنوں سے، کیا چل رہا ہے آج کل۔" ہما ہلکے پھلکے خوشگوار موڈ میں گویا ہوئی۔

"یہیں ہوں، اسی گھر میں، بس آپ کو نظر نہیں آیا۔" زائر کا لہجہ پرسکون تھا اور الفاظ چبھتے ہوئے۔ ہما نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔

"چلو میں چکن چیز آملیٹ بنواتی ہوں' دونوں کھائیں گے۔ کتنے دنوں بعد آج ہم ایک ساتھ ناشتہ کریں گے۔" اپنی مسکراہٹ زبردستی برقرار رکھتے ہوئے اس نے ایک اور کوشش کی۔

"میرے لیے زحمت نہ کریں' میں اپنا ناشتہ بنوا چکا ہوں۔ وہی کھاؤں گا۔" زائر کے روکھے لہجے پہ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

"ماہم کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ انتہائی بے دلی سے ملازمہ کے لائے ہوئے سلائس اور آملیٹ کے چھوٹے چھوٹے لقمے کھا رہا تھا۔

"تم لوگ شادی کب پلان کر رہے ہو اپنی، اب تو تمہارا کیریئر بھی کافی اسٹیبلش ہو گیا ہے۔" ہما نے سیب کا تازہ رس گلاس میں انڈیلا۔

"میں؟" ایک تلخ ہنسی ہنس کر اس نے اپنی طرف

اشارہ کیا۔ "ہمارے والدین اپنی شادیوں سے فارغ ہو جائیں تو ہم بھی اپنے بارے میں کچھ سوچ لیں گے۔"

ہما سنانے میں آگئی۔

کچن قریب ہی تھا جہاں اس وقت وہ ملازم موجود تھے۔ وہ لوگوں کی پروا نہیں کرتی تھی۔ اس کی زندگی کے آسمان پر "لوگ کیا کہیں گے" نام کا پرندہ کبھی پرواز کے لیے نہیں آیا مگر زائر میں تو اس کی جان تھی۔ اس کا بہت پیارا اور بہت لاڈلا بیٹا تھا۔ اس کی بلکہ دونوں بچوں کی تعلیم و تربیت کے خدوخال ہما نے اپنی سوچ اور فکر کے مطابق ترتیب دیے تھے۔ دونوں اپنی ماں کی طرح بہت لبرل اور بہت آزاد خیال تھے مگر دیر کے معاملے میں دونوں پتا نہیں کیوں اتنے تنگ نظر اور تنگ دل بن رہے تھے۔ ہما کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیوں؟

"مڈل کلاس کی طرح بی ہیو کیوں کررہے ہو؟" ہما نے انگریزی کا سہارا لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ملازم ان کی بحث سنیں، بہت سے صحافی حضرات اندر کی خبر لینے کے لیے گھر کے ملازموں کو سیڑھی بناتے ہیں۔

"مورل ویلیوز ہر کلاس میں ہوتی ہیں ممی! مڈل کلاس سے مخصوص نہیں ہیں۔" ہما کی پیشانی سے زیادہ بل اس نے اپنی پیشانی پر سجالیے۔

"تم دونوں بہن بھائی انگلینڈ میں پلے بڑھے ہو، پھر یہ تنگ نظری میری سمجھ سے باہر ہے۔" پوری دنیا میں یہ واحد انسان تھا جس کے آگے وہ اتنی کمزور پڑجاتی تھی۔

"آپ نے میرے بارے میں بھی نہیں سوچا کہ میں ماہم کو اور اس کی فیملی کو کیسے فیس کروں گا؟" زائر نے ایک نگاہ اسے دیکھا اور پھر اپنے ناشتے پہ نظریں جما دیں۔ اس کی نگاہوں میں لاتعداد شکوے مچل رہے تھے۔

"ماہم کی فیملی بہت ایڈوانس ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اس طرح ری ایکٹ کریں گے۔" ہما کا لہجہ محتاط مگر چہرے پہ ناگواری کے اثرات تھے۔

"آپ وہی کریں گی جو آپ نے ٹھان لی ہے، کچھ کہنا بے کار ہے۔" زائر ناشتہ ادھورا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"زائر! ناشتہ پورا کرو۔"

"آپ کی مرضی پوری ہو رہی ہے نا، اب میرا ناشتہ ادھورا ہو یا زندگی کیا فرق پڑتا ہے۔" کرسی کو ایک زور دار ٹھوکر مار کر وہ باہر نکل گیا۔

اہانت اور غصے سے ہما کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ زائر کے رویے اور چہرے سے غصہ اور بے بسی ہی نہیں بلکہ کہیں کہیں شاید نفرت بھی چھلک رہی تھی۔

جوس کا بھرا گلاس وہ بھی وہیں چھوڑ کر اٹھ گئی۔



"میں نے کیا نہیں کیا اپنے بچوں کے لیے، تمہیں پتا ہے، جب عالم سے میرا سیپریشن ہوا تو میں نے صرف اور صرف ان دونوں کی وجہ سے خود کو تنہا رکھا۔ بہت ہاتھ بڑھے میری طرف مگر میں نے ان کے بڑے ہونے کا، سمجھ دار ہونے کا انتظار کیا۔ میری وہ قربانی کسی گنتی میں نہیں، باپ رنگ رلیاں مناتا رہے کوئی پروا نہیں، ساری مورل ویلیوز میرے لیے ہی ہیں۔" جدید فیشن کے سلے ہوئے براؤن شیفون کے لباس میں ملبوس وہ فرحت کے پاس بیٹھی اپنے دکھڑے رو رہی تھی۔

"یہ دونوں آگے پڑھنے کے لیے لندن چلے گئے اپنے باپ کے پاس، جو اکثر مجھے فون کرکے جتاتا رہتا کہ اب ان دونوں کا فیوچر وہیں ہے گریٹ برٹین میں، اپنے باپ کے پاس اپنے باپ کے ساتھ، کبھی کبھی ان دونوں کی باتوں سے بھی یہی محسوس ہوتا جیسے وہ پاکستان واپس آنے میں زیادہ انٹرسٹڈ نہیں ہیں۔ تم نہیں جانتیں فرحت ان دنوں میں کتنی خوف زدہ رہنے لگی تھی۔ میں یہی سوچتی رہتی تھی کہ اگر میرے بچے واپس نہ آئے تو اور اس تو کے آگے میرے لیے زندگی سوالیہ نشان بن جاتی۔" ہما نے ذرا ٹھہر کر سانس لی پھر آگے کہنے لگی۔

"عورت چاہے کتنی ہی کامیاب، کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، تنہائی اکیلا پن اسے کھا جاتا ہے، ختم ہو

جاتی ہے وہ۔" ہما پھر رک کر کچھ سوچنے لگی۔
"ارشد وقار میرا کو اسٹار تھا' اس کے ساتھ میری بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ ہو گئی تھی' وہ اپنی میریڈ لائف کو زبردستی آگے گھسیٹ رہا تھا' اپنی دو بیٹیوں کی وجہ سے۔ محبت اور جذباتی سہارا اسے بھی چاہیے تھا اور مجھے بھی۔ ہم نے ایک دوسرے میں اپنی محرومیوں کا ازالہ ڈھونڈنا چاہا' اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ دے گا مگر وہ اپنا وعدہ پورا کرنے میں ناکام رہا۔ میں بٹی ہوئی زندگی نہیں گزار سکتی' مجھے ایسا شوہر نہیں چاہیے جو دو کشتیوں میں سوار ہو' آدھا ادھر آدھا ادھر۔ زائر اور مبینہ کی اسٹڈیز ختم ہوئی تو میری شادی بھی ختم ہو چکی تھی۔
یو نو فرحت' کبھی کبھی مجھ جیسی عورت بھی یہ سوچنے پہ مجبور ہوتی ہے کہ ہمارے معاشرے میں پہلی شادی دیوار کی پہلی اینٹ ہے گویا' یہ ٹیڑھی ہو تو آگے وال آف لائف ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ یہ اینٹ اگر نکل جائے تو آگے دیوار کی کوئی سمت ہوتی ہے نہ پائیداری نہ خوبصورتی۔ جا بہ جا خلا ہو جاتے ہیں۔ اس خلا کو بھرنے کی کوشش کرو تو دیوار اور بدصورت ہونے لگتی ہے اور کبھی کبھی کمزور بھی۔ تم نے کبھی سوچا' ہمارے ہاں عورت کی زندگی اتنی محدود کیوں ہے؟" اس نے بولتے بولتے فرحت کی آنکھوں میں جھانکا۔
"مجھے لگتا ہے مرد کا ذہن محدود ہو جائے تو عورت کی زندگی بھی محدود ہو جاتی ہے۔" فرحت کی خاموشی پہ ہما نے خود ہی خیال ظاہر کیا۔
"آزادی لامحدود ہو تو زندگی محدود ہو جاتی ہے۔" فرحت نے بالآخر خاموشی ختم کی تو ایک مبہم جملے پہ۔ ہما کے پاس وقت نہیں تھا کہ وہ مبہم جملوں یا فلسفیانہ باتوں پہ غور کر کے ان سے مطلب نکالے۔ اسے صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنی تھی اور بس۔



دبیر کا نیا اسکرپٹ تیار تھا۔ اس پر نظرثانی کر کے اس نے ڈرامے کی کاسٹ بھی فائنل کر لی تھی۔ سوائے ہما صادق اور بصیرہ تقی کے تقریباً" سارے چہرے نئے لیے تھے اس نے۔ ہما اس کے آفس میں بیٹھی تھی اور اپنا کردار ڈسکس کر رہی تھی۔ ڈسکشن ختم ہوئی تو سر کو کرسی کی پشت سے لگا کر ہما نے ایک گہری سانس لی۔
"کیا ہوا؟"
"تھک گئی ہوں۔" ہما نے آنکھیں موند لیں۔
"کس بات سے؟"
"لڑتے لڑتے تھک گئی ہوں' اپنے آپ سے بھی اور اپنوں سے بھی۔"
"کیا ضرورت ہے خود کو تھکانے کی؟" دبیر اپنا لیپ ٹاپ بند کر کے پرسکون موڈ میں کرسی پر جھولنے لگا۔
"ہمارا ایج ڈفرنس بہت ایب نارمل ہے دبیر۔" ہما بولی۔
"ساٹھ سال کا مرد بیس سال کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ یہ فرق نارمل ہے؟"
"جو بات سوسائٹی میں عام ہو وہ بڑی آسانی سے ایکسیپٹ ہو جاتی ہے' ہمارا معاملہ عام نہیں ہے۔"
"میری شادی میرا پرسنل میٹر ہے۔ مجھے سوسائٹی میں کسی سے کوئی سرٹیفکیٹ نہیں چاہیے۔" دبیر سنجیدگی سے گویا ہوا۔
"اور ایک بات اور' اس ڈرامے کی شوٹنگ ختم ہونے سے پہلے ہم نکاح کر رہے ہیں۔" دبیر کا لہجہ ہنوز سنجیدہ تھا۔
"شوٹنگ ختم ہونے سے پہلے؟" ہما صادق چونک پڑی۔
"جی..." دبیر نے ایک نظر اسے دیکھا۔
"میں بہت انتظار کر چکا ہوں' ناؤ اٹس انف' ویسے بھی مزید ڈیلے کرنا آپ کے حق میں بھی اچھا نہیں۔ آپ بہت زیادہ ٹینس ہو رہی ہیں آج کل' کہیں ایسا نہ ہو کہ نروس بریک ڈاؤن کروا کر ہسپتال پہنچ جائیں۔" اس نے ہما کی دماغی کیفیت کا بالکل ٹھیک تجزیہ کیا تھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔
"ٹھیک ہے' جیسے تم چاہو۔" وہ سیدھی ہو کر مسکرائی۔

✡ ✡ ✡

اینٹی ایجنگ کریم کو وہ بڑی نرمی سے چہرے اور گردن پہ لگا رہی تھی۔ کریم اچھی طرح جذب ہو گئی تو ٹشو سے چہرہ اور گردن سے فالتو کریم صاف کر کے وہ آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔ آئینہ اسے بہت پرکشش اور گریس فل بتا رہا تھا۔ کاٹن کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس اس نے بالوں میں برش کیا اور انہیں پونی میں جکڑ لیا۔ کار پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تھی۔

"سبرینہ آگئی۔" وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آگئی' کوریڈور سے گزرتے ہوئے زائر کے کمرے کے آگے وہ ٹھٹک گئی۔ کھلے دروازے سے زائر کا بیڈ اس پر بکھرے کپڑے اور سوٹ کیس' بیگز وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ وہ بے اختیار کمرے میں داخل ہو گئی۔

"تم کہیں جا رہے ہو؟" وہ بیگ میں کپڑے رکھتے ہوئے زائر سے مخاطب ہوئی۔

"جی۔" وہ نظر اٹھائے بغیر بدستور اپنے کام میں لگا رہا۔

"کہاں؟"

"لندن۔"

"لندن؟" وہ چونک کر ایک قدم اور آگے بڑھ آئی۔

"تم لندن جا رہے ہو اور ذکر تک نہیں کیا مجھ سے؟"

"بتا دیتا ابھی گھر سے نکلنے سے پہلے۔" زائر کا گریز' اطمینان اور مصروفیت بدستور اپنی جگہ تھی۔

"کس لیے جا رہے ہو؟"

"یوں ہی فار چینج۔"

"کب آؤ گے؟"

"شاید دو تین ماہ میں۔" زائر نے کندھے اچکائے' بیگ کی زپ بند کی اور اسے اٹھا کر نیچے رکھ دیا۔

"اسٹے کہاں کرو گے؟"

"ظاہر ہے ڈیڈ کے پاس اور کہاں۔" زائر کا جواب

تابوت میں آخری کیل تھی۔

وہ تلملا کر' کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اپنے کمرے میں آ کر یخ پانی کی بوتل منہ سے لگا کر بھی اس کا غصہ اور تلملاہٹ نہ کم ہوئی نہ ختم ہوئی۔

ڈیئر ٹھیک کہہ رہا تھا' یہ لوگ میرا نروس بریک ڈاؤن کروا کر ہی رہیں گے۔ نیند کی گولی کو پانی سے پھانکتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ بڑی مہارت اور تیزی کے ساتھ دوپٹے کے کنارے پہ باریک باریک چاول بنا رہی تھی۔ ایک پلو مکمل ہو چکا تھا۔

ہما نے وہ تیار پلو ہاتھ میں لے کر کروشیے سے بنی بیل دیکھی۔

"تمہیں یہ شوق کب سے ہو گیا؟"

"بس یوں ہی' فارغ بیٹھی رہتی تھی تو سوچا کچھ کر ہی لوں' کبھی کڑھائی کر لیتی ہوں کبھی ٹٹنگ اور کبھی کروشیے سے شغل کر لیتی ہوں۔"

"خاصی محنت کا کام ہے۔"

"محنت تو دنیا کے ہر کام میں کرنی پڑتی ہے۔" فرحت مسکرائی۔ اسی وقت دروازے پہ دستک ہوئی۔

"دیکھتی ہوں کون ہے۔" فرحت اپنا سارا تام جھام ایک طرف رکھنے لگی۔

"تم رہنے دو' میں دیکھ لیتی ہوں۔" ڈیلیوری بوائے ہو گا میں نے پیزا آرڈر کیا تھا۔" ہما نے اپنا بیگ کھول کر پیسے نکالے اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں پیزا کے دو پیکٹ تھے۔

"تم تو کہہ رہی تھیں میرے ہاتھ کے کریلے قیمہ کھاؤ گی۔ میں نے پکا بھی لیے۔" فرحت نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں' میں وہ کھاؤں گی۔ یہ تم دونوں کے لیے منگوایا ہے۔ یہ لو' اسے کھانے کا مزا گرم گرم میں ہی آتا ہے۔"

"اچھا بھئی' بہت شکریہ تمہاری عنایت کا۔"

فرحت مسکرا دی۔

"میری بیٹی کا بھی کبھی موڈ ہوتا ہے تو بیک کر لیتی ہے گھر میں ہی، مجھے بھی پھر اس کے ساتھ کھانا پڑتا ہے۔"

"بہت لکی ہو، اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی ہوں، مجھے پتا نہیں کتنے مہینے ہو گئے سبرینہ کے ساتھ لنچ یا ڈنر کیے ہوئے۔" ہما صادق اس طرح جذباتی ہوتی تو نہیں تھی مگر پتا نہیں کیوں اس وقت ہو گئی تھی۔

"تم دونوں ہی اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتی ہو اسی لیے شاید۔" فرحت نے تسلی دینی بھی چاہی تو جملہ ادھورا رہ گیا۔

"ہاں اسی لیے شاید۔" ہما نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پہ سجائی۔

"تم بتا رہی تھیں کہ سبرینہ اپنے ونٹر کلیکشن کی تیاریوں میں مصروف ہے۔"

"ہاں، تقریباً" سب کچھ مکمل ہے بس فائنل ٹچ ہے اب۔" ہما نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"دن رات اسی میں لگی ہوئی تھی نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔" ہما کے لہجے میں جہاں روایتی ماؤں والی محبت اور تشویش تھی وہیں بیٹی کے لیے فخر بھی جھلک رہا تھا۔ فرحت نے ایک نظر اسے دیکھا اور خاموشی سے پیزا کا ٹکڑا کھانے لگی۔

"ارے ہاں تم پچھلی بار ذکر کر رہی تھیں کہ کرن کے رشتے کی بات چل رہی ہے کہیں۔" ہما کو اچانک یاد آیا وہ پوچھنے لگی۔ "آئی ایم سوری میں اپنے معاملات میں ایسی پھنسی کہ تم سے پوچھنا یاد ہی نہیں رہا۔" ہما کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" فرحت کی مسکراہٹ بڑی پھیکی سی تھی۔

"تو بات نہیں بنی۔" اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہما سمجھ گئی۔

"اونہوں۔" فرحت نے نفی میں سر ہلایا۔

"مگر تم تو بتا رہی تھیں کہ وہ لوگ بات آگے بڑھانے میں انٹرسٹڈ ہیں۔"

"ہاں، لڑکے کے پیرنٹس تو انٹرسٹڈ تھے اس رشتے میں، مگر دادا، دادی کو اعتراض ہوا مجھ پر، اور ان کا ابھی تک اپنی فیملی پر کافی ہولڈ ہے اس لیے۔"

"تم پہ کیسا اعتراض ہوا۔" ہما کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔

"میرے ٹی وی سے تعلق پر اعتراض، فنکارہ ہونے پہ اعتراض۔"

"مگر تمہیں تو برسوں ہو گئے شوبز چھوڑے ہوئے۔" ہما واقعی حیران ہوئی تھی۔

"ہاں، برسوں ہو گئے چھوڑے ہوئے، مگر جو چھاپ لگ گئی ہے، وہ مرنے کے بعد بھی نہیں مٹے گی۔"

"چھوڑو، دفع کرو ایسے لوگوں کو جو فنکار کی قدر و قیمت ہی نہ جانیں۔" ہما اپنے ازلی تنک پن سے گویا ہوئی۔

"ایسے لوگ بھی آئے تھے جو میری اور میرے فن کی قدر و قیمت کو جانتے اور سمجھتے تھے۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ انہیں میری بیٹی پہ اعتراض ہوتا تھا۔ نماز روزے کی پابندی لوگ خوشی خوشی قبول کرتے ہیں، پردے پہ آ کر بات اٹک جاتی ہے، برقع، پردہ، وہ بھی شرعی، یہ سب کے حلق سے نیچے نہیں اترتا، تو بس مختصر کہانی یہ ہے کہ جو لوگ مجھے ایکسیپٹ کرتے ہیں ان کے لیے میری بیٹی قابل قبول نہیں ہوتی اور جو میری بیٹی کو قبول کرتے ہیں انہیں مجھ پر اعتراض ہوتا ہے۔" پیزا کا ٹکڑا بھی ختم ہو گیا تھا اور فرحت کی بات بھی۔

"یہ کیسی کہانی ہے یار۔" ہما نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے سوال کیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بس، ایسی بھی ہوتی ہے کہانی اور ایسی بھی ہوتی ہے زندگی۔" فرحت نے لب بھینچ لیے۔



نیا لڑکا تھا۔ پتا نہیں پہلا شوٹ تھا اس لیے گھبرا رہا تھا یا پھر ہما صادق جیسی منجھی ہوئی ایکٹریس کو اپنے

سامنے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ کئی بار ری ٹیکس کے بعد جا کر شاٹ مکمل ہوا۔ تھوڑی دیر کی بریک تھی' ہما بے زار سی ایک طرف بیٹھ گئی۔ دماغ بہت الجھا ہوا تھا پھر بھی ایک پروفیشنل اور اچھے آرٹسٹ کی طرح وہ اپنا تمام تر فوکس اپنے کام پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ نیا لڑکا تو بہت ہی کنفیوز ہو رہا ہے۔" بصیرہ تقی ہمیشہ کی طرح اس کا دماغ چاٹنے آ گئی۔

"پتا نہیں کیوں ُدبیر نے اس عورت کو پھر میرے ساتھ کاسٹ کر لیا۔ منع بھی کیا تھا اسے۔" انتہائی کوفت کے ساتھ ہما نے سوچا۔ اسے وہ جواب بھی یاد تھا جو دبیر نے دیا تھا۔

"اچھی فنکارہ ہے یار' پھر اس رول کے لیے وہی سوٹ کرتی ہے' تم کیوں ٹینشن لے رہی ہو اس کی؟"

"دماغ بہت کھاتی ہے۔"

"اچھا' میرا تو کبھی نہیں کھایا۔" دبیر زور سے ہنسا تھا۔

"کیا ہوا ہما' تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" بصیرہ نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔

"سر میں درد ہو رہا ہے۔" (تم جو سر کا درد میرے پاس آ کر بیٹھ گئی ہو)

"ٹیبلیٹ منگوا دوں؟" بصیرہ کی ہمدردی عروج پر تھی۔

"ہے میرے پاس' کھائی تھی ابھی۔" ہما نے جھوٹ بول کر اس سے جان چھڑانی چاہی۔

"چلو پھر تو ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ پھیل کر بیٹھ گئی۔

"پتا نہیں کہاں سے بنواتی ہے اتنے عجیب و غریب ہیئر اسٹائل۔" ہما نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اسے برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ ہما کا اور اس کا ساتھ بہت پرانا تھا۔ کئی ڈراموں میں ایک ساتھ کام کیا تھا۔ ہما کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اب اسے یہاں سے اٹھنے پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔

"صبوحینہ کے ونٹر کلیکشن کے پرومو دیکھے تھے' میں تو ابھی سے ایگزیٹیشن کا ویٹ کر رہی ہوں۔" بصیرہ شروع ہو گئی۔

"اچھا۔" ہما کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہوا۔

"اور سناؤ' صبوحینہ کی شادی وادی کا کیا پلان ہے! کوئی لڑکا پسند کیا؟" وہ آگے کو جھک کر پوچھنے لگی۔ ذرا بھی ایٹی کیٹس نہیں ہیں اس میں' ہر بات منہ پھاڑ کر پوچھ لیتی ہے ہما جزبز ہونے لگی۔

"دیکھ لیں گے' اتنی جلدی کیا ہے۔" خود پر قابو پا کر ہما نے رسان سے جواب دیا۔

"اچھے لڑکے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔"

"اپنا تجربہ بیان کر رہی ہے بے چاری۔ ہما نے ترحم سے اسے دیکھا۔ تقریباً" ہما کی ہی ہم عمر تھی وہ اور ہنوز غیر شادی شدہ تھی۔

"اگر تم برا نہ مانو تو صبوحینہ کے لیے ایک لڑکا بتاؤں' مجھے تو بہت پسند ہے۔ تمہیں اور صبوحینہ کو بھی ضرور پسند آئے گا۔"

"یا اللہ یہ عورت۔" ہما نے ایک گہری سانس لی۔

"بتاؤ۔"

"دبیر بہت اچھا لگتا ہے مجھے' جہاں تک میں نے آبزرو کیا ہے' کہیں انٹرسٹڈ بھی نہیں ہے' صبوحینہ کو بہت سوٹ کرے گا' ہے نا۔" وہ بڑے جوش و خروش سے بول رہی تھی اور ہما کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پہ جمع ہو گیا تھا۔

"اف... بیہودہ عورت۔" دل چاہ رہا تھا کہ کوئی چیز ملے تو اس کا سر توڑ دے۔

"میرے لیے ایک کپ چائے منگوا دو گی پلیز' ایک گولی اور کھانی پڑے گی۔ سر کا درد بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔" ہما نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"شیور' ابھی منگواتی ہوں۔" بصیرہ فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی۔



لیپ ٹاپ پہ تین گھنٹے تو ہو گئے تھے اسے کام کرتے

ہوئے۔ چند منٹ آرام کی خاطر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ تب ہی اس کا فون بجا۔

"ہیلو۔"

"ہیلو میں ساشا بات کر رہی ہوں۔"

"میں تمہارا فون نمبر اور آواز پہچانتا ہوں ساشا۔" نرمی سے بولتے ہوئے وہ سیدھا ہوا۔

"اچھا، مجھے تو لگا ایک ڈراما میرے ساتھ کرنے کے بعد آپ بھول گئے مجھے۔"

ساشا کا شکوہ سن کر وہ ہنس دیا۔ "ہر پرندے کی پرواز کا آسمان الگ الگ ہوتا ہے، جس کیریکٹر کے لیے مجھے لگے گا کہ تمہیں سوٹ کرتا ہے، اس کے لیے تمہیں ہی بلاؤں گا کسی اور کو نہیں۔"

"ویٹ کروں پھر میں؟" ساشا کا لہجہ اور الفاظ دونوں ہی معنی خیز تھے۔

"اچھے اسکرپٹ اور کیریکٹر کے لیے آف کورس۔" دبیر کا سنجیدہ اور محتاط لہجہ سن کر وہ خاموش ہو گئی۔

"تو پھر کیسے یاد کیا؟"

"رزلٹ آیا ہے میرا ماسٹرز کا، آپ نے کہا تھا نا کہ فرسٹ ڈویژن آئی تو ٹریٹ لیں گے۔" ساشا کا پہلے والا جوش ماند سا پڑ گیا تھا۔

"کانگریچولیشن۔" دبیر نے گرم جوشی سے اسے مبارک باد دی۔

"کل ایک چھوٹی سی گیٹ ٹوگیدر رکھی ہے، اگر آپ کے پاس ٹائم ہو تو..." ساشا کی سنجیدہ آواز سن وہ ہنس پڑا۔

"ناراض ہو گئیں؟"

"میرا، آپ کا ناراضی کا کیا رشتہ۔" ساشا کے پھیکے ہوئے لہجے میں ناراضی تھی۔

"میری کوئی بات بری لگی تو سوری فار دیٹ۔"

"سوری کر کے مجھے شرمندہ مت کریں۔" ساشا نے تیزی سے جواب دیا۔

"میں، تمہیں شرمندہ نہیں، خوش کرنا چاہ رہا تھا۔"

"آپ کل آئیں گے تو میں مزید خوش ہو جاؤں گی۔" ساشا کا ناراض لہجہ تبدیل ہو گیا۔

"اپنی خوشی کو کسی کے آنے جانے سے مشروط نہیں کرتے لٹل گرل۔"

"کیوں؟"

"زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔"

"وہ تو ہو بھی چکی۔" ساشا کا جواب بے ساختہ تھا۔

دبیر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"پھر ملتے ہیں کل۔"

"آئی ایم ویٹنگ۔" ساشا کا لہجہ پھر معنی خیز تھا۔

فون بند کر کے دبیر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

✲ ✲ ✲

بیوٹی سیلون میں اسے ایک گھنٹے سے زائد ہو چکا تھا، کئی بار اس نے چاہا کہ اپنا ذہن ہر قسم کے خیالات سے خالی کر کے اپنی سروس انجوائے کرے مگر دماغ اتنا الجھ چکا تھا کہ کوئی سرا ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ سبرینہ اور زائر کے بارے میں سوچ رہی تھی اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ ورکر لڑکی اس کے آگے نیم گرم پانی کا چھوٹا سا ٹب رکھے، اس میں پاؤں ڈالنے کو کہہ رہی تھی۔

"میم"، تیسری پکار پہ وہ ہڑبڑا کے سیدھی ہوئی۔

مینی کیور، پیڈی کیور کے بعد وہ گھر واپس آئی تو خلاف توقع سبرینہ کو اس وقت گھر میں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"ہاؤ آر یو ڈارلنگ۔" ہما نے بیٹی کو مسکرا کر دیکھا۔

"فائن۔" روکھے لہجے میں مختصر جواب دے کر اس نے ریموٹ ہاتھ میں لیا اور ٹی وی چلا دیا۔

"دانیال کیسا ہے!" ہما اس کے سامنے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ دانیال ایک معروف گلوکار اور فنکار تھا سبرینہ نے کچھ عرصہ پہلے ہما سے ذکر کیا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہیں۔

"پتا نہیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"کیا مطلب؟"

"بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی اور بات بھی اس لیے اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔"
صبوحینہ بات تو ہما کو بتا رہی تھی مگر اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔
"کوئی بات ہوئی ہے تم دونوں کے درمیان؟"
"کوئی بات ہی تو نہیں ہوئی' بس خاموشی سے ہو گیا جو ہونا تھا۔" صبوحینہ کے لبوں پہ ایک تلخ مسکراہٹ تھی۔
"چھوڑو دفع کرو' تمہارے لیے کیا کمی ہے لڑکوں کی" ہما نے اسے تسلی دینا چاہی تھی۔
"آپ کے لیے یہ بہت آسان ہے نا ممی' آپ نے تو اپنے لائف پارٹنرز کو بھی ایک کے بعد ایک دفعان کر دیا۔ آپ نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی' سوائے اپنے۔ آپ کے یہ میں نے کی ہے' میں اتنی آسانی سے اسے دفعان نہیں کر سکتی۔" صبوحینہ نے ہاتھ میں پکڑا ریموٹ زور سے کانچ کی میز پہ دے مارا۔ ہما سکتے کے سے عالم میں بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔
"میں نے کسی سے محبت نہیں کی سوائے اپنے آپ کے؟" وہ بے یقینی کی کیفیت میں گھری جیسے خود سے بول رہی تھی۔
"اور تم' تم دونوں سے؟ کیا اپنے بچوں سے بھی محبت نہیں کی میں نے؟" وہ حلق کے بل چلائی تھی۔
صبوحینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پہ پتھروں کی سی سختی تھی اور ان آنکھوں میں بے گانگی تھی' جو وہ ٹی وی اسکرین پر جمائے ہوئے تھی۔
"اپنی جوانی' اپنا بہترین وقت' اپنی محنت' اپنی محبت کیا کچھ نہیں دیا میں نے تم لوگوں کو؟ ہو نا آخر احسان فراموش' بے مروت اپنے باپ کی طرح۔" ہما طیش میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اب کے وہ بولی تو لہجے میں چٹان اور لفظوں میں آگ بھر کے بولی۔
"پہلے تو پھر بھی میں اپنے فیصلے کے بارے میں ڈانوا ڈول تھی۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔" صبوحینہ پہ ایک نگاہ ڈال کر وہ اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

اپنے تراشیدہ بالوں پہ گاگلز اٹکائے' نظر نہ آنے والا میک اپ چہرے پہ سجائے' وہ بالکنی میں مخصوص زاویے سے بیٹھی فرحت سے مخاطب تھی۔
"یہ لوگ آج بھی اپنی زندگیوں میں مگن ہیں' کل بھی ہوں گے۔ میرے لیے کیا ہو گا ان کے پاس؟ نہ وقت نہ محبت۔ میں اپنی خوشیوں کا سامان نہ کروں' اپنے برے وقت کے لیے نہ سوچوں' بس قربانیاں دیتی رہوں اپنی اولاد کے لیے؟ اور اولاد بھی ایسی جسے اپنی ماں کا کوئی احساس نہیں' جنہیں اپنے باپ کی باتیں ٹھیک لگتی ہیں۔ تم مجھے بتاؤ فرحت! کیا میں ہی غلط ہوں' ساری غلطیاں میری ہیں؟ میری بیٹی کہتی ہے میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی سوائے اپنے آپ کے' دیکھو تو ذرا' کیسی سخت بات کہی اس نے۔ سچ میں بہت ہرٹ کیا اس نے مجھے۔" ہما کی آنکھیں اور آواز بھیگ چلی تھیں۔
زندگی یوں بھی الجھ جاتی ہے۔ صحیح غلط میں اور غلط صحیح میں کچھ اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ الگ کرنا تو دور کی بات دونوں کی الگ الگ شناخت تک مشکل ہو جاتی ہے۔ فرحت بھی اسی الجھن میں تھی کہ ہما کو سمجھانے کے لیے کون سے الفاظ منتخب کرے۔ ابھی تو خود اس کی سمجھ میں ٹھیک سے نہیں آ رہا تھا کہ ہما' صادق غلط ہے یا اس کے بچے؟ اور اگر دونوں ہی اپنی اپنی جگہ درست ہیں تو ان سب کے بیچ غلط کیا ہے؟
ہر انسان نہ مکمل فرشتہ ہوتا ہے نہ پورا شیطان' وہ اچھا بھی ہوتا ہے برا بھی' خوبیوں کا' خامیوں کا دونوں کا ملاپ' اچھائی اور برائی دونوں کا مکسچر' انسان ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ کبھی وہ نیک ہوتا ہے' کبھی بد' کبھی صحیح کبھی غلط' کبھی کسی کے ساتھ اچھا' کبھی کسی کے ساتھ برا۔ کبھی ظالم کبھی مظلوم۔ ہما صادق کو وہ کیسے کسی ایک کیٹیگری میں رکھے؟ فرحت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
ہما بھی اسے زیادہ امتحان میں نہیں ڈالتی تھی۔ بڑی

آزمائش میں مبتلا نہیں کرتی تھی فرحت نے کوئی رائے دی ہما نے تبصرہ کیا تو ٹھیک وگرنہ وہ خود ہی اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیتی۔

"فرحت۔" ہما نے بالکنی سے سامنے دیکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"مجھے یہ منظر ہمیشہ سے جانا پہچانا لگتا تھا بالکنی سے باہر جھانکو تو سڑک پھر بڑا سا میدان اس کے پیچھے پھر ایک روڈ اور روڈ سے ذرا پرے پرانے بنے ہوئے مکانات۔" ہما کھوئے کھوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

"ہمارا گھر ایسا ہی تو تھا' اسی طرح اس گھر کی چھت پہ کھڑے ہو کر ہم کتنی کتنی دیر باہر کا نظارہ کرتے رہتے تھے' باتیں کرتے رہتے تھے۔ تم آتی تھیں نا ہمارے گھر۔" فرحت نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں' تب ہی مجھے سب کچھ جانا پہچانا سا لگتا تھا مگر یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ جیسے بہت' بہت عرصے پہلے کی بات ہو' سالوں گزر گئے ہوں' جیسے بچپن کی کوئی بھولی بسری یاد۔" ہما نے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ بچپن تو نہیں تھا' جوانی ہی تھی' پھر اتنی دور کیوں محسوس ہوتا ہے وہ وقت؟ کیا ہماری جوانی گزرے بہت زیادہ عرصہ گزر گیا؟ گزری صدی کے آخری عشروں میں دنیا بہت تیزی کے ساتھ بدلی ہے اور اس نئی صدی میں تو جیسے روز ہی کوئی نئی تبدیلی آتی ہے جب ہر آنے والا دن اتنے نئے پن کے ساتھ آئے کہ گزرا کل پرانا لگنے لگے تو پچیس سال پہلے کی دنیا تو قدیم لگنی ہی لگنی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی خواب۔" فرحت نے مسکراتے ہوئے توجیہہ پیش کی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو' وہ سب کچھ ایک خواب ہی لگتا ہے کبھی۔" ہما بظاہر سامنے دیکھ رہی تھی مگر حقیقت میں وہ کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔

"میرے لباس میں' میرے انداز میں' میرے رہن سہن میں' بودوباش سب میں مشرق سے زیادہ مغرب کا رنگ آگیا ہے۔ اب کبھی کبھار خیال آتا ہے تو یقین نہیں آتا کہ تم اور میں بازار جاتے وقت سر پر چادر لے لیا کرتے تھے' سر سے پاؤں تک اسے لپیٹے جامع کلاتھ کے کتنے چکر لگایا کرتے تھے' ہے نا۔"

"یہ تو تم نے واقعی بہت پرانی یاد تازہ کی ہے۔ یہ تو ہمارے ٹی وی میں بھی آنے سے پہلے کی بات ہے۔" فرحت مسکرادی۔

"پھر دنیا بدلتی چلی گئی اور ہم بھی بدل گئے۔"

"دنیا بدلنے سے ہم نہیں بدلتے بلکہ ہمارے بدلنے سے دنیا بدلتی ہے' دنیا ہم انسانوں سے ہی تو عبارت ہے۔" فرحت نے تصحیح کی۔

"تمہارے گھر آکر مجھے بہت سکون ملتا ہے' حالانکہ گرمی بہت لگتی ہے۔ عادت نہیں رہی نا بغیر اے سی کے رہنے کی۔" ہما کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو گیا۔ "پھر بھی مجھے یہاں آکر اچھا لگتا ہے' مگر....." وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی جیسے آگے اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہی ہو۔

"مگر..... میں اس طرح زندگی نہیں گزار سکتی' تمہاری طرح۔ چاہوں بھی تو..... اب اس طرح..... میں اپنی لائف میں ریورس گیئر نہیں لگا سکتی۔" وہ رک رک کر بول رہی تھی۔

"تو تمہیں کس نے کہا اپنا آپ چینج کرنے کو؟" فرحت نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"شاید میرے دل نے یا دماغ نے؟ یوں ہی ایک بار میں نے سوچا مگر..... اس سوچ پر عمل کا سوچ کر ہی میں ہمت ہار گئی۔" وہ نہ جانے کیوں صفائی پیش کر رہی تھی۔ حالانکہ فرحت نے تو کبھی اس سے نہیں کہا کہ وہ آگے جاتے اپنے قدموں کو پیچھے کی طرف موڑ لے' واپسی کا سفر کوئی آسان تو نہیں ہوتا۔ ماضی میں جھانکنا اچھا لگتا ہے' پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے میں مزا آتا ہے مگر ان ہی راستوں پہ دوبارہ قدم رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

"ہما میں تمہاری خوشیوں کے لیے دعا کرتی ہوں۔ خدا تمہیں اس غم سے محفوظ رکھے جس سے میں گزری ہوں۔" فرحت نے بہت سچائی کے ساتھ اس سے یہ الفاظ کہے تھے۔

"تم نہ بھی کہو تو مجھے معلوم ہے۔ اس دنیا میں ایک

تم ہی ہو جو صدق دل سے میرے لیے دعا کرتی ہو اور کر سکتی ہو۔" ہما کی ممنون نگاہیں فرحت پر جمی ہوئی تھیں۔



"زہے نصیب میں تو مایوس ہی ہو گئی تھی۔" ساشا نے دبیر کو کھڑا دیکھا تو لپک کر آئی۔

"جب میں نے کہا تھا آنے کا تو کیوں نہ آتا' وعدہ نبھانا آتا ہے جناب اور کتنی دیر سے آیا ہوا ہوں میں' مہمان موجود میزبان غائب۔" دبیر نے مسکراتے ہوئے اس کا گفٹ پکڑایا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔ آپ آ گئے' کافی ہے میرے لیے۔" ساشا نے آج کی اس چھوٹی سی گیدرنگ کے لیے بھی اتنا اہتمام کیا تھا کہ وہ نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی اور نظر تو پھر نظر ہے' با ارادہ بھی اٹھ جاتی ہے اور بلا ارادہ بھی۔ دبیر صوفے پہ بیٹھا تھا اور ساشا دور جاتے ہوئے بھی اور قریب آتے ہوئے بھی اس کی نظروں کا ارتکاز پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ کھانے سے پہلے' کھانے کے دوران بھی اور کھانے کے بعد پتا نہیں کتنی سیلفیاں لی گئیں سب کے ساتھ' دبیر تو خاص مہمان تھا۔ میزبان کی مرضی اور خوشی میں خوش سیلفیاں بنواتا رہا۔ دبیر پارٹی سے گھر واپسی کے لیے پر تول رہا تھا جب ہما کا فون آیا اس کے پاس۔

"ہیلو' کیسی ہیں آپ۔" موبائل کان سے لگائے لگائے وہ باہر آ گیا۔

"میں ٹھیک ہوں' تم سناؤ' کہاں ہو؟ بڑے شور شرابے کی آوازیں آ رہی ہیں۔"

"ایک پارٹی میں انوائیٹ تھا ساشا کے گھر' بس نکلنے ہی والا تھا۔"

"ساشا کے گھر! کیسی پارٹی ہے۔" ہما تھوڑی سی حیران ہوئی۔

"اس کا رزلٹ آیا ہے تو اس خوشی میں۔"

"رزلٹ آنے پہ کلاس فیلوز اور فرینڈز کو پارٹی دی جاتی ہے۔" ہما کے چبھتے ہوئے لہجے میں بین السطور سوال موجود تھا کہ تم اس کے کون لگتے ہو؟

"کم آن' مجھے ایک دعوت ملی میں اس میں چلا گیا۔ بات ختم۔ اب پلیز اسے اشو نہ بنائیں' مجھے اس قسم کی تفتیش سے بہت چڑ ہوتی ہے۔" دبیر کا لہجہ واضح بیزاری لیے ہوئے تھا۔ ہما خاموش ہو گئی۔

"تمہیں برا لگا؟"

"جی' مجھے اس طرح کا لہجہ اور اس قسم کی باتیں بہت بری لگتی ہیں۔" وہ ایسا ہی تھا دو ٹوک۔

"آئم سوری دبیر' مجھے پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی میں بہت ان سیکیور فیل کرتی ہوں۔"

"اس وقت' فون پہ تو میں آپ کو کچھ سمجھا نہیں سکتا' کہیے فون کیسے کیا؟"

"کل ڈنر کا پروگرام رکھ لیں؟"

"کل.....؟" دبیر سوچنے لگا۔

"میرا کل کا شیڈول کافی ٹائٹ ہے' میں کوشش کروں گا۔ ایسا کرتا ہوں کل دوپہر میں آپ کو فون کر کے بتا دوں گا' ٹھیک ہے۔"

"فون کرو گے نا؟"

"آف کورس' کروں گا۔" وہ حیران ہوا۔ "آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟"

"میں..... مجھے پتا نہیں..... اچھا چلو کل ملتے ہیں ٹھیک ہے۔ میں فون بند کر رہی ہوں' او کے۔" زندگی کی طرح ہما کے جملوں میں بھی کوئی ربط نہیں تھا۔

"او کے....." دبیر نے موبائل کان سے ہٹا کر جیب میں رکھا' کچھ دیر وہ وہیں کھڑا سوچتا رہا پھر اندر چلا گیا۔



رات آدھی سے بھی زیادہ گزر گئی تھی وہ نیند کی گولیوں کے بغیر سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر ہنوز ناکام تھی۔ یہی نیند تھی جو کبھی اس پر یوں مہربان تھی کہ دن دیکھتی تھی نہ رات' وقت بے وقت نیند کو بلانے کے لیے اسے کوئی خاص تردد نہ کرنا پڑتا تھا سوائے آنکھیں بند کرنے کے اور اب..... اب تو نیند

بھی بری طرح روٹھ گئی تھی سب کی طرح، کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تو ہما صادق اٹھ کر بیٹھ گئی۔
تنہائی کتنی وحشت ناک ہوتی ہے اور نیند کا روٹھ جانا کیسا عذاب ہوتا ہے۔ اے سی کی کولنگ شاید بہت تیز تھی، تب ہی ہلکی سی چادر میں وہ یوں کپکپا رہی تھی۔

اکیلے پن اور سناٹے کے ساتھ اتنے بڑے گھر میں رہنا کوئی مذاق تو نہیں، اوپر سے نیند کیا یہ دوائی کے بغیر نہیں آسکتی جیسے پہلے آتی تھی، پہلے کبھی، سالوں پہلے، جب... ہما صادق کا ذہن برسوں پیچھے بھٹک رہا تھا۔
آخر میں ماضی کو اتنا کیوں سوچنے لگی ہوں۔ میں بہت زیادہ ناسٹیلجیک ہو گئی ہوں۔ ماضی کو سوچتے سوچتے اچانک ہی اس کے ذہن نے قلابازی کھائی تھی۔

"کیا میں بوڑھی ہو رہی ہوں؟" وہ بیڈ سے نیچے اترنے لگی۔
انسان جتنا بوڑھا ہوتا جاتا ہے اتنا ہی ماضی میں سفر کرنے لگتا ہے۔ اپنے گزرے وقت کو سوچتا ہے، یاد کرتا رہتا ہے۔ آئینے کے سامنے کھڑی وہ خود کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔
کیا آئینہ مجھے بتائے گا کہ میں بوڑھی ہو رہی ہوں یا نہیں۔ وہ اپنا چہرہ آئینے کے قریب لے گئی پھر اک دم پیچھے ہو گئی۔ آئینہ کون سا سچ بولتا ہے، اسے تو جو دکھاؤ وہی دکھاتا ہے۔ جب اس کے سامنے سجی سنوری، میک اپ اور تمام لوازمات سے آراستہ ہما صادق کھڑی ہوتی ہے تو وہ اسے خوب صورت، جوان اور گریس فل دکھاتا ہے اور اس وقت آدھی رات میں بغیر کسی میک اپ کے جو پریشان حال ہما صادق اس کے سامنے کھڑی تھی اسے وہ ایک اجڑی بکھری عورت دکھا رہا تھا۔
انسان بھی دغاباز ہے اور چیزیں بھی۔ ہما نے انتہائی نفرت سے آئینہ دیکھا اور مڑ کر واپس بیڈ پہ چلی گئی۔ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ آئینہ اس پر ہنستے ہوئے بتا رہا تھا کہ اس نے دراصل آئینے کو نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

بیڈ پہ کچھ دیر وہ یونہی بیٹھی رہی پھر موبائل اٹھا کر نمبر ملانے لگی۔ گھنٹی بجتی رہی پھر دوسری طرف سے لائن منقطع کر دی گئی۔ اس نے پھر نمبر ملایا۔ پھر بھی ہوا بیل بجتی رہی اور پھر لائن کاٹ دی گئی۔ وہ پھر نمبر ملاتی رہی بار بار، ساتویں بار اسے فون بند ملا۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے فون کو دیکھا۔ بےدردی سے اپنی بھیگی آنکھیں رگڑیں اور دوسرا نمبر ملانے لگی۔
"ہیلو۔" عالم حسین نے اسے زیادہ انتظار نہیں کروایا تھا۔
"زائر سے میری بات کرواؤ۔" اپنی آواز کی شکستگی پہ قابو پا کر وہ بغیر کسی تمہید کے گویا ہوئی۔
"تمہارے پاس زائر کا نمبر نہیں ہے۔"
"وہ فون کاٹ رہا ہے میرا۔" ہما نے چیخ کر جواب دیا۔
"پھر میں کیا ہیلپ کر سکتا ہوں تمہاری۔"
"تم نے بھڑکایا ہے اسے میرے خلاف، شرم نہیں آتی ایسی اوچھی حرکتیں کرتے ہوئے۔" وہ بھڑک رہی تھی۔
"تمہارے خلاف بچے، تمہاری اپنی حرکتوں کی وجہ سے ہوئے ہیں، میرا کوئی کمال نہیں اس میں۔" عالم حسین کا انداز استہزائیہ ہو گیا۔
"تم کچھ بھی کر لو، میرے بچے مجھ سے زیادہ دیر دور نہیں رہ سکتے۔ لوٹ کر میرے ہی پاس آئیں گے۔ میں ماں ہوں ان کی۔" ہما شاید اس سے زیادہ خود کو باور کرا رہی تھی۔
"تم صرف ایک مغرور، خود پسند اور گھمنڈی عورت ہو۔ نہ کسی کی ماں بن سکتی ہو نہ بیوی۔"
"اور تم، تم کیا ہو؟ احساس کمتری کا مارا ایک شوہر جس کو نہ بیوی کی صلاحیت و قابلیت ہضم ہوئی نہ شہرت۔" ہما صادق کے تو تلووں پہ لگی اور سر پہ بجھی۔ حساب "فورا" کے فورا" بےباق کرنا تو اس کی پرانی خصلت تھی۔
"شوہر پہ شوہر بدلنے میں تو تم ماہر ہو مگر خود کو نہ بدل سکیں آج تک۔" عالم حسین زخموں پہ نمک چھڑک

رہا تھا۔

"تمہاری زبان بھی تو ویسی ہی ہے جیسی آج سے پچیس سال قبل تھی۔ دو دھاری تلوار' ہر طرف سے انسان کو زخمی کرنے والی۔"

"کیا تم نے مجھے باتیں سنانے کے لیے اس وقت فون کیا ہے؟"

"میں نے نہ باتیں سنانے کے لیے فون کیا ہے نہ سننے کے لیے' مجھے اپنے بیٹے سے بات کرنی ہے۔ تم اس کے کان بھرنا بند کردو۔ اس سے کہو مجھ سے بات کرے' میرا فون اٹینڈ کرے۔"

"ٹھیک ہے' میں تمہارا میسیج دے دوں گی۔" عالم حسین نے خدا جانے اس سے جان چھڑانی چاہی تھی یا واقعی اس پر ترس آگیا تھا۔

فون بند کرکے وہ کتنی ہی دیر یوں ہی خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی رہی۔ عالم حسین سے بات کرکے پرانے زخم جیسے پھر سے ہرے ہونے لگے تھے۔

شادی کے چند سالوں بعد ہی ان کے درمیان لڑائی جھگڑے شروع ہوگئے تھے۔ آئے دن ہونے والی جھڑپوں کی بس ایک ہی وجہ تھی' ہما کا اداکاری چھوڑنے سے انکار اور عالم حسین کا شوبز چھوڑنے پہ اصرار۔

"تمہیں گھر اور بچے سنبھالنے والی بیوی چاہیے تھی تو کسی گھریلو لڑکی سے شادی کرتے مجھ سے کیوں کی؟" ہما تڑخ جاتی۔

"گھر اور بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔" عالم حسین بھی ناک سے دھواں نکالتا۔ "تم نہیں دیکھو گی تو کون دیکھے گا' نہیں؟"

"میں کوئی دھوبن' باورچن یا آیا نہیں' آرٹسٹ ہوں۔ جب تم اپنا پروفیشن نہیں چھوڑ سکتے تو میں کیوں چھوڑوں۔ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ملازم ہیں تو سہی۔"

"ملازمہ' بچوں کی ماں نہیں بن سکتی' ہما نہیں وہ وقت اور محبت نہیں دے سکتی جو تم دے سکتی ہو۔"

"مجھے اپنے فرائض اچھی طرح معلوم ہیں۔" ہما

روز کی چخ چخ سے بے زار ہوگئی تھی۔

دس سال ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے بعد دونوں کا ضبط جواب دے گیا۔ علیحدگی ہوگئی تو دونوں نے سکون کا اور سکھ کا سانس لیا۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ یہ علیحدگی ایک پھانس بن کر ہما کے دل میں کہیں اٹکی ہوئی تھی' شاید خلیل جبران کا یہ فلسفہ ہما صادق جیسے لوگوں پہ صادق آتا ہو کہ ہم زندگی میں فقط ایک بار محبت کرتے ہیں اور پھر باقی تمام محبتیں اس ایک محبت کو بھلانے کے لیے ہوتی ہیں۔

وہ اپنے تئیں سوچتی تھی کہ اس نے عالم حسین سے جتنی محبت کی تھی' بعد میں نفرت بھی اسی قدر کی مگر محبت و نفرت کی گتھی بھی خوب ہے' اپنے آپ کو نفرت کی رسیوں سے باندھتے باندھتے احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ اس میں جابجا محبت کی گرہیں لگی ہیں۔

ہما صادق اکثر خود کو باور کراتی تھی۔ "آئی ہیٹ یو عالم حسین۔"

اسے کبھی احساس تک نہیں ہوا کہ کسی کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کے دو ہی بہانے ہوتے ہیں' نفرت یا محبت وگرنہ جس سے کوئی لگاؤ نہ ہو' جس سے کوئی ربط نہ رکھنا ہو' کوئی تعلق نہ رکھنا ہو' اس سے نفرت کا رشتہ بھی کیوں؟ نفرت بھی تو "یاد" کو اسی طرح تازہ اور زندہ رکھتی ہے جس طرح محبت۔

رات کے تیسرے پہر اپنے بیڈ روم میں اکیلی بیٹھی وہ زارو قطار رو رہی تھی۔ ان محبتوں اور نفرتوں پر جو اس نے لوگوں سے کیں اور جو لوگ اس سے کر رہے تھے۔



سادہ سا ڈرائنگ روم' معمولی سا فرنیچر' جس پہ بیٹھے افراد بھی سادہ مزاج ہی تھے۔ لکڑی کی سینٹر ٹیبل پر کھانے پینے کے کچھ لوازمات سجے تھے۔

فرحت نے سامنے صوفے پہ بیٹھی دونوں خواتین کو دیکھا جو سرتاپا حجاب میں ملبوس تھیں' چہرہ کھلا ہوا تھا کہ

وہاں فرحت اور کرن کے علاوہ کوئی مرد نہیں تھا۔
"آپ یہ لیجئے نا۔" فرحت نے سموسوں کی پلیٹ ان کی طرف بڑھا کر آداب میزبانی نبھائے۔
"ناحق تکلف کیا آپ نے' اتنی اچھی اور پیاری بچی کے گھر کا سادہ پانی بھی ہمارے لیے بہت شیریں ہے۔" یہ نور الصباح تھیں۔ کرن جس مدرسے میں جاتی تھی اس کی نگراں' منتظم اعلا۔ اب تو کرن بھی اپنا کورس مکمل کرکے ان ہی کے پاس پڑھا رہی تھی۔ ان کے ساتھ ان کی بہن تھیں۔ فرحت سے انہوں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ وہ کچھ خاموش سی ہو گئیں۔
"آپ جانتی ہیں کہ میں..." فرحت نے جھجک کر بات شروع کی پھر ادھوری چھوڑ دی۔ نور الصباح اپنی بہن کو دیکھ کر مسکرا دیں پھر کہنے لگیں۔
"میں بھی اس وقت تقریباً" آپ ہی کی عمر کی تھی' جب ٹی وی پہ آپ کے ڈرامے بڑے شوق سے دیکھا کرتی تھی۔ ہمارے گھر کا ماحول نہ بہت زیادہ آزاد تھا نہ بالکل ہی مذہبی۔ بس ان دونوں کے بین بین' گھر میں رکھے ٹی وی' ریڈیو سننے' دیکھنے پہ کوئی پابندی نہیں تھی ہاں ہماری اماں کو سنیما جانا پسند نہیں تھا مگر ابا اجازت دے دیا کرتے تھے' پھپھو اور بڑے بھائی کے ساتھ جانے کی۔ پھر ہم دونوں بہنوں کی شادی دو بھائیوں سے ہو گئی۔ یہ بدلاؤ شادی کے بعد آیا ہے۔ کسی جبر سے نہیں بلکہ پورے شعور کے ساتھ سوچ سمجھ کر اس راستے پر قدم رکھا ہے۔" وہ ایک لمحے کو رکیں۔
فرحت غور اور دلچسپی سے انہیں سن رہی تھیں مگر ان کے سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا تھا۔ وہ بھی شاید فرحت کی بے چینی بھانپ گئیں۔ اس بار بولیں تو بغیر کسی تمہید کے گویا ہوئیں۔
"آپ کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔ خود کو منوانے کی خواہش بڑی منہ زور ہوتی ہے۔ شہرت کا نشہ بڑا ظالم بڑا مہلک ہوتا ہے۔ آپ نے ان دونوں کو پچھاڑ دیا۔ آپ ایک بہادر خاتون ہیں۔ دنیا میں بہت سے انسانوں کو بڑے بڑے غم ملتے ہیں مگر ان میں چند خوش نصیب ہی ایسے ہوتے ہیں جو اپنے دکھوں کے ذریعے اللہ کے قریب ہو جاتے ہیں۔ میں جو دست سوال لے کر یہاں آئی ہوں تو آپ سے متاثر ہو کر ہی آئی ہوں۔"
ان کے شیریں لب و لہجے کی حلاوت اور ایک قابل قدر عزت و محبت کے احساسات فرحت کے دل میں گھر کرتے چلے گئے۔ انہیں یقین تو تھا کہ اللہ انہیں اکیلا نہ چھوڑے گا۔ ان کی مشکلات ضرور حل کرے گا۔ اللہ سے سچی بات بھلا کس کی ہو سکتی ہے کہ اس پہ بھروسہ رکھنے والے کو توکل کرنے والے کو وہ ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتا ہے جہاں بندے کا دھیان' گمان بھی نہیں ہوتا۔
کچھ دنوں سے انہیں خوابوں میں بڑے اچھے اشارے مل رہے تھے۔ لگتا ہے ان خوابوں کی تعبیر کا وقت قریب آگیا ہے۔ گہری طمانیت کا احساس' سکون بن کر فرحت کے چہرے پہ چھا گیا تھا۔



پتا نہیں موبائل کب سے بج رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھی کہ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے خواب میں گھنٹیوں کی آوازیں سن رہی ہو' جب مسلسل بجتا ہوا موبائل دماغ پہ ایسے اثر انداز ہوا کہ نیند کی وادیوں سے جیسے کوئی گھسیٹ کر اسے بیداری کی دنیا میں لا رہا ہو تو اس نے مندی مندی آنکھیں بمشکل کھولتے ہوئے موبائل اسکرین پہ نگاہ کی۔
"ڈیئر کالنگ۔" اس کی آنکھیں فوراً" کھل گئیں۔
"ہیلو۔" آواز میں غنودگی کا اثر تھا۔ تب ہی ڈیئر نے سوال کیا تھا۔
"سو رہی تھیں؟"
"ہاں' ابھی اٹھی ہوں تمہاری کال سے۔" ہما نے جمائی لیتے ہوئے منہ پہ ہاتھ رکھا۔
"سوری میں نے ڈسٹرب کیا۔"
"تم کر سکتے ہو۔"
"سو نائس آف یو۔" وہ شاید مسکرایا تھا۔
"اچھا میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ آج ڈنر پہ مل رہے ہیں ہم۔"

"کہاں؟"

"آپ کی فیورٹ جگہ ' دو دریا میں پک کرلوں گا آپ کو ' آٹھ بجے تک ریڈی رہیے گا ' ٹھیک ہے۔"

"اور کوئی حکم؟"

"ابھی تو فی الحال اتنا ہی ' اوکے۔ اب میں ذرا بزی ہوں اپنے کام ختم کرلوں؟ اجازت ہے۔"

"اوکے ' خدا حافظ۔" ہما نے فون آف کیا تو نیند آنکھوں سے رخصت ہو چکی تھی۔ وہ اپنی ساری کسل مندی اور تھکن (جو جسمانی سے زیادہ ذہنی تھی) کو گڈ بائے کہتے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑی تھی ' متورم آنکھیں ' ستا ہوا چہرہ ' ایک لمحے کو وہ خود کو پہچان بھی نہ سکی۔

اف ' انگوٹھی اور شہادت کی انگلی سے اس نے اپنی پیشانی سہلائی ' آج تو دوپہر سے ہی پارلر میں جا کر بیٹھنا پڑے گا۔ اپنے آپ کو تشویش سے دیکھتے ہوئے وہ سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔



رات ٹھیک آٹھ بجے جب دبیر اسے پک کرنے آیا تو وہ بالکل تیار تھی ' ہلکے سے کام کی فیروزی شیفون کی ساڑھی میں اس کا سراپا خوب جچ رہا تھا ' تقریباً" چھ گھنٹے پارلر میں گزارنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدلے ہوئے نئے ہیئر اسٹائل اور خوب صورت میک اپ میں بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

"واؤ ' ویری گڈ لکنگ یو آر" دبیر گاڑی کا دروازہ اس کے لیے کھولے کھڑا تھا ' کچھ ٹھٹک سا گیا۔

"گزرتا وقت اتنے حسین ستم بھی کرتا ہے؟"

"مجھے احساس نہ دلاؤ ' نہ گزرتے وقت کا ' نہ گزرے وقت کا ' بس آنے والے وقت کے بارے میں بات کرو۔" ساڑھی کا پلو نزاکت سے سنبھالے وہ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ دبیر کچھ نہ بولا بس مسکرا کر رہ گیا۔

ویٹر کو آرڈر کرنے کے بعد دبیر ابھی ٹھیک سے بیٹھا بھی نہیں تھا کہ ہما نے اپنے موبائل کی اسکرین اس کے سامنے کی۔

"یہ کیا ہے دبیر؟"

"کیا ہے؟" دبیر نے جھک کر پلکیں جھپکائیں پھر سیدھا ہو بیٹھا۔

"کل ساشا کے گھر پارٹی کی سیلفیز ہیں۔" (جو ساشا نے اپنی فیس بک آئی ڈی پہ پوسٹ کررکھی تھیں۔)

"اتنی کلوز؟"

"کم آن۔" وہ بد مزا ہوا۔

"کلوز میں نہیں ' وہ ہوئی تھی۔ سیلفیز بھی میں نے نہیں اس نے لی تھیں۔"

"یہ چاہتی کیا ہے؟"

"آپ کیا چاہتی ہیں اس وقت ' یہ کہ میں یہاں سے اٹھ کر چلا جاؤں؟" دبیر کا غصہ بھی اس کی محبت کی طرح تھا ' بہت شدید اور بڑا ظالم ' ہما صادق نے ایک نظر موبائل اسکرین پہ چمکتی سیلفی کو دیکھا اور دوسری نظر سامنے بیٹھے دبیر پہ ڈالی۔ ایک جھوٹی زندگی میں وہی تھا جو سب سے بڑا سچ تھا اگر یہ سچ بھی زندگی سے نکل جائے تو باقی کیا رہ جائے گا؟ وہ سہم گئی۔

"تم نے کہا تھا کہ میں اب مزید ڈلے (تاخیر) نہ کروں۔" ہما نے ایک نظر اس کے ناراض چہرے کو دیکھا جو اس کی جان لے رہا تھا۔

"یس۔" دبیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر ' کمنگ سنڈے ٹھیک رہے گا؟" ہما نے رکتے رکتے کہا دبیر کے چہرے پہ حیرت اور خوشی کے تاثرات نے جگہ بنائی۔

"آج جمعرات ہے ' فرائی ڈے ' سٹرڈے ' دو دن ہیں بس درمیان میں۔"

"ہاں۔" ہما نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آر یو شیور؟" دبیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اس نے وہ آنکھیں بند کر کے جواب دیا تھا۔

واپسی پہ دبیر نے اسے گھر پہ ڈراپ کر دیا تھا۔ وہ اندر آئی تو ملازمہ لاؤنج میں بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

"سکینہ۔" اس کی آواز پہ وہ اک دم ہی مستعد ہو گئی۔

"جی بیگم صاحبہ۔"
"سبرینہ آگئی۔"
"جی وہ تو شام سے ہی گھر پر ہیں آج۔"
"اچھا... کھانا کھایا اس نے۔"
"نہیں میں نے پوچھا تھا مگر منع کر دیا کچھ منگایا بھی نہیں باہر سے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" وہ سوچتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی' سکینہ اپنے سرونٹ کوارٹر میں چلی گئی۔

"سبرینہ۔" اس نے اس کے بیڈ روم کا دروازہ بجایا' وہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ ہاتھ کا دباؤ پڑا تو اندر کھلتا ہی چلا گیا۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔

"سبرینہ!" اس نے ٹیرس میں کھلنے والا دروازہ کھولا' جہاں سے اسے کچھ ناگوار سی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ سبرینہ ٹیرس پہ تنہا بیٹھی ہوئی تھی' ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ اور سامنے میز پہ رکھی ایش ٹرے میں سگریٹ کے چند ٹوٹے پڑے ہوئے تھے۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم؟" اس نے بے حد تاسف اور حیرانی سے اپنی لائق فائق ذہین بیٹی کو دیکھا۔

"وہی جو آج سے چند سال قبل آپ بھی کرتی تھیں۔" سبرینہ نے بغیر کسی جھجک کے بڑی بدلحاظی اور بددماغی سے جواب دیا تھا۔

"میں بہت ٹینس تھی اس وقت۔" ہما نے اپنی بیٹی کو دیکھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو ترحم کی نگاہ سے دیکھے۔ یا خود کو۔

"آج میں بہت ٹینس ہوں۔" سبرینہ نے سگریٹ کا ٹوٹا ایش ٹرے میں بے دردی سے مسلا۔

ہما نے اب اسے غور سے دیکھا تھا جو ایک رف سی جینز اور ایک ملگجی سی شرٹ میں ملبوس تھی۔ وہ بہت نفیس لڑکی تھی' اس طرح' اس حال میں دیکھنے کا تصور ہما نے تو کیا' خود اس نے بھی اپنے لیے نہیں کیا ہوگا۔

"جسے تمہاری کوئی پرواہ نہیں' کیا اس کے لیے خود کو اس طرح تباہ کر دوگی۔" ہما کو غصہ آنے لگا۔

"یہ ایک فیز ہے' گزر جائے گا میں نارمل ہو جاؤں گی۔ آپ اس وقت مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش نہ

کریں۔ پلیز۔" وہ ماں کی طرف سے منہ پھیر کے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"تم.... لندن کیوں نہیں چلی جاتیں' کچھ چینج ہو جائے گا۔" کوشش کے باوجود بھی وہ عالم حسین کا نام نہ لے سکی۔ سبرینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"جب یہ ٹھکانہ نہیں رہے گا تو اگلا ٹھکانہ ڈیڈ کا گھر ہی ہے۔" ہما چپ چاپ کھڑی اسے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اس نے خود کو کہتے سنا۔

"اس سنڈے میں اور دبیر نکاح کر رہے ہیں۔"

سبرینہ کی حیران آنکھوں میں بے یقینی اتر آئی۔ وہ کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"ممی.... آپ۔" اس نے انگلی اٹھا کر طیش میں کچھ کہنا چاہا مگر جانے کیا سوچ کر خاموش ہو گئی۔

"اف.... دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے' بے یقینی سے اسے ہلاتے ہوئے وہ ہما کے قریب سے گزر کر چلی گئی۔

ہما کو اپنی ٹانگیں بے جان سی لگ رہی تھیں۔ شاید اتنی دیر سے کھڑے رہنے کی وجہ سے' وہ سبرینہ کی چھوڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔



مسز دبیر کی حیثیت سے وہ اس کی پہلی پارٹی تھی بیوٹیشن نے اور خود ہما نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اور ناکام کوئی نہیں ہوا تھا' نہ بیوٹیشن نہ مسز دبیر مرزا خوب صورتی اور وقار و متانت کا امتزاج اپنی شخصیت میں سمیٹے وہ دبیر کے ہمراہ پارٹی میں آئی تو سب کی نظریں ان دونوں پر تھیں۔ مختلف نظروں میں مختلف تاثرات تھے۔ کچھ کی نگاہوں میں حسد تھا تو کچھ کی نظروں میں استہزا' تمسخر تھا کچھ رشک سے دیکھ رہے تھے' کچھ حیرت سے' مگر یہ تو صرف دل و نگاہ کی بات تھی جو مخفی تھی۔ اپنی زبانوں سے تو سب نے ان کے منہ پہ انہیں مبارک باد ہی دی تھی۔

ہما' اکیلی کھڑی دبیر کو ڈھونڈ رہی تھی جسے ایک بے تکلف دوست کچھ دیر پہلے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ہما کی ڈھونڈتی ہوئی نگاہوں نے بالآخر اسے کھوج ہی لیا۔ وہ کچھ دور اپنے فرینڈز کے سرکل میں کھڑا چہک رہا تھا۔ ہما اس کی طرف جانے لگی' گزرتے ہوئے پھولوں کے ایک کنج کے پیچھے سے آتی آوازوں میں' اپنے نام پر وہ ٹھٹک گئی۔ اس کی کچھ ساتھی فنکارائیں کھڑی اس پر تبصرہ کر رہی تھیں۔

"میں تو سچی' ہما کی اس حرکت پر شرم سے گڑ گئی زمین میں' ہارون کو فوت ہوئے سترہ برس ہونے کو ہیں کبھی کسی کی جرات نہیں ہوئی' انگلی اٹھا کر کچھ کہنے کی۔ عزت کے ساتھ اس فیلڈ میں کام کر رہے ہیں۔ ایسی ہی حرکتوں پہ لوگ ہماری فیلڈ اور ہمارے متعلق الٹی سیدھی باتیں بناتے ہیں۔" یہ عالیہ انصاری تھی۔ ہما سے بڑے اچھے تعلقات تھے اس کے' مگر اب وہ کھنچی کھنچی سی رہنے لگی تھی ہما سے۔

"آج کی ینگ جنریشن کو تو جانتی ہی ہو' کتنی منہ پھٹ ہے۔ میرا بیٹا مجھ سے کہنے لگا کہ اگر میں زائر کی جگہ ہوتا تو سوسائیڈ کر لیتا۔ میں نے کہا توبہ کرو بیٹا' تمہاری ماں کوئی ہما صادق تھوڑی ہے۔" عارفہ احتشام بڑی اترا اترا کر بول رہی تھی۔

"بتاؤ ذرا' اتنی بڑی دنیا میں اس عورت کو بیٹے کا دوست ہی ملا تھا بیاہ رچانے کے لیے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ کتنے دن چلے گی یہ شادی۔" انیتا خان کیوں پیچھے رہتی جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں۔

"تو اور کیا۔" پروا کاظمی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"ڈھلتی شام کے سائے تلے کوئی کتنی دیر سفر جاری رکھے گا؟ رات ہونے پہ' اندھیرا چھانے پہ مسافر سفر اور ہم سفر دونوں چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔" پروا کاظمی شاعرہ بھی تھی سو شاعرانہ توجیہات پیش کر رہی تھی۔

ہما کے لیے مزید کچھ سننا سوہان روح تھا' وہ تیز قدموں سے آگے چل پڑی مگر اب اس کا چہرہ وہ نہیں تھا جسے لے کر وہ اس پارٹی میں آئی تھی۔



"بہت بہت مبارک ہو تمہیں' اب تم کرن کے

فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گی۔ سچ میں تمہاری خوشی دیکھ کر مجھے بھی بہت خوشی ہو رہی ہے۔" ہما اپنے گوشہ عافیت' فرحت کے گھر آئی تو کرن کے رشتے کی بات سن کر اس نے بہت گرم جوشی اور سچے دل سے فرحت کو مبارک باد دی۔

"تمہیں بھی بہت مبارک ہو۔ میں تمہاری خوشیوں کے لیے بھی بہت دعائیں کرتی ہوں۔" فرحت کے لہجے میں' لفظوں میں خلوص تھا۔ ہما جانتی تھی۔

"بس مجھے تمہاری دعاؤں کی ہی ضرورت ہے۔"

دبیر کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد ہما آج پہلی بار آئی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں۔"

"خوش ہو۔" فرحت نے اسے غور سے دیکھا۔

"میں کوشش کرتی ہوں خوش رہنے کی مگر لوگ بڑے ظالم ہیں یار! خوش ہی نہیں ہونے دیتے۔" ہما پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

"لوگ تو کسی کو بھی نہیں چھوڑتے اور تم کب سے لوگوں کی پرواہ کرنے لگیں۔" فرحت نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہونہہ "آئی ڈونٹ کیئر۔" اپنے مخصوص تلخ لہجے میں گویا ہوئی۔

"پتا ہے کیا' اب کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہمارے معاشرے میں عورت کی تین شادیاں' تین طلاقوں کی طرح ہیں۔ پہلی اور دوسری شادی پہ تو پھر بھی رعایت ہے' چھوٹ مل جاتی ہے مگر تیسری پر تو عورت اچھوت ہو جاتی ہے۔ ناقابل قبول' یو نو فرحت۔"

ہما نے اس کی طرف دیکھا۔

"بہت سارے لوگوں سے بہت اچھے ٹرمز تھے میرے' سب دور دور رہنے لگے ہیں اور میں کسی کو کیا کہوں' میرے اپنے بچے ہی مجھ سے دور ہو گئے ہیں۔" ہما کے میک اپ زدہ چہرے پہ اداسی اور مایوسی کے سائے چھائے ہوئے تھے۔

"حوصلہ رکھو' سب ٹھیک ہو جائے گا' دبیر تو اچھا ہے نا تمہارے ساتھ۔" فرحت نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"ہاں' وہ ابھی تک تو ٹھیک ہے میرے ساتھ' آگے کا کچھ کہہ نہیں سکتی۔" ہما نے کندھے اچکائے۔

"آگے بھی یقیناً "اچھا ہی ہو گا۔" فرحت سب سے بڑے اچھے گمان رکھتی تھی۔ اللہ سے بھی' بندوں سے بھی اور حالات سے بھی۔



فرحت کے بہت اچھے گمانوں' ڈھیروں دعاؤں اور بہت سی تسلیوں کے بعد بھی.... اس کے بعد بھی یہ کیا ہوا؟؟ ہما کو یقین نہیں آرہا تھا کہ زائر نے اپنے بارے میں جو خبر (اس کے لفظوں میں خوشخبری) ٹوئٹر پہ اپنے ویورز کے ساتھ شیئر کی ہے' وہ سچ ہے یا کوئی جھوٹ مگر جھوٹ کیسے ہو سکتا ہے؟ تصاویر موجود تھیں' ہر دن'

ہر موقعے کی۔ وہ پڑھ رہی تھی۔ دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ خطرناک حد تک زرد پڑ گیا تھا۔ اسے پتا نہیں' اس نے کیسے زائر کو کال کی تھی ڈیڑھ سال بعد یہ پہلی بار تھا کہ اس نے ہما کی کال اٹینڈ کی تھی۔

"یہ' یہ کیا ہے زائر؟" ہما کی تو آواز بھی اس کے حواسوں کی طرح ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

"کیا ممی؟" اس نے بڑی معصومیت سے بالکل اسی طرح پوچھا تھا جس طرح پہلے بھی ری ایکٹ کیا کرتا تھا۔

"تمہارے ٹوئٹر اکاؤنٹ پہ کسی نے گھٹیا مذاق کیا ہے کہ تم نے ——" ہما کے لیے تو یہ جملہ بھی مکمل کرنا آگ پہ چلنے کے مترادف تھا' کجا کہ اس عمل کو وقوع پذیر ہوتے دیکھنا۔

"کہ میں نے بصیرہ تقی سے شادی کرلی ہے۔" زائر نے بڑے پرسکون لہجے میں ان کا ادھورا جملہ مکمل کیا تھا۔

"تم یہ کیسے کرسکتے ہو زائر' وہ میری عمر کی عورت ہے' تمہاری ماں کی عمر کی' اور وہ بھی انتہائی گھٹیا' تم ایسی عورت سے۔۔ اس نے کیسے تمہیں اپنے جال میں پھنسالیا' تم کیسے آگئے اس کی باتوں میں' تم نے یہ کیا کردیا۔" ہما کا دل پھٹ رہا تھا تکلیف کے مارے۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ زائر سے کیا کہہ رہی ہے' کیوں کہہ رہی ہے' کیا سچ مچ زائر نے ــــ اسے یقین بھی نہیں آرہا تھا۔

"زندگی میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ سب کچھ اسی زندگی میں ہوتا ہے جو ناقابل یقین ہوتا ہے اور وہ بھی اسی زندگی میں ہوتا ہے جو ناقابل فراموش ہوتا ہے اور بائی دا وے آپ اتنی ٹینشن میں کیوں لگ رہی ہیں مجھے میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا' شادی ہی تو کی ہے ایک خاتون سے' کیا یہ کوئی غلط بات ہے؟ بری بات ہے؟ یا گھٹیا بات ہے۔"

"اوہ میرے خدا' تم نے مجھے نیچا دکھانے کے لیے' مجھے جتانے کے لیے یہ سب کیا ہے؟" ہما کی آواز بس اتنی ہی تھی جیسے خودکلامی جیسے سرگوشی مگر زائر نے پھر بھی سن لیا تھا۔

"مجھے معلوم تھا' اچھی طرح معلوم تھا کہ میری ماں ایک بہت ذہین عورت ہے' دیکھا' آپ نے فوراً گیس کرلیا اصل بات کو۔"

"تم نے خود کو تباہ کرڈالا میرے بیٹے۔" وہ کرلائی' بری طرح رودی۔ زائر میں تو ان کی جان تھی ـــ آج اتنی گھٹن ہورہی تھی کہ اس سے ٹھیک سے سانس بھی نہیں لیا جارہا تھا۔

"نہیں آج تو تباہ نہیں ہوا ممی! بہت پہلے ہی ہوگیا تھا۔" زائر کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"تم نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔" وہ اور بھی بلبلا کر رو رہی تھی' بری طرح رو رہی تھی۔

"اور آپ؟ آپ نے تو مجھے کہیں منہ چھپانے کے لائق بھی نہیں چھوڑا تھا۔" زائر کے لفظوں میں' آواز میں' لہجے میں اتنی ٹھنڈک' اتنی نفرت تھی کہ وہ بولنا تو درکنار سانس لینا بھی بھول گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

لاؤنج میں صوفے پہ بیٹھی' وہ اپنے موبائل پہ مصروف تھی۔ کل ہی وہ لوگ انڈونیشیا کے جزائر کی سیر کرکے پورے تین ہفتے بعد واپس آئے تھے' دبیر نے شادی کی دوسری سالگرہ وہیں منانے کا پلان کیا تھا اور اس کی اکثر بلکہ ہر ضد کے آگے ہما کو ہار ماننی پڑتی تھی۔

موبائل میں وہ اپنی اور فرحت کی ایک تصویر دیکھ رہی تھی جو اس کے بہت اصرار کرنے پہ فرحت نے اس کے ساتھ بنوائی تھی۔ اس سیلفی میں دونوں مسکرا رہی تھیں۔

"اب میرے لیے دعائیں کون کرے گا فرحت' میں تو بالکل اکیلی رہ گئی۔ کس سے کروں گی اپنے دل کی باتیں' کس سے اپنی فیلنگز شیئر کروں گی۔" ہما کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ جس رات وہ واپس آئی تھی' اسی دن صبح اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی

تھی۔

"ماضی کی مشہور اور باصلاحیت اداکارہ فرحت پروین اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئیں۔ فن کے لیے ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔"

اور اب کوئی سراہے تو سراہے یاد رکھے یا نہ رکھے وہ تو بہت پہلے ہی ستائش سے بے نیاز اور صلے سے بے پرواہ ہو چکی تھی۔ ہما نے اپنی آنکھیں خشک کیں۔

اسے سبرینہ کی طرف سے بہت پریشانی تھی۔ زائر نے جو کچھ کیا اس کے بعد سے وہ اتنی دہل گئی تھی کہ ہر دم' ہر پل اسے سبرینہ کی فکر لاحق ہونے لگی تھی کہ وہ کہیں کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھالے' حالانکہ وہ کچھ عرصے لندن میں اپنے باپ کے پاس رہ کر آئی تھی۔

اب یہاں دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ بظاہر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا مگر اس کی آنکھوں کی ویرانی اور دل کے خالی پن سے ہما ہی واقف تھی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی سبرینہ کے بارے میں اس نے دبیر سے بات کرنے کی ٹھانی۔

"میں ایک بات سوچ رہی تھی دبیر؟" اس کا موڈ خوشگوار دیکھ کر ہما نے بات چھیڑی۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" دبیر اس کی ہر بات ہی توجہ سے سنتا تھا۔

"ہاں وہ میں سوچ رہی تھی کہ کیوں نہ ہم' اپنے پرانے گھر میں شفٹ ہو جائیں وہاں....."

"ہم شادی کے بعد سے اسی فلیٹ میں رہتے ہیں' ہمارا کون سا پرانا گھر ہے؟" دبیر حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

"میرا مطلب ہے میرا گھر' جہاں میں پہلے رہتی تھی۔ میرا گھر بھی تو تمہارا ہی ہے' ایک ہی بات ہے۔"

"کھل کے بات کریں۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"میں چاہتی ہوں ہم دونوں وہاں شفٹ ہو جائیں سبرینہ اکیلی ہے وہاں' مجھے اس کی طرف سے فکر لگی رہتی ہے میں....."

"اوہ کم آن' سبرینہ کوئی بچی تو نہیں جو اس کی فکر لگی ہوئی ہے آپ کو' پھر اکیلے رہنے کا کیا سوال' اس گھر میں زائر اپنی وائف کے ساتھ ہے۔ وہ دونوں ہیں تو سہی سبرینہ کے ساتھ۔"

"یہی سوچ سوچ کر میرا دل جلتا ہے کہ وہ چڑیل میرے گھر پہ قبضہ جما کر بیٹھی ہے' مجھے اسے بھی نکالنا ہے وہاں سے۔"

"اور سبرینہ؟"

"اسی کی وجہ سے تو وہاں شفٹنگ کی بات کر رہی ہوں میں۔"

"آئی ایم سوری ڈیئر' آپ جانتی ہیں کہ میں بہت پرائیویٹ پرسن ہوں۔ مجھے اپنی لائف میں کسی کی مداخلت پسند نہیں ہے' چاہے وہ میرے پیرنٹس ہوں یا آپ کے بچے۔ میں صرف آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں اور کسی کے ساتھ نہیں۔" دبیر نے عادت کے مطابق دوٹوک بات کی اور موبائل میں گم ہو گیا جو اس بات کی علامت تھی کہ اب وہ مزید اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنے والا' ہما چپ کی چپ بیٹھی رہ گئی۔

اس کا غصہ' طنطنہ' اکڑ دبیر کے غصے کے آگے سب ڈھیر ہو گیا تھا۔ وہ بہت اچھی عادتوں اور خوبیوں کا مالک تھا مگر جب اسے غصہ آتا تو پھر وہ سب کچھ بھول جاتا تھا' ہر بات کو' ہر شخص کو' ہر رشتے کو فراموش کر دیتا تھا۔

ہما بہت کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ وہ اب اپنی زندگی کو مزید تماشا نہیں بنا سکتی تھی۔ دبیر کے ساتھ اب تک کا وقت جیسے تنی ہوئی رسی پہ سفر تھا۔ ایک قدم اٹھاتی تو ڈرتی' دوقدم رکھتی تو ڈولتی' پتا نہیں آگے کتنا سفر ہے باقی' کتنی مسافت جو ایسے ہی طے کرنی ہے۔

وہ یاد کر رہی تھی ایک بار فرحت نے کہا تھا کسی کے متعلق۔

"ہاں ادھوری ہی تو ہے۔" ہما یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ کیا ہے جو ادھوری ہے

عورت؟

کہانی؟

یا زندگی؟



سمیرا حمید

اُس در کا جوگی

"مجھے دو عدد سرمے دے دیں۔"

مدرسے کے بچوں کی طرح رحل پر جھکے سپارہ پڑھنے کے انداز سے وہ، اونگھ رہا تھا کہ آواز آئی۔ آواز کچھ ایسی تھی کہ وہ سوتا ہی رہ جاتا تو کتنا ظلم ہوتا...... اس پر...... اُس پر...... دونوں پر......

"دو......؟"

آنکھیں مسل کر اس نے نیند کی دھند کو کم کرنے کی کوشش کی۔ عورتوں کو "محبوب آپ کے قدموں میں" کا سرمہ دیتے دیتے، وہ خود کم و بیش سرمے جیسا سرمئی ہو گیا تھا۔ پھر اس کی زندگی بھی تو سرمہ دانی میں مقید ہو گئی تھی جیسے۔

"جی دو......" وہ شاید ہنسی تھی۔

"ایک سرمے کی شیشی چار پانچ مہینے نکل جاتی ہے، دو کیا کریں گی جی؟" حکیم صاحب سن لیتے تو اسے دو سو کوڑے لگواتے۔

"وہ زیادہ سرمہ لگاتے ہیں۔"

"دو آنکھوں میں کتنا زیادہ لگا لیتے ہیں...... یہی کوئی چھٹانک بھر؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔" وہ پھر ہنس دی۔ ہاتھ سے دوپٹے کے کنارے کو کھینچ کر چہرہ چھپایا ہوا تھا۔

"پھر تو باگڑ بلا ہی لگتے ہوں گے وہ۔"

"آپ کو اس سے کیا۔" وہ برا مان گئی۔

اسے بھی برا لگا کہ آخر ایسا کون ہے، جو اس کے آگے جھک جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جس کے لیے اسے یہاں آنا پڑا ہے۔ عقل کا گھامڑ، دل کا اندھا۔ ایسا کون ہے۔

سرمے کی دو شیشیاں اس نے اس کے آگے کیں اور بقایا پیسے اسے واپس کیے۔ جب وہ جانے لگی تو رُک کر اس کی طرف پلٹی۔ پرانے لاہور کی، گرد آلود دُکان کے کھلے پھاٹک کے اس پار، سورج کی کرنیں، اس کے آنچل سے ہو کر، کلائی کی چاندی کی چوڑیوں پر چمک چھوڑ رہی تھیں۔ اور گاؤں کے گنوار کی آنکھیں، چکا چوند ہونے لگی تھیں۔

"آپ لگاتے ہیں یہ سرمہ؟"

"نہیں...... میری آنکھوں میں چبھتا ہے......"

"پھر مجھے کیوں دیا...... ہمیں کانٹے نہیں چاہیے......"

"آپ کو محبوب تو قدموں میں چاہیئں نا؟"

وہ ہنسی۔ سڑک سے گزرتے کچھ راہ گیر، کھلے پھاٹک سے اندر جھانکنے لگے۔ اس کی ہنسی کی گھنٹیوں نے، شہر کے گنواروں کے دلوں میں بھی اودھم مچا دیا ہوگا نا۔

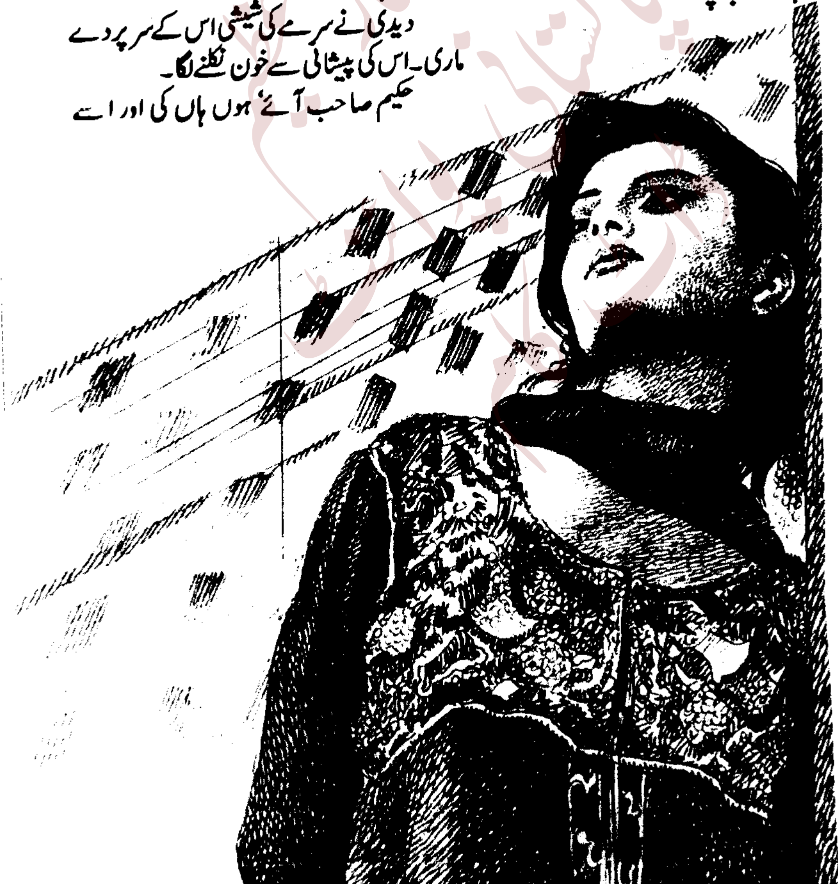
"یہ میں اپنی سہیلی کے لیے لے کر جا رہی ہوں۔"

"بہت نیک دل ہیں آپ، سہیلی کے غم کی بہت فکر ہے۔"

دوپٹے کا کنارا ذرا سا ڈھیلا چھوڑ کر اس نے بڑی اداسی سے کہا۔ "کسی کو میرے غم کی فکر جو نہیں۔"

"آپ کا کیا غم ہے جی؟"

''سب خود ہی بتانا ہوتا' تو یہاں تک کیوں آتی؟''
دکان کی محراب کے نیچے سے گزرنے سے پہلے اس نے ایک نظر پیچھے مڑ کر اسے دیکھا' کہا اور چلی گئی۔
''دیکھا تھا یا نہیں دیکھا تھا۔'' وہ رات بھر یہ بات سوچتا رہا تھا۔ ''نہیں دیکھا تھا۔'' صبح تک وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔
اور اسی صبح ایک عورت آندھی طوفان بنی ہوئی آئی تھی۔
''یہ کیا کوئلے کی راکھ پیس کر دی تھی؟ دھنک کر رکھ دیا اس نے مجھے ڈنڈوں سے۔''
''کس نے؟'' اس کی کم بختی اس نے پوچھ لیا۔
''تمہارے باپ نے......''
''پر وہ تو مر چکے ہیں...... میں یتیم ہوں آپا جی......''
''آپا ہو گی تیری ماں...... دیدی بول مجھے۔''
''پر دیدیاں تو ہندوستان میں نہیں ہوتیں......''
''میں بھی وہیں سے آئی ہوں...... پیسے واپس کرو میرے۔''
''اوہ! دیدی سرحد پار کے لوگوں پر یہ سرمہ اثر نہیں کرتا......''
''پر میرا والا تو یہیں تمہارے دیش کا رہنے والا ہے۔''
''لیکن لینے والا تو اس دیش کا نہیں ہے نا دیدی......''
''تو اس شیشی پر یہ لکھو نا کہ یہ کس پر اثر کرے گا اور کس پر نہیں کرے گا......''
دیدی نے سرمے کی شیشی اس کے سر پر دے ماری۔ اس کی پیشانی سے خون نکلنے لگا۔
حکیم صاحب آئے' ہوں ہاں کی اور اسے



ہلدی لگانے کا کہہ کر چلے گئے۔ اسے بڑا غصہ آیا۔
یعنی وہ مرتے مرتے بچا اور یہاں حکیم صاحب ہوں ہاں کر کے چلے گئے۔ تین سال سے وہ حکیم صاحب کی خدمت کر رہا تھا۔ صبح سے رات تک اس قدیم خانے میں بیٹھا رہتا تھا۔ رات کو ایک کونے میں بستر بچھا کر سو جاتا تھا۔ صبح اٹھ کر سرمہ خانے کی صفائی کرتا' سڑک پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے جھاڑو لگاتا' دکان کے لکڑی کے کواڑوں کی گرد جھاڑتا' "محبوب آپ کے قدموں میں" کا بورڈ صاف کرتا' اور پھر کسی ہوٹل سے نان چنے لے کر کھا لیتا۔ دن کو حکیم صاحب کے گھر سے کھانا آجاتا' جو وہ بچا کر رات تک کھا لیتا تھا۔ پتا نہیں حکیم صاحب ہی سب سے زیادہ کنجوس تھے' یا گھر والے بھی اسی بیماری میں مبتلا تھا۔ آج تک دوپہر کے کھانے میں دو روٹیوں سے زیادہ' ایک نوالہ نہیں آیا تھا۔ آیا تو انہیں کبھی اس پر ترس بھی نہیں تھا کہ بچہ اتنے سالوں سے اپنی جوانی' اس کوٹھری جیسی دکان میں برباد کر رہا ہے' اسے ہفتے دو ہفتے کی چھٹی دے کر گاؤں ہی بھیج دیا جائے۔ ورنہ پوری چھٹی دے کر برخاست ہی کر دیا جائے۔
حکیم صاحب ان کے گاؤں سے تھے اور مائی کے دور کے رشتہ دار تھے۔ آج کل ایک نیم سرکاری دوا خانے میں ملازمت کرتے تھے' اور اسے اپنا ملازم رکھے ہوئے تھے۔ آپا کی شادی کے لیے مائی نے حکیم صاحب سے کچھ قرض لیا تھا۔ اس کی تنخواہ اسی قرض میں کاٹی جاتی تھی۔ اب مائی نے ہی اتنا قرض لے لیا تھا کہ تین سال میں بھی ادا نہیں ہوا تھا' یا وہ خود ہی نکما تھا کہ حکیم صاحب سے حساب کتاب نہیں کر سکتا تھا کہ بتائیں میری جان بخشی کب ہو گی۔ اس نے ایک دو جگہ کام تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ آس پاس کے دکان دار اور چائے کے ہوٹلوں والے حکیم صاحب سے ڈرتے تھے' اسے کام کیسے دے دیتے۔
خط لکھ لکھ کر وہ مائی کی منت کرتا تھا کہ خدا کے لیے اس کی جان حکیم صاحب کے چنگل سے نکلوا دیں۔ پر مائی بے چاری بھی کیا کرتیں' ان کے پاس تھا ہی کیا جو وہ حکیم صاحب کو دے کر اسے واپس گاؤں بلا لیتیں۔
لیکن آج اس کی ہمت جیسے جواب دے گئی تھی۔ سر پر چوٹ کھانے کے بعد دل کی چوٹوں کا حساب لینے وہ حکیم صاحب کے گھر آ گیا۔ دروازے پر مکا مارا' پھر پاؤں سے ٹھڈا۔
"کون ہے؟ یہ کیا طریقہ ہے دستک دینے کا۔" حکیم صاحب کی بھڑکی ہوئی آواز آئی
"میں ہوں قدوس......" وہ بالکل نہیں ڈرا۔
"یہاں کیا کرنے آئے ہو......" وہ اور بھڑک کر بولے
"حساب لینے آیا ہوں میں......" دہلیز پار کر کے وہ صحن میں کود گیا اور حکیم صاحب سے زیادہ اونچی آواز میں چلایا۔
"یہ کیسے غنڈوں کی طرح بات کر رہے ہو۔ عقل سمجھ کہاں گئی تمہاری۔"
"گنوار ہونے سے تو غنڈا ہونا اچھا ہے۔ کیا سمجھا ہے آپ نے مجھے؟ تین سال سے ہمارا قرض ہے کہ ادا ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ رات دن میں اس گھٹیا سرمے کے ساتھ پستا ہوں۔ جب سے میں دکان میں آیا ہوں' آپ کا کاروبار چمکنے لگا ہے۔ کبھی کبھی تو دن کی سو شیشیاں بھی آرام سے نکل جاتی ہیں۔ اور تنخواہ کے نام پر آپ مجھے کیا دیتے ہیں؟ ہر مہینے کٹوتی' دو روٹیاں اور پتلی دال؟ شہروں میں ایسے کھانے پکائے جاتے ہیں؟ نہ نمک نہ مرچ' ٹماٹر نہ پیاز؟ گھی کا تڑکا لگانا نہیں آتا پکانے والوں کو تو سیکھ لیں کسی سے۔ انسان ہوں میں' بطخ نہیں کہ پانی میں بھیگی روٹیاں کھا لوں گا۔"

اس کی تقریر جاری رہتی اگر اس کے کانوں نے چوڑیوں کی جھنکار اور دبی ہنسی پر غور نہ کر لیا ہوتا۔ ان میں کوئی ایک ہنسی ایسی تھی کہ حکیم صاحب کو کھری کھری سناتے' وہ اس ہنسی پر چونک کر رکا اور گردن اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اُوپر ستون اور پردوں کے پیچھے کوئی تین چار لڑکیاں کھڑی تھیں۔ کسی کی کلائی دکھائی دے رہی تھی' کسی کے بال اور ایک کی کاجل سے بھری آنکھ۔

سامنے موڑھوں پر حکیم اور حکیمہ صاحبہ بیٹھے چائے پیتے رہے ہوں گے' کہ اس کی گرما گرم باتوں نے چائے سے پہلے انہیں ٹھنڈا کر دیا تھا۔

''میں گاؤں واپس جا رہا ہوں۔'' اتنی ساری لڑکیوں کی ہنسی سے گھبرا کر اس نے بھی گھبرا کر کہا۔

''دفعان ہو جاؤ یہاں سے...... دوبارہ بھی اپنی شکل نہ دکھانا......''

وہ دفعان ہو گیا۔ قدیم خانے آ کر اپنا سامان سمیٹنے لگا کہ حکیم صاحب آئے۔

''یہ کھانا کھا لو' پھر چلے جانا۔''

اس نے طنزیہ ٹرے کی طرف دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ آلو گوشت کا سالن' تنوری روٹیاں اور کھیر۔

''یہ طشتری لے جائیں' مجھے ایسا کھانا کھانے کی عادت نہیں جناب!''

ایسا کھانا لانے کی عادت انہیں بھی نہیں تھی اس لیے وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ واقعی چلے گئے ہیں تو اس نے کھانا کھا لیا۔ پھر سامان باندھنے لگا کہ پکوڑوں کے ساتھ چائے آ گئی۔

''گاؤں پہنچتے تک اندھیرا پھیل جائے گا۔ گاؤں کے تو راستے بھی بہت خراب ہیں۔ صبح منہ اندھیرے نکل جانا۔''

پکوڑے کھا کر' چائے پی کر وہ نکلنے ہی والا تھا کہ حکیم صاحب نے کہا۔ وہ رات رک گیا۔ صبح حلوہ پوری کا ناشتہ کیا اور جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اب حکیم صاحب کھانوں سے لدی طشتریوں سمیت شرمندہ تھے تو کچھ شرم اسے بھی کرنی پڑی اور وہیں رکنا پڑا۔

☆☆☆

''اتنے سرمے کا آپ کی سہیلی کیا کرتی ہے۔''

رکا ہوا وقت چلنے لگتا تھا...... ایک مہینے میں وہ تیسری بار جو آئی تھی۔

''پانی میں گھول کر پی جاتی ہوں۔''

''ہوں......؟؟ تو آپ اپنے لیے لے کر جاتی ہیں۔ اگر آپ نے واقعی میں مرنا ہے' تو زہر پئیں' سرمہ نہیں۔''

''آپ دوسروں کو جان سے جانے کے مشورے دے رہے ہیں؟''

''وہ تو آپ کے اپنے ارادے ہیں...... میں تو بس......'' وہ گڑبڑا گیا

''تو آپ کے ارادے کیا ہیں؟ اب بتا بھی دیں......؟؟''

''اب بتا بھی دیں۔'' قدوس کو اس ''اب'' پر بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے اس کی بے پردہ آنکھوں کو دیکھا۔ اور اچانک' اس لمحے اسے لگا کہ جیسے وہ حکیم صاحب کی آنکھیں دیکھ رہا ہو۔

''آپ حکیم صاحب کی کوئی رشتہ دار ہیں؟''

''بہت دیر سے یاد آیا رشتہ پوچھنا۔'' منہ موڑ کر وہ چلی گئی۔ پھر دوبارہ نہیں آئی۔ نہ جانے سہیلی کا کام بن گیا تھا یا اس نے ہی سرمے کو زہر بنا کر پی کر خود کو ختم کر لیا تھا۔

☆☆☆

اب کبھی کبھی وہ کھانے کے برتن دینے حکیم صاحب کے گھر چلا جاتا تھا۔ برتن باہر سے ہی پکڑ لیے جاتے تھے اور چائے کا گلاس تھما دیا جاتا تھا۔

ایک دن بے خیالی میں اس کا پاؤں کیچڑ سے

بھر گیا تو اس نے کیچڑ دھونے کے لیے پانی کی درخواست کی جس کے جواب میں اسے اندر آکر پیر دھو لینے کی اجازت مل گئی۔ حکیمہ صاحبہ صحن میں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

پاؤں دھو کر وہ پلٹنے ہی لگا تھا کہ نظر اُوپر کی سمت اٹھ گئی۔ جہاں ستون کے پیچھے وہ جلدی سے چھپ گئی تھی......لیکن وہ دیکھ چکا تھا۔

''جی' وہ وہاں کوئی ہے......'' اس کی سادگی کہ اس نے حکیمہ صاحبہ کو ہاتھ کے اشارے سے بتایا

''تو......؟ تمہیں اس سے کیا؟'' تسبیح پڑھ رہی تھیں پھر بھی آواز میں مٹھاس کی بڑی کمی تھی

ہاں اسے اس سے کیا۔ لیکن وہاں جو تھی وہ ہنس دی۔ ستون سے چہرہ اس کی طرف کیا اور پھر دوپٹے کے پلو میں چھپالیا۔

قدیم خانے واپس آکر اس سے پھر اور کوئی کام نہیں ہو سکا۔ شیشیوں میں سرمہ بھرا گیا' نہ ہی ان پر پرچیاں چپکا سکا۔ رات کو حکیم صاحب نے دن بھر کا کھاتہ دیکھا تو حیران اسے دیکھنے لگے۔

''یہ کیا ہے؟''

وہ چونک کر رجسٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں دو آنکھیں بنی تھیں۔ ''آنکھیں ہیں جی......''

''یہاں کیا کر رہی ہیں؟''

''پھر کہاں جائیں جی؟''

''سٹھیا گئے ہو؟''

وہ سٹپٹا کر انہیں دیکھنے لگا۔ رات کو کھانے کے ساتھ دیسی گھی کی چوری بھی آئی۔ دماغ کی گرمی خشکی دُور کرنے کے لیے۔

اگر وہ لڑکی حکیم صاحب کی رشتہ دار ہے تو وہ سرمہ لینے یہاں کیوں آئی تھی۔ سرمہ تو حکیم صاحب کے گھر ہی بنتا تھا۔ وہ سوچتا رہا' سوچتا رہا اور پھر سفید پٹی ہاتھ پر اچھی طرح سے باندھ لی۔ کھانے کے برتن دینے گیا تو اس زخمی ہاتھ سے برتن آگے کیے۔

''یہ ہاتھ پر کیا ہوا؟'' حکیمہ صاحبہ کی آواز آئی۔

''گر گیا تھا۔ گوشت پھٹ گیا ہے...... بہت خون نکلا...... سچ ہے جی......''

''بتا دیتے کوئی مرہم بھجوا دیتی۔ اچھا چلو اندر آؤ۔''

وہ اندر چلا گیا۔ صحن میں جا کر بیٹھ گیا۔ حکیمہ صاحبہ اندر باورچی خانے میں تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر اُوپر دیکھا اور پھر سر کو واپس جھکانا بھول گیا۔ وہاں وہ کھڑی تھی۔ کاجل کی جگہ آج سرمہ آنکھوں میں لگا تھا اور محبوب قدموں میں بیٹھا تھا۔

وہ جانتی تھی' وہ آئے گا...... وہ جانتا تھا' وہ جائے گا......

اس کا ماننا تھا' محبوب قدموں میں گرانے کے لیے نہیں ہوتے......

وہ بھی مانتا تھا کہ محبوب تو سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں......

☆☆☆

رات بہت مشکل سے گزری۔ صبح منہ اندھیرے وہ حکیم صاحب کو بتائے بغیر قدیم خانہ چھوڑ کر گاؤں واپس لوٹ آیا۔

لیکن چین آیا نہ سانس۔ وہ چچا کے کھیتوں میں ہاتھ بٹانے لگا۔ چپ چاپ کام کرتا۔ رات کو ڈیرے پر ہی سو جاتا۔ چچا کے یار بیلیوں کو حقے بنا بنا کر دیتا۔ دن ڈھلتا' تو پگڈنڈی پر کھڑا ہو کر کتنی ہی دیر تک سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھتا رہتا کہ رات ہو جاتی۔ ستارے ٹمٹمانے لگتے۔ رات کچھ کانٹوں پر' کچھ آہوں پر گزرتی۔

''دل پر جنتری لگ گئی ہے کا کا! یا کھول دو' یا کھلوا لو۔'' چچا کے یار دوستوں میں سے ایک نے شانہ تھپتھپا کر کہا۔

دل سے آہ نکلی۔ وہ ماں بیٹا سوکھی روٹیاں کھا رہے ہیں۔ حکیم صاحب اسے زہر کھلا دیں گے' اس

کے ہاتھ اپنی لاڈلی کا ہاتھ نہیں دیں گے۔

"حکیم صاحب سے کوئی جھگڑا ہو گیا تھا قدوس؟" جیٹھ ہار کے بچھڑے سے مائی نے ماگھ میں پوچھا

"نہیں مائی......"

چچا کی فصل اچھی رہی۔ گھر میں دانے بھی آگئے۔ مائی نے دو بوری چاول حکیم صاحب کے گھر بھجوائے تو وہ واپس آگئے۔

"وہاں کیا کر آیا ہے قدوس؟" مائی رونے لگی۔ ان کی ایک بیٹی ہے مائی!"

اس نے بس اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔ مائی نے بھی دوبارہ نہیں پوچھا۔

کبھی اسے بھی لگتا تھا کہ وہ گبھرو جوان رانجھا جوگی ہے۔ کبھی اس کا بھی ماننا تھا کہ اس کے دل سے نکلتی بانسری اس کی ہیر سیال کو گھیر گھار کر اس تک لے آئے گی۔ لیکن جب شہر میں حکیم صاحب نے اسے اس کی اوقات دکھا دی تو گاؤں کی لڑکیاں جو اسے رک رک کر دیکھا کرتی تھیں اسے جھوٹی مکارنیں لگی تھیں۔

چار سال پہلے جب وہ پہلی بار حکیم صاحب کے گھر گیا تھا تو کوٹھری کی میلی کچیلی چارپائی دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ حکیم صاحب کے لیے کسی چوڑے چمار سے کم نہیں۔ پتیل کے رنگ برنگے برتنوں میں دال روٹی اور کچی پیاز دیکھ کر وہ جان گیا تھا کہ گاؤں کے گنوار کی مہمان نوازی شہر کے سنار ایسے ہی کرتے ہیں۔ گھٹی ہوئی کوٹھری کی اداس رات میں بہت سے خواب اس کی آنکھوں میں دم توڑ گئے تھے۔ ورنہ مائی نے تو کہہ کر بھیجا تھا کہ کچھ عرصہ دکان پر کام کرنا پھر حکیم صاحب تمہیں کسی اچھی جگہ لگوا دیں گے۔

اسے کھٹمل کاٹنے لگے اور اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ باہر نکل آیا اور چھت پر ٹہلنے لگا۔ بڑی دیر تک ٹہلتا رہا پھر پیاس لگی تو دبے پاؤں نیچے آیا اور پانی پی کر واپس اوپر جانے ہی لگا تھا کہ ایک کمرے سے اسے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ کھڑکی سے روشنی بھی آرہی تھی۔ گاؤں کے گنوار نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔

ایک میز پر شیشے کا گلاس رکھ کر تین لڑکیاں آلتی پالتی مار کر بیٹھی تھیں۔ میز کے چاروں کونوں پر ایک ایک موم بتی روشن تھی۔

"میں بورڈ کے امتحان میں پاس ہو جاؤں گی نا؟" آنکھیں بند کر کے ایک لڑکی نے پوچھا۔ گلاس چلتا ہوں ناں پر گیا۔ لڑکی نے چیخ ماردی پھر منہ بنالیا۔

"یہاں کوئی روح ووح نہیں ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔"

بورڈ میں فیل ہونے والی جھلا گئی۔ پھونک مار کر موم بتیاں بجھا دیں۔ کھڑکی سے جھانکتے اسے ہنسی آگئی۔ گنوار تھا نا آہستہ آواز میں ہنس نہیں سکا۔ اس کی ہنسی سن کر ان کی چیخیں نکل گئیں۔

"کون ہے وہاں......؟؟" ان کی آوازیں کانپیں۔

"ہائے اللہ! وہ روح باہر کھڑی ہے...... کیوں برا بھلا کہا اسے تو نے۔"

وہ ڈر کر کمرے کی دہلیز پر آکر کھڑا ہو گا۔

"جی۔ یہ میں ہوں جی...... قدوس...... گاؤں سے آیا ہوں...... کوئی روح ووح نہیں ہوں جی...... آپ سب ڈریں نہیں۔"

اس کے اتنا کہنے پر سناٹا چھا گیا۔ اندر کمرے میں اندھیرا تھا صحن کی روشنی میں وہ کھڑا تھا۔ بورڈ میں فیل ہونے والی چلتی ہوئی اس کے پاس آئی......

"چھپ کر ہماری باتیں سن رہے تھے۔"

نیم اندھیرے میں وہ اس کی دو آنکھیں ہی دیکھ سکا لیکن وہ اسے پورا دیکھ رہی تھی۔

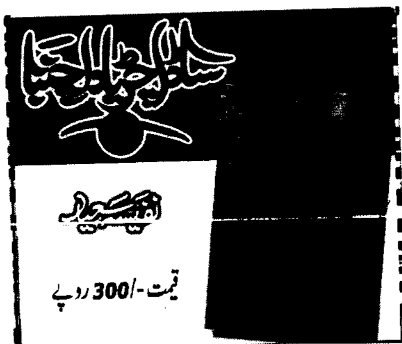
وہ بے وقوفی سے ہنس دیا۔ "میں پانی پینے آیا

تھاجی! ویسے آپ پاس ہو جائیں گی، فکر نہ کریں۔"
"تمہیں کیسے پتا؟؟؟"
"ابھی ابھی پتا چلا ہے...... یہ نہیں پتا کہ کیسے چلا لیکن چل گیا۔"
وہ اسے گھورتی رہی۔
"باجی! ابا جی آجائیں گے...... دروازہ بند کردو۔"
دوسری، تیسری بہن نے سرگوشی کی لیکن وہ اس کے سامنے ہی کھڑی رہی۔ وہ بھی کھڑا رہا۔ اسے بڑا انتظار تھا کہ کوئی اس پر جان لٹا دے۔ اس کے قدموں میں آ بیٹھے۔ کوئی جوگن ہو کر، اسے جوگی کر دے...... انتظار شاید تمام ہو گیا تھا......

"باجی! سنتی کیوں نہیں ہو...... کیوں مروانا ہے ہمیں......"
وہ واپس چھت پر چلا گیا۔ کوٹھری کے کھٹمل پھر اسے نہیں کاٹے۔ میلی کچیلی چارپائی کمخواب کا بستر بن گئی۔
اگلے دن صبح اسے دکان میں لے جا کر بٹھا دیا گیا اور کام سمجھا دیا گیا۔ تین سال اس سے اتنی مشقت لی گئی کہ وہ بھول گیا کہ اس نے کسی کو پاس ہونے کا اشارہ دیا تھا۔ جس دن حکیم صاحب کے گھر سے ان کی کسی بچی کے پاس ہونے کی مٹھائی آئی تھی وہ تب بھی بھول گیا تھا کہ یہ وہی ہے، جو رو پڑی تھی۔ جو روحوں سے پوچھ رہی تھی۔
لیکن اسے یاد رہا کہ اس کے گھر کا کوٹھا کچا ہے۔ گاؤں کی پگڈنڈیوں پر دھول اڑتی ہے۔ حکیم صاحب کی اور اس کی ذات ایک ہے لیکن اوقات میں بہت فرق ہے۔ وہ ستر سال بھی رانجھا بن کر ہیر سیال کے باپ کا ملازم بنا رہے گا تو بھی انہونی، ہونی نہیں ہو گی۔ اور پھر آگ ادھر لگے یا ادھر، یا بھڑک جائے گی یا بجھا کر راکھ کر دے گی۔
اور وہ راکھ ہو رہا تھا۔ مائی نے اس کی شادی کرنی چاہی، لڑکی دیکھ لی، بات پکی کر دی، اور اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔
"آدھا مر گیا ہوں، پورا نہ مار مائی! یہ سب کام رہنے دے۔"
مائی نے بڑی آہیں بھریں، منتیں کیں اور پھر اس کی طرح چپ ہو گئی۔ جوان اولاد کے دل کا غم، موت کے غم سے زیادہ ہوتا ہے۔ دوا چلتی نہیں، شفا ملتی نہیں۔
حکمت کے چوراہوں پر بھی، ہجر کے ناسور دہائیاں دیتے پھرتے ہیں......
اِدھر اُدھر پھرتے ہیں...... پھر بھی راہ پاتے ہیں نہ "یار"۔
اسی راہ پر، سالوں بعد وہ "قدیم خانہ" محبوب آپ کے قدموں میں" کے بورڈ کے سامنے کھڑا تھا۔ دکان کے اندر کوئی کارخانہ لگ چکا تھا۔ بھاری مشینوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اُوپر محراب کی پیشانی پر بورڈ البتہ ویسے ہی لگا ہوا تھا اور اتنا گندا ہو چکا تھا کہ کچھ پڑھا ہی نہیں جا رہا تھا، لیکن اس نے ایک نظر دیکھ کر اسے پہچان لیا تھا۔
چچا نے بڑی منّت کر کے اسے شہر ضروری کاموں کے لیے بھیجا تھا۔ دو مہینے سے بہت بیمار تھے چچا۔ وہ انکار کرتا رہا، لیکن پھر آنا ہی پڑا...... ٹرین سے اُترتے ہی بڑا ضروری لگا آنا کہ آتے ہی وہ بازار آیا، اور دکان کو دیکھنے لگا...... پھر دوسرے دن...... پھر تیسرے دن بھی......
پتا نہیں وہ کس چیز کی تسلی کر رہا تھا۔ اپنی...... اس کی...... یا کسی کی بھی نہیں......
چوتھے دن جب اسے گاؤں لوٹ جانا تھا، اور وہ دکان کے سامنے کے ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا تو "قدیم خانہ" کے سامنے سے وہ گزری۔ ساتھ ایک چھوٹی بچی تھی۔ اسے گمان ہوا کہ وہ وہی تھی، جو خود تو پاس ہو گئی تھی لیکن اسے فیل کر گئی تھی،

لیکن پھر اسے گمان ہوا کہ وہ، وہ نہیں تھی۔ حسن کتنا بھی گہنا جائے، اتنا بھی زوال پذیر نہیں ہوتا۔
وہ اٹھ کر اس کے پیچھے چلنے لگا، اور جب وہ اسے دیکھے بغیر ایک اور پل نہ رہ سکا تو سامنے آ گیا اور بری طرح سے چونک گیا۔ اس کی من موہنی صورت کو ایسا مرجھایا ہوا دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ گیا۔
"السلام علیکم جی...... میں قدوس۔"
"تو......؟" کیسی تپش تھی اس کی آواز میں۔ کس دکھ سے اس نے کہا تھا۔
وہ گھبرا گیا۔ "یہ بیٹی ہے آپ کی...... بہت پیاری ہے......"
ایک دم اس کی آنکھیں بھر گئیں۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ "بانو کی بیٹی ہے......"
"بانو کی بیٹی......" وہ زیر لب بڑبڑایا اور اسے دیکھنے لگا۔
"اب ہم جائیں؟" کیسے مر مر کر جیتے اس نے پوچھا تھا۔ کس تڑپ سے اس نے دیکھا تھا۔
"اب......" گاؤں کے گنوار کے دل پر بہت گراں گزرا یہ "اب"۔
بانو کی بیٹی کا ہاتھ تھام کر وہ اس کے شانے سے ٹکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ایک گلی، دو گلی، ایک سڑک، دوسری سڑک۔ وہ رکنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ جیسے کسی کنوئیں کی تلاش میں ہو۔ اس میں جھانک کر کود جانے کے لیے۔
جان دے کر یہ جان لینے کے لیے محبت کے تاج پر، ہجر کے موتی کون پرو دیتا ہے۔
ایک سے دوسرے دل کے ملن میں یہ ماہی ماہی کون کوکتا ہے۔
وہ تو اس کا نام تک نہیں جانتا تھا...... وہ کیسے اسے پیچھے سے پکار لیتا......
وہ رکتی ہی نہ تھی...... وہ اُسے روکتا ہی نہ تھا......
لیکن جب تیز تیز چلتے اس نے پیچھے سے جا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا...... تو......
"تم نے تو کہا تھا میں پاس ہو جاؤں گی۔" بڑی لمبی آہ تھی جسے سمیٹ کر وہ رو دی۔
"حکیم صاحب...... وہ کہاں مانتے۔"
کتنی مشکل سے اس نے کہا۔ اور اس نے اپنا ہاتھ جھٹک کر چھڑا لیا۔
"بزدل۔"
اپنے پیچھے وہ یہ کہتی گئی۔ حکیم صاحب نہ مانتے، وہ تو مان جاتا۔ اس کے قدموں میں بیٹھ کر کہہ دیتا، کہ میں ہار گیا۔ کچھ دل سے گیا، کچھ جان سے۔ میں تمہارا ہوا، تو اپنا بھی نہ رہا۔ وہ کچھ تو کہہ دیتا۔ اس کے در کا جوگی، روگ کا کاسہ توڑ دیتا......
اس نے توڑ دیا اور بڑے احترام سے گھر میں داخل ہو کر، موڑھے پر بیٹھے وقت سے پہلے ضعیف ہو چکے حکیم صاحب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ وہ حکیم صاحب کے پیچھے کھڑی تھی۔ حلیمہ صاحبہ قرآن مجید پڑھ رہی تھیں۔ وہ ہجر کاٹ سکتا ہے تو ہجر سمیٹ بھی سکتا ہے۔ وہ ان قدموں میں اجازت ملنے تک بیٹھا رہنے والا تھا، اور سوالی بنے آخری سانس تک کہنے والا تھا۔
"میں جس کا نام تک نہیں جانتا، اسے میرے نام کر دیں حکیم صاحب۔"

☆



سائرہ رضا

حسن آراج اور...



عبدالمبین اور مولانا صاحب کی صحبت میں رہ کر موسیٰ دن بہ دن دین کے نزدیک ہوتا جاتا ہے۔ موسیٰ کے والدین موسیٰ کی جدائی میں تڑپتے ہیں۔ موسیٰ شوبز چھوڑ دیتا ہے اور حسنل کو بھی چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ حسنل شوہر کے حوالے سے اپنے خیالات موسیٰ پر واضح کرتی ہے۔ موسیٰ ان خیالات کو عبدالمبین کے سامنے رکھ کر رہنمائی کا طالب ہوتا ہے۔ شہزاد دوستی کے پردے میں حسنل سے دشمنی کا آغاز کر دیتی ہے۔ جیک اپنی دوست کو شادی کا پیغام دیتا ہے جسے وہ سختی سے رد کر دیتی ہے۔

گیارہویں قسط

مکمل ناول

"نہیں....." اس نے پیروں کا وزن بدلا۔ وہ آفس جانے کے لیے نکل رہی تھی۔ جب ایمانے کی پرنسپل کی کال ریسیو کی۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم بھلا کیوں اپنی بیٹی کا اسکول بدلوانے لگے۔" اس نے کہنی سے لٹکتے پرس کو ذرا سا جھک کر زمین

اسکول ہی نہیں..... میں نے ڈورا کو بھی (ایمانے کی میڈ) فارغ کردیا ہے۔"

"ڈورا کو بھی....." اس نے دہرایا "مگر کیوں.....؟"

"وہ میری بیٹی ہے۔ میں اب تک غلطی کرتا رہا تو پھر اسے سدھار نہیں سکتا۔"

"ڈورا نہیں ہوگی تو ایمانے کو کون دیکھے گا۔



پر پیروں کے پاس چھوڑ دیا۔ وہ پوری توجہ سے دوسری جانب کی بات سن رہی تھی۔ ماتھے پر شکنوں کا جال بچھتا جا رہا تھا۔

سلسلہ منقطع ہونے پر وہ الٹے قدموں اندر پلٹی تھی۔ پرس وہیں چھوڑ کر.....

"ہاں' میں تم سے بات کرنے والا تھا۔ صرف

چھوٹے بچے کے سو کام ہوتے ہیں۔"

"میں نے نئی میڈ کے لیے بات کرلی ہے۔ دو ایک روز میں آجائے گی۔"

"اوہ.....!" اس نے ابرو اٹھائی "اور ڈورا کو فارغ کرنے کی وجہ.....؟"

"میں ایک غیر مذہب کی عورت کو بچی کے ساتھ

رکھ نہیں سکتا۔"

حسنل کے منہ سے آواز نہ نکلی۔ وہ بھونچکا رہ گئی تھی۔

"اور اسکول۔۔۔؟"

"اسکول کے لیے بھی یہی ریزن ہے۔"

"تو کیا اسے کسی مدرسے میں داخل کروانے جا رہے ہیں۔" اس نے ایک ایک لفظ کو چبایا۔

"میں نے کچھ اچھے اسکول سرچ کیے ہیں۔ چلیں گے ہم دونوں۔۔۔ تم دیکھ لینا۔"

"آپ یہ صحیح نہیں کر رہے موسیٰ۔۔۔" اس نے خود کو ضبط کا درس دیتے ہوئے کہا۔ "ایمانے برداشت نہیں کرپائے گی۔ اسکول بھی اور ڈورا بھی۔۔۔ وہ بہت اٹیچ ہے اس سے۔"

اس نے اپنے لہجے کو آخری حد تک گمبھیر کرلیا۔

"ہاں میں نے سوچا ہے۔ ہمیں کچھ عرصہ اسے زیادہ ٹائم دینا ہوگا۔" اس کا انداز متفکر تھا۔

"اوہ تو دراصل یہ مجھے گھر بٹھانے کی کوشش ہے۔" اس نے گویا اصل وجہ کو پالیا۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ موسیٰ نے چونک کر دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

"اس کے لیے مجھے کوشش کی نہیں حکم دینے کی ضرورت ہوگی۔ میں صرف یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم آخر کب میرے کہے کو سمجھوگی۔ (اس کا اشارہ اس کے آفس جانے اور دیگر سرگرمیوں کے ہنوز جاری رہنے کی طرف تھا)

حسنل کے سر پر ہتھوڑا پڑا۔ وہ کتنے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ جیسے وہ چابی کی گڑیا ہے اور چابی دیتے ہی موسیٰ کے اشاروں پر ناچنے لگے گی۔

وقت گزرا تھا۔ حسنل کا مزاج نہیں بدلا تھا۔ لاجواب ہونے پر وہ صبغہ پر جھپٹ پڑتی تھی۔ یہاں تو جیسے منہ کی کھائی اور موسیٰ اس کے اندر اٹھتے مدوجزر سے بے خبر اپنے فون کے اندر سم ایڈجسٹ کرنے لگا۔

اپنی قسمت کا فیصلہ سنتی چھپ کر کھڑی ڈورا نے اپنی میم کو سر سے پہلے کبھی اس طرح الجھتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ڈورا۔۔۔ اسکول اور اپنی ذات کے حوالے سے نجانے کیا کیا بولتی چلی جارہی تھی۔

اس نے موسیٰ کو سائیکاٹرسٹ سے کنسلٹ کرنے کا کہا۔

میم کا بولنا حیرت تھا تو سر کی خاموشی۔۔۔ صد حیرت۔ یہاں تک کہ میم بولتے بولتے تھک گئی۔ ڈورا مایوسی سے اپنا سامان سمیٹنے کے لیے اندر کو چل دی۔ سر اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹے تھے۔

☆ ☆ ☆

سر کو اسکارف سے لپیٹے تیس برس تک کی نرم چہرے والی عورت۔۔۔ حسنل کے پورے وجود میں چیونٹیاں چلنے لگیں۔

ڈورا کے چلے جانے والے واقعے پر تو اس نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ دوسری میڈ دوسرے ہی دن آگئی۔ وہ بہت شائستگی سے بیٹھی تھی۔ حسنل نے پہلو بدلا۔ موسیٰ اسے ایمانے کے معمولات بتا رہا تھا۔

پھر ایمانے آگئی۔ میڈ نے شستہ اردو میں اسے مخاطب کیا۔ ایمانے نے ماں اور باپ دونوں کی صورتیں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ڈورا تو انگلش میں بات کرتی تھی۔ یا پھر کھنچی ہوئی اردو۔۔۔ وہ بھی کبھی کبھار۔۔۔

"کیا آپ انگلش بولنا نہیں جانتیں؟" ایمانے نے ابرو چڑھا کر تنقیدی نظر سے جیسے انٹرویو لینا چاہا۔

حسنل کو دلی سکون کا احساس ہوا۔ کیا ہی اچھا ہو' وہ خود ہی موسیٰ سے کہہ دے کہ اسے اس میڈ کے ساتھ نہیں رہنا۔ موسیٰ دلچسپی سے اپنی بیٹی کے انداز کو دیکھ رہا تھا۔

میڈ کا سر نفی میں ہلا۔ حسنل آگے کو سرک آئی۔ بحث کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اب وہ آسانی سے منع کر سکتی تھی۔ اسے بوا ٹائپ کی میڈ نہیں چاہیے تھی۔

ڈورا کتنی اپ ٹو ڈیٹ تھی۔ سلیقے سے بنے بال'

نفاست سے رنگے جانے والے ناخن وہ ہر صبح نیا نیل کلر استعمال کرتی تھی۔ نئی میڈ نفی میں سر ہلانے کے بعد کچھ کہہ رہی تھی۔ حسنل کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"مجھے نہ صرف انگلش بلکہ عربی۔۔۔ اور ترکش بھی بولنی آتی ہے۔ ملکی زبانوں میں چار صوبوں کی بولیاں اس کے علاوہ ہیں۔"

اس نے یہ جواب انگلش میں دیا تھا۔ موسیٰ کا سر تن سا گیا۔ ایمانے باپ کے پاس سے ہٹ کر میڈ کے نزدیک جا کھڑی ہوئی اس کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

"اوہ واؤ۔۔۔ ترکش بھی۔۔۔؟" اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

میڈ کا سر اثبات میں ہلا۔ اس نے ایمانے کا ہاتھ تھام لیا۔ "اور تھوڑی سی اسپینش بھی۔" میڈ نے جیسے چٹکی بھر نمک جیسا اشارہ کیا۔

"او پھر تو آپ کو Bailando (اسپنش سانگ) (موسیٰ نے پہلو بدلا۔ اس کی بیٹی یہی سوال کر سکتی تھی۔ وہ ہی تو اسے گود میں لے کر ڈھیں بنایا کرتا تھا) گانا بھی آتا ہو گا۔"

ایمانے خوشی سے جھوم اٹھی۔ حسنل کے سارے اعتراضات دم توڑ گئے۔ کہاں سے ڈھونڈ کر لے آیا تھا موسیٰ یہ ماہر لسانیات۔۔۔ اس نے بیٹی کو دیکھا جو ماں باپ دونوں کو چھوڑ کر میڈ کے ساتھ کھڑی تھی۔

موسیٰ نے ایمانے کو ہدایت کی کہ وہ اسے اپنا کمرہ دکھا دے۔

اور خود حسنل کو میڈ کے بارے میں بتانے لگا۔

حسنل بظاہر سن رہی تھی۔ مگر دھیان کہیں اور تھا۔

اب اور کیا کیا بدلے گا موسیٰ۔۔۔؟

یہ اگلی صبح پتا لگا۔۔۔ اگلی تبدیلی ایمانے کے اسکول کی تھی۔ یعنی اس نے حسنل کے تمام اعتراضات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

"نہیں۔" حسنل نے گویا پتھر پر لکیر کھینچ دی۔ موسیٰ کی ایک سو ایک مثالیں بھی اس کے انکار کو نہ ہلا سکیں۔ موسیٰ اسے نیا اسکول دکھانے لے گیا۔ وہ پرنسپل سے ایک لفظ نہ بولی۔ اپنے موبائل پر انگلیاں چلاتی رہی۔ ہوش تب آیا جب وہ ایمانے کے موجودہ اسکول پہنچے۔

"یہاں کیوں؟" اس نے سوالیہ نظروں سے موسیٰ کو دیکھا۔ وہ رخ پھیر کے کھڑا ہو گیا۔ منہ سے کیا بولے، جو کچھ ہو گا۔ ابھی اس کے سامنے آجائے گا۔ حسنل نے دانت کچکچائے۔ پھر اس کے پیروں سے زمین سرک گئی۔ موسیٰ فون پر اپنی آمد کا مقصد بتا چکا تھا۔ ایمانے کا سرٹیفکیٹ تیار تھا۔ بس پرنسپل کے دستخط۔۔۔ وہ بھی انہوں نے ایک آخری کوشش کر لینے کے خیال سے روک رکھے تھے۔ وہ ہر صورت موسیٰ کو باز رکھنا چاہتی تھیں۔

موسیٰ خاموشی سے سن رہا تھا۔ سیدھی بات تھی۔ وہ چکنا گھڑا لگ رہا تھا۔

وہ دونوں جس اسکول سے ہو کر آئے تھے، وہ بھی کم نہیں تھا۔ مگر یہ والا۔۔۔ سیاست دانوں، سفارت کاروں اور شہر کی کریم یہاں بچے داخل کرواتی تھی۔

مذہب کو تعلیم سے الگ رکھنے کا موٹو رکھنے والے اسکول کی پرنسپل کے آفس میں ان کی سیٹ سے پیچھے بہت بڑی صلیب کا نشان تھا۔

موسیٰ قائل نہیں ہوا۔ پرنسپل نے سینے پر کراس کا نشان بنایا اور قلم کا ڈھکن کھول لیا۔ قریب تھا کہ وہ سائن کر دیتیں۔ حسنل نے اپنا ہاتھ میز پر مارا۔

"ایک منٹ پلیز۔۔۔"

اتنے دنوں سے جاری بحث میں وہ فقط انکار کرتی تھی۔

آج اس نے وجہ دریافت کی۔ موسیٰ جیسے اسی کا منتظر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں حسنل نے سوچا کہہ کر پچھتائی۔ (یہ بحث کم از کم یہاں چھیڑنے کی نہیں تھی)

موسیٰ اپنی بیٹی کو کسی ایسے ادارے میں نہیں بھیج سکتا۔ جہاں یا تو سیکولرازم کو پروان چڑھایا جاتا ہو۔ یا پھر غیر محسوس طریقے سے اسکول کی آڑ میں مشنریز کام کرتی ہوں۔ مسز جونز نے ساری عمر ادھر گزاری تھی۔

وہ بامحاورہ اردو تک کو سمجھ لیتی تھیں۔ موسیٰ کے خیالات جان کر ششدر رہ گئیں۔ ایسا مذہبی شدت پسند۔

انہوں نے سائن کر کے اسٹمپ بھی لگادی۔ ٹھاہ۔

انہوں نے اپنا سارا غصہ یوں نکالا تھا۔ جیسے کورٹ میں جج ہتھوڑی مار کے فریقین کو خاموش ہونے کا حکم دیتا ہے۔

موسیٰ کے حلق سے پرسکون سی سانس نکلی۔ اس نے اچھل اچھل کر بولتی حسنل کو نظرانداز کرتے ہوئے سرٹیفکیٹ پکڑلیا۔



یہ سوال اب اتنا مشکل نہیں رہا تھا کہ ان دونوں کا درمیانی اختلاف زبان زدعام کیسے ہوگیا۔ سورس آف انفارمیشن کیا ہوسکتی تھی۔

موسیٰ نے نیوز چینل بند کر کے اخبار اٹھایا تو وہاں بھی یہی قصہ تھا۔ اس نے دوسری نظر ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ جبکہ حسنل نے اخبار کا کچومر بنا کر پھینک دیا۔

موسیٰ کو بھی ان سب چیزوں سے تکلیف پہنچی تھی۔

گھر کے اندر کی... سراسر ان دونوں کے بیچ کی خبریں وہ بھی حرف بہ حرف... ہیڈلائنز کیسے بنیں۔ ایک تو ڈرا

جیسے لگی لگائی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔

دوسری اسکول پرنسپل مسز جونز...

ہاں یہ عین ممکن ہے۔ بلکہ یہی ہوا ہے۔

مگر کچھ باتیں اور بھی تھیں۔ وہ کیسے بھلا... یہاں موسیٰ بھی چپ ہوگیا۔

عین اسی وقت میرون پردوں اور صوفوں سے سجے ٹی وی لاؤنج میں چائے کا مگ لے کر بیٹھتی شہزادو نے ٹی وی آن کیا تھا۔ تیسرا ذریعہ وہ جملے تھے۔ جو اس نے بظاہر سرسری انداز میں اپنے حلقے میں کہے تھے۔

ایسے جیسے پکی ہوئی ہانڈی میں کوئی چپکے سے مرچ کی مٹھی کھول دے۔

اس نے کھل کر ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ مگر جن لوگوں کے سامنے کہا تھا۔ ان کو صرف پر درکار ہوتا تھا۔ کوا وہ خود تیار کرتے تھے۔

کیسی تازہ دم صبح تھی۔ نیوز اینکر کی چبھتی آواز سماعتوں میں رس گھول رہی تھی۔ سچی بات ہے۔ بہت مزہ آرہا تھا۔



دو تین روز کی ہیڈلائنز کے بعد معاملہ ٹھنڈا ہوا تو دونوں نے سکھ کا سانس لیا اور اپنے اپنے طور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کا عہد بھی...

موسیٰ نے کچھ مہمانوں کی آمد کا بتا کر کھانے کا بندوبست کروادینے کی ہدایت کی تھی۔ شیف مینیو پوچھنے کے لیے کھڑا تھا۔

"کون لوگ ہیں؟" اس نے بھرپور توجہ سے موسیٰ کو نوازا۔

"کچھ دوست ہیں۔" حسنل کو دوست لفظ سن کر اچھا لگا۔ دوست... ہم...

اس نے جلدی جلدی مینیو گنوانا شروع کیا۔ موسیٰ کی پسند کے سارے کانٹی نینٹل کھانے...

"ایک منٹ' ایک منٹ..." موسیٰ کا ہاتھ اٹھا۔ "یہ سب رہنے دو۔ سادہ سا کھانا بناؤ۔"

"سادہ کھانا' وہ کیا بھلا...؟" موسیٰ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔

"مٹن پلاؤ اور کوئی سبزی گوشت اور دہی... وہ جو پلاؤ پر ڈالتے ہیں۔"

"رائتہ سر..." شیف نے الجھن رفع کی۔ وہ میم سے زیادہ ہکابکا تھا۔

"ہاں وہی رائتہ۔ اور میٹھا لازمی بنانا ہے۔"

شیف نے میم کو دیکھا۔ اس نے سر کو کبھی ایسے کھانے کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے پاکستانی کھانوں سے مسالوں اور تیل کی سخت شکایت تھی۔

وہ آج تک اپنی غذائی عادات نہیں بدل سکا تھا۔ اور اب تو ویسے بھی اس کی خوراک بہت کم رہ گئی تھی۔

ایک وہ وقت تھا جب ذرا سی بھی کمی بیشی پر وہ طوفان اٹھا دیتا تھا۔ ذائقے پر کوئی کمپرومائز نہیں کرتا تھا۔ اچھا برتن... اچھی پریزنٹیشن' نیپکن' چھری' کانٹے۔ اور اب... سبزی گوشت تو اس نے اپنی پوری زندگی میں نہیں کھایا تھا۔

"سر! پھر آپ کے لیے کیا بناؤں۔" شیف نے اپنے تئیں سب سے ضروری سوال کیا۔

"کچھ نہیں... میں بھی یہی سب کھالوں گا۔ پیٹ ہی تو بھرنا ہوتا ہے ناں۔" اس کے چہرے پر اضمحلال ٹھہر گیا۔

"جی... جی سر!"

حسنل جانتی تھی۔ وہ صحرا میں بھوکا پیاسا رہا تھا۔ ایک بوند پانی کو ترستا روٹی کا ایک خشک ٹکڑا ہی مل جائے۔ اس نے بتایا تھا۔ اس نے سوچا تھا۔ آسمان پر اڑتے کسی کوے کے پنجوں سے ہی کچھ چھوٹ جاتا اور وہ اسے کھالیتا۔

موسیٰ بے تابی سے مہمانوں کا منتظر تھا۔ حسنل اس کے کہے بغیر تیار ہو گئی۔ موسیٰ کو تو اب بہت کچھ کہنا بھول جاتا تھا۔ مگر وہ تو مینرز نہیں بھولی۔

آخر وہ میزبان ہے۔ مہمانوں کی آمد کی اطلاع پر موسیٰ تقریباً "بھاگا"۔ حیران ہوتی حسنل نے پردہ سرکا کر جھانکا اور اس کی نگاہوں کے سامنے ہفت آسمان گھوم گئے۔

☆ ☆ ☆

"آج کے لیے یہ رنگ مناسب ہے۔" اس نے گہرے جامنی رنگ کا فراک لہرایا۔ "یہ تم پر بہت سجتا ہے۔"

اس نے آدھا سچ کہا۔ اسے تھا کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔

"مجھ پر اب کوئی رنگ نہیں سجتا۔" اس نے حقیقت پسندی سے برامانے بغیر ٹوک دیا۔

"تم چینج کرلو تو پھر کچھ کھانے کو لے آؤں۔ تمہاری دوا کا وقت ہو رہا ہے۔" وہ حجت کرنا چاہتی تھی مگر پھر اس نے اپنے بازو اوپر اٹھا دیے۔ یہ اشارہ تھا کہ یہ کام بھی وہی کرے۔

فراک پہنا کر اس نے سینے کے تمام بٹن بند کیے۔ پھر اس نے اس کے بالوں میں برش کیا۔ بہت احتیاط سے سرخ لپ اسٹک لگانے کے بعد اب وہ اس کے ناخنوں پر رنگ پھیرنے لگا تھا۔ اسے اس کام میں مہارت حاصل تھی۔ مگر بڑھاپے اور بیماریوں نے ہاتھ میں رعشہ پیدا کر دیا تھا۔ پھر بھی اس کی کوشش تھی۔ کام خراب نہ کرے۔

"اس کا فون نہیں آیا ناں...؟" اس کا ہاتھ لرز گیا۔ سرخ رنگ پور پر جا لگا۔

"تم نے اسے فون کیا تھا ناں...؟"

"میں نے کیا تھا۔ کچھ نیٹ ورک پر ابلم ہے۔" (بالکل جھوٹ...)

"نہیں... وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتی ہوں۔ اس سے کہنا میں مرنے سے پہلے اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی وہ تم سے مل کر گیا تھا ناں..."

"مگر میں مری نہیں ناں..." اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "دوبارہ دل کرتا ہے۔ میں کیا کروں۔"

اس نے نیل پالش سائیڈ پر رکھ دی اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گیا۔ جب وہ بہت سارا بول لیتی تھی۔ تو اس رات سکون کی نیند سوتی تھی۔ (ہاں پھر وہ جاگتا رہتا تھا۔)

"وہ کبھی بھی مجھے پسند نہیں کرتا تھا۔" وہ آغاز یہیں سے کرتی تھی۔

"وہ کبھی بھی ہمیں پسند نہیں کرتا تھا۔" اس نے جیسے کھرنڈ نوچ لیا۔ وہ بری طرح چونکی۔

"اس نے کہا تم سے...؟" ہاں ماں کی نسبت وہ باپ سے نزدیک تھا۔ اس نے یقیناً "کہا ہو گا۔ اسے یقین آگیا۔

"سی ڈی لگا دو' میں اس کی آواز سننا چاہتی ہوں۔" وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے لمبا سانس بھرتے ہوئے

حکم کی تعمیل کی۔
"اس کا نیا البم نہیں آیا۔" وہ چھپر کھٹ پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ وہ خاموش رہا۔ اس کا بولنے کا دل نہیں تھا۔
بڑھاپے کی سو بیماریوں کے ساتھ اسکارلٹ کو بولنے کی بیماری بھی لگ گئی تھی۔ اور بدر کو چپ کی۔

وہ جلے پیر کی بلی کی طرح گھوم رہی تھی۔ کہاں تو ایک ذمہ دار میزبان کا کردار بنا ہنے کی پوری تیاری تھی۔ اور پھر یہ کہ سارے کام ملازمین کرتے رہے۔
اور وہ کمرے سے اٹھتے قہقہوں پر پیچ و تاب کھاتی رہی۔ ڈائننگ ٹیبل پر سجی قیمتی خوب صورت امپورٹڈ کراکری... فرشی دسترخوان پر سجادی گئی۔ کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اور پردے آگے سرکائے ہوئے تھے۔ اس نے پھر بھی جھری بنالی اور اندر کا منظر دم بخود کردینے والا تھا۔
دوستوں کی دعوت... اس نے خوش گمانی کی پتنگ آسمان کی حد تک اڑائی تھی۔ تو یہ تھے موسیٰ کے دوست... اس نے واقعی آنکھیں مل کر دیکھا تھا۔
آنے والے مہمان... اور ان کا استقبال کرتا موسیٰ... وہ رکوع ہوجاتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو تھام کر مصافحہ کرتا تھا اور پھر بغل گیر ہوجاتا تھا۔ خوشی، ہنسی، طمانیت جس کا موسیٰ کی زندگی میں اب فقدان لگتا تھا۔ اس وقت ایسا کچھ نہیں تھا۔
اور موسیٰ کے دوست... یہ حسنل کی سوچ سے پرے کی چیز تھی۔ سفید شلوار کرتے، کھلے ٹخنے... سر پر ٹوپی، پاجامہ، باریش چہروں والے... ہر عمر کے مرد... دوست... موسیٰ نے کن لوگوں کو گھر بلایا تھا۔
اور دوست — کہا تھا۔ حسنل کو لگا، وہ تین چار برس کی بچی ہے۔ اور یہ مفتی عبدالرحمن کا گھر ہے۔ ان ہی کے گھر میں ایسے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا نا...
ذرا سی درز بھی پورے کمرے کی وضاحت تھی۔ کھانا بہت رغبت سے خوش گوار ماحول میں کھایا جارہا تھا۔ وہ سب ہاتھ سے پلاؤ کھا رہے تھے۔ حسنل سانس لینا بھول گئی۔
موسیٰ... موسیٰ بھی ہاتھ سے کھا رہا تھا۔ اس میں اسے مشکل کا سامنا تھا۔ وہ بہت چھوٹا لقمہ بنا رہا تھا۔ اس کے پاس ہی کانٹا چمچ پڑا تھا۔ مگر اس نے اسے چھوڑ کر... یہ وہ موسیٰ نہیں تھا۔ جسے وہ جانتی تھی۔
"میم...!" آواز پر وہ اچھل کر پلٹی۔ شیف مؤدب کھڑا تھا۔
"سر نے قہوہ کے لیے کہا تھا۔ وہ لے آؤں؟"
وہ اس کی صورت دیکھنے لگی۔ اس نے سوال دہرایا حسنل نے سر جھٹکا۔ خود پر قابو پانے میں بڑی دقت تھی۔
"ابھی نہیں... کھانے کے برتن اٹھالینے کے بعد قہوہ دیتے ہیں۔"
وہ شیف کو سر ہلاتا دیکھ کر اندر بڑھی۔ شیف کا سوال اچنبھا نہیں تھا۔ اس گھر میں پہلی بار ایسی مہمان داری کی جارہی تھی۔ جبکہ حسنل... وہ سب جانتی تھی۔
مفتی عبدالرحمن کے گھر میں یہی طریقہ تھا۔



"بڑے بڑے لوگوں کے بڑے بڑے دعوے دیکھے ہیں۔ سب واپس لوٹ آتے ہیں۔ تم تھوڑا صبر کرو ہنی۔"
یہ ملک کا نامور ڈائریکٹر تھا۔ نئی ڈراما سیریل کے حوالے سے میٹنگ ہورہی تھی۔ حسنل بہت خاص موقعوں پر آفس آیا کرتی تھی۔ ڈرامے کا مرکزی کردار شہزاد ادا کررہی تھی۔ اور آج اس کا برتھ ڈے بھی تھا۔ میٹنگ اختتام پذیر ہوچکی تھی۔ اب چائے کا دور چل رہا تھا۔ ساتھ ہی کیک بھی کاٹ لیا گیا۔ اس پر سولہ موم بتیاں تھیں۔ جس کی توجیہہ شہزاد نے پیش کی۔ اس کا دل آج بھی سولہ سالہ لڑکی طرح دھڑکتا ہے۔
سارا کمرہ ورکرز سے بھر گیا۔
کسی نے موسیٰ کا ذکر چھیڑ دیا۔ بحیثیت دوست

شہرزاد کا برتھ ڈے کیک موسیٰ لازمی منگوایا کرتا تھا۔ مگر آج وہ نجانے کہاں تھا۔ اسے یاد بھی کہاں ہوگا کہ..... شہرزاد کا دل ٹوٹ گیا۔ ایسے یا ویسے..... وہ نکلا شہرزاد کے ہاتھوں سے بھی تھا۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے' تھوڑا اور صبر کرو۔ بہت مشکل ہوتا ہے' ایسے یک دم پورا لائف اسٹائل بدلنا۔"

اسے کچھ تو کہنا تھا۔ سب موجود تھے ناں..... ورنہ تنہائی میں وہ اسے ڈراتی تھی۔ موسیٰ اگیا کام سے۔

"صبر ہی تو کر رہی ہوں اور کر بھی کیا سکتی ہوں؟" وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ گھر میں رہنا دوبھر ہو چکا تھا۔ اب یہاں بھی یہی ذکر.....

تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔ یہ موسیٰ تھا مسکراتا چہرہ اور ہاتھوں میں پکڑا بہت بڑا اور خوب صورت کیک..... جس پر لکھا "شہرزاد" سرسری نگاہ پر نظر میں آجاتا تھا۔

سب کے مسکراتے چہرے سمٹے تھے۔ کئی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ اس نے سرگرمیوں سے لاتعلقی کا اعلان کیا تھا۔ مگر مالک تو تھا ناں..... وہ دروازے میں ایستادہ تھا۔ باہر نکلنے کی کوشش بے سود تھی۔ کیک کی باقیات ماحول اور وجوہ بیان کر رہی تھیں۔

"دلس اوکے..... آفسز میں برتھ ڈے ایسے ہی منائی جاتی ہیں۔ نو پرابلم..... نو ایشو..... مگر..... مگر....."

موسیٰ کی پیشانی پر لکیریں کھنچ گئیں۔

مگر حسن المآب وہاں کیا کر رہی تھی۔

اس نے کہا نہیں تھا۔ اسے کہ وہ بھی اس سب سے دور ہو جائے۔ یہ فیصلہ تھا۔ حکم تھا۔ وہ گناہ کی دنیا سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا اور اس کی بیوی یعنی شریک حیات..... ایمانے موسیٰ کی ماں..... ہنوز وہیں۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" موسیٰ گول تکیے جتنے بڑے کیک کو شہرزاد کو دینا بھول گیا۔ اس نے اسے یوں ہی ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ وہ حسنل پر بولنا شروع ہو گیا تھا۔

بات نہ بڑھتی مگر حسنل بھی چپ نہ رہی۔ ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہو گئیں۔ موسیٰ کے ہاتھ سے تحمل کی ڈور چھوٹ گئی۔

وہ اس سے صرف یہ پوچھ رہا تھا کہ اس کے منع کرنے کے باوجود..... کنارہ کش ہونے کے باوجود..... وہ پھر بھی یہاں ہے۔

حسنل نے کہا۔ وہ کنارہ کش ہونا چاہتا ہے تو ہو جائے۔ اپنی سرگرمیاں ختم کر دی ہیں تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ نہیں چاہتی جو چیزیں اس کے نام سے ہیں۔ جنہیں وہ ہینڈل کرتی ہے' وہ کرے گی۔ وہ اسلام کے بارے میں جانتا ہی کیا ہے۔ جمعہ جمعہ چار دن ہوئے نہیں۔ اسلام عورت کو کام کرنے سے نہیں روکتا۔

اس نے حضرت خدیجہ کی مثال دی۔

موسیٰ کی بولتی بند ہو گئی۔ وہ واقعی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ورنہ منہ توڑ جواب تو دو حرفی تھا۔

حضرت خدیجہ تو تجارت کرتی تھیں اور بی بی تم؟

موسیٰ کی یک دم خاموشی سب نے محسوس کر لی۔

حسنل بھی شیر ہو گئی۔

جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی۔ پھر رونا شروع کر دیا۔ زندگی عذاب ہو گئی تھی بے چاری کی..... بتانے کی ضرورت نہیں کہ سب کی ہمدردیاں کس کے ساتھ تھیں۔

شہرزاد نے حسنل کو چپ کروانا شروع کر دیا۔

سب دھیرے دھیرے سرک گئے۔ موسیٰ صوفے پر بیٹھا ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے سامنے دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

شہرزاد سرکاری وکیل لگ رہی تھی۔

حسنل نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ڈھیلے ہو جانے والے دوپٹے کو کستے پرس کو جھپٹ کر وہ موسیٰ کے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔

شہرزاد نے چونک کر خود کو دیکھا۔ اتفاقاً "سراسر اتفاقاً" وہ آج گلے میں شیفون کا دوپٹا لٹکا کر آئی تھی۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو موسیٰ..... ہنی کو تمہاری بات ماننی چاہیے۔"

وہ باپردہ سی بی بی بن کہ موسیٰ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

موسیٰ کا کرتا موراں ہائی ہونے لگا۔ شہزلو نے اور بھی ایسی بہت سی باتیں دردمندی سے کی تھیں۔

موسیٰ یک دم اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔ اس نے ہنی کا نمبر ملایا۔ وہ اسے شاباش دے رہی تھی۔

اس نے بہت اچھے طریقے آج سے موسیٰ کو ٹریٹ کیا تھا۔ اور اسے آئندہ کے لیے بھی قطعاً "ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے موقف پر یوں ہی ڈٹی رہے۔"

حسنل کا کرتا موراں بھی ہائی ہو گیا۔ ایک کان سے فون لگائے دوسرے گال سے کُکے کو جوڑے وہ پھولوں کی خوشبو سے سرشار ہوتے ہوئے بلا تکان بول رہی تھی۔

آفس کے باہر بنے کیبن میں ایک ورکر دوسرے کو اپنے موبائل سے وہ ویڈیو دکھا رہا تھا۔ جو اس نے موسیٰ اور حسنل کی تلخ کلامی کے دوران چپکے سے بنائی تھی۔ چپکے سے کیے جانے والے کاموں کی تشہیر چپکے سے نہیں ہوتی۔

ایک اور نیا محاورہ حاضر ہے۔

ویڈیو سے نکلی سوشل میڈیا پر چڑھی۔

✲ ✲ ✲

مذہبی معاملہ تھا۔ براہ راست بات نہیں ہو سکتی تھی۔ ہر طرح کے مکتبہ فکر کے لوگ ہوتے ہیں۔ تنقید میں محتاط روی تھی تو تعریف سے بھی آنکھ بچالی جاتی۔ لیکن سوشل میڈیا... سوشل میڈیا تو پھر سوشل میڈیا ہے۔

راز... راز نہ رہا۔ موسیٰ کو اس چیز کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ انگریز معاشرت کا پروردہ تھا۔ جہاں بات شخصی آزادی سے شروع ہو کر شخصی آزادی پر ختم ہوتی ہے۔ فرد آزاد ہے۔ معاشرہ جائے بھاڑ میں... اس کے والدین شخصی آزادی کی مثال تھے۔

بچپن میں میڈ اسے اپنے کام سے کام رکھنے کی تلقین کرتی تھی۔ یہ عادت پھر گھٹی میں پڑ گئی۔ مزاج بن گیا۔

"لوگ کیوں ذاتیات میں دخل دیتے ہیں۔" وہ طیش میں تھا۔ "مجھے نہیں پسند ایسے لوگ۔ لوگوں نے مذاق بنالیا ہے۔" اس کا اشارہ ان ہزاروں کمنٹس کی جانب تھا۔ جو کچھ بھی ہو سکتے تھے۔

"میں سخت اذیت میں ہوں حضرت...!" اس نے مولانا صاحب سے کہا۔

"زمانہ بدل گیا ہے سمیع الدین... اذیت پہنچانے کا انداز بھی بدل گیا ہے۔ اب اسی طرح تنگ کرتے ہیں لوگ۔"

"لوگ مجھے وحشی۔ شدت پسند۔ تنگ نظر میل شاؤنسٹ اور نجانے کیا کیا کہہ رہے ہیں۔ میں ایسا نہیں ہوں جناب۔"

"آپ اپنے گھر کی اصلاح کیجئے سمیع الدین... لیکن صبر و تحمل کے ساتھ" مولانا صاحب نے نظر چرا کر کہا۔ "پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ صبر مشکل مگر نتیجہ خیز ہوتا ہے۔"

مگر حسن المآب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

پہلے وہ صبر سے موسیٰ کے ٹھیک ہو جانے کی منتظر تھی۔ اور تمام اعتراضات کو دانتوں تلے داب لیا کرتی مگر اب۔ چینلز پر چلتی سنسنی خیز خبریں... ہانپتا رپورٹر... چلاتا اینکر دونوں کی اکٹھی تصویر کے بیک گراؤنڈ میں آسمانی بجلی کی آواز ہوتی اور تصویر میں دراڑ پڑ جاتی۔ تصویر کا رخ بدل دیا جاتا۔ وہ دونوں مخالف راستوں کے مسافر دکھائی دیتے۔

وہ تصاویر لگائی جائیں۔ جب وہ بالکل ایک جیسے لگتے تھے۔ اور یہ تصاویر جب بالکل الٹ لگتے تھے۔ مگر یہ خبریں سچ ہونے کے باوجود بہت جلد کشش کھو بیٹھی تھیں۔

اور وجہ ان دونوں کی خاموشی تھی۔ جیسے لب سی لیے ہوں... نہ تصدیق نہ تردید...

لوگ بھولنے لگے کہ کوئی موسیٰ نام کا گلوکار تھا' سحر کار تھا۔

لیکن گھر کے اندر..... ان دونوں کے بیچ..... پکچر اب شروع ہوئی تھی۔ وہ دونوں لڑنے لگے تھے۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں قدغن لگائی۔

اور جواباً" حسنل ایک بہت زبان دراز جھگڑالو عورت بن کر سامنے آگئی۔ اس نے مصلحت کا چولا اتار پھینکا۔ اس نے کھل کر انکار کر دیا۔

اس نے موسیٰ سے کہا: جو جیسے چل رہا ہے ویسے چلنے دے۔ وہ بھی تو ہے ناں۔ دین دنیا دونوں چیزوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔"

یہ بات چھ ماہ پہلے تک کی جاتی تو موسیٰ مان جاتا مگر مسئلہ یہ تھا۔ موسیٰ نے اب خود سے ہر شے کو جج کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے اب خود صحیح غلط کی پہچان ہونے لگی تھی۔ کچھ وقت جاتا۔ وہ راہ سے بھٹکی بیوی کو بزور طاقت روکتا۔ مگر یہ وہی دن تھے جب اس کا فون دن رات کا خیال کیے بغیر بجتا تھا۔ اور ایسے میں وہ حال کو بھول کر ماضی میں سفر کرنے لگتا تھا۔

اتنے محاذوں پر کیسے لڑے۔ ایک لڑائی خود سے..... جس میں وہ جیت کی طرف گامزن تھا۔ ایک طرف گھر اور گھر والی..... اور دوسرا یہ فون.....

سب نے اسے اتنے دنوں بعد آفس میں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ وہ جبراً" مسکرا کر سب کے ہمدردانہ تبصرے سنتی رہی۔ بہت کام تھے۔ اس نے سب کو فاسٹ فاسٹ کہہ کر دوڑایا۔ برق سی دوڑ گئی۔ وہ معمول سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔

"اب ـــ آپ روزانہ آیا کریں گی میڈم؟" ایک نئی ورکر نے اشتیاق آمیز پرامید لہجے میں دریافت کیا۔ اس کا مسکراتا چہرہ سمٹ گیا۔

"میں روزانہ کبھی بھی نہیں آیا کرتی تھی۔"

سب کے سر تائیداً" ہلنے لگے۔

شہزاد تک اس کی آفس میں موجودگی کی خبر پہنچ گئی تھی۔ وہ اپنی مصروفیات ترک کر کے فوراً" پہنچی۔ حسنل کی ہمت کی داد دی کہ اسے کسی سے ڈرنے گھبرانے کی ضرورت نہیں..... وہ جتنی ڈھیلی ہو گی موسیٰ اتنا ہی اکڑے گا۔ وہ ڈٹی رہے۔

حسنل کی رگوں میں کسی کھلاڑی کا سا جوش دوڑنے لگا۔

"تم ہی ہو جو اسے واپس لا سکتی ہو۔" موسیٰ کے ایک اور پروجیکٹ سے منسلک ..... لوگ بھی اس کی موجودگی کا سن کر دوڑے آئے تھے۔ ان کی اپنی چتا تھی۔

"وہ کسی چیز پر راضی نہیں۔" ڈائریکٹر سخت دلبرداشتہ تھا۔

"تم اس سے کہاں ملے۔ موسیٰ تو کسی سے بھی نہیں مل رہا۔" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

ڈائریکٹر نے حاضرین کو دیکھا اور پہلو بدل کر شہر کے مشہور مدرسے کا نام بتا دیا۔

"مدرسے میں....." شہزاد کے حلق سے سیٹی نکلی۔

"تم البم کی بات کرنے مدرسے پہنچ گئے؟"

"تو کیا کرتا....."

"اور بات کیا کی.....؟" سب کی عجلت حد سے سوا تھی۔

"میں نے تو وہی کہا جو کہنا چاہیے تھا کہ اس البم کو مکمل کروا دو۔ آدھے سے زیادہ کام ہو چکا ہے۔ کتنے ہی

لوگ اس سے منسلک ہیں۔"
کہنے لگا۔"اسی لیے بلوایا ہے تمہیں.... اگر کسی کی پے منٹ وغیرہ کا ایشو ہے تو بتاؤ مجھے.... میں سب کلیئر کروں گا۔"
"میں نے کہا بات پے منٹ کی نہیں ہے۔ کم از کم یہ ہی اجازت دے دو کہ ہم اسے ایسی حالت میں استعمال کرلیں۔ وہ لاتعلقی کا اعلان کردے۔ تو کہنے لگا۔ وہ اپنے نام کے ساتھ کسی بھی طریقے سے اس طرح کی چیزوں کو منسوب نہیں کرسکتا۔ یہ بات تو میں بھول کر بھی نہ کروں اور کوئی مسئلہ ہے تو بتادو میں نے پھر بھی منت کرنا نہیں چھوڑی۔ اور کہا دیکھو موسیٰ! ساری محنت ضائع جائے گی۔ یوں ہی ڈبوں میں بند پڑی کس کام کی.... بہت سوں کا بھلا ہوجائے گا۔ کہنے لگا کیا فرق پڑتا ہے۔ پڑی رہیں ڈبوں میں بند.... اگر میں مر چکا ہوتا تب بھی تو یہ چیزیں یونہی ڈبوں میں بند رہ جاتیں۔ اب بتاؤ میرے کہنے کو کچھ بچا؟؟؟ سب ٹھیک کہہ رہے ہیں، موسیٰ سے بات کرنے کا مطلب ہے۔ "مرنے کے بعد کیا ہوگا" والی کتاب پڑھی جارہی ہے۔"
ڈائریکٹر نے قصہ ختم کردیا۔ بولنے کو بھی دل نہیں کرتا تھا۔
"مجھے تو آپ پر حیرت ہوتی ہے۔ آپ کیسے ان سب چیزوں کو برداشت کررہی ہیں۔" میاں بیوی کے رشتے میں یہ خوامخواہ کے ہمدرد دراصل شیطان کے چیلے ہوتے ہیں۔
حسنل کے انداز میں بھی بے چارگی سی آگئی۔
سب اس کی ہمت کی داد دے رہے تھے اور ڈٹے رہنے کی تلقین.... اپنے ساتھ کی یقین دہانی....
ان میں شہزاد سرفہرست تھی۔ اسے شوٹ پر جانا تھا سو سب پہلی اٹھ گئی۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر اس نے موسیٰ کے لیے ایک میسج ٹائپ کیا۔
"آج ہنی کو آفس میں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ میں اس امید پر آئی تھی کہ تم بھی ملو گے۔ تم بہت اچھے راستے پر چل پڑے ہو موسیٰ.... جہاں شاید میری دوستی کی گنجائش نہیں۔ مگر غم گساری کا رشتہ تو کبھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔ ایک بات یاد رکھنا۔ تم ہر حال میں، ہر شکل میں میرے سب سے اچھے دوست ہو۔ تم غلط کر ہی نہیں سکتے۔"
بھیجنے سے پہلے اس نے متن کو بغور پڑھا۔ ایک آدھ جگہ درستی کرکے کلک کردیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔
"میرے منع کرنے کے باوجود ہنی....؟" حسنل فیصلہ نہ کرسکی۔ موسیٰ کے لہجے میں صدمے کا عنصر زیادہ تھا یا غصے کا.... اس کا آفس جانا چھپنے والی بات ہرگز نہیں تھی مگر اتنی جلدی موسیٰ کے علم میں آئے گی۔ اپنے تئیں تو وہ بہت سے ضروری کام نبٹاتی بروقت گھر پہنچی تھی اور بہت گھریلو حلیے میں بالوں کو کوہان کی طرح سر پر کلپ کیے ایمانے کا بیگ چیک کررہی تھی۔
جب موسیٰ گھر لوٹا۔ اس کے انداز میں عجلت اور نگاہیں متلاشی تھیں۔ وہ بے تابی سے پکارنا چاہتا تھا۔ مگر تب ہی اس نے ماں بیٹی کو دیکھ لیا۔
ایمانے بھاگ کر باپ سے لپٹی تھی۔ بیٹی کو غائب دماغی سے جواب دیتے ہوئے بھی اس کی نظریں بظاہر بے نیاز نظر آتی حسنل پر جمی تھیں۔
"پاپا کے لیے پانی کون لائے گا....؟" اس نے ایمانے کو منظر سے ہٹانے کی غرض سے کہا اور حسنل کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
"میرے منع کرنے کے باوجود ہنی....!" اس نے یہاں سے آغاز کیا۔
"کیا....؟" وہ واقعی نہیں سمجھی تھی یا یہ تجاہل عارفانہ تھا۔
"تم آج سارا دن آفس میں تھیں۔"
"ضروری کام تھا۔" اس نے بالوں کو کسا اور اٹھنے لگی۔
"اب ہمارا وہاں کوئی ضروری کام نہیں ہے ہنی!" اس نے گردن اٹھا کر تنبیہی انداز سے کہا۔
"یہ آپ کا خیال ہے۔" وہ بے خوفی سے بولی۔
"تمہیں میرا ہم خیال ہونا پڑے گا حسن المآب!" اس نے اس کا ہاتھ جھپٹا اور ایک لحاظ سے اسے

اپنے سامنے بٹھایا اور اپنی کرسی اتنا نزدیک کرلی کہ دونوں کے گھٹنے ٹکرانے لگے۔

"نہیں..." اس نے ہاتھ چھڑانے کی کشمکش چھوڑ دی۔ اس پر ٹھہری ندی کا گمان ہونے لگا۔

"تمہیں تو مجھ سے محبت تھی۔" سنہری آنکھیں سُندر رنگ آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔

"تھی کیا مطلب؟" اس کے ابرو کمان ہوگئے۔ "اب بھی ہے۔"

"تو محبت میں تو محبوب کے رنگ میں خود کو رنگ لیا جاتا ہے۔" وہ کتنی دیر بعد بولنے کے قابل ہوا تھا۔ ہاتھ کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی۔

"ہاں...!" حسنل نے اپنا ہاتھ کھینچا اور اپنے سر سے پیر تک کی لمبائی اشارہ سے دکھائی۔

"تو میں نے رنگ لیا نا... یہ دیکھیں مجھے..." وہ اسے اپنے سراپے کی طرف متوجہ کررہی تھی۔ "میں اپنی ماں کے گھر سے ایسی نہیں آئی تھی' یہ جو کچھ ہے آپ ہی کا رنگ کا ہے۔"

کٹ ٹراوزر میں اس کی پنڈلی عیاں تھیں... ٹشو پیپر جیسی لان کے اونچے کرتے سے زیر جامہ جھلک مار رہا تھا۔ دوپٹا کہنی میں پھنسا ہوا تھا۔

تراشیدہ زلفیں... بھنویں خاص اٹھان سے بنوائی گئی تھیں۔ نفاست سے بڑھے ناخنوں پر پیل آف (چھلکے کی طرح اتر جانے والی) نیل پالش تھی۔ وہ جس جانب اشارہ کررہی تھی۔ موسیٰ سمجھ گیا۔

محی الدین سہگل نے اچھی عورت کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا تھا۔ "اچھی عورت وہ ہوتی ہے جو شوہر کا کہا مانے۔"

وہ حسنل کو اچھی عورت کہتے تھے۔ نہ بھی کہتے موسیٰ کو لگتی تھی وہ... لیکن وہ پہلے کی بات ہے۔ ابھی تو وہ لاجواب ہوگیا تھا۔

"محبت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جو دل چاہے منوا لیا جائے۔ محبت کو ٹول (اوزار) مت بنائیں جس سے میں بلیک میل ہونے لگوں۔" اس نے روکھے پن کی حد کردی۔

"تو میں اتنے سال اس دھوکے میں جیتا رہا کہ ہنی میری ہر بات مانتی ہے۔"

آفس جانے کا غصہ ذہن سے نکل گیا۔ وہ درمیان میں یہاں اٹک گیا۔

"میں بھی دھوکے میں جیتی رہی کہ موسیٰ میری ہر بات مانتا ہے۔" اس نے دوبدو کہا۔

موسیٰ چونکا... پھر اس کا چہرہ اتر گیا۔ "میں اکیلا تو اس محاذ پر کھڑا نہیں رہ سکوں گا۔"

"تو کس نے کہا ہے اعلان جنگ کرنے کے لیے... آپ کو اپنی زندگی کا سکون اچھا نہیں لگتا۔ کس بات کا طوفان اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم کتنی اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ دنیا رشک کرتی تھی اور اب وہی دنیا..."

اسے اپنا بیان روکنا پڑا۔ موسیٰ پر ان جملوں کا اثر ہوا تھا۔ ہاں اس نے کیوں سکون تیاگ کر اس وادی خارزار میں قدم رکھ دیا... سوال تو بنتا تھا۔

"اچھا ایک بات بتائیں۔ آپ کی بات مان لوں... تو یہ سب چھوڑ کر کیا کروں گی میں... گھر بیٹھ جاؤں؟ اس بارے میں سوچا آپ نے؟"

اس کے سوال نے موسیٰ کا ذہن خالی کردیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی اس میں اپنے عظیم خیالات بھرنے شروع کردیے۔

"ایسا نہیں ہوسکتا کہ دنیا کی آدھی آبادی کو گھر بٹھا دیا جائے۔ دنیا کی کسی کتاب میں عورت کو مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے سے نہیں روکا گیا۔" اس کے لہجے میں حلاوت گھلنے لگی۔ وہ بغور سن رہا تھا۔

"ہاں تو ٹھیک ہے ناں... تمہیں کون کہہ رہا ہے گھر بیٹھنے کو... بیٹھنا بھی نہیں چاہیے۔" حسنل کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔

"تم بھی میرے ساتھ آجاؤ۔ ہم دونوں مل کر دین کو سیکھیں گے سکھائیں گے۔"

وہ اپنے آئیڈیے پر پھولا نہ سمایا۔ حسنل کو اپنے حواس مختل ہوتے محسوس ہوئے۔

"آپ کا... میرا دماغ خراب نہیں ہوا ابھی..." وہ چلا بھی نہ سکی۔ آواز بند ہوگئی تھی۔



عبدالمبین نے نہ چاہتے ہوئے بھی چور نظروں سے کتنی ہی بار موسیٰ کی صورت دیکھی۔ بہت خاموش اور الگ تھلگ سا بیٹھا تھا۔

ایسے میں اس کا وقتاً" فوقتاً" بجتا فون ... نمبر دیکھنے سے وہ بدمزہ ہوتا تھا۔ کبھی خفا اور کبھی ازحد پریشان ... عبدالمبین کے قیاس کی گھوڑے حسن المآب پر آکر رک گئے۔ فون کے دوسری طرف یقیناً" وہی تھی۔ بلاوجہ اسے ڈسٹرب کرنے کے لیے کال کرتی ہوگی۔

ایک عمر گزاری تھی عبدالمبین نے ... دین کی طرف آنے والوں کے مسائل دیکھے تھے۔ عجیب و غریب واقعات ... معاشرہ' ماحول ... عزیز رشتے دار ماں باپ بہن بھائیوں تک کے رویے بدل جاتے تھے۔ استہزاء کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ وہ ایسے لڑکوں سے واقف تھا جن کے والدین نے سوتے میں ان کی داڑھیاں کاٹ ڈالیں۔ وہ انہیں شدت پسند نہیں بنانا چاہتے تھے۔

وہ ایک ایسے نوجوان سے بھی ملا تھا جو شرعی رہنمائی چاہتا تھا کہ وہ پنج وقتہ نمازی ہے اور اب داڑھی رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی ماں بہنوں نے سختی سے منع کیا ہے۔ کہ ایک بار رشتہ ہو جائے۔ شادی ہو جانے دو پھر جو مرضی رکھتے رہنا مگر ابھی نہیں' وہ ماں کی حکم عدولی کرے یا ...

تو اس کے آگے روز نئے تماشے ہوتے تھے۔

دین کی طرف آنے والوں کو ایک جنگ اپنے نفس سے جیتنی ہوتی تھی۔ ایک اپنے ماحول سے اور اپنے قریب کے لوگوں سے ... دوراہے پر کھڑے مظلوم لوگ ...

اور موسیٰ کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ... حسن المآب تھی۔

وہ ایک عام سی سطحی ذہنیت والی عورت ہوتی تو تب بھی احتجاج کو نظر انداز نہ کیا جاتا جبکہ وہ تو حسن المآب تھی۔ اور اب جبکہ عبدالمبین اس کے اصل خیالات سے واقف ہو چکا تھا۔ تب اس کی جانب سے کیے جانے والے احتجاج اور کھڑی کی گئی رکاوٹوں کا اندازہ کر سکتا تھا۔

"آپ فون سن کیوں نہیں لیتے موسیٰ؟" بیل بار بار مخل ہوتی تھی۔ عبدالمبین کہے بنا رہ نہ سکا۔ موسیٰ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر فون کو ... "میں اسے سائلنٹ کر دیتا ہوں۔"

"یہ اخلاقیات کے خلاف ہے۔ آپ اپنی مصروفیت بتادیں۔ یا پھر بات کرنے سے منع کر دیجیے۔ آپ کے اس عمل سے دوسری طرف موجود انسان کو سخت اذیت پہنچ رہی ہے۔ اسلام ایذا رسانی سے منع کرتا ہے۔"

"کیا یہ گناہ ہے۔" اس نے کسی بچے کی سی بے ساختگی سے کہہ ڈالا۔

عبدالمبین مسکرا دیا۔ "اخلاق ہمارے دین کی بنیاد ہے۔ اسلام تلوار کی مار سے نہیں اخلاق کے زور پر پھیلا ہے۔"

عبدالمبین نے اخلاقیات پر بیان شروع کر دیا۔ اس کی فصاحت و بلاغت کے کیا کہنے ... اس دوران فون بجتا رہا۔

"دوسری طرف کون ہے؟" یہ سوال بہت دنوں سے نوک زبان پر تھا۔ وہ پوچھنے کے بارے میں سوچتا تو بہت معیوب لگتا مگر اس وقت منہ سے نکل گیا۔

"آئی ایم سوری ..." اس نے سخت شرمندگی سے معذرت بھی کر لی۔ موسیٰ نے میز پر پڑا فون اٹھا لیا۔

"ہنی ... میرے ڈیڈ ... اور ..."

"آپ کے ڈیڈ ...؟ آپ ان کی کالز کیوں نہیں سن رہے۔" عبدالمبین نے الجھ کر دیکھا۔ موسیٰ نے نظر اٹھائی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ فون پھر بجنے لگا۔

"اور میں کسی کو انٹرویو دینا نہیں چاہتا ... مجھے کوئی کتاب نہیں لکھنی۔" اس نے فون بند کر دیا۔

"انٹرویو ... کتاب ... یہ کون کہہ رہا ہے؟" عبدالمبین چوکنا ہو کر بیٹھا۔

عبدالمبین، موسیٰ کو مولانا صاحب کے پاس لے آیا اور معاملہ ان کے روبرو پیش کر دیا۔ موسیٰ کے چہرے سے ناراضی ہویدا تھی۔ مولانا صاحب متبسم نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی داڑھی کو سہلا رہے تھے۔

"آپ مجرم تو نہیں ہیں۔ جو منہ چھپا کر بیٹھ جائیں۔ آپ کو ضرور انٹرویو دینا چاہیے۔ لوگ یقیناً" آپ کے اندر آنے والی ان تبدیلیوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اور جہاں تک کتاب لکھنے لکھوانے کی بات ہے۔ اسے ابھی رہنے دیں۔ تھوڑا سفر اور کریں تھوڑا راستہ اور طے ہو جائے۔ کتاب تو آپ کو لازمی لکھنی ہی ہوگی۔"

"نہیں..." اس نے سختی سے سر کو جنبش دی۔ "میرا تماشا بن جائے گا۔ وہ لوگ نجانے کیسے سوال پوچھیں۔ میں دین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، لوگ ہنسیں گے مجھ پر۔"

"ایسا نہیں ہے سمیع الدین...!" مولانا صاحب نے اس کی غلط فہمی دور کرنی چاہی۔

"جب رام ناتھ نے مجھ سے سوال پوچھے تھے ناں۔ تب لاعلمی نے مجھے اپنی ہی نظروں سے گرا دیا تھا۔ اور اگر اب لاجواب ہوا تو سب کی نظروں سے گر جاؤں گا۔"

"بجا فرماتے ہیں سمیع الدین..." مولانا صاحب کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "ہم نے عمریں لگا دیں۔ میں ڈھائی برس کا تھا جب والد صاحب نے مسجد میں بٹھا دیا تھا۔ آج زندگی کے سارے ادوار دیکھ چکا ہوں مگر اب بھی یہی لگتا ہے۔ نجانے کتنے فتوے دے چکا ہوں۔ مگر غلطی کے امکان کو کبھی رد نہیں کیا کیونکہ یہاں کوئی کلاس آخری نہیں ہے۔ تاحیات جاری۔"

موسیٰ ششدر ہو کر اثبات میں سر ہلاتے عبدالمبین کو دیکھنے لگا۔

"میں پھر بھی کوئی انٹرویو نہیں دینا چاہتا۔ میرے پاس تو دوسرے سے تیسرا جملہ نہیں ہوتا۔ دین خالی ہو جاتا ہے۔ دنیا کو تو چھوڑیں، مجھے تو میری بیوی دو جملوں میں پچھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ میں پوری تیاری سے بھی جاؤں تب بھی اس کی معلومات مجھ سے کہیں زیادہ ہیں وہ..."

"آپ کی بیوی؟" مولانا صاحب نے پہلے موسیٰ کو دیکھا اور پھر عبدالمبین کو۔ موسیٰ نے نظریں جھکائیں اور عبدالمبین نے چرائیں۔

"انٹرویو میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آپ پورے اعتماد سے کہیے گا کہ ابھی آپ سیکھ رہے ہیں۔"

"میرا خیال ہے انٹرویو سے پہلے اگر یہ ڈاکومینٹری والوں سے مل لیں تو بہتر ہے۔ ان کے سروائیول کی کہانی۔"

"میں اس وقت کو یاد نہیں کرنا چاہتا۔ میں یہ ذکر برداشت نہیں کر پاتا۔"

"ارے! اس موقع کو ضائع مت کریں۔ دنیا کو بتائیں اللہ جسے بچانا چاہے تو کیسے بچاتا ہے۔ اس سے اللہ پر ایمان مضبوط ہوگا۔"

موسیٰ نے چونک کر دیکھا۔ ہاں اس پہلو پر تو اس نے سوچا نہیں۔

"دل آسانی سے نہیں پلٹتے سمیع الدین... لیکن اگر اتنی بڑی دنیا میں سے ایک... کوئی ایک شخص بھی سمجھ لے تو کام بن گیا سمجھیں۔"

موسیٰ کا فون پھر بجنے لگا تھا۔ اسکرین کو دیکھتے ہی وہ بے بسی کا شکار نظر آنے لگا۔ جیسے اٹھانے کی کشمکش میں ہو۔

"کیا یہ ڈاکومینٹری والوں کا فون ہے۔" عبدالمبین نے قیاس لگایا۔ "لائیے میں بات کرتا ہوں۔" اس نے ہاتھ بھی بڑھا دیا۔

"نہیں۔" اس نے بجتے فون کو جلدی سے جیب میں رکھ لیا۔ "میرے ڈیڈ کا فون ہے۔"

"تو آپ فون اٹھائیں ناں... بوڑھے والدین کو ایسے انتظار نہیں کرواتے۔"

عبدالمبین کے لہجے میں عقیدت تھی۔ موسیٰ کے کندھے جھک گئے۔ کاش وہ کسی سے اس موضوع پر بھی گفتگو کر سکتا۔

☆ ☆ ☆

"تمہارے باپ نے میرے بیٹے کو روک رکھا ہے۔ اس نے زندگی بھر اسے مجھ سے چھیننے کی کوشش کی۔" اس نے غصے سے اپنے بال نوچ ڈالے۔

"وہ چھوٹا بچہ نہیں ہے کہ کوئی اسے روکے گا اور وہ رک جائے گا۔" بدر نے تھکے انداز میں کہا۔

"اس نے میرے بیٹے کو ہمیشہ میرے خلاف بھڑکایا۔" وہ حلق بل کے چیخی۔ "تم انکار نہیں کر سکتے اس سے۔۔۔" اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے تھے۔

"جو کیا ہم نے خود کیا۔۔۔ کسی نے کچھ نہیں کیا اس کا۔۔۔!" اس کے لہجے میں شکست آمیز اعتراف تھا۔

"نہیں۔۔۔" اس کا سر زور سے نفی میں ہلا۔۔۔ "میں نہیں مانتی۔ وہ ابھی تو مجھ سے مل کر گیا تھا۔ وہ کرتا ہے میری فکر۔۔۔ مجھ سے محبت۔۔۔ جب ہی تو آیا تھا میری بیماری کا سن کر۔"

اس کی خوش گمانی۔ بدر ٹھٹکا۔۔۔ ہاں اس بات میں دم تو تھا۔

"یاد کرو، وہ یہیں میرے بستر پر یہاں میرے پاس بیٹھ گیا تھا۔" اسکار نے بیڈ کی چادر تھپتھپائی "اور اس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑے رکھا۔"

"جب تک وہ بیٹھا رہا۔ مجھے یاد ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ بدر کے سامنے کر دیے۔

بدر نے خود پر مصنوعی تکان طاری کر لی۔ کہیں سچائی عیاں نہ ہو، تم آنکھیں موند لیں اور یہ خود کو اذیت دینے جیسا کام تھا۔

جس ملاقات کو وہ حاصل زندگی سمجھ کر دہرا رہی تھی۔ اسے وہ بند آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور یہ تکلیف دہ تھا۔ اسکار مزے میں تھی۔ اس وقت نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھی اور اس نے وہی دیکھا تھا جو اس نے دیکھنا چاہا تھا۔

وہ کن مشکلوں اور منتوں ترلوں کے بعد عیادت کو پہنچا تھا۔ کیسی خالی نظروں سے ماں کو دیکھتا تھا اور بدر کو بھی۔۔۔ کتنی اجنبیت تھی۔ اس کے انداز میں۔۔۔ بدر کو ہر بار یہ لگتا کہ وہ کمرے سے بھاگ جائے گا مگر وہ بہت دیر تک بیٹھا تھا۔ اس نے ماں کی میڈیکل رپورٹ کو بہت غور سے پڑھا تھا۔ بدر منتظر رہا کہ وہ فارغ ہو تو اس سے بھی بات کر لے۔

وہ کتنا مکمل، خوب صورت جوان تھا۔ کتنا کامیاب تھا، کتنی اچھی لائف گزار رہا تھا۔ اس کا ایک نام تھا عزت، شہرت کے ساتھ۔

اسے ایسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔

آخر بدر نے بات شروع کی۔

"اور۔۔۔ ہنی کیسی ہے؟" جواب سر کی جنبش سے آیا۔

"اور۔۔۔ اور ایمانے۔۔۔" خفیف سا اثبات۔

"اسکول جاتی ہے۔"

"ہوم۔۔۔" چلو کوئی آواز تو اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔

"اور ڈیڈ۔۔۔؟" محی الدین سہگل کا حال جاننے کی فکر بدر الدین سہگل کو پوری زندگی نہیں ہوئی تھی۔ مگر کسی سوال پر تو سمیع الدین سہگل کی چپ کا اونی گولا لڑھک جائے اور باتیں شروع کی جا سکیں۔

بدر الدین نے ساری زندگی دوست نہیں بنائے تھے۔ اپنے کیریئر کی دیوار میں اسے چنتے عقیلہ سہگل اور محی الدین سہگل۔۔۔ ان کے پاس نگاہ غلط انداز سے بھی بدر کی سمت دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

اپنے بوڑھے نانا نانی کے ساتھ رہتے بدر کو دوستوں کا پتا نہیں تھا۔

پھر آیا مل گئی۔ اور فلپ۔۔۔ جس نے اسے کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیا۔ اور اسکارلٹ کے بعد اسے باتیں کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ دونوں پیتے تھے اور لڑھک جاتے تھے۔

مگر جب سمیع الدین پیدا ہوا تو بدر کو اس کی تربیت کا خیال رہنے لگا۔ تب وہ اپنے بیٹے سے باتیں کرنے لگا۔ بہت سی باتیں، بے سروپا باتیں، وہ اپنے بیٹے کو اچھائی اور برائی کے بارے میں سب بتا دینا چاہتا تھا تاکہ اسے صحیح غلط کی پہچان ہو۔

وہ اپنے ماں باپ جیسا نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ سوچتا تھا

اسے اور اسکار کو ایک آئیڈیل پیرنٹس بننا ہے (جب جب ہوش میں ہوتا۔) یہ اور بات رہی کہ وہ دونوں ان سے بھی زیادہ برے پیرنٹس ثابت ہوئے۔

"کتنے دنوں کے لیے آئے ہو؟" بدر نے پوچھ وحشت زدہ ہو کر پھر سے نقطہ آغاز تلاشنا چاہا۔ اس نے جیسے سوال سنا ہی نہیں۔۔۔

"ہنی اور ایمانے کو بھی ساتھ لے آتے۔۔۔ ڈیڈ کو بھی۔۔۔ وہ کیا بالکل نہیں بول پاتے۔ فالج کے بعد سے۔"

اس بار سمیع نے نظر اٹھائی تھی۔ بدر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

گفتگو تکلف کی دیوار کو گرا دیتی ہے۔ وہ کچھ تو بولے۔ سمیع نے فائل اٹھائی اور پھر اسے گستاخانہ انداز سے یوں پٹخا کہ وہ میز کے دوسری طرف بیٹھے بدرالدین کے ہاتھ سے ٹکرا کر گر گئی۔

"آپ کی ایسی فائل کب تک منظر عام پر آجائے گی؟"

بدر کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹے نے کیسا سوال کر دیا تھا۔ وہ اس سے اس کے مرنے کی تاریخ پوچھ رہا تھا۔

"یہ میڈیکل رپورٹ تھوڑی تھی 'سیدھا سیدھا ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔۔۔ جس پر دستخط ہونے کی کسر باقی تھی۔

"ان کا مرض اوپن ہو گیا ہے۔ آپ کا ہونے میں کیسی دیر۔۔۔

کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ پینے پلانے میں کون دوسرے پر بازی لے گیا۔۔۔ نہیں ناں۔"

"میں چھوڑ چکا ہوں۔" بدر کی زبان لڑکھڑاہٹ کا شکار تھی۔

"اوہ۔۔۔!" سمیع کے ہونٹ گول ہو گئے۔ "کتنے گھنٹے ہوئے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجھے اس طرح بلوانے کا کیا مقصد تھا۔ میں کر ہی کیا سکتا ہوں آپ کے لیے۔۔۔" اس کے سوال کی تلخی۔۔۔ جیسے کسی نے کمرے میں نیم کی پتیاں بکھیر دی ہوں۔

"یہ تمہیں دیکھنا چاہتی تھی۔" بدر کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ وہ اس بچے کی طرح نگاہیں چرانے پر مجبور تھا۔ جسے اس کے باپ نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

"کیا وہ مجھے دیکھ پا رہی ہیں؟"

"ایسے مت کہو سمیع! وہ دواؤں کے زیر اثر ہے۔ مگر اسے پتا چل گیا ہے' تم آگئے ہو۔ وہ اب ٹھیک ہو جائے گی۔ میں بھی۔۔۔ ہم بدل گئے ہیں۔ تمہیں اس پر ترس نہیں آتا۔"

"سچ کہوں گا ڈیڈ۔ میں یہاں آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں آگیا۔ ان کی طبیعت کی خرابی کا سن کر اگر کوئی فیلنگز ہوئیں بھی تو۔۔۔" اس نے ہاتھ مسلنے شروع کر دیے۔

"ان پر نظر پڑتے ہی سب ختم ہو گیا۔ اگر کوئی پوچھے کہ میں آپ لوگوں سے محبت کرتا ہوں تب میرے پاس کوئی جواب نہیں۔۔۔ اگر کہے کہ نفرت۔۔۔ میرے پاس تب بھی جواب نہیں ہے۔ آپ لوگ کم از کم میرے لیے ایک جانب کھڑا رہنے کی جگہ تو بنا دیتے۔"

"ہم تم سے بہت محبت کرتے ہیں سمیع۔۔۔!" بدر کا لہجہ محبت سے بھرپور بے ساختہ تھا۔

"ہم نہیں۔۔۔ آپ صرف اپنی بات کریں۔"

"نہیں' وہ بھی کرتی ہے۔" یہ کہاں ممکن تھا کہ بدر' اسکار۔۔۔ کے اعمال کی صفائی پیش نہ کرے۔

سمیع نے جواباً "بس اک نگاہ ڈالی تھی۔ اور بدر نے ساری رات سوچا اس نگاہ سے بہتر تھا وہ گالیاں دے دیتا۔ لڑ لیتا' مار دیتا۔

وہ اگلے روز اسکارلٹ کے ڈاکٹر سے بھی ملا۔۔۔ اس نے اس کی رپورٹس کے حوالے سے میٹنگز بھی اٹینڈ کیں اور جتنے روز رہا۔ اسے دوا تک اپنے ہاتھ سے پلائی۔ ہاں یہ چیز بدر کی نظروں سے مخفی نہ رہی کہ فرماں برداری کے ان سارے مظاہروں میں بھی وہ ماں کے چہرے پر نظر نہیں کرتا تھا۔

وہ بدر کے ساتھ چہل قدمی کے لیے بھی نکلا۔

خاموش کی چادر اوڑھے' وہ من ہی من میں خود سے باتیں کر کر کے تھک گئے۔ مگر زبان کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا۔

اور کہاں تو اسکارلٹ بستر مرگ پر تھی اور کہاں یہ کہ وہ اٹھ بیٹھی... ڈاکٹرز تک حیران رہ گئے۔

"میرا بیٹا آ گیا نا!" اسکار نے سن اٹھارہ سو کی کسی مشرقی ماں کے سے لہجے میں کہا۔ ڈاکٹرز نے اسے کچھ دواؤں اور بہت سی ہدایات کے ساتھ روانہ کیا۔

"تم رک جاتے موسیٰ...!" موسیٰ نے نظر اٹھائی اور جھکالی۔ کیا دیکھتا؟ والدہ ماجدہ نے بدر کے منع کرنے کے باوجود من مانی کرتے ہوئے بھرپور تیاری کی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ مگر اس نے پپوٹوں کو سرخ رنگ سے سجایا۔ سرخ لانگ فراک پہنی جس کے شانوں پر فیتے تھے۔

"ڈاکٹرز نے منع کر دیا۔ ورنہ ایک جام صحت یابی کے نام... تینوں کا بنتا تھا۔" اس نے گڑگڑاتی آواز میں قہقہہ لگایا تھا۔

"میرے گلے لگ جاؤ موسیٰ...!" بدر نے دیکھا' وہ متامل تھا۔

"اٹس اوکے... بس ٹھیک ہے۔" اس نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ اس کی قطعیت نے اسکار کو ڈھیلا کر دیا۔

"نو... مجھے گلے ملنا ہے۔" اگلے ہی پل وہ اپنے مخصوص ہٹیلے لہجے میں بولی تھی۔ "تم نے ایک بار بھی مجھے ہگ (گلے لگانا) نہیں کیا موسیٰ...!" یک بیک اس کی آواز رندھ گئی۔ "اس موئی دین (محی الدین) نے تمہیں میرے خلاف کر دیا ہے۔ وہ منحوس بڈھا۔"

"ان کا نام اس طرح سے مت لیں۔" وہ طیش میں آ گیا۔

"لوں گی... لوں گی۔" اور اس کے بعد وہ شروع ہو گئی۔

"کیا بولتے ہوں گے محی الدین اسکار کے بارے میں... جو خیالات اسکار کے تھے ان کے بارے میں۔

بدر الدین عادی تھا اور واقف تھا اس کے سنہرے خیالات سے... بے خبر موسیٰ بھی نہیں تھا مگر... وہ اسکار کے منہ پر جھک آیا۔

"اور آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ آپ خود کیا ہیں۔ بلکہ آپ دونوں...." اس کا ہاتھ بدر الدین کے شانے پر گر سا گیا۔

"کیوں بلوایا ہے مجھے یہاں... نہیں آنا چاہتا میں شرم آتی ہے مجھے آپ دونوں کو اپنا ماں باپ کہتے ہوئے۔ مائیں ایسی نہیں ہوتیں۔" وہ انگشت شہادت سے اسکار کو سر سے پیر تک پوائنٹ آؤٹ کر رہا تھا۔

بدر کی حیران آنکھیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ جو برسوں کا غبار نکال رہا تھا۔ اس نے اسکار کو دیکھا نہیں... جو سہمی نگاہ سے موسیٰ کو دیکھ رہی تھی۔

وہ ماں اور باپ کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ جس میں وہ ایک دوسرے کو برہنہ کھڑا پاتے تھے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ جملے نہیں بھالے تھے' زہر میں بجھے تیر تھے۔

بدر کا رنگ بدلا... ایسے کہ سیاہی شرمانے لگے۔

اور اسکار... وہ منہ کھولے تعجب سے بس بیٹے کی صورت تکتی تھی۔

وہ جواب طلبی کرتا تھا مگر بولنے کا موقع بھی نہیں دیتا تھا۔ اس کا کہا حرف حرف سچا تھا۔

"آپ ماں کہلانے کے قابل نہیں ہیں۔ آپ جیسوں کو اولاد پیدا ہی نہیں کرنی چاہیے ہاہ... لیکن پاگل ہوں میں بھی... آپ لوگوں نے پیدا تھوڑی کیا ہے مجھے... آپ کی زندگی میں میری گنجائش نہیں تھی۔"

اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ اس نے دیوار پر مکا مارا۔

بدر نے اسکار کی آنکھوں کو ڈبڈباتا دیکھا۔ اس کا رنگ بدلا تھا۔ اسکار نے موسیٰ کو مخاطب کیا تھا۔

"تو تم..." اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "تو تم مجھے ہگ نہیں کرو گے۔"

بدر تو بدر... موسیٰ بھونچکا رہ گیا۔ اتنا سب سننے کے بعد اس نے کہا تو کیا کہا۔

اور موسیٰ... اس سے رد عمل کی طاقت چھین لی گئی۔ اسکار کا ماضی جو بھی تھا۔ مگر بانہیں پھیلائے منتظر نظروں سے دیکھتی وہ صرف ماں نظر آتی تھی۔ ایسے لگتا

تھا کہ اسے یقین ہے کہ وہ جواب میں انکار کر ہی نہیں سکے گا۔

وہ جھٹکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسکار کے اٹھے بازو پہلو میں گر گئے۔

"تمہارے باپ نے اسے مجھ سے بددل کر دیا۔۔۔"

بدر نے سر ہتھیلی پر ٹکا لیا۔ اپنا جرم کسی اور کے نام کر دینا بھی ایک فن ہے۔ اور وہ آج بھی یہی کر رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ محی الدین سہگل کو موردالزام ٹھہرا رہی تھی۔ ورنہ اس کا موسیٰ تو اتنا اچھا بیٹا تھا کہ حد نہیں۔۔۔۔

وہ اس سے پیار کرتا تھا۔ وہ قسم کھا کر واقعات سے ثابت کر سکتی تھی۔

جب وہ اس کے گال چومتا تھا (اوں ہوں' میرا بلش آن مٹ گیا' اسٹوپڈ۔۔۔)

وہ اسے گلے لگاتا تھا۔ (مت چپکو۔۔۔ دور ہو جاؤ'')

وہ اس کے شوز اتارتا تھا۔ (جب تک میں سوؤں ناں۔۔۔ میرا پیر دباتے رہنا۔

اور وہ اٹھ بھی جاتی اور وہ دبا رہا ہوتا۔

(اور تم اب تک میرے سر پر سوار ہو۔)

"مجھے اپنے ساتھ لے جائیے ممی۔۔۔ (وہ میرے ساتھ رہنا پسند کرتا تھا)۔"

"تم نے تو کہا تھا یہ سو گیا ہے۔ لے جاؤ۔" (وہ میڈ پر چلاتی اور اسے کسی بلی کے بچے کی طرح گردن سے اچک کر بیڈ پر پٹخ آتی۔)

"اس کے ساتھ ایسے مت کیا کرو۔" بدر کبھی کبھی ہوش میں بھی ہوتا تھا۔ اسے کبھی کبھی بحیثیت باپ اپنے عظیم فرائض یاد آتے تھے۔

تب اسکار اپنا مشہور زمانہ فقرہ کہتی۔ "بدر ایک کیئر لیس شخص تھا۔ ورنہ بچے کا ٹنٹنا ہوتا ہی ناں۔۔۔"

اسے بچہ نہیں چاہیے تھا۔ بچے ہوتے ہی کیوں ہیں۔ اور بڑھاپا بھی نہیں ہونا چاہیے۔

بڑھاپا۔۔۔ بیماری' لاچاری' بے بسی۔۔۔

اسے رونا آتا تھا۔ اور اس کا بیٹا' ان دونوں کا بیٹا انہیں اس حال میں دیکھ کر بھی چھوڑ کر چلا گیا۔



تین روز کی خود ساختہ زبان بندی اور بیڈ روم کی گوشہ نشینی کو ترک کر کے وہ اسٹوڈیو جا پہنچا۔۔۔ ٹوہ میں لگی حسنل ہکا بکا رہ گئی۔ وہ اپنی گھومنے والی کرسی پر براجمان سسٹم آن کر رہا تھا۔ والیوم اپنی آخری حد پر تھا۔ در و دیوار ہلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

حسنل نے دل پر ہاتھ رکھا۔ بے یقینی آمیز مسرت میں گھری وہ موسیٰ کی صورت تک رہی تھی۔ اس کے پورے وجود میں ترنگ سے دوڑ گئی۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود پہلی بار۔۔۔ بالکل پہلی بار اس نے یہ کام کیا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔۔۔ اس نے کی بورڈ پر بے ترتیب سا ہاتھ مارا۔ بے ہنگم سا شور۔۔۔ اس نے گٹار کی بیلٹ اپنی گردن میں ڈال لی۔

کمرے کی دائیں دیوار شیشے کی تھی۔ وہ گھوم کر خود کو دیکھنے لگا۔ کس قدر عجیب سی شبیہ دکھائی دی۔ سفید شلوار قمیص۔۔۔ چہرے پر داڑھی۔۔۔ سر پہ جالی والی ٹوپی۔۔۔ اور گٹار۔۔۔

اتنی دیر سے بے تاثر چہرے پر استہزاء پھیل گیا۔ وہ خود پر ہنسا تھا۔ اس نے گٹار اتار کر رکھ دیا۔

اور یکدم کمرے سے باہر نکل آیا۔ حسنل کو سنبھلنے' پلٹنے کا موقع بھی نہ ملا۔ موسیٰ کی نظر پڑ گئی اور وہ گڑبڑا گئی۔

مگر موسیٰ نے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

اور یہ منظر تو اس سے بھی زیادہ خوشگوار تھا۔ موسیٰ الماری کے پٹ کھولے کھڑا تھا اور اپنے بیش قیمت برانڈڈ سوٹ نکال کر ڈھیر کر دیے تھے۔

وہ موسیٰ کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ کوٹ پینٹ کو خود سے لگا لگا کر دیکھ رہا تھا۔

"یہ نہیں۔۔۔ یہ۔" حسنل نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں بشرٹ دیکھی اور منع کرتے ہوئے ایک

گرے شرٹ اس کے شانے سے لگادی۔ "اور یہ ٹائی۔"

موسیٰ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ ساتھ ہی دیگر چیزیں میچ کردو۔"

"کہاں کی تیاری ہے؟" اس نے شوخی سے آنکھیں مٹکائیں۔ موسیٰ مسکرا دیا۔ حسنل دھک سے رہ گئی۔ کتنے عرصے بعد وہ اس طرح نارمل میاں بیوی کی طرح بات کر رہے تھے۔ وہ اس کی دل موہ لینے والی ادائیں... اور ان پر موسیٰ کی بڑھاوا دیتی مسکراہٹ۔

"انگلینڈ..." وہ اب ٹائیاں اٹھا رہا تھا۔

"انگلینڈ..." اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھوٹ گیا۔ "کیوں ایسے اچانک۔"

"اچانک تو نہیں... بس سیٹس اب کنفرم کروائی ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے موسیٰ... بلکہ ایسا کرتے ہیں ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ ڈیڈ کو بھی لے چلیں گے۔ بہت کرائنسس جھیل لیے ہم سب کو تبدیلی کی ضرورت ہے۔" اس نے ایک منٹ کے اندر اندر سارا پروگرام ترتیب دے دیا۔

"نہیں..." موسیٰ الجھ سا گیا۔ "تمہیں نہیں لے جا سکتا۔" "میرا پروگرام کسی اور کے ساتھ ہے۔" موسیٰ کو پروگرام بتانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔

"کسی اور کے ساتھ..." حسنل نے دہرایا۔

"کس کے ساتھ؟" اس نے بلند آواز سے پوچھا۔ موسیٰ بری طرح چونکا۔

اس نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ "میں آپ کو اکیلے نہیں جانے دوں گی... کبھی نہیں یاد نہیں پچھلی بار آپ کے ساتھ کیا ہو گیا... کیسے بھٹکے کن دقتوں سے ملے... اور پھر یہ سب..." اس کا اشارہ غیر ارادی طور پر موسیٰ کے سراپے پر ہو گیا۔

"نہیں..."

"میں تمہیں نہیں لے جا سکتا... میں تبلیغی مشن پر جا رہا ہوں۔" وہ جھنجلا گیا۔

"تبلیغی جماعت کے ساتھ... انگلینڈ۔" حسنل نے دہرایا۔ اس کے سر پر بم پھوٹا تھا۔

"انٹرویو... سیمی نار اسلامک سینٹر میں لیکچر... ڈاکومینٹری اور اس کے علاوہ بہت کچھ" حسنل نے اپنے بال نوچ ڈالے۔

"بس بہت ہو گیا آپ کو بدلنا ہو گا۔ میری زندگی میں روز روز کے ان تماشوں کی گنجائش نہیں۔" اس نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا۔ وہ اب مزید بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تمہارے نزدیک یہ سب تماشا ہے؟" موسیٰ کے چہرے سے غضب چھلکنے لگا۔

"ہاں اور وہ بھی فضول سا..."

"تم حد سے گزر رہی ہو ہنی..." اتنے سالوں بعد یہ پہلا موقع تھا جب وہ دھاڑا تھا۔

حسنل ایک پل کو بدکی مگر اگلے ہی پل اس نے زمانے بھر کی بے خوفی بھر کے موسیٰ کے چہرے کو دیکھا تھا۔

"میں تو سمجھتا رہا کہ میری اس تبدیلی پر سب سے پہلے خیر مقدم کرنے والی ہمت بڑھانے والی تم ہو گی... پر تم تو... عبدالمبین ٹھیک کہتا تھا تم..."

"عبدالمبین..." وہ بری طرح چونکی... "کیا کہتا تھا عبدالمبین... اس کی ہمت کیسے ہوئی میرے بارے میں کچھ کہنے کی... وہ ہوتا کون ہے۔ اوہ... اب سمجھی اس سب کے پیچھے... کمال ہے، مجھے پہلے کیوں نہ خیال آیا۔" وہ چراغ پا ہو کے چلائی۔

"میں اتنی اونچی آواز سننے کا عادی نہیں ہوں ہنی۔" اس نے اس سے بھی بلند آواز سے کہا۔ "لہجہ دھیما کرو۔" اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جیسے بزور طاقت باز رکھے گا۔

حسنل کی نگاہیں ہاتھوں پر جم گئیں۔ پھر اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑالیا۔ اور پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔

موسیٰ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ وہ فوری طور پر سمجھ نہیں سکا۔ یک دم چونکا۔ یہ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز

تھی۔ کہاں گئی تھی وہ اس وقت۔ موسیٰ تیزی سے کھڑکی تک آیا۔

"اس عبدالمبین سے تو نپٹنا جانتی ہوں میں۔" اس نے یہ نکلتے نکلتے کہا۔

عین اسی وقت مفتی عبدالرحمٰن کے کتب خانے میں بھی ایک بحث جھگڑے کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ حسنل کے دونوں ماموں سخت طیش سے عبدالمبین کو گھیرے بیٹھے تھے۔

"آج تک یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکی کہ ابا جان نے یوں بیٹھے بٹھائے اسے کیوں بیاہ دیا۔" بڑے ماموں نے تائیدی انداز سے چھوٹے ماموں کو دیکھا۔

"بھائی جان ٹھیک کہتے ہیں، جبکہ گھر میں رشتے موجود تھے۔" انہوں نے براہ راست عبدالمبین کو دیکھا۔ جس نے بے آرامی سے پہلو بدلا تھا۔

"آپ پوچھ لیتے ان سے۔"

"تو کیا نہیں پوچھا تھا۔ مجال ہے جو وہ ایک لفظ بھی بولے ہوں۔ اور بات بیاہنے کی نہیں.... کس جگہ، کس شخص سے بیاہا، وہ حیرت آج تک نہیں جاتی۔"

"وہ شخص اب وہ نہیں رہا بھائی جان۔" عبدالمبین نے ٹوکنا ضروری سمجھا۔ موسیٰ کے لیے ان کا لہجہ و تخاطب اسے بہت برا لگا تھا۔

"یہ جس چار دن کی چاندنی کو تم چراغاں سمجھ رہے ہو ناں بہت جلد ٹامک ٹوئیاں مارو گے اور وہ گویا.... گلے میں گٹار ڈال کر اسٹیج پر بندر کی طرح چھلانگیں لگا رہا ہو گا۔" بڑے ماموں کے لہجے کی تلخی حد سے سوا ہو گئی۔

"ایسا کچھ نہیں ہو گا بھائی جان....!" عبدالمبین کو بہت تکلیف پہنچی۔ آپ نے اسے دیکھا نہیں ہے۔"

"وہ جو مرضی آئے کرتا رہے۔ ناچے یا گائے.... ہمارا مسئلہ نہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں کی حرکات کے ساتھ یہ جو ہمارا نام جڑ رہا ہے، یہ برداشت سے باہر ہے۔"

"آپ کا نام...." عبدالمبین چونکا۔

ہاں ہمارا نام.... وہ اور زمانے تھے۔ جب ناخلف اولاد سے قطع تعلق کر لیا جاتا تھا۔ سب رشتے توڑ لیے جاتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہوتا یہ موبائل۔"

حسن المآب لکھنے کی دیر تھی۔ سیدھی قطار سے ایک کے بعد کتنے سارے آپشن کھل گئے۔

"آپ کیا جاننا چاہتے ہیں اس کے بارے میں۔ اس کی تعلیم.... آمدنی.... بچے.... کامیابیاں.... کیا چاہیے کلک کیجیے۔"

ان کی انگلی نیچے سے اوپر کو سرک رہی تھی۔ پھر کلک کر دیا۔ حسنل کو خوب صورت تصاویر کے ساتھ بیک گراؤنڈ میں.... معلومات چل رہی تھیں۔

عمر، تعلیم، شادی بچے اور کریئر کے بعد.... آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ ہنی.... جن کا اصل نام حسن المآب ہے۔ ملک کے جید عالم مفتی عبدالرحمٰن کی نواسی ہیں۔ وفاقی شرعیہ کونسل کے رکن مفتی عبدالمنان اور جید اسکالر مولانا عبدالمنان ہنی کے سگے ماموں ہیں۔ "جب سے ان دونوں کے اختلافات سامنے آئے ہیں۔ دیکھو.... تم بھی دیکھو اب تک کتنے لوگ اس کو شیئر کر چکے ہیں۔"

"مجھے تو یہ سارا گورکھ دھندا سمجھ میں ہی نہیں آرہا.... بلکہ یہ جو تبدیلی کی باتیں ہو رہی ہیں، مجھے تو یہ بھی ڈھکوسلہ لگتی ہیں۔" بڑے ماموں نے صاف کہا۔

"ایسا نہیں ہے بھائی جان....!" عبدالمبین کو بالکل اچھا نہ لگا یہ تبصرہ.... "آپ سمیع الدین کو دیکھیں گے تو دنگ رہ جائیں گے۔"

"چلو.... میں سب مان بھی لوں تو کیا اس میں اتنی ہمت نہیں کہ دو تھپڑ لگا کر بیوی کو سیدھا کر دے، مجھ کو تو ان کے اختلافات کی اصل وجہ ہی پتا نہیں چل رہی۔

تم سے ملتا ہے وہ.... اصل معاملہ کیا ہے؟" بڑے ماموں نے کہا۔

بات گھوم پھر کے پھر عبدالمبین پر آٹھہری۔ اب وہ کہاں سے شروع کرتا۔ موسیٰ کی وہ سو باتیں کہہ دیتا جو اس نے اس روز بتائی تھیں کہ موسیٰ حسنل کا آئیڈیل تھا یا حلیمہ کی زبانی سنواتا۔

"اس سے کیا پوچھتے ہیں بھائی جان....!" چھوٹے

ماموں نے عبدالمبین کے چہرے سے نگاہ ہٹائی۔
"حسن المآب شروع ہی سے سرکش لڑکی تھی۔ ذہن پر زور دیں' سب سمجھ میں آجائے گا۔" چھوٹے ماموں نے بڑے ماموں کی توجہ ماضی پر دلائی تھی۔
"پرانی باتوں کو چھوڑیں بھائی جان... یہ بتایئے اب کیا کرنا ہے؟؟"
"کیا کرنا مطلب... اس موسیٰ... کیا نام ہے سمیع الدین... اس سے کہیں نکیل ڈال کر رکھے اپنی بیوی کو۔ اور یہ جو بھی اختلافات ہیں۔ انہیں گھر تک محدود رکھے۔
غضب خدا کا اتنے اونچے علمی قد کے خاندان کی لڑکی کے ایسے خیالات... اب تو حلقے میں سے لوگوں نے بھی گھما پھرا کر پوچھنے کی کوشش شروع کردی ہے۔"
وہ اب بے بس دکھائی دینے لگے۔ "ہماری سخت بدنامی ہورہی ہے عبدالمبین!"
کتب خانے کے دو دروازے تھے ایک گھر کے اندر سے ملا ہوا تھا اور دوسرا باہر لان کی طرف۔ تمام زندگی مفتی عبدالرحمٰن کے ملاقاتی اسی دروازے سے تشریف لائے تھے اور دونوں ماموؤں کی عبدالمبین سے اس تلخ و ترش گفتگو کا مفتی عبیدالرحمٰن نے آخری حصہ ہی سنا۔
ان کی سماعت و بصارت قوی ممیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ کمر کا خم سیدھا کھڑا ہونے نہیں دیتا تھا۔ وہی پرانے امراض ڈاکٹر ساری کارروائی کے بعد واک کا کہتا تھا۔
اب بھی دل اوب جانے سے وہ ملازم کے سہارے لان میں نکلے تھے۔ دھوپ بڑھ آئی تو لاٹھی ٹیکتے خود واپس آئے کہ اندر کے منظر نے قدم روک دیے۔ یہ کیسی بحث تھی؟ کمزور بصارت کے باوجود ان سے بیٹوں کے چہرے کی درشتی چھپی نہ رہ سکی۔ دونوں بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے اور اس پر عبدالمبین کا نظریں جھکانا... چرانا جیسے اسے فرد جرم سنائی جارہی ہو۔
اور اس سے پہلے کہ وہ پکارتے ان کے کانوں میں حسنل کا نام پڑگیا۔ بڑے ماموں نے اخبارات کے پلندے کو میز پر پٹخا تھا۔ کچھ میگزینز... اور ران پر ہاتھ کی پشت مار مار کے جرح کررہے تھے۔
تینوں کے کمرے سے نکل جانے پر مفتی عبیدالرحمٰن... الماری کی آڑ سے نکل آئے۔
تب ہی نگاہ اخبار پر پڑگئی۔ ہاں دونوں اسی اخبار کو لے کر بحث کررہے تھے اور ذکر حسن المآب کا تھا۔
تصویر' بلکہ تصاویر بھی اسی کی تھیں۔ ایک کے بعد ایک دکھائی دیتی حسنل... پڑھے بغیر ہی سمجھ میں آرہی تھی۔
مفتی صاحب نے سر سے ٹوپی اتارلی۔

✡ ✡ ✡

حسن المآب کی بڑی سی تصویر کے ساتھ کوئی کیپشن بھی درج تھا۔ اخبار کو آنکھ کے بالکل نزدیک لے جانے پر بھی دھندلاہٹ مانع ہوگئی۔
اور کیا لکھا ہوگا اس کے اندر... حسنل کی تازہ ترین مصروفیات... اس کے کارنامے... اس کی کامیابیاں... وہ اب کیا کرنے والی ہے۔
اتنے سال گزر گئے تھے۔ ان کے دونوں بیٹے اسی طرح اخبار و تراشے لاکر ایک لحاظ سے ان کے منہ پر مار دیا کرتے تھے۔ وہ سوال پوچھتے "آخر کیا سوچ کر انہوں نے حسنل کو اس شخص سے بیاہ دیا... کون سی مجبوری پڑ گئی تھی۔ وہ کیا کہتے۔
اس نے جیسے شوہر کی ڈیمانڈ کی تھی۔ فوری طور پر کہاں سے لاتے... تو سمیع الدین مل گیا (حالانکہ بعد میں وہ یہ سوچ سوچ کر پچھتاتے رہے کہ اس کی مرضی کا ہی ڈھونڈتے... جسے دیکھ کر وہ خوش ہوجاتی۔ مگر...
انہوں نے کیا کیا... اسکارلٹ جیسی ماں... اور بدر جیسے باپ کی اولاد کو چنا۔ آہ... آہ' وہ دل مسوستے۔
کاش وقت پلٹایا جاسکتا۔
ایسا شخص اور گھرانہ بہت آسانی سے مل جاتا جو نانا اور نواسی دونوں کے معیار پر اترتا۔ کاش...
اور زندگی ان ہی تین حروف پر آکر رک گئی۔
"کاش..."

اور کس کس موقع پر یہ خواہش کی تھی۔ اب تو شمار بھی نہیں تھا۔ جب اپنے داماد کو گٹار لیے بنیان نما شرٹ میں ناچتے گاتے دیکھا۔

"یہ آپ کا داماد ہے ناں... مفتی صاحب...؟"

"سنا ہے یہ رشتہ آپ نے خود کیا ہے۔ آپ کے دوست کا پوتا ہے یہ... دوستی اپنی جگہ مگر رشتے داری کرتے ہوئے تو... بلکہ ہم تو بچپن سے سنتے آرہے ہیں۔ دوستی کرتے وقت بھی احتیاط لازم ہے۔ دوست تو پہچان ہوتے ہیں۔"

اور وہ کسی بھی چیز سے انکار نہیں کرسکتے تھے۔

دلہن بنی حسنل کی تصاویر کے اخباری تراشے... چندے کی اپیل والے پمفلٹ کی طرح جگہ جگہ بانٹی گئیں۔

مفتی صاحب کی سمجھ میں نہ آیا... انہیں بٹنے پر شرمساری تھی یا چھپنے پر... سمیع الدین ان کے گھر نہ آنے کے برابر آیا کرتا تھا۔ حسنل کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

بہت مجبوری میں وہ اکیلی آجاتی یا کبھی کبھار عقیلہ بیگم ساتھ ہوتیں اور رہے محی الدین... تو رشتے داری نے دوستی کو ختم کردیا تھا۔ وہ نجانے کیوں محی الدین سے برافروختہ رہتے۔ وہ اگر آبھی جاتے تو دونوں کے درمیان حائل خاموشی سانس روکنے لگتی۔ اور سمیع الدین کی آمد...

اس کی آمد پر دونوں ماموں جزبز ہوتے تھے۔ ان سے لڑتے... آپ اس سے کہہ دیں' یہاں مت آیا کرے۔ اور وہ خود بھی چاہتے تھے مگر کہنا...

"آپ اب بھی کچھ نہیں کہیں گے؟" سارا گھر ان کے سر ہو گیا تھا۔

وہ اسٹیج پر موسیٰ کی بانہوں میں ناچ رہی تھی اور وہ مر رہے تھے۔ وہ ریمپ پر جلوے بکھیر رہی تھی۔ اور مفتی صاحب سوچتے تھے۔ قیامت آنے پر تو سب لوگوں کے مرجانے کا کہا گیا ہے۔ تو وہ کیوں زندہ ہیں۔

"تمہیں ایک بار بھی ہمارا خیال نہیں آیا... حسن المآب' کہ تم کس خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ میں تمہارا نانا... اور تمہارے ماموں... اور تمہارے کزنز انہیں اس سے کہنا پڑا۔

"جب میرے شوہر کو اعتراض نہیں تو... آپ لوگوں نے ہمیشہ ہی درس دیا ہے ناں کہ شوہر کی تابعداری کرنی ہے۔ ہاں میں ہاں ملانی ہے۔"

وہ آسانی سے ان کے الفاظ کو اپنے معنی دے کر بری الذمہ ہو گئی۔

"مجازی خدا کی تابعداری کی حد... حقیقی خدا کی حد شروع ہونے پر ختم ہو جاتی ہے۔" صبغہ کو اس سے مقابلہ کرنا آتا تھا۔ "بجائے اس کے تم اس کی اصلاح کرو تم خود اس کے رنگ میں رنگ گئیں۔" اس کی تربیت کا رنگ اتنا کچا تو نہیں تھا۔

"ارے...!" لاجواب ہو جانے والی حسنل زور سے ہنس دی۔

"میرا تو خیال تھا تم لوگ میری کامیابیوں پر خوش ہو گے... مگر میں بھول گئی تھی۔ تم لوگ اپنی عینک اتار کر رکھ ہی نہیں سکتے۔ ہاہاہا۔"

"جسے تم کامیابی کہہ رہی ہو نا' یہ ناکامی کا دروازہ ہے۔ جس کے اختتام پر کھائی ہے اور افسوس یہ ہے' اور تم تو گرو گی ہی' ساتھ ہم سب کو بھی گرادو گی۔"

"تو تم لوگ کہہ دو ناکہ تمہارا مجھ سے' میرے شوہر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"کاش کہہ دینے سے تعلق ختم ہو جایا کرتے۔" صبغہ کو واقعی ملال تھا۔

حسنل کے چہرے پر تنفر پھیل گیا۔

"صبغہ ٹھیک کہہ رہی ہے حسن المآب...!"

"تم ادھر مت آیا کرو..." مفتی عبیدالرحمٰن نے کہہ دیا۔

سب ششدر رہ گئے۔ دونوں ماموں نے کتنی بار ہر طریقے سے منا کر دیکھ لیا' وہ نہیں مانے اور اب یوں اچانک...

مفتی صاحب نے غضب ناک نظروں سے گھورتی حسنل کے ہاتھ میں اخبار دے دیا۔ فیشن ویک کی کوریج تھی۔ سر پر دوپٹا حسب معمول تھا۔ مگر بغیر

آستینوں کی قمیص سے جھانکتے شانے۔۔۔ حسنل نے اخبار کا گولہ بنا کر اڑا دیا اور کمرے سے نکل گئی۔

دونوں مامیاں سراہ رہی تھیں۔ صبغہ ساکت بیٹھی تھی۔ اور اندر اپنے کمرے میں مفتی صاحب سجدہ ریز تھے۔ وہ پچھتا رہے تھے۔ دراصل انہوں نے اپنے تیئں فساد کی جڑ کو ڈھونڈ لیا تھا۔

"وہ بے وقوف ہے' نا سمجھ ہے۔ ساری غلطی میری ہے۔ میری عجلت نے اسے اس راہ پر کھڑا کر دیا۔ اے اللہ۔۔۔ میری بچی تو بہت نیک طینت' پرہیز گار تھی۔ پابند تھی مگر۔۔۔ وہ سچ کہتی ہے۔ وہ تو اپنے شوہر کی منشا سے سب کر رہی ہے۔

تو اے اللہ! تو سمیع الدین کو ہدایت دے۔ اسے سیدھا رستہ دکھا۔ اس کی وجہ سے میری بچی کیا ہو گئی۔"

مفتی عبدالرحمٰن نے ساری رات سجدہ ریز ہو کر اور بعد میں ہر نماز کے بعد' اپنی مغفرت کی دعا مانگنی بھول گئے ہوں مگر سمیع الدین کے لیے راہ راست کی دعا وہ کبھی نہ بھولے۔ بس ایک بار وہ صحیح ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کس راستے پر ڈال دیا تھا اس نے ان کی حسن المآب کو۔۔۔

انہیں یقین تھا۔ حسنل اپنے شوہر کی اطاعت گزار ہے۔ تو بس سمیع الدین سدھر جائے۔۔۔ اے اللہ! سمیع الدین کو سیدھا راستہ دکھا۔

اور دعا مانگتے مانگتے اب اتنا وقت گزر چکا تھا کہ حرف دعا بھول گئے تھے۔ مگر یہ یاد تھا کہ فساد کی جڑ سمیع الدین ہے۔ تو بس سمیع الدین۔۔۔

کیا لکھا تھا اس خبر میں۔۔۔ کیوں بھڑکے ہوئے تھے ان کے بیٹے۔۔۔ اور عبدالمبین کس بات کی صفائیاں دے رہا تھا۔ اب کیا کیا تھا حسن المآب نے۔۔۔ بلکہ کیا کروایا تھا سمیع الدین نے۔

سارا قصور خود مفتی عبدالرحمٰن کا تھا۔

انہوں نے اخبار بغل میں داب لیا۔ لاٹھی کو مضبوطی سے تھاما۔ انہیں بھی تو پتا چلنا چاہیے۔ وہ خاندان کے بڑے ہیں۔ ابھی زندہ ہیں۔



یہ حسنل ہی کی آواز تھی یا انہیں وہم ہوا تھا۔ وہ رک کر بغور سننے لگے۔ صرف حسنل نہیں۔۔۔ یہ حلیمہ کی آواز بھی تھی۔

"اتنا اونچا مت بولو حسنل!" حلیمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ حسنل نے ہاتھ جھٹک دیا۔ یہ مفتی عبدالرحمٰن نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

"میں اس سے بھی اونچا بولوں گی۔ یہ سب تم لوگوں کا کیا دھرا ہے۔" وہ حلق کے بل چلائی۔

"یہ سب تو معجزہ ہے۔ اللہ جسے ہدایت دے۔" حلیمہ نے حلیمی سے کہا۔

"اوہ۔۔۔!" وہ ناگن سا بل کھا کر گھومی۔ "تو یعنی تم کہنا چاہتی ہو۔ موسیٰ بے ہدایت تھا۔"

"وہ پہلے کیا تھا۔ یہ تو اب لوگ بھولنے لگے ہیں حسنل۔۔۔! وہ اب کیا ہے۔۔۔ یہ بات کرو تم۔" حلیمہ نے سابقہ لہجے میں کہا۔

"یہی بات کرنے آئی ہوں۔ تم سب اس کا پیچھا چھوڑ دو۔" وہ چنگھاڑی۔ "آگے میں خود سنبھال لوں گی۔"

دونوں مامیوں نے ایک دوسرے کو اور پھر ساکت بیٹھی امی کو دیکھا۔

"یہاں کس نے پیچھا لیا تھا سمیع الدین کا۔۔۔" چھوٹی مامی کے انداز میں حقارت تھی۔

امی نے اس سے نظریں چرالیں۔ انہیں اپنی بیٹی کو پہچاننے میں دشواری ہوئی تھی۔ نقشہ تو وہی تھا مگر عمارت عجب ڈھب سے اٹھی تھی۔ کتنے دنوں بعد اسے دیکھا تھا۔ ہاں آخری بار جب اس نے سمیع الدین کی بخیریت واپسی پر قرآن خوانی کروائی تھی اور اس سے پہلے جب وہ گمشدہ تھا۔ تب وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر زندگی میں پہلی بار حسنل کے گھر رہنے چلی گئیں۔ لاکھ اختلافات کے باوجود اس محل جیسے گھر کی ملکہ۔۔۔ اپنی بیٹی کو دیکھ کر ان کا دل باغ باغ ہوتا تھا اور

اگر خدانخواستہ سمیع الدین نہ مل سکا.... وہ رو رو کر بے حال ہوتیں۔ اس پر بھی حسنل نے ٹوک دیا۔

"بدشگونی مت کریں امی! موسیٰ مل جائے گا۔"

اس کا انداز یقین سے بھرپور تھا۔ انہیں اس پر رشک آیا۔ وہ اس حال میں بھی اپنے حواسوں میں تھی۔

تو اب کیا ہو گیا ہے۔ جو وہ ایسے اچھلتی تھی جیسے تلوے جلتے ہوں۔

"اتنی بے خبر مت بنیے چھوٹی مامی....!" اس نے زہر خند لہجے میں مخاطب کیا۔

"یہ سامنے بیٹھا ہے آپ کا بھائی.... پوچھیے اس سے۔"

اس نے معاندانہ انداز سے عبدالمبین کی سمت اشارہ کیا۔ جو صوفے پر براجمان تھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ قمیص کے دامن سے نادیدہ گرد جھاڑی اور یوں متوجہ ہوا۔ جیسے اس سے پہلے تو کچھ سن ہی نہ رہا ہو۔ حسنل کی جان جل گئی۔

"مت دیکھو اس طرح میری طرف تم مکر نہیں سکتے۔ تم نے یہ سب جان بوجھ کر کیا ہے۔"

"میں نے اسے بھٹکنے سے بچایا ہے حسن المآب!"

عبدالمبین کو اپنی آواز اجنبی لگی۔ اس نے کتنے زمانوں بعد اسے اس طرح مخاطب کیا تھا۔

"میں تمہاری چرب زبانی میں آنے والی نہیں عبدالمبین.... کہاں لے کر جا رہے ہو تم اسے.... جیسے میں جانتی نہیں۔"

"میں اسے نہیں لے جا رہا.... وہ جا رہا تھا تو میں اس کے ہمراہ ہو لیا۔"

"الفاظ بدلنے سے سچائی نہیں بدلے گی۔"

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے حسنل.... وہ بدلتا ہے، جسے اللہ بدلے۔"

"کس بات پر خوش ہوؤں.... کس بات پر امی! میری ہنستی بستی زندگی سوالیہ نشان بن گئی ہے۔ جہاں سے گزرتی ہوں لوگ باتیں کرتے ہیں۔ وہ جو میرے سوا کسی کی سنتا نہیں تھا۔ سب بھول گیا ہے۔ ایک گھر ہے بزنس، بیوی، بچے.... اس کا کیریئر داؤ پر لگا ہے۔ زندگی سے سکون غائب ہو گیا ہے۔" وہ پھٹ پڑی "اور یہ سب اس عبدالمبین کی وجہ سے...."

"کیا معاملہ ہے؟ کیا کیا ہے عبدالمبین تم نے؟"

سب کی گردنیں گھومیں۔ یہ مفتی عبدالرحمٰن تھے۔ عبدالمبین نے تیزی سے سہارا دے کر انہیں بٹھایا۔

امی کا سر جھک گیا۔ اس نے نانا کو سلام نہیں کیا تھا۔ ہنوز غیظ کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ اس نے ان کو صریحاً" نظرانداز کیا تھا۔

"میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے پٹاخ سے جوڑ بھی دیے۔ "میری کوئی غلطی ہے ناں تو میں معافی مانگتی ہوں۔ مگر میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دو خدا کے لیے۔"

"میں کہیں نہیں ہوں حسن المآب.... اسے اب میرے سہارے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اس نے خود سے سوچنا شروع کر دیا ہے۔" عبدالمبین کے سادہ انداز اور سادہ جملے نے حسنل کے سر پہ سالن مارنے جیسا کام کیا۔

"یہ.... یہی...." وہ کسی شعبدہ باز کی طرح چاروں جانب گھوم گئی۔

"یہی باتیں تم اس کے سامنے کرتے ہو۔ اور وہ اس کے منہ میں تمہاری زبان ہے عبدالمبین تم انکار نہیں کر سکتے۔ کیوں سایہ بنے ہوئے ہو اس کا؟"

"وہ اس مقام پر آ چکا ہے حسنل.... آنکھیں باندھ کر بھی چھوڑ دو تو اب گرے گا نہیں، بھٹکے گا نہیں۔" عبدالمبین نے مسکرا کر کہا تھا۔

"تم نے بدلہ لیا ہے مجھ سے...." اس کے نتھنے پھول گئے۔ سر نفی میں ہل رہا تھا۔

"کس چیز کا بدلہ....؟" وہ واقعی تجاہل برت رہا تھا۔

"میں نے تم جیسوں کو ریجیکٹ کر کے اسے جو چنا۔" اس نے رعونت کی حد کر دی۔

"ہاں....!" عبدالمبین نے سینے پر ہاتھ لپیٹے۔ وہ حسنل کے روبرو ہو گیا۔ "اور دیکھو آج وہ بھی مجھ

جیسا ہو گیا۔"
عبدالمبین کے لاشعور میں بھی ایسی سوچ کا گزر نہیں تھا۔ مگر دوبدو مکالمے میں بعض جملے تیر بن کر نشانے پر لگ جاتے ہیں۔
"تو بالآخر تم مان گئے۔ دیکھا آپ سب لوگوں نے میں نے اگلوا لیا ناں۔" وہ پھر شعبدہ باز کی طرح سب کو دیکھنے لگی۔ "اور تم... اتنا تو جانتے ہو ناں، مجھے حالات اپنے بس میں کرنے آتے ہیں۔"
"تو پھر جاؤ جو کرنا ہے کر گزرو... یہاں کیوں آئی ہو؟"
"آخری بار سمجھانے آئی تھی۔" اس کی آواز بلند تھی۔
"آواز نیچی رکھو حسنل!" عبدالمبین دھاڑا تھا۔
"نہیں رکھوں گی، میں چیخوں گی، چلاؤں گی کہ تم نے کس طرح..." وہ جو منہ میں آ تا گیا بولتی چلی گئی۔
اس نے کوئی لحاظ نہ رکھا۔ مامیاں گنگ کھڑی تھیں۔ عبیدہ ماں تھیں، مگر ان کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ وہ اٹھیں اور طمانچے مار مار کے اس کے گال سرخ کر دیں یا پھر اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیں۔ حلیمہ، حسنل کے ہاتھوں شوہر کی بے عزتی دیکھ رہی تھی اور عبدالمبین کا تحمل... وہ ضبط کی سرحد پر کھڑا تھا۔
"ارے اگر..." حسنل نے عبدالمبین کو سخت استہزائیہ نظروں سے سر تا پا دیکھا۔ "ایسا ہی شوہر کرنا ہوتا تو تم سے نہ کرلیتی۔"
امی اپنی جگہ سے اٹھیں۔ حلیمہ ششدر کھڑی تھی۔ یہ کیا کہہ دیا تھا اس نے... اس کے خیالات سے واقف ہونے کے باوجود اس سے اس دیدہ دلیری کی توقع نہیں تھی کبھی بھی... عبدالمبین کی آنکھوں سے شرارے سے نکلے اور حسنل ایسے دیکھ رہی تھی۔ اب بولو... کر دیا ناں لاجواب...
امی کا تھپڑ حسنل کے گال پر پڑنے والا تھا۔ حلیمہ نے یک دم ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ پھڑپھڑا کر رہ گئیں، مگر تب ہی چٹاخ کی آواز... اور حسنل کی سسکاری دونوں تڑپ کر پلٹی تھیں۔ حلیمہ کا دل حلق میں اٹک گیا۔
حسنل کی آنکھیں بے یقینی سے ابل رہی تھیں۔ گال پر ہاتھ دھرا تھا اور نظریں... سامنے کھڑے موسیٰ پر تھیں، جس کے دوسرے تھپڑ کو عبدالمبین نے روک رکھا تھا۔ موسیٰ ہاتھ نہ چھڑا سکا تو اس نے حسنل کا بازو دبوچ کر اسے یوں جھنجھوڑا کہ اس کی ساری ہڈیاں جگہ سے ہل گئیں۔
"کیا بکواس کر رہی تھیں تم... تم ایسا بول سکتی ہو ہنی... میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" اس کی آواز صدمے و بے یقینی سے پھٹی پڑی تھی۔
"چھوڑ دیں سمیع الدین... مت کریں ایسا..."
بوکھلائے عبدالمبین نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ اور مفتی عبیدالرحمٰن... وہ سب کو متوجہ کرنا چاہتے تھے کہ یہ کون ہے۔ انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا اسے... نفیس کاٹن کا سفید سوٹ جس پر شکنیں تھیں۔ کف موڑے ہوئے تھے۔ سر پر جالی کی ٹوپی... صبیح پیشانی... خوب صورت آنکھیں... داڑھی سے سجا چہرہ۔ عجب نور سا تھا، پاکیزہ۔ چہرہ جانا پہچانا لگا تھا، مگر بہت زور دینے پر بھی یاد نہیں آیا کہ یہ کون تھا۔ اور کوئی بھی تھا۔ گھر کے اس حصے میں ایسے جوان مرد کے آنے کا کوئی کام تھا ہی نہیں... اور اس نے آتے ہی حسنل کے منہ پر تھپڑ دے مارا تھا۔ وہ لاٹھی پکڑ کر لڑکھڑاتے ہوئے اٹھنے ہی والے تھے۔ جب عبدالمبین کے الفاظ سماعت سے ٹکرائے۔
"چھوڑ دیں سمیع الدین..."
"سمیع الدین...!" انہوں نے زیر لب دہرایا۔ انہیں قطعاً یاد نہیں آیا کہ یہ نام کس کا ہے۔ ساتھ ہی تحیر سے پھٹتی دوسری پکار حلیمہ کی تھی "موسیٰ..."
موسیٰ۔ سمیع الدین... مفتی صاحب لاٹھی پکڑے کسی کبڑے کی طرح جھکے سر اٹھائے دیکھ رہے تھے۔ صوفے پر ایسے بیٹھے جیسی کسی نے شانوں پر دباؤ دے کر نیچے کو گرایا ہو۔
یہ... یہ موسیٰ تھا... حسنل کا شوہر... سمیع الدین

تھا‘ محی الدین سہگل کا پوتا۔۔۔ ان کا داماد ان کی نواسی کو سخت ترین الفاظ میں سرزنش کر رہا تھا۔ غصے کی شدت سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ اور حسن المآب جو گال پر ہاتھ جمائے موسیٰ کو سن رہی تھی۔ اس کا سکتہ ٹوٹا وہ عبدالمبین کا گریبان پکڑنے کو بڑھی۔

”ہو گئے خوش۔۔۔ تمہاری وجہ سے موسیٰ نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ یہی چاہتے تھے ناں تم؟“

درمیان میں موسیٰ حائل ہو گیا۔

”کسی کی بھی وجہ سے نہیں۔۔۔ تمہاری اپنی وجہ سے ہنی۔۔۔ تم ایسے خیالات رکھتی ہو‘ میں یقین نہیں کر سکتا‘ مگر میں نے اپنے کانوں سے سنا۔ او مائی گاڈ۔۔۔ تم۔۔۔ تم۔ تم تو رام ناتھ سے بھی زیادہ غلط انداز سے بات کرتی ہو۔ (اف یہ رام ناتھ۔۔۔) کوئی فرق نہیں ہے تم میں اور اس میں اور میں اتنے سال تمہارے ساتھ رہا۔۔۔ اور میں نے ہمیشہ خود کو۔۔۔ تم سے کم سمجھا ہنی۔۔۔ گرینڈ پا نے کہا تھا تم اچھی عورت ہو۔۔۔ تم تو اچھی عورت نہیں ہو۔ او گاڈ۔۔۔!“ وہ ریت کی دیوار کی طرح کرسی پر ڈھے گیا۔ دونوں ہاتھ سر پر دھرے تھے۔

”بلکہ۔۔۔ تم اچھی انسان ہی نہیں ہو۔ اچھے انسان دوسرے انسان کو ایسے ڈی گریڈ نہیں کرتے اور تم تو اچھی مسلمان بھی نہیں ہو۔۔۔ اچھے مسلمان۔۔۔ اپنے دین کی ویلیوز اور پرنسپلز کا ایسے مذاق اڑاتے ہیں کیا؟“

اس نے حسن المآب کی زبان سے جو سنا تھا۔ اسی کو سوال بنا کر اس کے سامنے پیش کر دیا اور وہ پل بھر کو بوکھلائی اور لاجواب ہوئی تھی کہ موسیٰ اس کی اصلیت سے واقف ہو گیا‘ مگر پھر اس کے اندر سے آواز آئی ٹھیک ہے۔ اب بات کرنا آسان ہو گئی تھی۔

لیکن۔۔۔ بات کرتی کیسے۔۔۔ موسیٰ اسے بولنے کا موقع تو دیتا وہ تو خود ہی بلا تکان بولتا چلا جا رہا تھا۔ قرآن و حدیث کے حوالہ جات کے ساتھ۔۔۔ وہ حسنل پر غصہ ہو رہا تھا۔ اسے پھٹکار رہا تھا۔ مفتی صاحب نے یہ تو سمجھ لیا‘ مگر اتنے تند و تیز لہجے سے الفاظ کی تشریح مشکل تھی‘ مگر معنی یک دم وحی کی طرح دل پر اتر گئے۔

مفتی عبیدالرحمن کی سمجھ میں سارا واقعہ آ گیا۔ تو یہ بات تھی یہ بات۔۔۔ ان کی بے یقینی بتانے کو کوئی مثال ملنی مشکل تھی۔ ان پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا تھا کسی نے۔۔۔ یہ حسن المآب تھی ان کی نواسی۔۔۔ جسے اس کے شوہر نے بھٹکا دیا تھا۔ اور مفتی عبیدالرحمن نے اتنے سال سمیع الدین کے لیے راہ راست پر آنے کی دعا مانگی تھی اور حسنل کی ہر حرکت پر اسے مورد الزام ٹھہرایا تھا۔

مفتی عبیدالرحمن پر اب کھلا تھا کہ ان کی دعائیں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔ وہ قبول ہو چکی تھیں۔ بس وہی بے خبر تھے۔

وہ حسن المآب کا دوبدو مقابلہ کر رہا تھا۔ کہاں تو وہ حسنل کے علمی قد کو آسمان جیسا بلند سمجھ کر بول نہیں پاتا تھا اور خود کو کمتر سمجھتا تھا۔

اور کہاں وہ اسے غلط ثابت کر رہا تھا۔ اس سے جواب طلبی کر رہا تھا۔

مفتی عبیدالرحمن کی دھندلائی نظروں پر نمی کی تہہ جمنے لگی۔ جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ ہاتھ کے سہارے زمین پر کھڑی لاٹھی نے بجنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی زبان اکڑ گئی تھی اور سوچیں ایک مقام پر آ کر رک گئیں۔

ہاں تو وہ اتنے سال غلط دعا مانگتے رہے کہ اللہ! سمیع الدین کو ہدایت دے سیدھا راستہ دکھائے۔ دعا کی ضرورت تو حسن المآب کو تھی۔

مسئلہ سمیع الدین نہیں تھا مسئلہ حسن المآب تھی۔ سیاہی کا شکار۔۔۔

ہٹ دھرم‘ بے لچک۔۔۔ بدتمیز۔۔۔ بدنصیب۔۔۔ دعا کی ضرورت تو اسے تھی۔

ایسا لگتا تھا موسیٰ اس کا منہ توڑ دے گا اور وہ اس چیز کو بھانپنے کے باوجود ذرا نہ ڈرتی تھی۔ امی کی حالت مردے سے بدتر تھی۔ بڑی مامی چہرے پر زمانے بھر کی نفرت سجائے حسنل کو تک رہی تھیں۔ چھوٹی مامی نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں اور حلیمہ۔۔۔؟

”میں تمہیں وارن کر رہا ہوں ہنی۔۔۔!“ موسیٰ کی

انگشت شہادت اس کی سمت اٹھی۔ "ایسے نہیں چلے گا۔ تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔" حسنل نے کیا جواب دیا اسے جیسے سننے میں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی کمرے سے نکل گیا۔

دروازے پر دونوں ماموں کھڑے تھے۔ نجانے کب سے... کیا کیا دیکھ چکے تھے۔ موسیٰ ایک پل کو ٹھٹکا اور پھر ایکسکیوزمی کہتا نکل گیا۔ ماموؤں کی نظروں نے تعاقب کیا۔ ہوا کے جھونکے کی طرح حسنل ان کے پاس سے نکلی تھی۔ ماموں راستہ نہ دیتے تو دونوں ٹکرا جاتے۔

مفتی عبیدالرحمٰن نے لرزتے ہاتھوں سے لاٹھی کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

وہ اتنے سال غلط دعا مانگتے رہے۔

✡ ✡ ✡

محی الدین سہگل کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ ان کی عزیز ازجان بہو حسن المآب کبھی ننگے سر ان کے سامنے آئی ہو۔ بلکہ اگر بے خیالی میں سر ننگا ہوتا بھی تو وہ انہیں دیکھتے ہی سُرعت سے ڈھک لیتی، لیکن آج اس نے کچھ اس ڈھب سے دوپٹا چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا جیسے گھونگھٹ سا نکالا ہو۔ اس نے نظر اٹھائی تو سوجی آنکھوں میں نمی تھی۔ چپکی پلکیں...

محی الدین سہگل کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کا چہرہ ساری رات رونے کا ترجمان تھا۔

موسیٰ تو ٹھیک ہے... اور ایمانے اور... ب...

بد...

فالج نے زبان پر اثر ڈالا تھا۔ لکنت زدہ آواز میں بیتابی حد سے سوا تھی۔

حسنل نے ہونٹ کا کونہ دابا اور نفی میں سر ہلایا۔

"سب ٹھیک ہیں۔" اس کی آواز بلغم زدہ تھی۔

"پھ... پھر... کیوں...؟"

وہ کیوں روئی تھی اس طرح... ان کی یادداشت میں کوئی ایسا پل نہیں تھا جب انہوں نے اس کی آنکھ میں نمی دیکھی ہو۔ وہ تو موسیٰ کی گمشدگی کے دنوں میں بھی کمزور نہیں پڑی تھی پھر اب کیا ہوا تھا۔ حسنل کے لبوں سے سسکی نکلی۔

محی الدین نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر منت سی کی۔ دائیں پر تو فالج کے اثرات تھے۔ وہ ذرا سا ان کی سمت جھکی اور دائیں گال پر پڑے دوپٹے کو پیچھے گرا دیا۔ اس پر اس کی سسکی...

"یہ... کیا ہے؟" محی الدین کو چند پل لگے پھر وہ اپنی جگہ ہل کر رہ گئے۔ اس کے ملائم بے داغ گال پر نیل کے نشان تھے۔ اسے یہ چوٹ کیسے لگی۔ پر یہ چوٹ آہ... یہ چوٹ نہیں تھی یہ تو تھپڑ کا نشان تھا۔

"تمہیں مارا... ہے کسی نے؟"

حسنل کا سر زور سے اثبات میں ہلا۔ محی الدین میں جان ہوتی تو اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ اس وقت ساری طاقت پہلو بدلنے میں صرف ہو گئی۔ ان کے لبوں سے لایعنی سے آوازیں نکلیں۔

"موسیٰ..." وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"م... م... مو... سیٰ...؟" محی الدین نے بے یقینی سے بمشکل دہرایا۔ اس کی سسکیاں بلند ہو گئیں۔ ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ موسیٰ کی جگہ وہ محی الدین کا نام لے دیتی کہ آپ نے مجھے مارا ہے تو بھی وہ ایسے حیران نہ ہوتے جیسے موسیٰ کے نام پر...

"مو... چھا... مو... س... نے کک..." ان کی باچھوں سے رال سی گرنے کو تھی۔ حسنل نے تیزی سے ٹشو ہونٹ پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا تھا۔ وہ اپنا رونا فراموش کر کے ان کی باچھیں صاف کر رہی تھی۔ محی الدین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کیوں... اور یہی تو وہ چاہتی تھی کہ وہ پوچھیں کیوں؟ وہ طے کر چکی تھی اسے کیا کیا کہنا تھا اور کیسے۔

دس سال یا پندرہ سال پہلے موسیٰ میں یہ تبدیلی آتی تو یقیناً "محی الدین بیٹھ کر بات کرتے اور اسے اعتدال پسندی کا درس دیتے ہوئے اس شدت پسندی سے باز رہنے کی تلقین کرتے اور اس وقت تک کرتے جب تک کہ وہ "مان" نہ جاتا۔

مگر عمر کے ان آخری دنوں میں... فالج کے بعد جب وہ حوائج ضروریہ تک کے محتاج تھے اور اپنے حال پر رحم کھاتے تھکتے نہیں تھے۔

تو زندگی یاد آتی تھی کہ کیسے گزاری... اور موت یاد آتی تھی۔ کیسے گزاری جائے گی ایسے میں انہیں قضا نمازیں یاد آتی تھیں۔

اور یہ ایسی قیامت تھی کہ قضا پڑھنے کا وقت بھی "قضا" ہو گیا۔ زیادہ نہ سہی... فالج سے پہلے دھیان آجاتا۔

تو ایسے میں سمیع الدین کا یہ روپ... انہیں یاد آیا۔

نیک اولاد صدقہ جاریہ ہوتی ہے اور نیک اولاد والدین کی بخشش کا باعث ہوتی ہے۔

تو انہیں موسیٰ ہی کا سمیع الدین ہو جانا بہت بھلا لگا۔

لیکن یہ حسن المآب کون سی کہانی سنا گئی اور گال پر لکھی دکھا گئی... کیا ہو گیا تھا سمیع الدین کو... حسنل جیسی بیوی سے وہ کیا چاہتا تھا۔ مزید کیا چاہتا تھا... کیا کرے وہ...

"وہ مذہبی جنونی بن گیا ہے۔ اس کی شدت پسندی اسے برباد کر رہی ہے اور پھر سب برباد ہو جائے گا۔" اس نے رو رو کر سخت دل گرفتی اور پریشانی سے انہیں بتایا تھا۔

"وہ مجھے کام کرنے سے روک رہے ہیں۔ وہ مذہب کی تعلیمات کو غلط طریقے سے سمجھ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں باز نہ آئی تو وہ... انہوں نے راستہ بدل لینے کی بات کی گرینڈ پا..." اس کی سسکیاں اعصاب شکن تھیں۔ ان کے سر پر جیسے بجلی کا ننگا تار گر گیا۔

"آپ انہیں سمجھائیں... ایک آپ ہی ہیں جو..." اس سے جملہ مکمل کرنا دو بھر ہو گیا۔

"واہ ہنی... تم نے تو ساری کہانی ہی بدل دی۔"

موسیٰ کی آواز پر دونوں بری طرح چونکے۔ حسنل بس پل بھر کو سٹپٹائی تھی۔

وہ کب آیا... اور اس نے کیا کیا سنا... اس نے سرعت سے فیصلہ کیا کہ اسے اٹھ جانا چاہیے۔ وہ وہاں موجود رہی تو لڑائی دوبارہ سے شروع ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی اس نے بہت سوچ سمجھ کر محی الدین سہگل کے ہاتھ میں کمان دے دی تھی۔ اسے ان کی جیت پر ذرا شک نہ تھا۔ فی الوقت وہ کسی بھی طرح موسیٰ کو انگلینڈ جانے سے روک دیں۔ سچا جھوٹا کوئی بھی بہانہ کر کے... آگے کے لیے اس کے پاس ایک لائحہ عمل تھا۔

موسیٰ نے آنسو پیتی حسنل کو بغور دیکھا۔ پھر باقاعدہ گردن موڑ لی۔ وہ اس صورت کو دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ پچھلی رات وہ دونوں جاگتے رہے تھے حسن المآب — آئندہ کا لائحہ عمل طے کر رہی تھی۔ موسیٰ کو باز رکھنے کی کوششیں... ادھر موسیٰ حسن المآب پر غور کرتا رہا۔

وہ چھری چھری لے کر بیدار ہوا۔ حسنل نجانے کب جا چکی تھی اور محی الدین سہگل اسے دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے سمیع الدین...؟" لکنت زدہ بوجھل آواز میں انہوں نے لہجے میں تحکم بھرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

اب وہ بدقت مگر بھرپور جوش سے حسنل کے حق میں بولنا شروع ہو گئے۔ وہ کتنی اچھی اور کتنی خاص ہے اور حسنل کی اچھائیاں اسکارلٹ کی برائیوں کا کھاتہ بھی کھول دیتی تھیں۔ ادب سے سنتے موسیٰ کے پورے وجود سے بھوری چونٹیاں لپٹ گئیں۔

محی الدین بتا رہے تھے۔ کیسے بدر الدین جیسے سترہ برس کے نوعمر لڑکے سے اسکارلٹ جیسی جونک چمٹ گئی تھی جو آج تک اس کا خون چوس رہی تھی اور کیسے بدر الدین کی زندگی برباد ہو گئی۔

وہ موسیٰ کو بتا رہے تھے۔ حسن المآب بہت اچھی ہے۔ وہ خوش قسمت ہے جو اسے اتنی اچھی بیوی ملی۔ وہ ایک بار پھر شروع ہوا چاہتے تھے۔ موسیٰ سیخ پر چڑھے مرغ کی طرح بھن گیا۔ وہ چیخا تھا۔ محی الدین سہم کر خود میں سمٹے۔

"نہیں ہے وہ اچھی عورت... اس نے سب کو اس

دھوکے میں ڈال کر رکھا کہ وہ اچھی ہے۔ وہ مام سے زیادہ بری ہے۔ اس نے اپنی برائیوں کو اچھائی کے پردوں میں لپیٹ رکھا ہے۔"

"تم اسکارلٹ اور حسن المآب کا موازنہ کر رہے ہو... کک... وہ... (گالی) اور... کک... حسن... مآب..."

محی الدین کا تن بدن پھنکنے لگا۔ انہیں حسنل کی کہی باتوں کا یقین آگیا۔ موسیٰ کا دماغ پھر گیا تھا۔ وہ واقعی کسی شدت پسندوں کے گروہ میں شامل ہو چکا تھا۔ وہ...

"ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ دونوں کا کوئی موازنہ نہیں... مام بری تھیں تو بری تھیں اور یہ...؟" اس سے جملہ مکمل نہ ہوا۔

"یہ اچھی عورت نہیں ہے۔ آپ بھی دھوکا کھا گئے گرینڈ پا...!" وہ رندھی آواز سے ہنس پڑا۔ محی الدین کو اس کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔ اس نے ان کا فالج زدہ ہاتھ تھام لیا۔

"آپ نے کبھی بہروپیے دیکھے ہیں؟"

"سمیع...!" محی الدین کے لبوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

"ہاں...!" وہ چلایا۔

چھپ کر باتیں سنتی ہنی... کی بھنویں آپس میں جڑ گئیں۔

اسے لگا۔ اس کا دل پگھل رہا ہے۔ اس کا لاشعور موسیٰ کو صحیح قرار دے رہا تھا۔ ضمیر کے اثبات پر خود پسندی کی رعونت کا زعم غالب آگیا۔ پگھلتا دل ٹھہر گیا۔ موم بتی سیدھی کھڑی رہ کر جلتی ہے تو چار عالم اجالا کرتی ہے۔

لیکن وہی پگھلتا موم نیچے بہتی سے جمتا ہے۔

حسن المآب بھی ویسی جمی ڈھیری بن گئی۔

جس سے روشنی پھوٹنے کی امید دیوانے کا خواب ہی ہو سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس رات موسیٰ نے اسے اپنے سامنے بٹھایا۔ اپنا مطمع نظر بیان کیا۔ حسنل نے دس بار جملہ کاٹ کر تردید یا تنقید کرنی چاہی، مگر موسیٰ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے دم سادھ لینے کی تنبیہہ کی۔ وہ اسے اچھی طرح سوچنے، سمجھنے اور بدلنے کا موقع دے رہا تھا۔ اگر وہ اس سے اعتدال کی خواہش رکھتی تھی تو موسیٰ نے بھی اس کا جملہ اس کے منہ پر مار دیا۔

محی الدین سہگل سے بغل گیر ہوتا۔ وہ کتنی ہی دیر ایملانے کو سینے سے لگائے کھڑا رہا۔

"آپ پھر گم تو نہیں جائیں گے پاپا...؟" اس نے معصومیت کی حد کر دی تھی۔

موسیٰ چونکا۔ اس کا سر نفی میں ہلا تھا۔ "کبھی نہیں..." اس کے لہجے کے تیقن نے بھی ایملانے کی پریشانی کو کم نہ کیا۔

"مجھے ساتھ لے جائیں۔ میں آپ کو گمنے نہیں دوں گی۔" اس نے اس کا چہرہ اپنے چھوٹے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ اس نے حسنل کو دیکھا جو اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے موسیٰ کا حلیہ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ سیاہی مائل نیلے سوٹ میں ٹائی کے ساتھ اس کے سر پر ٹوپی تھی۔ وہ انگلینڈ سے جانے کے لیے گھر سے نکل رہا تھا۔ اس کی چال کا اعتماد حسنل کو نجانے کیوں لگا جیسے اس کے قدموں کے نیچے زمین نے جھرجھری لی ہو۔



حساس نوعیت کی اس میٹنگ میں اسے شریک نہیں کیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ ادارے کا سب سے بڑے شو کو ان کرتی تھی۔ مگر وہ جو اس کے نام کے ساتھ مسلم ہونا لکھا تھا' وہ جرم بن گیا۔ اور اسے کوئی شوق بھی نہیں تھا کہ وہ تھامس جیسے عیسائی شدت پسند کے خیالات سنے اور پھر ان سے ہنٹ لے کر شو کا فارمیٹ ترتیب دے۔ پتا نہیں باس نے اسے کیوں بھیج دیا۔ اسے اندر جانے سے روکتے ہوئے بتایا گیا تھا۔

"آپ اگلے مرحلے میں شامل ہوں گی۔"

"گڈھا..." اس نے شستہ لہجے میں جواباً" کہا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔" وہ بندہ مؤدب تھا۔

وہ پیر پٹختی واپس پلٹ گئی۔
اب وہ باہر بیٹھی کافی کے تلخ گھونٹ بھر رہی تھی۔ نگاہیں کانفرنس روم کی لال بتی پر تھیں۔ اندر سفید بندر جیسا تھامس۔۔۔ آنکھوں کو پھیلائے، چہرے پر زمانے بھر کی سنسنی پھیلائے حاضرین کو دہلا رہا تھا۔
وہ کیا کہہ رہا ہوگا۔ اسے جاننے کا کوئی شوق نہیں مگر پھر اس نے یوں ہی اپنے ٹیب پر تھامس لکھ کر کلک کر دیا۔ تھامس کے خیالات (لعنتی خیالات) وہ پہلے سے جانتی تھی۔
اور اندر بیٹھا تھامس۔۔۔
"ہمیں جاننا ہوگا کہ اسلامک سینٹرز میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کی وجہ سے ہماری نئی نسل عیسائیت کو چھوڑ رہی ہے۔ وہاں بیٹھے لوگ ہوشیاری سے ہمارے معصوم لوگوں کو اپنے دین میں شامل کر رہے ہیں۔ جیسے کسی کو کچھ بھی نہیں کہتے، مگر پھر بھی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔"
اس نے ہتھیلی پر مکا مارا۔ "او گاڈ"
اپنا گنجا سر تھام لیا اور ایک تفکر آمیز چپ سادھ کر اپنے معتمد کو دیکھا۔ اس نے کمان سنبھال لی۔
"ہم ان ممالک کی تعریف کریں گے جو اسکارف پر پابندی لگاتے ہیں۔ ہم سے یہ بھی نہیں ہو سکا کہ۔ جی یہ بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ ابھی یہیں اسی شہر (لندن) میں اسکارف ڈے منایا گیا۔ جس میں ہماری اپنی لڑکیوں (عیسائی) نے ماڈلنگ کی۔"
معتمد خاص قصداً" رکا اور تھامس کو دیکھا۔ جو اس قیامت خیزیات کو سن کر دونوں ہاتھ اٹھائے چھت کو دیکھ رہا تھا کہ اس سے بڑھ کر اب اور کیا ہو سکتا ہے۔
"یہ لوگ یہاں بہت خاموشی سے آتے ہیں اور تبلیغ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو تو ایئرپورٹ پر ہی روک لینا چاہیے، مگر نہیں۔۔۔ یہ دیکھیں یہ گروپ۔۔۔ اور یہ۔۔۔ یہ آتے ہی پورے ملک میں پھیل جاتے ہیں۔ ہمارے اپنے یہاں کے مسلم شہری انہیں اپنے گھر میں مہمان ٹھہراتے ہیں۔ بلکہ بعض تو اپنے خرچے پر دعوت دے کر بلاتے ہیں۔ اپنی گاڑیوں میں لے کر گلی گلی گھماتے ہیں۔ اور ہماری نئی نسل کو گمراہ کرتے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں اس سال برطانیہ میں کتنے لوگ مسلم ہوئے اور کیا یہ بھی کہ ان میں سے زیادہ تر نیو جنریشن تھی۔ نیو جنریشن کین یو امیجن۔۔۔ او گاڈ۔۔۔"
وہ شل ہو گیا۔ معتمد نے اٹھ کر بڑی اسکرین پر کچھ اعداد و شمار چلانے شروع کر دیے۔ کچھ ڈاکومنٹریز جو تھامس کی باتوں کی تصدیق کر رہی تھیں۔
"ہم چاہتے ہیں کہ میڈیا اپنا کردار ادا کرے، پرنٹ میڈیا، الیکٹرونک میڈیا، لوگوں کو بتایا جائے کہ یہ مسلم کیسے گھیرتے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔" وہ ایک بار پھر شروع ہو گیا اور سب کو قائل کر کے دم لیا۔
ساتھ ساتھ اسکرین پہ چھوٹی چھوٹی پلوگس چل رہی تھیں۔
ان میں مائیکل جیکسن، محمد علی کلے اور دبے الفاظ میں ڈیانا کا بھی نام آیا۔
نئی نسل کو اٹریکٹ کرنے کے لیے۔۔۔ وہ مسلمانوں کے داؤ پیچ بتا رہا تھا۔
"اور یہ دیکھیے، یہ گروپ۔۔۔" وہ جیسے اب اصل بات شروع کرنے لگا تھا اسکرین پر ایک جماعت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سب لوگ ناموں اور شکلوں سے ناواقف تھے۔ تھامس نے ہی تکلیف اٹھائی۔ وہ بگڑے تلفظ سے پکار رہا تھا۔ مولے نا۔۔۔ آسد۔۔۔ مولے نا اظہر۔۔۔ اینڈ۔۔۔ سامی۔۔۔ دین۔۔۔ اسے آپ سب جانتے ہوں گے۔ یہ موسی۔۔۔ بی ہے۔ وہی موسیٰ بی۔"
ساتھ موسیٰ کے حوالے سے رپورٹ شروع ہو گئی۔ وہ اسی شہر میں پیدا ہوا۔ اس کے ماں، باپ۔۔۔ اسکول۔۔۔ کالج۔۔۔ یونی ورسٹی۔۔۔ اس کا میوزیکل بینڈ، گانے گاتے ہوئے بہت سارے شارٹ۔۔۔ ناچتا اچھلتا۔ اور آج کا سامی دین۔
یہ واقعی خوف ناک صورت حال تھی۔ یہ کیسا مذہب تھا جو انسانوں کو ایسے بدل دیتا تھا۔ یہ کیا کوئی جادو تھا۔ کیا لوگ ہپناٹائز ہو جاتے تھے۔ کیوں ہو جاتے تھے ایسے۔۔۔ جیسا ہو جانے ان کے حوالے سے سوچنا بھی

ناممکن لگتا تھا۔
اور اگر یہ ہی صورت حال رہی تو.....
اس کا ذخیرہ الفاظ باقی تھا مگر وہ تھک گیا جیسے۔
"تو ہمیں کیا کرنا ہو گا؟" سب جیسے کورس میں بولے تھے۔
"ہاں....." تھامس نے کہنیاں میز پہ ٹکا کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کا شکنجہ بنا لیا۔
"میں ریسرچ کر رہا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کے بارے میں تفصیل سے جاننا ہے۔ میں کیمپئن کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے لوگ الرٹ ہوں۔ مسلم پوری دنیا کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں یہ کس طرح کام کرتے ہیں۔ ان کا طریقہ کار....."
وہ جوش جذبات میں تیز بول رہا تھا۔ تو یہ سب آسان ہو گا؟ کوئی اپنا طریقہ نہیں بتاتا۔
"یہ کیوں دیں گے انٹرویو..... اور انٹرویو..... اس طرح تو ہم انہیں پروموٹ نہیں کر دیں گے۔"
ایک صحافی کا دماغ تھامس سے تیز چل رہا تھا۔ وہ اس طرح ٹوکے جانے پر بدمزہ ہوا۔ مگر پھر مسکرانے لگا۔ اتنی گہری مسکراہٹ..... کہ جیسے وہ قہقہہ روکنے کی کوشش میں ہو۔
"یہ انٹرویوز کہیں پبلش نہیں ہوں گے۔ کبھی ٹیلی کاسٹ نہیں ہوں گے..... اس نے شعوری فیصلہ کیا۔
اور یہ کہ کیا آپ نے کبھی ایڈ ٹنگ کا نام سنا ہے؟"



جیک کی بڑھائی فائل کو وہ یوں الٹ پلٹ رہی تھی۔ جیسے لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لینے کی ماہر ہو پھر اس نے حقارت بھرے انداز سے فائل پٹخ دی۔
"عیسائیت کا تو پتا نہیں مگر انسانیت کو ضرور خطرہ لاحق ہے اس کی وجہ سے..... تھامس دی گریٹ....." اس نے دانت کچکچائے۔
"ہنہ..... میں اس کے نظریات سے اتفاق نہیں کرتا۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔
"تو اس کے منہ پر کہنا ناں..... ویسے اب کون سے خطرے سے دوچار ہے وہ..... اور کیا ہمارے منہ میں اب وہ اپنی زبان ٹھونسے گا۔ اس سوال نامے کا کیا مطلب ہے؟ (اس نے پڑھے بغیر سوال نامہ مسترد کر دیا جیسے)۔
"تم نے اسے بتایا نہیں میں اپنے پروگرام کا فارمیٹ خود ترتیب دیتی ہوں۔"
"وہ ایک دردمند عیسائی ہے۔ اور اس سے اختلاف کا مطلب ہے آپ عیسائیت سے اختلاف کر رہے ہیں۔" جیک نے بات ختم کرنا چاہی۔
اس نے فائل اٹھائی اور یوں ہی ورق پلٹنے لگی۔
جیک کی نظریں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ جارحیت آمیز ناگواری سے سکڑی آنکھیں..... یک بیک پھیل گئیں۔ اس نے بے ساختہ جیک کی صورت دیکھی۔
"یہ..... یہ تت.....؟"
"ہاں یہی....." جیک نے قلم کو چرخی کی طرح گھمانا شروع کر دیا۔
"یہ..... یہاں..... کک کیوں.....؟"
"فائل میں سب درج ہے۔"
اس نے فائل پر نظر ڈالی۔ "تو اس بار تھامس اسے ٹارگٹ کر رہا ہے۔"
"ہاں وہ اس کے بارے میں سب جاننا چاہتا ہے۔"
"تو یہ کام وہ کسی جاسوس سے لے۔" وہ بھڑکی۔
"نہیں..... وہ اسے گندا کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے دنیا کو بتا سکے کہ اسلام کس طرح نارمل انسانوں کو بگاڑ رہا ہے۔ اسلام کیسا بڑا خطرہ ہے۔ اس کے دماغ میں پورا پلان ہے۔"
"تو اس سے تھامس کو کیا مسئلہ ہے؟" وہ جزبز ہوئی۔
"مسئلہ یہ ہے ڈیئر کہ یہ ساسی دین..... موسی..... جو بھی ہے۔ یہ ایک گروپ کے ساتھ اس وقت اسی شہر میں موجود ہے۔"
"کیا.....؟"

"بلکہ شہر کیوں... تم سے چند گز کے فاصلے پر..." اس نے ہوٹل کا نام بتادیا۔

☆ ☆ ☆

وہ سحرزدہ سا مجمع کو دیکھ رہا تھا۔ اتنے لوگ بہت سارے لوگ۔ ہر رنگ و نسل کے لوگ انہیں سننے ان سے ملنے آئے تھے۔ یہ شہر کا سب سے بڑا اسلامک سینٹر تھا۔

بچپن میں بدر اسے اسلامک سینٹر لے جایا کرتا تھا۔ مگر ایسا اجتماع اس نے وہاں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ یہاں ایسے ہی لوگ آتے ہیں۔ اور بالخصوص جمعے کے روز تو بہت زیادہ رش ہوتا ہے۔ اور آج تو خیر سب اسی کے لیے آئے ہیں۔

اس کا تحیر شرمساری میں ڈھل جاتا۔

"میرے پاس تو کہنے کو کچھ بھی نہیں..." اس نے کمزوری بیان کردی۔ سر جھکا لیا۔

"آپ نہیں جانتے سمیع الدین! آپ کی یہاں اس طرح سے موجودگی سارے خطابات پر بھاری ہے۔" اسے ہر ایک یہ ہی کہہ کر تشفی کراتا تھا۔

"اچھا...!" اس نے خود کو یقین دلایا۔ "ایسے تو پھر ایسے ہی سہی..."

ان کے ساتھ آئے ایک عالم دین اسلام کے بنیادی ارکان کو سادہ ترین الفاظ میں بیان کررہے تھے۔ درمیان میں سوالات کا سلسلہ بھی تھا۔

کوئی بھی ہاتھ اٹھا لیتا۔ اور مولانا صاحب... کا جواب ایسے ہوتا جیسے چشمہ پھوٹ نکلا ہو۔ اور اگر اس سے کسی نے سوال پوچھ لیا؟ اس کے اندر کا خوف عود کر آیا۔

"جواب نہ آئے تو آپ معذرت کرلیجیے گا کہ آپ ابھی طفل مکتب ہیں۔ ویسے آپ سے کوئی نہیں پوچھے گا۔ یہ تو شرعی و فقہی مسائل ہیں۔ آپ سے تو صرف یہ پوچھا جائے گا کہ آپ اس طرف کیسے آگئے۔"

"میں رام ناتھ کا نام نہیں لینا چاہتا۔" وہ بدکا۔

"اوہ ہو... بھول جائیں اسے..." عبدالمبین نے لاپروائی سے ہاتھ اٹھایا۔

"آپ کو کہنا ہے جسے اللہ توفیق دے۔ جسے اللہ بلائے۔" عبدالمبین نے شعوری توقف کے بعد آیت کی تلاوت کی۔ البتہ مفہوم سمجھ میں آگیا تھا۔

"وہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے۔ خوب دیکھتا ہے۔ اور اللہ جس کو راہ پر لائے تو وہی راہ پر آتا ہے۔"

"تو میں یہ کہہ دوں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"آپ مجھے لکھ کردے دیں۔ میں سب کو سنا دوں گا۔"

"اوں ہوں... یہ تو میں نے آپ سے کہی ہے۔ میں آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ "وہی آتا ہے جسے اللہ بلاتا ہے۔""

"لوگ میری بات کا یقین کرلیں گے۔" اس کا اعتماد بحال نہیں ہورہا تھا۔

"آپ نے کسی کو یقین نہیں دلانا سمیع الدین۔" عبدالمبین نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

وہ مطمئن تو ہوا مگر یہ طمانیت بھی پل بھر کی تھی۔ وہ جوابوں کی فکر پال رہا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا۔ اسے تو ایسے سوالوں کا بھی علم نہیں۔ جو مجمع سے اٹھ اٹھ کر لوگ کررہے تھے۔

وہ سوال وحدانیت سے متعلق تھے۔ نبوت کے خاتمے سے تھے۔ روز قیامت پر کچھ لوگ متزلزل تھے۔ کچھ کو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی پر شک تھا۔

کوئی صرف یہ یہ جاننے کو پریشان تھا کہ پانی پینے کا صحیح طریقہ سمجھا دیا جائے' ایک فلپائنی لڑکا غسل کا طریقہ نہیں سمجھ پارہا تھا۔

تو ہر شخص کے لیے اس کا مسئلہ بڑا تھا۔ اور ہر شخص سیکھنا چاہتا تھا۔ اور جاننا چاہتا تھا اور کسی کو بھی کوئی شرمساری نہیں تھی۔ کچھ بھی پوچھنے میں...

اعتماد کی لرزتی دیوار کو سہارا ملا تو چہرے کے خفیف تاثرات بھی مدہم پڑنے لگے۔ تو لاعلمی گناہ نہیں ہے۔ شرمساری بھی نہیں ہے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ

آ گئی۔ وہ ایک بار پھر حاضرین کے چہرے ٹٹولنے لگا۔ وہ سب دل و جان سے متوجہ تھے۔

وہ پھیلی ناک اور موٹے ہونٹوں والے سیاہ فام مرد و زن۔۔۔ اور دبے ناک اور چھوٹی آنکھوں والے چینی۔۔۔ اور بڑے چہرے والے جاپانی۔۔۔ اور بہت گورے سنہرے بالوں والے انگریز۔۔۔ اور ایشیائی لوگ۔۔۔

اور وہ سب پوری طرح عالم دین کی طرف متوجہ تھے۔ مگر اس پر نظر ڈالنا بھی نہ بھولتے تھے۔

اور ادھر اس نے جب اسے ایک ایک چہرے کو کھوجتے دیکھا تو اسکارف کو کھینچ کر پردہ سا بنا لیا۔ رخ بھی موڑ لیا۔

ہاں وہ اب پہچانی نہیں جاسکے گی۔ پر اس کی تسلی بھک سے اڑ گئی۔ رخ موڑنے پر اس کا چہرہ مائیکل کی نظروں میں آگیا۔ جو سب سے آخیر میں بیٹھا تھا۔ نگاہ ملتے ہی اس کی جانب چلا آیا۔

"تم۔۔۔ تم نے یہی کہا تھا ناں۔ تمہیں کوئی دلچسپی نہیں۔" وہ اسے گھورنے لگا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

وہ ڈائریکٹر کتنا بڑا تھا۔ یہ تو پتا نہیں مگر کمینہ بہت بڑا تھا۔

دوسرے دن آفس آگیا۔

"میں خاص طور پر تم سے ملنے آیا ہوں ڈیر۔۔۔" وہ دھڑلے سے تشریف فرما بھی ہوگیا۔ "تشریف رکھیے۔" جیسے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔

وہ اس کے چہرے کی حیرت اور خفگی کو سراسر نظر انداز کیے بول رہا تھا۔

"تم نے تو کوئی ہاتھ نہ پکڑایا۔ لیکن دیکھو، میں نے اسے منا ہی لیا۔ وہ ڈاکومینٹری کے لیے راضی ہوگیا۔ ہم کل سے کام شروع کرنے والے ہیں۔" تم بھی آجانا۔۔۔ مل لینا اس سے۔"

"مجھے ضرورت نہیں۔۔۔" اس نے جبڑے بھینچ لیے تھے۔

"ارے کیوں۔۔۔ میں تو اسے بتاؤں گا کہ تم نے کیسے رو رو کر طوفان اٹھالیا تھا۔ کتنی فکر تھی تمہیں اس کی۔۔۔"

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" اس نے دھپ سے دونوں ہاتھ میز پر مارے۔

"بٹ وائے بے بی۔۔۔؟" مائیکل کے مسکراتے پُرجوش چہرے پر استعجاب ہلکورے لینے لگے۔ "نو پرابلم۔۔۔ بلکہ تمہیں تو سب سے پہلے اس سے مل کر اسے مبارک دینی چاہیے تھی۔ آفٹر آل۔۔۔ تم اس کی۔۔۔" وہ دوست۔۔۔ رشتے دار۔۔۔ کچھ بھی کہنے سے ٹھٹک گیا۔

ہاں وہ اس کی کون تھی۔۔۔ یا وہ اس کا کون تھا؟

جس کے لیے وہ تڑپی تھی۔ جیسے مچھلی پانی سے نکل کر تڑپتی ہے۔

جیسے تتلی اپنا ٹوٹا پر دیکھتی ہے۔

اس کی آنکھوں میں حزن ٹھہر گیا تھا۔ وہ اس مورنی کی طرح لگنے لگی تھی۔ جس نے زمانوں سے ساون نہ دیکھا ہو۔

اور اس پھول سی بے بس تھی۔ جسے قبر پر چڑھانے کے لیے پرویا جارہا ہو۔

تو مائیکل کے لیے یہ بے اعتنائی حیرت سی حیرت تھی۔

"مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔۔۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ اور پلیز جاؤ۔۔۔ مجھے بہت کام ہے۔" وہ مصروف نظر آنے لگی۔

مائیکل سخت اچنبھے میں گھرا اسے دیکھتے دیکھتے کمرے سے نکل گیا۔ اس نے جیک سے اس کے رویے کی بابت بات کی۔ جیک نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ کیا بتاتا کہ وہ اس حوالے سے بات کرنے پر اسے بھی ٹکا سا جواب دے چکی ہے۔

تو مائیکل کا اسے یہاں دیکھ کر اس طرح حیران ہونا بنتا تھا۔

"یہ اسلامک سینٹر ہے۔ آواز ہلکی رکھو۔" اس نے دبی آواز سے ٹوکا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑا۔ وہ اس کے کان میں گھس گیا۔

"تم یہاں... کیا کر رہی ہو؟ اس سے ملنے آئی ہو... یا صرف دیکھنے... ہاہاہا... اوہ۔" آواز دھیمی کرلی۔ "میں نے تو کہا تھا میں ملوادوں گا۔ آج ہماری میٹنگ ہے ناں۔"

"مجھے ملنا ہوگا تو کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور یہ اسلامک سینٹر ہے اور ہم مسلمز یہاں آیا ہی کرتے ہیں۔ سمجھے..." اس نے دانت پیسے تھے۔

"جھوٹ... تم نے جیک کے پرپوزل کو منع کردیا۔ کہ تمہارا مذہب الگ ہے۔" جیک کہتا ہے۔ تم کبھی اسلامک سینٹر گئی ہی نہیں..." وہ دھک سے رہ گئی۔

"مان لو ڈیئر... تم اس سے ملنے... اوہ آں... اسے دیکھنے آئی تھیں۔ مجھے تو یہ محبت... ون سائیڈڈ محبت لگتی ہے۔ مشرق میں ایسا ہی ہوتا ہے ناں۔ دیکھنے سے دل بھر جاتا ہے۔ ہی ہی ہی..." اچانک حملہ تھا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ مجلس اختتام پذیر ہوگئی۔ لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ وہ کیسے اٹھتی...

"میں تو چلا..." مائیکل جست بھر کے اٹھا۔ وہ ہنوز ٹس بیٹھی تھی۔

"اے ہیلو..." اس نے اس کے چہرے کے آگے چٹکیاں بجائیں۔ "میں تمہارے بارے میں بتاؤں اسے..." وہ متوجہ نہیں ہوئی تو وہ اس کے سامنے دو زانو ہوگیا۔ "اسے بتاؤں کہ کیسے ایک لڑکی روتی تھی اس کے مرنے کے خیال سے... تڑپتی تھی اس کی بھوک پیاس پر... اور..."

"وہ!" وہ چونکی...

"نہیں..." وہ مسکرا بھی دی۔ مائیکل بھونچکا رہ گیا۔ وہ بیگ سنبھالتی کھڑی ہورہی تھی۔ "تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" اس کا جملہ دھمکاتا ہوا یا منت بھرا نہیں تھا۔

وہ اسے چھوڑ کر باہر نکلتے ہی ہجوم میں گم ہوگئی۔

"میں اس سے کیسے مل سکتی ہوں... میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔ کبھی نہیں۔"

سمیع الدین سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے مائیکل کے کانوں میں اس کے الفاظ کی بازگشت تھی۔

مگر بس چار روز بعد...



"نہیں..." اس نے سوالنامہ جیک کے سامنے پٹخ دیا۔ "اسے انٹرویو نہیں سیدھا سیدھا ٹریپ کرنا کہیں گے۔ میں اس کا حصہ نہیں بن سکتی۔

بلکہ یہ... دیکھو" اس نے انگلی رکھ کر نشان دہی کی۔ ان سوالوں کو پڑھو ذرا... وہ کیا اسے دہشت گرد ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ جہاد اور جہادی تنظیمیں... صرف یہی ہوا ہے ناں کہ ایک شخص نے گانا چھوڑ دیا۔ گٹار رکھ کر رحل اٹھالی۔ کیا مطلب ہے اس سے ایسے سوال کرنے کا... سود' اسلام میں شادیوں کا تصور... ہم جنس پرستی کے بارے میں رائے... آخر تھو... وہ کیوں دے اس بارے میں رائے... بولو... میں جارہی ہوں۔ مجھے نہیں کرنا..." وہ جیک کے ہاتھ سے پرچا جھپٹ کر اٹھی۔

"کہیں تم یہ سب اس لیے تو نہیں کر رہیں کہ تم اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتیں؟"
جیک نے گردن گھمائے بغیر بہت سکون سے کہا۔
اس کا ناب پر گھومتا ہاتھ رک گیا۔ ایسا قیاس کرنے میں وہ حق بجانب تھا۔ اس کے لاشعور میں تھی یہ چیز۔۔۔
"اگر تمہارے خدشات۔۔۔ جو کہ درست ہی ہیں۔ تو تمہیں تو اس کو وارن کرنا چاہیے ناں۔" جیک نے کرسی کو اس کی سمت گھمالیا۔
"بلکہ تم ایسا کیوں نہیں کرتیں۔ تم خود کر لو انٹرویو۔۔۔ لائیو شو۔۔۔" وہ اس کی آنکھوں میں بغور دیکھ رہا تھا۔
"میں۔۔۔" اس کی آواز شکستہ تھی۔ "میں کیسے کر سکتی ہوں۔ میں صرف دوسروں کو ڈکٹیٹ کر سکتی ہوں۔ میں کیمرے کے پیچھے کھڑا ہونے والا وہ شخص ہوں۔ جو کیمرے کو ہینڈل کرنا تو جانتا ہے۔ اس سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔"
جیک کے دل کو ایک پل کو کچھ ہوا۔ مگر اگلے ہی پل اسے غصہ آگیا۔
"تو پھر ایسے ری ایکٹ مت کرو۔۔۔ جو ہو رہا ہے ہونے دو' وہ اتنا بھی بے وقوف شخص نہیں ہو سکتا کہ آسانی سے ٹریپ ہو جائے' وہ اپنا ہوم ورک پورا کر کے ہی اتنے بڑے فورم پر آئے گا۔" جیک نے حقیقت پسندی سے کہا۔
"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ تھکے قدموں سے واپس اپنی کرسی پر براجمان ہو گئی۔ "مگر یہ سب کچھ جو اس میں درج ہے۔ اس نے کاغذ لہرایا۔ "آؤٹ آف سلیبس ہے۔"
جیک کے لب بھینچ گئے۔ وہ ایک بار پھر ورق گردانی کر رہی تھی۔ ماتھے کی سلوٹیں اور چہرے کی پریشانی حد سے سوا تھی۔

✡ ✡ ✡

اس نے کسی بھی قسم کا ڈکٹیشن لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور واضح کر دیا تھا کہ وہ غیر جانب داری سے شو کرتی ہے۔
"نو۔۔۔" اس کی قطعیت کے آگے سب کو چپ لگ گئی۔
اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے وہ طمانیت سے مسکرائی۔ تب نظریں جیک کی چبھتی نظروں سے الجھ گئیں۔
"ایک تمہارے انکار سے کام نہیں بنے گا۔ ان کے پاس سو اور راستے ہیں ڈیر۔۔۔"
وہ پل بھر کو چپ ہوئی۔ ہاں جذباتیت میں گھر کر اس جانب دھیان ہی نہ دیا۔
"کوئی بات نہیں میں نے تو اپنا فرض ادا کر دیا ناں۔۔۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔"
"تم نے ضمیر کو مطمئن کرنا تھا۔ یا اسے پھنسنے سے بچانا تھا۔" جیک میز پر آگے کو جھکا اور وہ جو بے نیازی دکھا رہی تھی۔ ساکت ہو گئی۔
"ہاں یہ تو سوچا ہی نہیں۔۔۔" پھر وہ سوچنے لگی۔ اتنا سوچا اتنا سوچا کہ وحشت زدہ ہو گئی۔
کیا کرے کیا کرے' وہ فوری فیصلہ کر کے اٹھی تھی۔۔۔
اور عبدالمبین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ جو پیشگی اطلاع کے بغیر اس سے ملنے پہنچی تھی۔ مغربی لباس میں مشرقی لڑکی۔۔۔ جو بہت صاف اردو بول رہی تھی۔
"میں بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس کے لہجے میں سراسیمگی کا عنصر نمایاں تھا۔
"کیا؟" عبدالمبین نے سکون سے انداز نشست بدلا۔
اس نے تھوک نگلا۔ یہ بڑی بچکانہ سی حرکت کی تھی اس نے۔۔۔ کیسے بھاگی آئی تھی۔ خیر اس کا انداز جیسا بھی ہو۔ بات اس سے بہت سنجیدگی اور ٹھہراؤ سے کی۔ تھامس دی گریٹ کے خیالات۔۔۔
"آپ کا شکریہ۔۔۔ ہم ایسے اوچھے ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف ہیں بی بی۔۔۔ اور ان سے نبٹنا بھی جانتے

ہیں۔"

اس نے منٹ کے اندر بہت سی مثالیں دے دیں کہ کب اور کہاں اور کیسے.... انہیں ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا اور کیسے وہ اس سے ابھرے۔

"اور تھامس دی گریٹ کے بارے میں تو وہ بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اس لیے وہ قطعاً" فکر مند نہ ہو۔" وہ اس کی تعریف کر رہا تھا کہ وہ کیسی فکر مندی سے دوڑی آئی تھی۔

وہ اس کی تشفی کروا رہا تھا کہ مسئلہ ہی کوئی نہیں....

"میں آپ کے لیے نہیں کہہ رہی...." اتنے گمبھیر معاملے کو وہ اتنا ہلکا لے گا۔ وہ حیرت زدہ تھی۔

عبدالمبین چونکا۔ وہ بے تاب نظر آنے لگی۔

"میں... میں موسیٰ... میں سمیع الدین کے لیے کہہ رہی ہوں۔" وہ چیخ پڑی۔

"اگر ایسا ہے بھی تو آپ کو کیا لگتا ہے ہم ان کے عزائم کامیاب ہونے دیں گے؟"

"نہیں ناں۔" اس نے سر پکڑ لیا۔

"آپ سمیع الدین کے لیے اتنی فکر مند کیوں ہیں؟"

"تو کیا نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اور ساکت رہ گئی۔

عبدالمبین نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہ سمیع الدین تھا۔ جو اچانک اندر آنے پر مخل ہونے کے خیال سے شرمسار سا تھا۔ وہ سوری کہہ کر پلٹنے کو تھا۔ عبدالمبین اسے بیٹھنے کی دعوت دے رہا تھا۔ وہ تو کیا بیٹھتا... جسے حیرت سے دیکھ رہا تھا وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی تھی۔ گود میں رکھا بیگ زمین بوس ہو گیا۔ موبائل بھی گر گیا۔ مگر اسے ہوش نہیں تھا۔

"یہ ہمیں کسی خاص خطرے سے آگاہ کرنا چاہتی ہیں۔ بالخصوص آپ کے لیے سخت فکر مند ہیں۔ میں نے کہا...."

"میں چلتی ہوں۔" وہ جھک کر بیگ اور موبائل اٹھا رہی تھی۔ صاف لگتا تھا بھاگنا چاہتی ہے۔ عبدالمبین کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ وہ خطرے سے آگاہ کرنے کی بات کر رہی تھی۔ خود ہی تو خطرہ بن کر نہیں آئی تھی۔

عبدالمبین نے ایک بار پھر باریک بینی سے اس کا جائزہ لینا شروع کر دیا وہ ہونٹ کچلتی، پلکیں جھپکتی الجھن میں دکھائی دے رہی تھی اور صاف لگتا تھا بھاگ جانے کو پر تول رہی ہے اور اس نے الٹے قدموں پیچھے ہٹنا بھی شروع کر دیا تھا۔

عبدالمبین نے سوچا، وہ اس سے فوراً" پوچھے کہ وہ درحقیقت کون تھی اور کیا کرنے آئی تھی۔ اس کا بی بی سی والا کارڈ جھوٹا بھی تو ہو سکتا ہے۔

"اے رکو...." اس سے بیشتر کہ وہ پلٹتی۔ "ٹھہرو،"

"نہیں...." اس نے سمیع الدین سے نظریں ہٹائے بغیر عبدالمبین کو انکار کیا۔ وہ دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی۔ عبدالمبین آگے بڑھ کر اسے روکنے والا تھا کہ اس کے قدم اٹھے کے اٹھے رہ گئے۔ کہاں تو وہ عجلت کہ نکل بھاگے.... اور کہاں وہ پتھر بن گئی تھی۔

عبدالمبین نے سمیع الدین کو اپنے پاس سے گزر کر لڑکی کے سر پر پہنچتے دیکھا۔

"میرو...." وہ اسے پکار رہا تھا۔ بے یقین لہجہ.... پُر مسرت چہرہ.... اور مضبوطی سے پکڑے بیگ کا فیتہ ماروفیاض کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ بیگ قدموں میں ڈھیر ہو گیا تھا۔

بلو جینز' براؤن جیکٹ اس نے بالوں کا رنگ بدل لیا۔ اس کا چہرہ لمبوترا دکھائی دیتا تھا۔ آنکھوں میں سراسیمگی تھی اور شکست خوردگی۔ مگر ایسا بھی کیا.... کہ سمیع الدین پہچان نہ پاتا۔ وہ بیگ کو ٹھوکر سے دور کرتی' دھپ سے صوفے پر بیٹھی تھی۔

عبدالمبین نے اس کی آنکھوں کو بھرتے دیکھا۔ اس نے آنکھیں ہاتھ سے ڈھانپ لی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سرود فاطمہ منتی

میں ایک عورت ہوں

"ممّا جلدی کریں ہماری وین آ گئی ہے" نومی نے آواز لگائی۔ میں نے جلدی سے ان دونوں کے لنچ بکس تیار کر کے ان کے بیگز میں ٹھونسے اور ان دونوں کو روانہ کیا۔

"بھئی بیگم جلدی کیجیے۔ آج تو ہم بھی کافی سے زیادہ لیٹ ہو گئے ہیں۔"

ان دونوں کو باہر کر کے ابھی میں نے کچن میں قدم رکھا ہی تھا کہ ارسلان کی آواز آئی جو ٹیبل پر ہاتھوں سے طبلہ بھی بجا رہے تھے اور لیٹ ہونے کا سُر بھی ساتھ ملایا تھا۔

انہیں ناشتا دے کر میں نے جلدی سے گندے برتن سنک میں جمع کیے۔ سارے ڈبے کیبنٹ میں رکھے۔ باہر آئی تو ارسلان ناشتا کر کے جانے ہی والے تھے۔ انہیں دروازے تک چھوڑ کر اللہ حافظ کہا اور پھر سے کچن کی راہ لی کہ وہاں گندے برتنوں کا ڈھیر میری نظر التفات کا منتظر تھا۔

"باجی جی!" خفگی بھری معصوم آواز آئی تھی۔ میں ٹھٹک گئی۔ پیچھے دیکھا تو وہ سب ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

"ہماری باری کب آئے گی؟" منہ بنایا گیا تھا۔

مجھے بے اختیار ان پہ ترس آیا تھا۔ اور ان سے زیادہ خود پہ رحم آیا تھا۔ دل کیا دھاڑیں مار مار کر رووں۔ پچھلے ایک ہفتے سے میں ان سب کو نظر انداز کر رہی تھی اور ایسا کر کے میرے دل پہ کیا گزر رہی تھی۔ میرے جیسے لوگ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

"ابھی نہیں۔" میں سر جھک کر دوبارہ برتن مانجھنے لگی۔ "تھوڑا ویٹ کریں آپ لوگ، پلیز۔" میں نے دل کے کام پر گھر کے کام کو ترجیح دی تھی۔ خاصی شرمندگی بھی ہوئی تھی۔

کچن سے فارغ ہو کر لاؤنج سمیٹنے لگی۔ کشن صوفوں پر سیٹ کر کے ریموٹ ٹی وی ٹرالی تک پہنچایا سارے گل دان اپنی اپنی جگہ رکھ کر ڈسٹنگ کے بعد نومی اور سمی کے کمرے میں آ گئی۔ جہاں ان شریروں نے سب کچھ بکھیر دیا تھا۔ کھلونے، تکیے، بستر کی چادر میلے کپڑے کوئی بھی چیز اپنی جگہ پہ نہیں تھی۔ جلدی جلدی ان سب کو ادھر ادھر ان کی جگہ پہنچا کر اپنے کمرے میں آ گئی تو دماغ چکرا کر رہ گیا۔ کیونکہ ارسلان بچوں سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ دل کر رہا تھا کہ ابھی ارسلان آئیں اور میں ڈنڈا اٹھا کر ان ہی سے یہ سب ٹھیک کراؤں مگر ظاہر ہے میں یہ سب صرف سوچ ہی سکتی تھی۔

ٹائی کی تلاش میں صاحب بہادر نے پوری الماری بستر پر بکھیر دی تھی۔ تولیہ صوفے پہ پڑا اپنی قسمت کو رو رہا تھا تو کشنز ایک دوسرے کے پیچھے باتھ روم کے دروازے تک پہنچے ہوئے تھے۔ بستر کی چادر فرش پہ دو زانوں جھکی تھی تو تکیہ لیمپ کو سرکائے اس کی جگہ سائیڈ ٹیبل پہ براجمان تھا۔ اپنا پرفیوم اٹھانے کی خاطر میری ساری کاسمیٹکس ادھر ادھر لڑھکا دی تھیں۔ پورے کمرے کا حشر دیکھ کر مجھے اپنی بے بسی پہ رونا آیا تھا۔ گو یہ روز کا معمول تھا۔ مگر پتا نہیں کیوں آج میں تنگ سی آ گئی تھی کہ ابھی بھی ان لوگوں کو

نظرانداز گھر کے اسی پھیلاوے کی وجہ سے ہی تو کیا تھا۔
تھوڑی دیر بعد کمرے کی حالت تو سمٹ گئی مگر میری اپنی حالت بہت نازک ہو گئی۔ ایک تو بھوک سے برا حال تھا کہ ابھی ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ ارسلان چونکہ شام کو آتے، بچے دوپہر میں کچھ کھاتے ہی نہیں تو اس لیے میں ذرا لیٹ ناشتا کرتی جس سے دوپہر کا کام بھی چلاتی۔ سو اب دل بھرپور ناشتے کرنے کا چاہ رہا تھا۔

ناشتا بناتے وقت میں سوچ رہی تھی کہ کیوں نہ آج سارے کپڑے دھو ڈالوں پھر اتوار کو بچوں اور ارسلان کو ٹائم دے پاؤں گی۔ کیونکہ ارسلان کو میری اتوار کی مصروفیت سے بہت چڑ ہوتی تھی۔ وہ



جس وقت گھر پہ ہوتے، چاہتے ساری توجہ انہیں دی جائے اور بچے بھی اتوار کو کوئی نہ کوئی پروگرام بنا لیتے جس سے میرے اس دن کے کام ادھورے ہی رہ جاتے تھے۔

ناشتا کر کے اپنے جھوٹے برتن دھو کر میں نے سارے میلے کپڑے اکٹھے کیے اور باہر آئی تو دروازے پہ بیل ہوئی۔ سو کپڑوں کا انبار وہیں لاؤنج کے صوفے پہ دھر کر دروازہ دیکھنے چلی۔

دروازہ کھول کر سامنے کھڑی ہستی کو دیکھ کر میرے پورے وجود پر دماغ سمیت ایک بوجھ سا آ گرا۔ سامنے میری بڑی والی نند عاصمہ باجی ہاتھ میں اتنا بڑا شاپر پکڑے کھڑی تھیں۔ (ارے آپ مجھے کوئی تنگ نظر بھاوج قطعی نہ سمجھے بلکہ میری اس نند کی عادات کچھ ایسی تھیں کہ اچھے بھلے بندے کی مت مار دیتی تھیں)

''السلام علیکم باجی!'' چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجا کر میں نے سلام کیا تو وہ مجھے ایک طرف ہٹاتی بغیر جواب دیے ہی اندر داخل ہوئیں۔

''توبہ توبہ کتنی غضب کی گرمی ہے باہر۔'' صوفے پر بیٹھ کر دوپٹے سے پسینہ صاف کیا گیا۔

''اور ایک تم ہو کہ چار پانچ بیل دینے سے پہلے دروازہ کھولنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہو۔ ہنہ۔'' منہ بنایا گیا۔ لگتا تھا۔ دماغ پر بھی گرمی چڑھ گئی تھی۔ (حالانکہ اللہ گواہ ہے آج تو میں نے پہلی ہی بیل پر دروازہ کھولا تھا۔)

''سوری باجی وہ میں کمرے میں تھی تو اس لیے۔'' میں منمنائی۔

''آپ سنائیں کیسی ہیں۔ گھر میں سب ٹھیک تھے۔'' لگے ہاتھوں احوال بھی پوچھا اور کپڑے اٹھانے لگی تاکہ مشین میں رکھ ہی دوں۔ دھونا تو اب تب ہوتا جب باجی جاتیں۔

''ہاں ہاں سب خیریت سے تھے تم سناؤ، بچے اسکول گئے ہیں اور ارسلان کیسا ہے چکر ہی نہیں لگایا پھر۔'' صوفے پر ہی دراز ہو کر پوچھا گیا۔

''الحمدللہ سب ٹھیک ہیں۔ اور ارسلان کا تو آج کل کام کی زیادتی کی وجہ سے گھر میں پیر ہی نہیں ٹکتا۔''

''ہاں یہ تو ہے کہ بہت محنت کرتا ہے میرا چھوٹا بھائی۔'' بھائی کے ذکر پر لہجہ خود بخود شیریں ہوا تھا۔

''ان کپڑوں کا کیا کر رہی ہو۔'' میرے گود میں کپڑوں کے انبار پر شاید ان کی نظر اب پڑی تھی۔

''میلے کپڑے ہیں۔ سوچ رہی ہوں آج دھو لوں تو پھر اتوار کو فارغ رہوں گی۔''

''ہاں بھئی ایسے کام صرف سوچ سکتی ہو۔ عالیہ (چھوٹی نند) نے ٹھیک کہا تھا کہ بھابھی بہت پھوہڑ ہو گئی ہیں۔ نہ تو کپڑے ٹائم پر دھوتی ہیں نہ ہی گھر کی ڈسٹنگ وسٹنگ کرتی ہیں۔ جو چیز بچے جہاں گراتے ہیں وہیں پڑی رہتی ہے۔'' (سوال گندم جواب چنا) صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ اب ایسے کہہ رہی تھیں جیسے میری شان میں قصیدہ پڑھ رہی ہو۔

میں خواہ مخواہ ہی اپنی جگہ چور سی بن گئی۔ اور عالیہ کو تو دل ہی دل میں صلواتیں سنانے لگی۔ جس نے مرچ مسالا لگا کر پچھلے ویک اینڈ کا قصہ اپنی باجی جی سے بیان کیا تھا۔

اب جب وہ عالیہ صاحبہ اپنے چار عدد شیطانوں کے ہمراہ آ جاتیں اور میرے والے شیطان کے ماما زاد ہو جاتے۔ تو یہ سب مل کر گھر کے کشن سے کشن، برتن سے برتن، کھلونے سے کھلونا بجا دیتے، وہ تو خود آرام سے ٹی وی کے سامنے براجمان ہوتی جبکہ میں گھن چکر بنی ہوئی ان کے پیچھے اور کچن میں گھومتی پھرتی۔ کہ وہ جو چیزیں اپنی جگہ سے ہٹائیں میں دوبارہ سیٹ کرتی جاؤں۔ اوپر سے سب کی پسندیدہ ڈشز بنانا۔ میرا ایک پاؤں کچن میں تو دوسرا لاؤنج میں ہوتا۔ مگر مجال ہے جو ٹی وی میں مگن عالیہ صاحبہ کچھ ملاحظہ ہی کرتیں۔ مزے سے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے نگٹس پکوڑوں سے انصاف کرتی وہ جیسے اس جہاں میں ہوتی ہی نہیں تھی۔

آخر تنگ آ کر میں نے پچھلے ویک اینڈ پر کان ہی لپیٹ لیے۔ یہ سوچ کر کہ جب غالیہ رخصت ہو جائے گی تو اپنے والوں کو دو چماٹ رسید کر کے سارا پھیلاوا ایک ہی بار سمیٹ لوں گی۔ مگر وائے قسمت عالیہ نے ان سب کو میرا پھوہڑ پن سمجھ کر باجی جی سے شکایت لگادی تھی۔ جس کے نتیجے میں اب میں باجی جی کی عدالت میں کھڑی تھی۔

''ارے نہیں باجی وہ تو......''

''کیا نہیں، بھئی اب تو میں نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔'' میری بات درمیان میں ہی کاٹ گئی۔

''اب بتاؤ ذرا' ان میلے کپڑوں کی جگہ یہ بنتی ہیں جو تمنے یہاں رکھے تھے' ہیں۔'' پاؤں نیچے کر جوتے پہنے اور اٹھ گئیں جیسے باقی گھر کا جائزہ لینا ہو۔ میرا دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا۔

''ارے باجی! کہاں اٹھ گئیں آپ! میں شربت لاتی ہوں آپ کے لیے۔'' جلدی سے کہہ کر جیسے میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی۔ کپڑوں کا ڈھیر اب بھی میری بانہوں میں تھا۔

''ہاں تب تک تم شربت بناؤ' میں ذرا واش روم جارہی ہوں۔ صبح سے پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے۔'' کہہ کر وہ واش روم میں چلی گئی۔ اور اپنا اندازہ، غلط ثابت ہونے پہ میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

کپڑے جلدی سے واشنگ مشین میں ٹھونس کر کچن میں آئی۔ تو وہ سب منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی ضبط کرنے کی کوششوں میں تھے۔

''یہ تم لوگ کس خوشی میں دانت نکال رہے ہو۔'' انہیں یوں ہنسی سے بے حال ہوتا دیکھ کر میرا تو پارہ ہائی ہوا تھا۔

''دیکھ رہے ہیں' جس کام کی خاطر آپ ہمیں نظر انداز کر رہی ہیں اس میں آپ کتنی کامیاب ہوئی ہیں۔'' ان سب نے کورس میں کہہ کر قہقہہ لگایا تھا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ کیا کہا تھا میں نے صبح کہ پھر نہیں آنا جب تک میں نہ بلاؤں۔'' میں نے غصے سے کہا تو ان سب کے منہ اتر گئے اور چپ چاپ ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ مجھے ان کی ناراضی کا دکھ بھی تھا۔ مگر مجھے پتا تھا یہ مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتے' میں پھر جب بھی بلاؤں گی' آجائیں گے۔

''ارے بھئی یہ تم شربت بنا رہی ہو یا پائے۔'' باجی کی گرج دار آواز سے کچھ دیر پہلے والا منظر دھندلا گیا۔ اور میں گہرا سانس خارج کرتی حال میں آگئی۔

شربت کا جگ اور گلاس ٹرے میں رکھ کر باہر آئی تو باجی پھر سے صوفے پر آلتی پالتی مارے براجمان تھیں۔

''ویسے ہو تو تم کافی سے بھی زیادہ ست۔'' دو گلاس شربت کے چڑھا کر جیسے انہوں نے میری تعریف میں پھول جھاڑے تھے۔ ویسے وہ تو جب سے آئی تھی مجھ پر پھولوں کی بارش کرتی جارہی تھیں۔

''میرا یہ سوٹ ذرا جلدی سی دو۔ یہ اخبار ساتھ لائی ہوں۔ اس طرح کی ڈیزائننگ کرنی ہے۔'' اپنے ساتھ لایا بڑا شاپر کھول کر انہوں نے مجھے اس میں سے کپڑوں کے ساتھ ساتھ ایک مڑا تڑا اخبار کا ٹکڑا بھی تھمایا تھا۔ جس میں ماڈل نے کلیوں والی بڑی گھیر والی فراک زیب تن کر رکھی تھی۔

اخبار والا ڈیزائن اور چار عدد سوٹ کو دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا کہ سلائی جاہے جیسے بھی ہو، میرے لیے قطعی مشکل نہیں ہوتی صرف ایک بار دیکھنے پر میں بالکل ویسا ہی تیار کر لیتی تھی مگر مسئلہ وقت کا تھا۔ جو میرے پاس ان ''اپنوں'' کے لیے بھی نہ تھا کجا ان کپڑوں کے لیے ڈھیر سارا وقت فارغ نکالتی (دماغ پر ایک اور بوجھ آگرا تھا)۔

''ہمارے کپڑے تو کم از کم دو مہینے تمہارے پاس پڑے رہتے ہیں مگر یہ ذرا جلدی سی دو۔ میری دیورانی کی بیٹیوں کے ہیں۔ ننھیال میں شادی ہے اس کے لیے بنوا رہی ہیں۔'' کہہ کر انہوں نے ایک اور گلاس بھرا۔ اور دیورانی کے بارے میں سن کر تو مجھے سچ مچ میں باجی پر غصہ آیا تھا۔ اب بھلا میں ان نند صاحباؤں کی دیورانیوں کی بیٹیوں کے کپڑے بھی بلا معاوضہ سیتی رہوں، یہ کوئی آسان بات ہے؟

''بڑا اترا رہی تھی۔ میری چھوٹی بہن نے کورس کر رکھا ہے کپڑوں کے مختلف ڈیزائنز کا۔ مگر یہ والا وہ نہیں بنا سکتی۔ ہنہ۔ مگر میں نے تو دیکھتے ہی کہا کہ یہ میری بھاوج کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تو پتا ہے اس بے چاری کا منہ دیکھنے والا ہوگیا۔'' ہاتھ پہ ہاتھ مار کر انہوں نے مزہ لیا تھا۔

اپنی اس دیورانی سے انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ اسے نیچا دکھانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھیں۔ اب بھی جیسے قدرت نے انہیں اپنی دیورانی کو منہ چڑانے کا موقع دیا تھا تو بھلا وہ کیوں گنواتیں۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ کیا ہی اچھا ہوتا جو میں شادی کے دوسرے ہی دن ڈھنڈورا (کپڑے سینے کا) نہ پیٹتی۔ جو کہ اب سراسر میرے خلاف ہی استعمال ہو رہا تھا تو شاید اس طرف سے تو کچھ سکون ہوتا۔

مگر وہ کیا ہے نا کہ شادی کے اولین دنوں میں بندہ اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ ہواؤں میں اڑتا ہے اور دل کرتا ہے کون سا اپنا ایسا کارنامہ۔ کوئی خوبی ہو کہ بڑھ چڑھ کر بیان کرے اور خوب اترائے سب میں۔ اور سسرال والے اپنی نئی نویلی بہو اور بھابھی کی واہ واہ کرتے رہ جائیں۔

مجھے بھی یہ شوق ہوا تھا جس میں اپنی شو مارنے کے لیے شادی کے دوسرے روز ہی نندوں اور ان کی اولادوں کی جھرمٹ میں بیٹھے میں نے بڑے غرور سے کہا تھا کہ میں نے ڈیڑھ سال کا ڈپلومہ کیا ہے۔ ہر قسم کا ڈیزائن خواہ وہ فراک میں ہو یا شرٹس میں ہو یا لہنگے میں، میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اور تو اور مثال کے طور پر اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ وائٹ بیڈ شیٹ جس پر کپڑے ہی کا میرون نقش کا کام کیا تھا بڑے فخر سے دکھایا۔ بس پھر کیا تھا سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور میری گردن تفاخر سے کچھ اور اکڑ گئی کہ پھر سب کے سامنے تعریف ہوتی اور میں ہواؤں میں اڑتی رہتی (سسرال میں تعریف ہونا کوئی عام بات تو نہیں۔)

مگر ہائے ری خوش فہمی، گردن سے تفاخر کا سریا جلد ہی نکل گیا۔ کیونکہ چار عدد نندوں اور ان کی درجن بھر لاڈلیوں کے کپڑے میرے ذمے ہو گئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اب تک ان چھ سالوں میں کوئی دن ایسا نہ گزرا تھا کہ جس میں کسی کی طرف سے کپڑے نہ آئے ہوں سینے کے لیے۔ اور ان سب کے کپڑے سی سی کر میری کمر انگریزی والی C بن گئی تھی۔

مجال ہے جو کبھی اپنے کپڑوں میں کوئی نیا ڈیزائن بناتی۔ اگر غلطی سے کبھی دل سے مجبور ہو کر سی بھی لیتی تو پھر ان سب کے لیے بھی بالکل ویسا بنانے کے لیے تیار رہتی۔ (ہائے ری قسمت) باجی تو جلدی کا کہہ کر کپڑے چھوڑ کر چلی گئیں جبکہ میں سوچ رہی تھی کہ ان کے لیے کب کب ٹائم نکالنا ہے۔

☆☆☆

''مما آج بھی بریانی بنالیں ناں پلیز۔'' ہنی پچھلے آدھے گھنٹے سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا اور چونکہ بریانی میں نے کل ہی بنائی تھی۔ اس لیے کم از کم آج تو بالکل نہیں بنا سکتی تھی کہ ارسلان اور نومی کوئی بھی ڈش مسلسل نہیں کھاتے تھے۔ چاہے صرف دو دفعہ ہی کیوں نہ ہو اور اب تو میری بھی بڑی پکی عادت بن گئی تھی کہ ایک ڈش ہفتے میں صرف ایک بار بناتی ہوں۔ ہاں اگر مہمان آجائیں تو پھر روٹین کے خلاف چلی جاتی۔

''ہنی بیٹا کیا ہوگیا ہے آپ کو' کیوں بلاوجہ ضد کر رہے ہو۔ کل ہی تو بنائی تھی بریانی۔ پتا بھی ہے پاپا اور بھائی کا۔'' فریج سے ٹماٹر نکال کر دھوتے ہوئے میں نے اسے پھر ٹالا۔

''پلیز مما! صرف میرے لیے بھیا اور پاپا کے لیے تو آپ یہ دوسرا والا سالن بنا رہی ہیں نا۔'' اس نے معصومیت سے کہا تو مجھے بے اختیار اس پر ترس آیا۔

''اوکے'' میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

''بنا لوں گی مگر تب تک آپ نے سارا ہوم ورک کمپلیٹ کرنا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ ''ہرّا'' نعرہ

لگاتا ہوا نکل گیا۔

ٹماٹر کاٹ کر میں نے گرم تیل میں ڈالے اور فریج سے چکن نکال کر صاف کرنے لگی۔ نومی میرا فون لیے آگیا۔

"ممّا پاپا کا فون ہے۔"

"ہیلو۔" موبائل کان اور کندھے کے درمیان پھنسا کر میں نے آنچ کم کردی اور مرغی دھونے لگی۔

"ہاں فری! آج میں ذرا لیٹ آؤں گا۔ تم لوگ کھانا کھالینا۔" ارسلان نے کہا تو مجھے حیرت ہوئی کہ ارسلان بلاوجہ کبھی رات کا کھانا ہمارے بغیر نہیں کھاتے تھے۔ اس لیے پوچھا۔

"کیوں خیریت؟"

"ہاں خیریت ہے۔ بس ایک دوست کی طرف آج دعوت ہے تو اس لیے۔ اچھا رکھتا ہوں بائے۔" کہہ انہوں نے کال کاٹ دی اور میں مطمئن ہوکر جلدی جلدی کام نبٹانے لگی۔ اور دل میں خوش بھی ہورہی تھی کہ اچھا ہے ارسلان کے آنے تک کوئی ایک آدھ کام تو کرلوں گی۔

سارے کپڑوں کی کٹنگ کرلیتی ہوں پھر آرام سے تھوڑے سی لیا کروں گی کہ انہوں نے جلدی کا خاصا شور مچایا تھا یا پھر کپڑے دھولوں کہ باجی کے آنے سے وہ ویسے ہی رہ گئے تھے۔

میں ارادے باندھ ہی رہی تھی کہ فوج کی صورت وہ سب پھر آگئے۔

"باجی' یہ ٹائم ہمیں دے دیجیے' ورنہ ہم پھر نہیں آئیں گے۔" کورس میں کہہ کر جیسے دھمکی دی گئی تھی۔

"اور یہ بات تو آپ لوگ جانتے ہی ہوں گے کہ یہ لوگ اگر سچ مچ ناراض ہوجائیں تو پھر تو ان کے سامنے ناک رگڑنی پڑتی ہے کہ آنے میں پھر خاصے نخرے دکھاتے ہیں۔"

"او کے ٹھیک ہے۔ تم میرے کمرے میں ویٹ کرو۔ میں کھانا کھا کر آتی ہوں۔"

"یا ہو و و و۔" مثبت جواب سن کر سب نے مشترکہ نعرہ لگایا تھا اور خوشی خوشی جھومتے جھامتے چلے گئے۔

سب کچھ تیار کرکے میں نے کھانا لگایا اور جلدی جلدی کھا کر کمرے میں آئی تو وہ سب جیسے انتظار میں اونگھ رہے تھے۔ میرے پیارے۔

"اچھا اب سب لائن لگا کر کھڑے ہوجاؤ اور خبردار جو کوئی بھی آگے پیچھے ہوا تو۔" انہیں لائن میں لگا کر میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور تیار ہوکر بیٹھ گئی۔

اور پھر قلم کی نوک کو کاغذ پر رکھنے کی دیر تھی کہ الفاظ لڑیاں بننے لگے اور ڈھائی گھنٹے لگے تھے مجھے ایک ہی زاویے پہ بیٹھے بیٹھے کہ افسانہ بن گیا تھا۔

اپنا سارا تخیل سمیٹ کر میں نے کاغذات کا پلندہ دراز میں رکھا تھا۔ ٹائم دیکھا تو ساڑھے گیارہ کا وقت تھا۔ ارسلان کے آنے میں اب بھی وقت تھا سو کمر کس کر کپڑے دھونے جارہی ہوں۔

گو کہ میں رائٹر ہوں مگر اس سے پہلے میں ایک گھر گرہستن بھی تو ہوں۔ اور عورت کے لیے سب سے پہلے' اپنے دل سے بھی پہلے' اپنا گھر بچے اور شوہر ہوتا ہے۔ میرے لیے بھی ہیں۔ کیا ہوا جو میں رائٹر ہوں بلکہ رائٹر ہونے کے ناتے مجھ پر اپنے گھر کے علاوہ دوسروں کے گھروں کی بھی ذمہ داری ہے۔ اپنے پیغام ہی سے تو ہم کسی کا گھر آباد کرتے ہیں' برباد ہونے سے بچاتے ہیں۔ ایک جہاں ہماری تحریروں سے سبق سیکھتا ہے۔ تو اگر ہم خود اپنے لکھے پر عمل نہیں کریں گے تو ہماری تحریر میں وہ اثر جو دلوں پر ہوتا ہے' کہاں سے آئے گا۔

مجھے بہت دکھ ہوتا ہے جب مجھے لکھنے کا ٹائم نہیں ملتا۔ بہت غصہ بھی آجاتا ہے۔ چڑچڑی سی ہونے لگتی ہوں اگر مسلسل کئی دنوں تک کچھ نہ لکھوں تو کیونکہ ایک حساس رائٹر جب تک اپنی سوچ کو لفظوں کے جامے میں لوگوں کے سامنے نہیں لاتا' اس کی روح بے چین رہتی ہے۔

مگر میں خود کو سرزنش کرتی ہوں اور یہ یاد دلاتی ہوں خود کو کہ جہاں کے سدھارنے سے پہلے مجھے اپنا گھر سدھارنا ہے کہ یہ ہی میرا پہلا فرض ہے۔

☆

قرۃ العین خرم ہاشمی



صبح سے مسلسل ہونے والی بارش نے سڑکوں، گلی میں جگہ جگہ پانی کھڑا کر دیا تھا۔ بارش جو کبھی اسے اپنی ٹپ ٹپ کرتی بوندوں اور مٹی کی سوندھی خوشبو سے مست کر دیتی تھی، آج وہ ہی بارش آسمان سے مسلسل برستے ہوئے دیکھ کر بھی وہ خاموش اور گم صم سی دریچے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ نجانے کتنی دیر گزر گئی۔ بارش ایک دم سے رک گئی تھی۔ ایسا لگا جیسے اپنی پذیرائی نہ ہونے پر بارش بھی روٹھ کر، اپنی سب بوندوں کو گھنے بادل کے بڑے سے مٹکے میں بند کر کے دور کے کسی شہر کی طرف چل پڑی تھی۔

رات کا آخری پہر شروع ہو گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور پاؤں گھسیٹتی ہوئی پچھلے برآمدے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس کی نظر پڑوس کے گھر سے آتی انگور کی بیل پر پڑی۔ انگور کی بیل اس کے آنگن میں بھی کافی پھیل چکی تھی۔

انگور کی بیل پر ٹھہرے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ کر کے کچی زمین پر گر رہے تھے۔ وہ خاموش نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ اس کا خالی ذہن اور آنکھیں کسی چیز پر مرکوز نہیں تھیں۔ اچانک اس کی نظر اسٹور کی طرف اٹھی۔ ہلکی سی روشنی میں اسے کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے ذرا غور سے دیکھا۔ اسے ایک جھٹکا لگا۔ ایک دم سے اس کی سوئی ہوئی حسیات جاگ گئی تھیں۔ اسے لگا جیسے اس کے سن ہوتے جسم میں اچانک سے کرنٹ دوڑنے لگا ہے۔ ایک خیال کا سہارا لیتے ہوئے وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھی۔ تیز قدموں سے اسٹور کی طرف جاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

☆☆☆

"امی! میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ میرے لیے رشتے دیکھنا چھوڑ دیں۔ میں اپنی پسند سے شادی کروں گی۔"

حرا نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ پالک کو باریک باریک کاٹتی ریحانہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"اور تیری پسند وہ لفنگا، نالائق پاشا ہے' جو باپ کے پیسے پر عیاشی کرتا پھرتا ہے۔ اپنی کیا کمائی ہے اس کی؟ عقل کی اندھی! یہ تو سوچ کہ اس کے پانچ مرلے کے کرائے کے گھر میں پہلے ہی جنجال پورہ آباد ہے۔ وہ تجھے بیاہ کر کہاں رکھے گا؟ آئے دن ان کے گھر سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ ماں باپ سر پر نہ ہوں تو یہ تینوں بھائی ایک دوسرے کو قتل ہی کر دیں۔ تُو چلی ہے اپنا گھر بسانے۔"

ریحانہ کے ہاتھ سے زیادہ اس کی زبان تیز تیز چل رہی تھی۔ حرا نے منہ بنا کر ماں کی طرف دیکھا۔

"امی! تو میں کون سا کسی محل میں پلی بڑھی ہوں! انتیس سال میری عمر ہو گئی ہے۔ اسکول میں نوکری کرتے ہوئے، کئی سال گزر گئے ہیں۔ ابا کے مرنے کے بعد ہم لوگوں نے کتنا مشکل وقت دیکھا ہے۔ بڑے بھائی اور بہن تو شادی شدہ اور اپنے گھر بار والے تھے مگر ہم تینوں تو چھوٹے اور کسی سہارے کے محتاج تھے۔ اپنی خواہشوں کو مارتے ہوئے بمشکل تنگ دستی میں وقت گزارا، کسی قابل ہوئے تو سب

سے پہلے اپنے لیے نوکری تلاش کی۔ میں اور ہما ٹیوشن پڑھاتے پڑھاتے، بمشکل اچھے اسکول میں نوکری حاصل کر سکے اور ذیشان نے اپنے دوست کی منت سماجت کر کے دبئی کا ویزا لیا اور وہاں محنت مزدوری کر رہا ہے۔ مگر آپ جانتی ہیں کہ ابھی بھی ہمارے حالات بہت اچھے نہیں ہوئے ہیں۔ ہاں مگر بہتر ضرور کہہ سکتی ہیں۔

ہما کی شادی کس مشکل سے آپ نے کی ہے اور پھر بھی اسے کیسا سسرال ملا ہے۔ جہاں وہ ہر وقت شوہر کی مار اور گالیاں سہتی، اپنے دو بچوں کو لیے بیٹھی ہوئی ہے۔ پاشا کے ساتھ کچھ مسئلے ضرور ہوں گے مگر اماں! وہ ہزاروں سے اچھا ہے اور سب سے بڑی بات مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

حرا نے آج ٹھان رکھی تھی کہ ماں کو منا کر ہی دم



لے گی۔ ریحانہ نے پرات میں باریک کٹے پالک پر چھری پھینکی اور آس پاس بکھرے ہوئے پالک کے خراب پتے اٹھا کر شاپر میں ڈالنے لگی۔

''دیکھ حرا! تُو اپنی ضد منوا کر بہت غلط کرے گی۔ شادی سے پہلے کی محبت، بعد میں ایسے گم ہوتی ہے جیسے مون سون کی بارش کے بعد ایک دم سے ہی صاف آسمان نکل آتا ہے۔ بندہ سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ کہاں تو ابھی تیز بارش ہو رہی تھی اور کہاں اب چمکتا ہوا سورج سر پہ آن کھڑا ہوا ہے۔ بے وقوف لڑکی! اتنا تو سوچ، جس کو صرف دور سے دیکھا اور جانا، اس کی محبت کا کیسے دعوا کر سکتی ہے، ایسی راہ چلتی محبتیں بہت دیکھی اور سنی ہیں ہم نے۔۔۔ دماغ کا خلل ہے یہ اور کچھ نہیں۔۔۔''

ریحانہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی اور کٹے پالک سے بھری پرات اٹھا کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ حرا نے پاؤں زور سے زمین پر مارا اور باورچی خانے کی طرف منہ کر کے چلائی۔

''دماغ کا خلل ہو یا دل کا روگ! میں شادی پاشا سے ہی کروں گی۔ بس۔۔۔''

وہ بھاگتے قدموں کے ساتھ چھت کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ شام کا آنچل ہر طرف پھیل چکا تھا۔ اس لیے آس پاس کی چھتوں پر کافی رونق تھی۔

''اب چھت پر اس کمینے سے نین مٹکا کرے گی۔ سچ کہتے ہیں سیانے، کمانے والی لڑکیوں کے دماغ ساتویں آسمان پر چڑھ جاتے ہیں۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے یہ آج کل کی نسل! کیا ہم نے بال دھوپ میں سفید کیے ہیں! دنیا کے سب رنگ ڈھنگ دیکھ رکھے ہیں!'' ریحانہ بڑبڑاتے ہوئے پالک کو دھو رہی تھی۔ اس کی بڑبڑاہٹ سے بے پرواہ، حرا چھت پر پاشا کے ساتھ آنکھوں آنکھوں میں ہی دنیا جہاں کی باتیں کر رہی تھی۔

☆☆☆

''دیکھ پاشا! اب بہت ہو چکا۔ تیرے بڑے دونوں بھائیوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اب تیرا خرچا نہیں اٹھائیں گے۔ تُو دکان پر نہیں جاتا۔ مگر ہر مہینے دھڑلے سے جیب خرچ مانگ لیتا ہے۔ پاشا تُو اچھی طرح جانتا ہے کہ کپڑے کی یہ دکان تیری دونوں بھابھیوں کے جہیز میں لائے گئے زیور کو بیچ کر اور کچھ جمع پونجی اکٹھی کر کے لی گئی ہے۔ ان دونوں نمانیوں نے بھی ٹھیک سوچا کہ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے، اپنا آج قربان کر دیا اور اپنے شوہروں کو کاروبار کے لیے رقم دی مگر اس قربانی کے بدلے وہ دونوں ہر چیز پر گہری نظر اور سب معاملات پر پورا کنٹرول رکھتی ہیں۔ تیری ماں اور میں تو بس بزرگی کی چادر تلے وقت گزار رہے ہیں۔ تُو اب سنجیدہ ہو کر کمانے کا سوچ۔۔۔! اس طرح کرے گا تو تجھے کون لڑکی دے گا، صرف اچھی شکل و صورت پر مت اترا۔ خود کو ہیرو سمجھنا چھوڑ دے۔ تیری جیسی شکلیں غربت کے اندھیرے میں ایسے گم ہوتی ہیں کہ کہیں نظر نہیں آتی ہیں۔ کچھ عقل کر۔۔۔''

پاشا نے منہ بنا کر ابا کی اتنی لمبی تقریر سنی۔ اگر اس نے ابا سے پیسے نہیں لینے ہوتے تو کب کا اٹھ کر جا چکا ہوتا مگر ابھی اسے ابا سے کام تھا۔ اس لیے سر جھکائے سنتا رہا۔ مگر ابا جہاں دیدہ تھے۔ وہ بیٹے کے چہرے کے تاثرات سے جان گئے تھے کہ وہ بھینس کے آگے بین بجا رہے ہیں۔ ابا نے گہری سانس لے کر اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ پاشا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھا تھا کہ اس کے قدموں کو ابا کی سخت آواز نے روک دیا۔

''پاشا! یاد رکھ کہ اب تیرے پاس اس عیاشی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں، بہتر ہے کہ کچھ سوچ لے اپنے لیے۔''

پاشا نے پلٹ کر ابا کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔

''پاشا نے سب سوچ رکھا ہے ابا۔۔۔! فکر مت کریں۔''

پاشا سیٹی بجاتا گھر سے باہر نکل گیا۔ عام حالات ہوتے تو وہ ان پیسوں سے اپنے آوارہ اور

دوستوں کے ساتھ عیاشی کرتا یا کسی جگہ جوئے میں ہار دیتا مگر ابا نہیں جانتے تھے کہ پچھلے کئی مہینوں سے وہ اپنے جیب خرچ کا ایک بڑا حصہ حرا کو تحفے دینے پر خرچ کر رہا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے حرا سے کوئی محبت تھی۔ محبت تو اس کے لیے ہر روز بدلنے والے لباس کی طرح تھی۔ اس کی زندگی میں اتنے چہرے آئے اور گئے تھے کہ اسے ٹھیک سے گنتی بھی یاد نہیں تھی۔

حرا پچھلے کچھ مہینوں سے اس کے سر پر آسیب کی طرح سوار تھی۔ صرف دو وجوہات کی وجہ سے۔

ایک اس کی من موہنی اور حسین صورت۔ دوسرا وہ برسرروزگار اور تنہا لڑکی تھی۔ یعنی کہ اس نے بھی اپنے بھائیوں کی طرح مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ تلاش کر لیا تھا۔ وہ ایک ایسی کمیٹی ڈال رہا تھا، جو مستقبل میں اسے بہت منافع دینے والی تھی۔ اسے بھی اندازہ تھا کہ وقت بہت تیزی سے اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ جب سے بھائیوں کے بچوں نے لڑکپن کی دہلیز پر قدم رکھا تھا، بھائی ان کے مستقبل کے لیے بہت فکر مند رہنے لگے تھے اور اس فکرمندی کے پیچھے زیادہ ہاتھ، ان کی بیویوں کا تھا۔ جو اب کسی صورت بھی نکھٹو دیور کا مزید بوجھ برداشت کرنے پر تیار نہیں تھیں۔ اس لیے وہ ہر وقت اپنے شوہروں کے کان بھرتی رہتی تھیں۔ بات ان کی بھی غلط نہیں تھی۔ پاشا نے اب تک صرف آوارہ گردی اور عیاشی کے علاوہ کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کے کردار کی بدنامیوں اور مزاج کی رنگینی سے سب واقف تھے۔

پاشا نے آج فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مزید حرا پر پیسے خرچ کرنے کے بجائے، اس سے رشتے کی بات کرے گا۔ اسی لیے، پاشا نے حرا کو قریبی پارک میں بلایا تھا۔

☆☆☆

"دیکھو میں آج اپنی حرا کے لیے کیا لایا ہوں۔"

سنگی بینچ پر پھولوں کی باڑ کے پیچھے بیٹھے پاشا نے پر تجسس نظروں سے دیکھتی، حرا کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔

"یہ دیکھو!"

پاشا نے کہتے ہوئے سلور رنگ کا کیس کھولا۔ جس میں ایک نازک سی گھڑی جگمگا رہی تھی۔

"یہ بہت خوبصورت ہے۔" حرا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"ہاں۔ مگر تم سے بہت کم۔۔۔" پاشا نے کہتے ہوئے گھڑی نکالی تو حرا نے اپنا نازک سا ہاتھ آگے کر دیا۔ پاشا نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں گھڑی باندھی۔ حرا کا چہرہ حیا اور خوشی کے رنگوں سے سج گیا تھا۔

"تم جانتی ہو' میں نے آج تمہیں یہ گھڑی کیوں گفٹ کی ہے؟"

پاشا نے اپنے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ حرا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں چاہتا ہوں حرا کہ۔۔۔" پاشا نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ حرا نے گھبرا کر تھوڑی سی مزاحمت کی پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

"کہ اب ہم دونوں ایک ہو جائیں۔۔!" پاشا نے چالاکی سے پہلا پانسہ پھینکا تھا۔

"پاشا!" حرا نے شرما کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سے سر جھکا لیا۔

"میں بہت جلد اپنے والدین کو تمہارے گھر بھیج رہا ہوں۔ بس حرا! اب ہماری محبت میں جدائی کے لمحے ختم اور ملن کی گھڑیاں قریب آ رہی ہیں اس گھڑی کی تیز تیز چلتی سوئیاں تمہیں احساس دلاتی رہیں گی کہ اب وہ وقت دور نہیں ہے، جس کے خواب ہم دونوں نے مل کر دیکھے تھے۔"

پاشا نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ حرا ایک ٹرانس کے عالم میں اسے سن رہی تھی۔ پاشا ہر چالاک و مکار مرد کی طرح، ایک معصوم عورت کو بے وقوف بنانے کے لیے، ایک چھوٹے سے محبت بھرے گھر کا حسین خواب دکھا رہا تھا۔ حرا اس کی باتوں

کے زیر اثر بہت دور تک سوچتی چلی گئی۔ جب پاشا نے اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجا کر متوجہ کیا تھا۔

"لگتا ہے تم ابھی سے اپنے محبت بھرے آشیانے میں پہنچ گئی ہو۔"

پاشا کا لہجہ شرارتی تھا۔ حرا نے سنبھل کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اعتماد سے بولی۔

"اپنے محبت بھرے آشیانے میں جاؤں گی ضرور مگر تمہارے ساتھ۔۔۔"

"جیو میری شہزادی۔۔"

پاشا کا انداز لوفروں والا تھا مگر اس کی محبت میں ڈوبی حرا کو کب ایسی باتوں کا احساس ہوتا تھا۔

"حرا! تمہارے گھر والے مان جائیں گے نا؟"

پاشا نے کسی خدشے کے تحت پوچھا۔ حرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"گھر والے؟ گھر میں صرف میری ماں ہے پاشا! باقی بہن بھائی اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہیں۔ مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے۔ تم فکر مت کرو اور اپنے والدین کو رشتے کے لیے بھیجو۔"

پاشا کی آنکھوں میں عیاری کی چمک ابھری تھی۔ شام ڈھلنے لگی تو حرا نے جانے کی اجازت مانگی اور اگلی ملاقات کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد، پاشا نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے انگڑائی لی اور پھر بڑبڑایا۔

"تمہاری جیسی احمق، جنہیں گھر سے باہر نکلنے کی آزادی کیا مل جاتی ہے، وہ خود کو عقلِ کل سمجھ لیتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں ہی تو ہم جیسے لڑکوں کا آسان ترین ہدف ہوتی ہیں! محبت بھرا آشیانہ۔۔! اونہہ۔۔۔!!!"

پاشا نے منہ بنا کر کہا اور سیٹی بجاتا ہوا، گھر کی طرف چل پڑا۔ آج وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"دیکھ حرا۔۔۔! تُو نے سب کی ناراضی کے باوجود اپنی من مانی کر لی ہے۔ کل تیری شادی ہے، اور جس طرح ہو رہی ہے' وہ بھی تیرے علم میں ہے، نہ یہاں سے کوئی خوش ہے اور نہ وہاں سے۔ پاشا کے والدین کس طرح رشتہ لے کر آئے تھے۔ جیسے زبردستی لائے گئے ہوں۔ اس کے بڑے بھائیوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ کاروبار میں پاشا کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ گھر کرائے کا ہے۔ اگر پاشا کرایہ دے گا تو ہی رہ پائے گا۔ اور تُو بہت اچھی طرح جانتی ہے کہ پاشا نے چند دن پہلے ایک معمولی سی نوکری حاصل کی ہے۔ وہ اس گھر میں حصہ نہیں ڈال سکتا۔۔۔ اس لیے کچھ دن پہلے پاشا نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا ہے کہ تجھے رخصت کروا کے وہاں لے کر جائے گا یعنی کہ اس کے گھر والے لڑکے کی کوئی ذمہ داری نہیں لے رہے ہیں۔ کل کو کوئی مسئلہ ہوا تو ہم کس کے پاس جائیں گے۔"

ریحانہ نے مہندی والے ہاتھوں کو گھورتی حرا کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ دونوں بہنیں کچھ دن پہلے آ گئی تھیں۔ وہ ہی روز ڈھولک بجا کر رونق لگا لیتی تھیں۔ محلے کی لڑکیاں بھی شامل ہو جاتیں۔ محلے کی ایک لڑکی عارفہ، جس نے بیوٹیشن کا کورس کیا ہوا تھا اور اپنا چھوٹا سا پارلر چلاتی تھی، اس نے حرا کو مہندی لگائی تھی اور کل بارات والے دن، عارفہ نے ہی حرا کا میک اپ کرنا تھا۔

"امی! ان باتوں کو بار بار دہرانے کا کیا فائدہ؟ آپ فکر مت کریں۔" حرا نے ماں کو تسلی دی تو وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"اچھا میری بیٹی! اللہ تیری قسمت اچھی کرے۔"

ریحانہ نے حرا کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ حرا نے ماں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کر وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں آنے والے دنوں کا تصور کرتے ہوئے زیرِ لب مسکرانے لگی۔

پاشا نے اسے اپنے گھر والوں کے رویے کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ ان لوگوں سے زیادہ امیدیں مت رکھے۔ اس نے حرا کے مشورے

ے دو گلیاں چھوڑ کر چھوٹا سا اوپر والا پورشن لیا تھا۔
وہ اپنی محبت کے ملنے پر نازاں تھی۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس کے پیارے اس شادی سے خوش تھے یا نہیں۔۔! وہ اس وقت خود غرض ہو کر صرف اپنے لیے سوچ رہی تھی۔ حرا نہ چاہتے ہوئے بھی رخصتی کے وقت ماں سے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔ رخصتی کا درد اور دکھ کیا ہوتا ہے۔ یہ اسے اس وقت پتا چلا، جب وہ اس لمحے سے گزری۔ پاشا کے سنگ، ان کے دوست کی پرانی گاڑی میں بیٹھ کر ایک خیال اس کے ذہن میں آیا تھا۔ جب تک ہم کسی صورتحال سے خود نہیں گزرتے، ہم کسی چیز کی بھی تہ تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی "تجربے" سے پہلے ہم آدھے سچ سے واقف ہوتے ہیں اور تجربے کے بعد پورا سچ جان لیتے ہیں۔۔۔

"اگر ایسا ہے تو پھر میری محبت کا پورا سچ کیا ہے؟"

حرا ایک دم چونکی۔ اسی وقت گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ حرا نے بے چین ہو کر سر اٹھایا تھا مگر آس پاس سب انجان چہرے دیکھ کر اپنا سر دوبارہ جھکا لیا مگر ایک انجان سا خدشہ اس کے دل میں وسوسوں کا زرد رنگ پھیلا رہا تھا۔

☆☆☆

"پاشا!" حرا نے چائے کا کپ پاشا کے سامنے رکھتے ہوئے پکارا۔

پاشا جو بیڈ پر نیم دراز اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل میں مصروف تھا۔ اس کے پکارنے پر ایک نظر اس پر ڈالی اور "ہوں" کہہ کر دوبارہ موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ حرا نے چائے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور اپنا کپ تھام کر چھوٹے سے کمرے میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پاشا کو مصروف دیکھ کر وہ خاموشی سے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔

برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے فضا میں خاصا حبس تھا۔ ڈھائی مرلے کے اوپر والے پورشن میں صرف ایک چھوٹا سا کمرہ، جس کے ساتھ واش روم بھی منسلک تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر سامنے چھوٹا سا برآمدہ یا راہداری سی تھی اور ایک طرف بنا چھوٹا سا کچن۔ یہ اس کی کل کائنات تھا۔ حرا کی شادی کو ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ شادی کے شروع کے دن اتنی تیزی سے گزرے تھے کہ حرا سوچتی تو اکثر حیران رہ جاتی کہ وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ خوابوں کی مختصر سی چاندنی کے بعد، حقیقت کا سورج پوری آب وتاب سے چمکنے کے لیے تیار تھا۔ شادی سے پہلے پاشا نے جو نوکری شروع کی تھی، اتنے دن سے وہاں سے بھی ناغہ کر رہا تھا۔ حرا نے بہت بار دبے لفظوں میں کہا مگر پاشا بے فکری سے ٹال دیتا۔ حرا نے کچھ دن سے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ گھر بیٹھنے سے، خرچے پورے نہیں ہوں گے۔ آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تو وہ خود تھی اور یہ بات وہ پہلے سے جانتی تھی مگر جاننے اور بیتنے میں ایک واضح فرق تھا۔ جس کا احساس اسے اب قدم قدم پر ہوتا تھا۔

"پاشا! اس موبائل کی جان چھوڑ بھی دو۔ مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے!"

انتظار سے تنگ آ کر حرا جھنجلائی تو پاشا نے چونک کر اس کے طرف دیکھا اور پھر موبائل ایک طرف رکھ کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ چائے کے اوپر ملائی کی تہہ جم گئی تھی۔ پاشا نے منہ بنایا اور پھر سر اٹھا کر حرا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ حرا گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"پاشا! میں جانتی ہوں کہ شادی سے پہلے تم نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ تمہاری مالی حالت میرے سامنے ہے مگر پاشا! تم ایک بات بھول رہے ہو کہ تم نے مجھ سے محنت کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا؟"

حرا نے تمہید باندھی تھی۔ پاشا کی تیوری چڑھ گئی۔ اس نے تیکھی نظروں سے حرا کو گھورا تھا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو حرا!"

حرا کو اندازہ ہو گیا کہ پاشا کا موڈ آف ہو گیا ہے۔ اس لیے اس نے اپنا لہجہ مزید نرم بناتے ہوئے کہا۔

"دیکھو پاشا! میں نے ہر طرح کے حالات میں

تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے تمہاری محبت پر پورا یقین ہے۔ میں بس یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ تم کام پر تو جاؤ۔ تمہاری اتنی لمبی غیر حاضری پر، تمہیں نوکری سے فارغ کیا جا سکتا ہے۔''

پاشا نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اپنی جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے بولا۔

''مجھے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔ یہ بات میں نے تمہیں پہلے اس لیے نہیں بتائی کہ تم بلاوجہ پریشان ہوتیں اور مجھے بھی سکون سے بیٹھنے نہ دیتیں۔''

پاشا نے اتنے آرام سے کہا جیسے ابھی اسے دوسری نوکری مل گئی ہے۔ حرا اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہ گئی۔

''تمہارے نزدیک یہ چھوٹی سی بات ہے! اور تم اتنے اطمینان سے وقت گزار رہے ہو جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ پاشا! گھر کا کرایہ، بل، راشن، اور دوسرے خرچے سب میری تنخواہ سے پورے نہیں ہوں گے۔ میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں مگر تم بھی تو کچھ کرو۔۔۔''

''تم بھی عام عورتوں کی طرح شروع ہو گئی ہو! میرا دماغ خراب ہے جو گھر میں بیٹھا رہا۔ اس سے بہتر تھا کہ راکٹ [?] کے پاس چلا جاتا۔''

پاشا غصے سے بڑبڑاتا ہوا، اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ حرا بے بسی سے ہاتھ ملتی رہ گئی۔ پاشا کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ اس کی کسی بات کو سمجھنے کے بجائے بحث کرنے لگ جاتا تھا اور ہر بار اسی طرح اٹھ کر اپنے آوارہ دوستوں کے پاس چلا جاتا۔ حرا کو کبھی کبھی لگتا کہ زندگی بہت مشکل ہونے والی ہے مگر وہ کیا کرتی کہ یہ زندگی اس کا اپنا انتخاب تھی۔

☆☆☆

''ہاتھ دھو کے آجا! میں نے آج ساگ پکایا ہے۔ ساتھ مکئی کی روٹی۔''

باورچی خانے میں گرم توے کے آگے بیٹھی، ریحانہ نے تھکی ہاری حرا کو گھر کے کھلے دروازے سے اندر آتے دیکھا تو وہیں سے ہی پکار کر بولی۔ حرا کو بھی بہت بھوک لگی تھی۔ پھر ماں کے ہاتھ کا سادہ سا بھی کھانا، جس کے اعلا ذائقے کا احساس اسے اب ہر قدم پر ہوتا تھا کیونکہ ماں کے بنائے کھانے میں اس کی ماتا ہر نوالے میں اپنی اولاد کے لیے ہوتی تھی۔ حرا پیڑھی پر ماں کے سامنے بیٹھ گئی اور جلدی جلدی بڑے بڑے نوالے بنا کر کھانے لگی۔ جیسے کئی دنوں کی بھوکی ہو۔

''ارے آرام سے میری بچی!'' ریحانہ کا دل بیٹی کے حال پر تڑپ اٹھا تھا۔

شادی کو سال ہی ہوا تھا اور حرا کا رنگ روپ ماند پڑنے لگا تھا۔ ان دنوں تو وہ ویسے بھی امید سے تھی۔ مگر اچھی اور مناسب خوراک نہ ملنے اور اپنی ہمت سے زیادہ کام کرنے کی وجہ سے وہ بہت کمزور اور زرد لگ رہی تھی۔

''چائے پیو گی؟'' ریحانہ نے پوچھا تو حرا نے آخری نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

ریحانہ کے چائے بنانے تک وہ ہاتھ دھو چکی تھی۔ ریحانہ چائے کے کپ اٹھا کر صحن میں رکھی چارپائی پر آ بیٹھی۔ حرا نے بھی چارپائی پر بیٹھ کر پاؤں سیدھے کیے تو اس کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی تھی۔

''تھک گئی ہو نا! آخر کام بھی تو اتنا کرنے لگی ہو۔ حرا! تم کیوں اس نالائق اور آوارہ پر زور نہیں دیتی ہو کہ وہ بھی کہیں ٹک کر کام کرے۔ دو دن جاتا ہے اور پھر کسی نہ کسی بات کا بہانہ بنا کر کام چھوڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ نہ اسے کرائے کی فکر اور نہ کسی اور بات کی۔ پچھلے ایک سال میں تم لوگ کتنے ہی گھر وقت پر کرایہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے بدل چکے ہو مگر یہ مسئلے کا حل تو نہیں ہے! اب ایک اور جان دنیا میں آنے والی ہے۔ کچھ سوچا ہے کہ اسے کیسے پالو گی؟ اگر تم صبح اسکول اور شام میں ٹیوشن سینٹر چلی جاؤ گی تو اس ننھی سی جان کو کون سنبھالے گا؟''

ریحانہ نے آنے والے وقت کا بھیانک نقشہ کھینچا تھا۔ حرا پھیکی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر رہ گئی۔ وہ اپنی ماں کو کیا بتاتی کہ وہ بھی دن رات اسی سوچ میں گم رہتی ہے۔ پاشا کے پاس آمدنی کا کوئی بھی

مستقل ذریعہ نہیں تھا۔ وہ حرا اور گھر سے ایسے لاپرواہ تھا جیسے یہ اس کی ذمہ داری تھی ہی نہیں۔ حرا کچھ بھی کہتی یا شکوہ کرتی تو وہ حرا کو محبت کے طعنے مارنے لگتا۔ بار بار اسے جتاتا کہ ہر بات اس کے سامنے رکھ کر شادی کی ہے۔ اسے کوئی گھر سے بھگا کر نہیں لایا ہے۔

حرا کو بھی کبھی ایسے لگتا کہ یہ شادی کا پھندا اس نے خود اپنے گلے میں ڈالا تھا۔ اب وہ سولی پر لٹکی اپنی قسمت کے اندھیرے میں امید کے ستارے ڈھونڈتی رہتی تھی مگر اسے سوائے اندھیرے کے کچھ نہیں مل رہا تھا۔ روز بہ روز بڑھتی غربت اور تنگ دستی کی وجہ سے حرا نے شام کے وقت ٹیوشن سینٹر بھی جوائن کر لیا تھا۔ مگر خرچے تھے کہ بڑھتے ہی جارہے تھے۔ وہ اکیلی کتنا بوجھ اٹھا سکتی تھی اب اکثر اس کی پاشا سے لڑائی رہنے لگی تھی۔

حرا کو دکھ اس بات کا تھا کہ پاشا اور اس کے درمیان زبانی لڑائی جھگڑے سے بڑھ کر مار کٹائی تک بھی پہنچ گئے تھے۔ جب پہلی بار پاشا نے حرا پر ہاتھ اٹھایا تو وہ صدمے سے ساکت ہی رہ گئی تھی مگر پھر یہ روز کا معمول بن گیا تھا۔ پاشا جب نشے میں ہوتا یا گھر کے خرچے سے پریشان حرا کوئی سوال کرتی تو پاشا اسے مارنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ حرا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ محبت کے دعوے کرنے والا پاشا اتنی جلدی کیسے بدل گیا ہے۔ وہ اکثر حسرت سے سوچتی کہ کاش محبت کے خالی خولی دعووں سے ضروریات زندگی کا دوزخ بھی بھرا جا سکتا۔

''امی! میں کوشش تو کر رہی ہوں کہ پاشا کسی طرح کام پر لگ جائے۔ اگر پاشا کام پر جانے لگا تو میں ٹیوشن سینٹر چھوڑ دوں گی۔''

حرا نے کہا تو ریحانہ منہ بنا کر رہ گئی۔

''پاشا سے کسی کام کی امید رکھنا بے کار ہی ہے۔ میری بات سن۔۔ تو ایسا کر کہ رہنے کے لیے میری طرف آجا۔ تجھے وہاں کس نے سنبھالنا ہے۔ اچھا ہے تجھے بھی کچھ دن آرام کرنے کا موقع مل جائے گا۔''

ریحانہ کے کہنے پر حرا سوچ میں پڑ گئی۔

''ٹھیک ہے امی! میں کچھ سوچتی ہوں۔'' حرا نے نیم رضامندی سے کہا۔ اسے یقین تھا کہ پاشا یہ سنتے ہی صاف منع کر دے گا۔ اگر وہ گھر سے چلی گئی تو گھر کی ذمہ داری کون اٹھائے گا۔ مگر حرا کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب پاشا نے یہ سنتے ہی اسے ماں کے گھر رہنے کی اجازت دے دی اور کہا۔

''بہت اچھا فیصلہ کیا تم نے! ویسے بھی زمانے کا دستور ہے کہ پہلا بچہ میکے میں ہوتا ہے۔''

پاشا نے ایسے کہا جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اترا ہو۔ حرا کا دل چاہا کہ اس سے کہے کہ دنیا میں باپ بھی اپنی اولاد کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں مگر پھر چپ رہی کیونکہ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ پاشا کے بھاری ہاتھوں کی ضربیں برداشت کر سکتی۔

حرا نے اپنا مختصر سا سامان پیک کیا۔ ایک کمرے کے گھر میں تھا ہی کیا۔ پاشا اور اس کی ضرورت کی چند چیزیں۔ کباڑیے سے لی ہوئی ایک میز اور چند کرسیاں۔۔ ادھر باورچی خانے میں ایک چولہا اور استعمال کے چند برتن۔ حرا جسے بھی گھر سجانے، سنوارنے کا بہت شوق تھا، اب اس پرانے اور مختصر سے سامان کو بھی غنیمت سمجھتی تھی کیونکہ ہر دوسرے مہینے انہیں کرائے کا گھر چھوڑنا پڑتا تو مختصر سے سامان کی وجہ سے، کسی دوسری جگہ شفٹنگ میں بھی آسانی رہتی تھی مگر یہ حرا کا دل جانتا تھا کہ اس خانہ بدوش جیسی زندگی سے وہ کتنی اکتا چکی تھی مگر اپنے ہاتھوں پہنی گئی بیڑیوں کی وجہ سے لب سینے پر مجبور تھی۔

☆☆☆

بہار کی ایک خوشبو بھری دوپہر میں، ننھی سی پری نے اس کی ممتا بھری گود میں پہلی بار آنکھ کھول کر دنیا کو دیکھا تھا۔ حرا گلابی کمبل میں لپٹی سرخ و سفید سی بچی کو دیکھ کر بے ساختہ رو پڑی۔ بچی خوبصورتی میں ماں باپ دونوں پر گئی تھی۔ ریحانہ کے ساتھ ساتھ حرا کی دونوں بہنیں بھی ہسپتال میں موجود تھیں۔ بچی کی پیدائش کی خبر سن کر اس کے سسرال سے بھی سب آ گئے تھے۔ سب ہی خوش تھے ننھی پری کو دیکھ کر۔ بس

ایک بچی کا باپ ہی موقع پر موجود نہیں تھا۔ فون کرنے پر پتا چلا کہ وہ تو پچھلے ایک ہفتے سے اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ مری گیا ہوا ہے۔ حرا یہ سن کر بہت افسردہ ہوئی مگر اپنی بچی کی خاطر اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالی۔

اگلے دن اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔ وہ اپنی ماں کے گھر آ گئی۔ بچی کا نام اس نے حیا رکھا، جو سب کو بہت پسند آیا تھا۔ بچی دس دن کی تھی، جب پاشا نے اسے پہلی بار دیکھا۔ وہ جو بچی کی پیدائش کا سن کر دل ہی دل میں بہت ناراض ہوا تھا۔ بچی پر نظر پڑتے ہی اس کا پتھر دل ایک دم ہی موم ہو گیا۔ اس دن اسے پہلی بار احساس ہوا کہ بیٹی کیوں باپ کے دل کے اتنے قریب ہوتی ہے۔

حرا نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ وہ پاشا کے رویے سے بہت دل برداشتہ ہوئی تھی مگر پاشا کو اس کی رتی برابر بھی پرواہ نہیں تھی۔ وہ بہت آرام سے پلنگ پر لیٹا بچی سے کھیلتا رہا۔ ریحانہ نے داماد کو دیکھ کر رات کے کھانے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ بھلے پاشا کو دل سے پسند نہیں کرتی تھی مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ اس کی بیٹی کے سر کا تاج تھا۔ جسے سر پر بٹھا کر رکھنا اس کی مجبوری تھی۔ رات کو پرتکلف کھانا پاشا نے بہت مزے لے کر کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سگریٹ سلگا کر گلی میں نکل گیا۔ کچھ دیر کی چہل قدمی کے بعد واپس آیا تو حرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم گھر نہیں گئے؟'' پاشا نے پاس ہی جھولے میں سوئی ہوئی حیا کو دیکھا اور جھک کر نرمی سے اس کا گال چھویا تو وہ نیند میں کسمسا کر رہ گئی۔

''مالک مکان نے کرایہ وقت پر نہ دینے کی وجہ سے ہمیں نکال دیا ہے اور ہمارا سارا سامان کباڑیے کو بیچ دیا ہے۔''

پاشا کے کہنے پر حرا اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

''تمہارے لیے یہ معمولی بات ہے پاشا!'' حرا تڑخ کر بولی تھی۔ پاشا نے سرد نگاہ اس پر ڈالی۔

''تو اور کیا کروں، بہت کوشش کی تھی مگر کسی نے پیسے ادھار نہیں دیے۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ وہ سامان کون سا بہت قیمتی تھا۔ ہم تمہاری ماں کے ساتھ بھی تو رہ سکتے ہیں نا۔ آخر وہ بھی تو اس گھر میں اکیلی رہ رہی ہیں۔ تین کمروں میں سے ایک کمرہ اگر ہمیں دے دیں گی تو کیا قیامت آ جائے گی۔ آخر بیٹی ہو تم ان کی۔''

پاشا کے کہنے پر حرا تیر کی طرح اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے پاس آ کر اس کا کالر پکڑ کر چیخنے لگی۔

''تو یہ سارا کھیل تم نے جان بوجھ کر کھیلا ہے تاکہ بہت آرام سے میری ماں کے گھر پر قبضہ کر سکو، مگر ایک بات یاد رکھو پاشا! میں تمہاری کوئی بھی سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔''

پاشا کا ہاتھ اٹھا اور اس کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔ حرا لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گری تھی۔ ریحانہ بھی شور سن کر وہاں بھاگی چلی آئی۔ بیٹی کو فوراً آگے بڑھ کر سہارا دیا۔

''کچھ عقل کرو پاشا! تمہاری بیوی کی حالت ایسی ہے کہ تم اس پر ہاتھ اٹھاؤ، کچھ اور نہیں تو اپنی معصوم بیٹی کے بارے میں ہی سوچ لو اب۔''

شور کی آواز سے ڈر کر ننھی حیا بھی رونے لگی تھی۔ پاشا غصے میں کچھ کہتا رک گیا اور غصے سے پاؤں پٹختا گھر سے باہر نکل گیا۔ ریحانہ نے سسکتی ہوئی حرا کو سہارا دے کر اٹھایا اور بیڈ پر بٹھا کر چپ کرانے لگی۔

''امی! مجھے معاف کر دیں۔ آپ نے مجھے کتنا سمجھایا تھا مگر میں نہیں مانی اور آج اپنی من مانی کرنے کا نتیجہ دیکھ رہی ہوں۔ پاشا نے مجھے دھوکا دیا ہے اور میں بے وقوف اس کے دھوکے کو محبت سمجھ بیٹھی۔ کون سی برائی ایسی ہے جو اس میں نہیں ہے! شراب، نشہ، غیر عورتوں سے تعلقات، جوا، اب میں آپ کو کیا کیا بتاؤں امی! میں نے بہت کوشش کی مگر میں ہار گئی۔''

حرا نے دو سالوں کا غبار آج آنسوؤں کے ساتھ نکال دیا تھا۔ ریحانہ اسے سینے سے لگائے تسلی

دیتے ہوئے خود بھی رو پڑی۔ اولاد کا دکھ دیکھنا آسان نہیں ہوتا۔

☆☆☆

پاشا کے سلوک نے حرا کو باغی بنا دیا۔ اس نے سوچ لیا کہ اگر پاشا کو اس کا احساس نہیں ہے تو وہ بھی مزید پاشا کے ساتھ نہیں رہے گی۔ پاشا کچھ دن کے بعد حیا سے ملنے آیا تو حرا نے صاف منع کر دیا۔ جس پر پاشا بہت چراغ پا ہوا مگر اب کی بار اس نے حرا پر ہاتھ اٹھانے سے گریز کیا تھا۔ حرا نے اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا جسے سن کر پاشا حیران رہ گیا مگر پھر اس نے بھی ایسی شرط رکھی کہ حرا بھی دل تھام کر رہ گئی۔

"طلاق لینے سے پہلے ایک بات اچھی طرح ذہن میں بٹھا لینا۔ میں اپنی بیٹی تم سے چھین کر لے جاؤں گا" پھر بھلے تم کسی بھی کوٹ کچہری میں اپنی بچی کی کسٹڈی کے لیے دعوے کرتی رہنا اور ایک بات۔۔ میں ایک بار حیا کو لے گیا تو تم ساری عمر اس کی شکل دیکھنے کو ترس جاؤ گی۔"

پاشا دھمکی دے کر چلا گیا مگر حرا کی جان نکال کر لے گیا تھا۔ حرا جانتی تھی کہ پاشا کسی حد تک بھی جا سکتا تھا۔ وہ کمزور عورت ہو کر پاشا کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

ریحانہ نے ساری صورت حال جان کر کچھ سوچا اور پھر حرا کو لے کر پاشا کے گھر چلی گئی۔ پاشا کے والدین نے تحمل سے ساری بات سنی اور بہت افسوس کا اظہار کیا۔

"وہ شروع سے ایسا ہی ہے خود غرض اور بے حس۔"

اس کی بڑی بھابھی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"خیر، تم فکر مت کرو حرا! میں اسے سمجھاؤں گا۔ اگر اس نے مجھ بوڑھے کی بات سنی تو۔" پاشا کے باپ نے حرا کے سر پر ہاتھ رکھ کر کھوکھلی تسلی دی تھی۔

حرا وہاں سے واپس آ کر بھی بہت بے چین تھی۔ اسے ہر لمحے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ابھی پاشا آئے گا اور ننھی حیا کو چھین کر لے جائے گا۔

ایک دن پاشا آیا ضرور مگر اپنے والدین کے ساتھ۔ اس بار بہت شرمندہ اور سر جھکا کر۔ اس کے والدین نے پاشا کے رویّے کی معافی مانگی اور اسے ایک موقع مزید دینے کا کہا۔ پاشا نے کرائے پر ایک گھر لیا تھا۔ اس کے بھائیوں نے سستا سا سامان بھی ڈال دیا اور چھ مہینے کا ایڈوانس کرایہ بھی دے دیا تھا۔ ساتھ ہی آخری وارننگ بھی کہ اگر آئندہ بھی اس نے ایسا کیا تو وہ لوگ خود حرا کا ساتھ دیں گے۔

پاشا نے اس بات کو غنیمت جانا تھا اور حرا کو منا کر گھر لے آیا۔ جہاں ان دونوں نے ننھی حیا کی مسکراہٹوں اور آہٹوں کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کیا۔

حرا نے شام کی ٹیوشن چھوڑ دی تھی۔ وہ صبح کے وقت ننھی حیا کو ریحانہ کے پاس چھوڑ دیتی اور واپسی پر لے کر گھر چلی جاتی۔ ان دنوں پاشا کو بھی ایک فیکٹری میں کلرک کی نوکری مل گئی تھی اور پہلی بار تھا کہ پاشا دل لگا کر کام کر رہا تھا۔ وہ اکثر حیا کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں لے آتا تھا۔ حرا خوش نہیں تو مطمئن ضرور تھی کہ اس کی زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چل پڑی تھی۔

☆☆☆

سات سال گزر گئے تھے۔ حیا کے بعد دو اور ننھی پریاں ان کے آنگن میں آ چکی تھیں۔ پاشا کے مزاج میں بہت سنجیدگی آ گئی تھی یا پھر وہ حرا کے سامنے ایسا بننے کی کوشش کرتا تھا۔ حرا نے اس پر توجہ دینا چھوڑ دی تھی۔ اسے اب صرف اپنی بچیوں کے اچھے مستقبل کی فکر رہتی۔ وہ انھیں زندگی کی سب خوشیاں دینا چاہتی تھی اس لیے اس نے شام کے وقت بچوں کو گھر پر پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

پچھلے کچھ دنوں سے حرا کو پاشا بہت پریشان اور الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔ وہ زیادہ تر وقت گھر پر گزارتا اور اکثر سگریٹ سلگاتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم رہتا۔ ایک دن پاشا بیٹھک میں اپنے پرانے دوست ثاقب عرف راکٹ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ حرا نے پاشا کے حکم کے مطابق چائے بنائی اور سر پر دوپٹہ اچھی طرح لپیٹ کر بیٹھک کے دروازے کے پاس پہنچی۔ دستک دی تو پاشا نے ٹرے اندر لانے کو کہا۔ حرا ٹرے اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ ثاقب نے اسے

دیکھ کر فوراً سلام کیا۔ حرا نے آہستگی سے جواب دیا اور ٹرے میز پر رکھ کر خاموشی سے واپس مڑ گئی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے ثاقب کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"حیرت ہے پاشا۔۔! گھر میں اتنی نایاب چیز کے ہوتے ہوئے بھی تُو پریشان ہے! اب تیرا مسئلہ حل ہو جائے گا!"

حرا کا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ گھر میں ایسی کون سی نایاب چیز ہے جس کا وہ ذکر کر رہا تھا۔ کچھ دیر میں گھر کے کاموں میں مصروف ہو کر، حرا یہ بات بھول گئی مگر چند دن بعد ایک قیامت کی گھڑی نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔

☆☆☆

حرا نے پاشا کے ساتھ بہت مشکل اور تنگ وقت دیکھا تھا۔ سب سے بڑی بات اس نے محبت کے نام پر بہت بری طرح دھوکا کھایا تھا۔ پاشا اسے دکھائے سب خواب اور وعدے ایسے بھول گیا تھا جیسے کبھی ان کا وجود تھا ہی نہیں۔ حرا شاید اس سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیتی مگر حیا نے آ کر اس کی رہائی کے سب راستے بند کر دیے تھے۔ پھر حیا کے بعد پاشا میں بہت تبدیلی آئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح بے حس اور خود غرض نہیں رہا تھا۔ وہ بھلے آج بھی حرا کی پرواہ نہیں کرتا مگر حیا کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ حیا میں اس کی جان تھی۔ وہ حیا کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ حرا یہ تو جانتی تھی کہ وہ اپنی بری فطرت سے باز نہیں آیا۔ اس لیے آج بھی اس کی عاشقی کے قصے سننے کو ملتے رہتے تھے۔ اکثر کوئی نہ کوئی کام میں اس کی بے ایمانی اور دھوکا دہی کا ذکر ضرور کرتا تھا۔ کئی بار پاشا کو پولیس بھی پکڑ کر لے گئی تھی مگر کوئی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے وہ چھوٹ جاتا تھا۔ حرا یہ سب خاموشی سے دیکھتی رہتی مگر وہ اب پاشا کے معاملات میں نہیں بولتی تھی۔ مزید دو بیٹیوں کے ہونے سے یہ فرق پڑا تھا کہ اب پاشا پولیس کے چکروں میں نہیں پڑتا تھا۔ شاید اسے بھی یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ تین تین بیٹیوں کا باپ ہے۔ جن کی کل کو شادی بھی کرنی ہے۔ اگر باپ کی ایسی ریپوٹیشن ہو گی تو کون ان کے گھر رشتہ لے کر آئے گا۔

وقت کے ساتھ ساتھ پاشا میں یہ سمجھداری آ گئی تھی کہ بظاہر سب کے سامنے اچھا بن کر رہنا ہے مگر درپردہ اپنے سب کام کرتے رہنا۔

مگر اس سب کے باوجود، وہ بہت بری طرح ایک مسئلے میں پھنس گیا اور اس بار اسے بچاؤ کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے تو اس کے دن کا چین اور رات کا سکون ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ پاشا جس فیکٹری میں کام کر رہا تھا۔ وہاں اس نے ثاقب کی مدد سے بہت بڑا ہاتھ مارا اور مال کا ایک بڑا حصہ غائب کر دیا۔ جسے بیچ کر انہیں کافی منافع ملا مگر بہت جلد اس بات کی خبر فیکٹری کے سپروائزر کو ہو گئی۔ فیکٹری کے مالک نے پہلے ہی تحقیقاتی کمیٹی بنا دی تھی۔ اصل رپورٹ سپروائزر نے دینی تھی۔ جو خود بھی بہت بے ایمان اور دو نمبر آدمی تھا۔ وہ پاشا کے بارے میں اور پاشا اس کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ سپروائزر نے پاشا کو دھمکی دی کہ اگر اسے بیچے گئے مال میں سے بڑا حصہ نہ دیا گیا تو وہ اسے جیل بھجوا دے گا۔ پاشا نے اسے بہت یقین دہانی کروائی کہ وہ سب پیسے جوئے میں ہار چکا ہے۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے مگر وہ شخص کسی طرح بھی نہیں مان رہا تھا۔ اس دن وہ ثاقب عرف راکٹ سے اسی موضوع پر بات کر رہا تھا، جب حرا کو دیکھ کر ثاقب کے شیطانی ذہن میں ایک سوچ ابھری اور اس نے پاشا کے سامنے فوراً اظہار بھی کر دیا۔ پہلے تو پاشا یہ بات سن کر غصے میں آ گیا مگر ثاقب نے بہت چالاکی سے اسے شیشے میں اتار لیا تھا۔

"ارے پاگل! اس وقت تیرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے! تُو بڑا غیرت والا بن رہا ہے۔ مگر یہ تو سوچ کہ وہ خود کسی کے پاس تو نہیں جا رہی نا! تیری

مرضی اور خواہش پر جائے گی۔ اس میں غیرت والی کیا بات ہے اور ویسے بھی بیویاں ہر دکھ سکھ میں شوہر کا ساتھ دیتی ہیں اور پھر بھی اگر تجھے یہ بات منظور نہیں تو عمر قید کے لیے تیار ہو جا۔ فیکٹری کا مالک تو تجھے جیل سے باہر نہیں آنے دے گا۔''

ثاقب نے آنے والے وقت کا خوفناک نقشہ کھینچا تو پاشا سوچ میں پڑ گیا۔

''آخر میں نے خوبصورت لڑکی سے شادی کیوں کی تھی؟ اسی لیے نا کہ کل کو وہ میرے کام آسکے۔''

پاشا کو کئی سال پہلے کی اپنی منصوبہ بندی یاد آئی تو وہ خباثت سے مسکرا اٹھا اور پھر ثاقب نے آگے کے سب معاملات سنبھال لیے۔ دراصل سپروائزر کی نظر پاشا کی بیوی پر پہلے سے تھی۔ وہ حرا کو اسکول آتے اور جاتے ہوئے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ ثاقب عرف راکٹ اس بات سے واقف تھا۔ اس لیے ان دونوں نے مل کر منصوبہ بنایا، جس میں پاشا بہت آرام سے پھنس گیا تھا۔

ایک رات بچیوں کے سونے کے بعد جب پاشا نے حرا سے یہ بات کی، تو حرا غم اور غصے سے پاگل ہو گئی۔ اس نے پاشا کا گریبان پکڑ لیا اور چیخ چیخ کر بولنے لگی مگر پاشا کے اٹھے ہاتھ نے اسے خاموش کروا دیا تھا۔

''تم ایک بے غیرت اور گھٹیا انسان ہو۔ میں مر جاؤں گی مگر کبھی تمہارے گندے ارادے کو کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔''

حرا نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ پاشا نے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کا بازو زور سے پکڑا کہ حرا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پھر پاشا نے اپنے ہاتھ میں پکڑا سلگتا ہوا سگریٹ، حرا کے بازو میں لگا دیا۔ حرا درد سے تڑپ اٹھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ساتھ والے کمرے میں بچیاں سو رہی تھیں اگر وہ شور کرتی تو وہ ڈر کر اٹھ جاتیں۔ اس لیے وہ تکلیف برداشت کرتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں رونے لگی۔ پاشا نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ پیچھے کی طرف گر گئی۔ پاشا نے پاس پڑی کرسی کو زور سے ٹھوکر ماری اور نیچے گری حرا کے پاس پہنچ کر بولا۔

''ایک بات یاد رکھنا کہ میں اب کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں! اگر تم اپنی مرضی اور خوشی سے نہیں مانو گی تو میں تمہیں زبردستی اٹھا کر وہاں چھوڑ آؤں گا اور سارے دنیا میں مشہور کر دوں گا کہ تم اس کے ساتھ چکر چلا رہی تھیں۔ پھر جو لوگ تمہاری تعریف کرتے ہیں وہ سب تم پر تھوکیں گے۔ میں تمہیں طلاق دے کر، بچیاں اپنے پاس رکھ لوں گا۔ پھر دیکھوں گا کہ کون تمہاری مدد کرنے آئے گا۔''

پاشا آج مروت اور لحاظ کے سب لبادے اتار چکا تھا۔ وہ حرا کو ٹھوکر مار کر چلا گیا۔ حرا درد سے تڑپتی رہی مگر اس کی فریاد سننے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

پاشا تین دن سے گھر نہیں آیا تھا۔ حرا پچھلے تین دن سے گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ وہ گم صم سی بیٹھی رہتی یا گھر کے کام کرنے لگ جاتی۔ وہ بار بار اپنی معصوم بچیوں کی طرف دیکھتی۔ وہ ایک ایسی بند گلی میں آکر کھڑی ہو گئی تھی کہ جس کی دوسری طرف کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ کس کو مدد کے لیے پکارتی؛ کون اس کی سنتا۔۔ اور اگر کوئی اس بار مدد کر بھی دیتا تو کل کو پھر پاشا کسی ایسے ہی مطالبے کے ساتھ اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ وہ بدآدمی تھا۔ جس کی بدی کی کوئی حد نہیں تھی۔ سوال یہ تھا کہ وہ اپنی عزت کو کیسے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ اس کے ساتھ تین بچیاں بھی تھیں، جنہیں وہ کبھی بھی پاشا کے بھروسے پر چھوڑ کر یہاں سے نہیں جا سکتی تھی۔ وہ دن رات سوچتی رہتی۔ اس نے ایک برے مرد کا انتخاب کیا تھا مگر یہ بھی طے تھا کہ وہ اس برے مرد کے ساتھ مزید پستی میں نہیں گر سکتی تھی۔ صبح سے ہونے والی بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ حرا کے پاس صرف آج کی رات بچی تھی۔ اسے فیصلہ کرنا تھا۔ آر یا پار کا۔

وہ اتنی بہادر تو ضرور تھی کہ اپنی عزت بچانے کے لیے موت کو گلے لگا لیتی مگر تب اگر وہ اکیلی ہوتی ۔۔۔! اس کی معصوم بچیاں، اس کے زندہ رہنے کی سب سے بڑی وجہ تھیں۔ وہ اپنی بچیوں کو کسی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

یعنی اسے مرنا بھی تھا مگر زندگی کی خواہش کے ساتھ۔!

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ زندگی میں کوئی راستہ ایسا بھی ہے جو موت سے ہو کر گزرتا ہو۔۔۔!!

وہ ساری رات دریچے سے لگ کر برستی بارش کو دیکھتی رہی۔ گزرتے وقت کے ساتھ اس کی ہر امید ختم ہو رہی تھی مگر اس کے اندر جینے کی خواہش اتنی ہی شدت سے زور پکڑ رہی تھی۔

"میں جینا چاہتی ہوں اپنی بیٹیوں کے ساتھ، ان کا سایہ بن کر۔۔۔!!"

حرا خالی ذہن کے ساتھ رات کے آخری پہر، پچھلے صحن کی طرف چلی آئی۔ سیڑھیوں پر بیٹھی وہ بے دھیانی میں دیکھتی اچانک چونکی تھی۔ ہلکی روشنی میں چمکتی چیز، اسے اپنے جینے کا واحد سہارا لگی تھی۔

"ہاں جینے کے لیے، اس راستے کو بھی چنا جا سکتا ہے۔"

حرا نے اپنی سوچ کے تحت قدم اٹھایا اور دھیرے دھیرے چلتی، اسٹور تک پہنچی۔ جس کی کھڑکی کا شیشہ پچھلے کئی مہینوں سے ٹوٹ کر لٹکا ہوا تھا مگر اسے ٹھیک کروانے کی ضرورت کسی نے محسوس نہیں کی تھی۔ حالانکہ ریحانہ نے کئی بار حرا سے کہا تھا کہ لٹکے ہوئے ٹوٹے شیشے کو پھینک دے۔ کہیں بچیاں کھیلتے ہوئے بے دھیانی میں اس سے زخمی نہ ہو جائیں۔ حرا ہر بار "اچھا امی" کہہ کر پھر بھول جاتی مگر آج شیشے کے یہ ٹوٹے ہوئے بڑے بڑے ٹکڑے ہی اسے اپنی نجات کا ذریعہ لگ رہے تھے۔ بس تھوڑا سا انتظار اور کرنا تھا۔!!

☆☆☆

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ جب حرا نے بیرونی گیٹ کھلنے اور بائیک اندر آنے کی آواز سنی۔ پاشا واپس آ گیا تھا۔ حرا جو فجر کی نماز پڑھ کر تسبیح پڑھ رہی تھی۔ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی اور اس پر قائم رہنے کے لیے اسے ہمت چاہیے تھی۔ پاشا فخریہ انداز میں چلتا ہوا صحن میں داخل ہوا۔ اس نے کالے دوپٹے میں لپٹی حرا کو دیکھا۔ جو ہاتھ میں کپڑوں کی گٹھڑی تھامے ہوئے پچھلے صحن کی طرف جا رہی تھی۔ جہاں گندے کپڑوں کی ٹوکری اور واشنگ مشین رکھی ہوئی تھی۔ پاشا یہی سمجھا کہ وہ گندے کپڑے ٹوکری میں رکھنے گئی ہے۔ حرا نے جس طرح اسے دیکھ کر خاموشی اختیار کی تھی، پاشا دل میں بہت خوش ہوا کہ حرا اس کی بات مان گئی ہے۔

"بس ایک بار کی بات ہے پھر میں حرا کو محبت سے منا لوں گا! جیسے ہمیشہ وہ محبت کے نام پر بے وقوف بن جاتی ہے۔"

پاشا نے خود کلامی کی اور بے ساختہ ہنس پڑا۔ مگر کچھ لمحوں کی بات تھی۔ پھر سارا گھر چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔ شور سن کر پڑوسی بھی بھاگے آئے اور جو منظر دیکھا، اسے دیکھ کر سب دل تھام کر رہ گئے تھے۔ پولیس اور ایمبولینس کو کال کی گئی۔ سرخ خون تیزی سے پچھلے صحن میں پھیل رہا تھا۔

☆☆☆

ریحانہ کو جیسے ہی اطلاع ملی وہ جلدی میں چادر سر پر ڈالے گھر سے نکل پڑی اور جب وہ ہانپتی، کانپتی، لوگوں سے پوچھتی ہوئی ہسپتال پہنچی تو وہاں پہلے سے پولیس موجود تھی۔ ریحانہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ محلے کی ایک عورت کے ساتھ ڈری سہمی تینوں بچیاں بھی کھڑی ہوئی تھیں۔ نانی کو دیکھتے ہی وہ تینوں اس سے لپٹ گئیں۔ ریحانہ نے انھیں گلے لگا کر تسلی دی اور چپ کروا کر قریبی بینچ پر بٹھا دیا۔ پھر وہ آگے بڑھ کر صورتحال کا جائزہ لینے لگی۔ وہاں موجود لوگوں کے پاس ادھوری معلومات تھیں۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا اور کوئی کچھ۔۔۔

"میری بیٹی کہاں ہے؟" ریحانہ نے ایک پولیس والے سے پوچھا تو اس نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی اور بولا۔

"اماں جی! صبر کرو اور ذرا ہماری بات سنو!"

پولیس والا ریحانہ کو ایک کونے میں لے جا کر مختلف سوال کرنے لگا۔ زیادہ تر سوال پاشا کے بارے میں تھے۔ ریحانہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنے سوال کیوں کر رہے ہیں!

"بھائی! آپ کو اپنے سوالوں کی پڑی ہوئی ہے۔ مجھے کم از کم اپنی بیٹی کی خیریت تو پتا کرنے دو!"

ریحانہ نے چڑ کر کہا تو پولیس والا منہ بنا کر ایک طرف ہو گیا۔ اسی وقت ریحانہ کی نظر سامنے سے آتے شخص پر پڑی تو وہ چونک گئی۔

وہ شخص بھی اسے دیکھ کر جھجکتے ہوئے آگے بڑھا۔

ریحانہ تیزی سے آگے بڑھی۔

"پاشا! کیا ہوا میری حرا کو؟ وہ تین دن سے اسکول بھی نہیں گئی اور نہ ہی بچیاں میرے پاس چھوڑیں پھر اچانک خبر آئی کہ وہ زخمی ہے۔"

ریحانہ کے ساتھ ساتھ وہ پولیس والا بھی فوراً پاشا کی طرف متوجہ ہوا۔ جو خود بھی حیران پریشان تھا۔

"مجھے کچھ نہیں پتا۔ میں تو خود تین دن کے بعد گھر آیا تھا۔ حرا کپڑے رکھنے پچھلے صحن کی طرف گئی تھی،، جب اچانک اس کی چیخوں کی آواز آنے لگی۔ بس میں بھاگا بھاگا گیا تو حرا..."

پاشا کہنے لگا۔ ریحانہ نے دل تھام لیا۔

"ہائے میری معصوم بچی!" ریحانہ ساری تفصیل جان کر دل تھام کر رہ گئی۔ حرا کے بہن بھائی بھی خبر سن کر پہنچ گئے اور اس کی سسرال سے بھی سب لوگ آ گئے تھے۔ ہسپتال میں ایک رش لگ گیا تھا۔ حرا کا آپریشن ہو رہا تھا۔ ڈاکٹرز ابھی کچھ بھی کہنے سے گریز کر رہے تھے۔ آخر یہ طویل انتظار ختم ہوا اور ڈاکٹر نے انھیں حرا کی جان بچ جانے کی خوش خبری سنائی۔

"کچھ دیر کے بعد آپ حرا سے مل سکتے ہیں مگر برائے مہربانی......!" ڈاکٹر نے سخت لفظوں میں انھیں سمجھایا۔ ریحانہ دل تھام کر رہ گئی۔

صبح کے وقت حرا کو آئی سی یو سے وارڈ میں شفٹ کیا گیا۔ تب سب کو ملنے کی اجازت ملی۔ جو بھی حرا سے مل کر آتا، کتنی ہی دیر افسوس کرتا رہتا۔

ریحانہ نے سفید پٹیوں میں جکڑی حرا کو دیکھا تو بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر اس نے فوراً ہی اپنے آنسوؤں کو چھپا لیا۔

حرا کی حالت بہت بہتر تھی۔ وہ تھوڑا بہت بول بھی لیتی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد حرا کی پٹیاں کھلیں تو ریحانہ دوپٹے میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

"ہائے میری اتنی حسین بیٹی۔۔۔!!" ریحانہ کو لگا کہ جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ حرا ماں کی حالت سے بے خبر نہیں تھی۔ اس لیے بمشکل مسکرا کر بولی۔

"امی! مجھے آئینہ دیکھنا ہے!"

"ارے پگلی ہوئی ہے تو!" ریحانہ گھبرا گئی تھی۔

"امی! فکر مت کریں! مجھے ڈاکٹر نے سب بتا دیا ہے!" حرا کے مضبوط لہجے پر ریحانہ نے اپنے بیگ سے چھوٹا سا آئینہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ حرا نے کانپتے ہاتھوں سے آئینہ پکڑ کر دیکھا۔

اس کے چہرے پر ٹوٹے شیشے کے کٹ دونوں رخساروں پر بہت واضح تھے۔ جس سے اس کی شکل بہت بدنما لگ رہی تھی۔ حرا نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔

"تجھے میں کئی دنوں سے سمجھا رہی تھی کہ اس ٹوٹے شیشے کو نکال کر پھینک دے مگر تُو نے نہیں سنا......! اور اب دیکھ۔ کیسے بارش کے پانی سے تیرا پاؤں پھسلا اور تُو اوندھے منہ شیشے پر جا گری اس حادثے کی وجہ سے تیرا سارا چہرہ ہی۔۔۔"

ریحانہ کہتے ہوئے رونے لگی۔

"ڈاکٹر کہتے ہیں کہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے بہت مشکل سے تیری جان بچائی ہے۔ شکر ہے میرے مولا" ریحانہ نے کہا۔

''جی امی! ایک حادثہ تو تھا یہ!''
حرا نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ انھیں دیکھ کر خود کلامی کی تھی۔

☆☆☆

شام کو پاشا بھی تینوں بچیوں کو اس سے ملوانے لایا۔ بچیاں ماں کو دیکھ کر پہلے تو ڈر گئیں مگر کچھ دیر کے بعد وہ تینوں ماں کے آس پاس بیٹھ کر نرمی سے اس کے زخموں پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ جیسے اس کی تیمارداری کر رہی ہوں۔ پاشا نے اس کے بگڑے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بہت برا منہ بنایا۔
''اب اس بدصورت عورت کے ساتھ ساری زندگی کون گزارے گا۔ میرے کس کام کی؟ کچھ سوچتا ہوں اس کا بھی۔۔۔! تین بول، بول کر فارغ کرتا ہوں۔ اس منحوس عورت کو۔'' پاشا نے نفرت سے سوچا۔
ریحانہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھی۔ پاشا نے کچھ دیر کے بعد اکتا کر بچیوں کو چلنے کے لیے کہا جو ماں کو چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔
''آپ کل پھر آجانا۔۔!'' حرا نے نرمی سے سمجھایا۔
''میں روز روز نہیں لاسکتا انھیں یہاں!'' پاشا نے ناگواری سے کہا تو حرا نے زخمی چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ پاشا اس کی نظروں سے خائف ہونے لگا۔ اس لیے رخ پھیر کر جانے لگا۔ تو حرا کی سرد آواز نے اس کے قدم روکے تھے۔
''اب کی بار تمہارا وہ خبیث دوست گھر آئے تو حیا سے کہنا کہ چائے بنا دے۔ میں نے اپنی بچی کو چائے بنانا سکھا دیا ہے۔''
پاشا کو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے جلتے توے پر بٹھا دیا ہے۔ وہ حرا کا طنز سمجھ گیا، وہ غصے سے پلٹا اور انگلی اٹھا کر حرا سے کہا۔
''میری معصوم بیٹی کسی کے سامنے نہیں آئے گی۔ خبردار! جو تم نے دوبارہ اس کا نام لیا۔''
حرا طنزیہ مسکرائی۔
''اچھا میں بھی کہ بیوی نہیں تو۔۔۔!!''
''بکواس بند کر گھٹیا عورت۔!!'' پاشا نے بہت مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا۔ اگر یہ ہسپتال نہ ہوتا تو وہ حرا کو اس بات پر مار مار کر لہولہان کر دیتا مگر اس وقت وہ مجبور تھا۔
''میں ہر وہ آنکھ نوچ لوں گا، جو میری بچیوں کی طرف بری نیت سے اٹھے گی۔ پاشا نام ہے میرا......!''
اسی وقت ریحانہ اندر داخل ہوئی تو پاشا بچیوں کو وہاں چھوڑ کر کف اڑاتا چلا گیا۔
''اسے کیا ہوا ہے؟'' ریحانہ نے حیرت سے سوال کیا تھا۔
''کچھ نہیں امی! اکثر بے غیرت لوگوں کو بھی غیرت آ ہی جاتی ہے!''
حرا نے آخری جملہ منہ میں بڑبڑا کر کہا۔ اس لیے ریحانہ نہیں سن سکی تھی۔

☆☆☆

حرا تھکے ہوئے قدموں سے گھر میں داخل ہوئی تو شام ڈھل رہی تھی۔ حیا نے ماں کو دیکھتے ہی اپنے ہوم ورک کی کاپی ایک طرف رکھی اور جلدی سے پانی کا گلاس لے کر آگئی۔
''بہت شکریہ میری بچی!'' حرا نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ باقی دونوں بھی ماں کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ پھر وہ سارے دن کی روداد ایک دوسرے کو سنانے لگیں۔ ریحانہ نے باورچی خانے سے نکلتے ہوئے مسکرا کر انھیں دیکھا۔
''ارے ماں ابھی آئی ہے۔ پہلے سکون سے روٹی تو کھانے دو۔ پھر باتیں کر لینا۔''
''کوئی بات نہیں امی! ان سے باتیں کر کے میرے سارے دن کی تھکن اتر جاتی ہے۔''
حرا نے نرمی سے کہا۔ پھر ان سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد بچیاں اپنا اسکول کا ادھورا کام لے کر بیٹھ گئیں۔ تو حرا چائے بنا کر ریحانہ کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ دونوں ماں بیٹی دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگیں۔ ساتھ ساتھ ایک نظر ان تینوں

پر بھی ڈال رہی تھیں۔

"سنا ہے کہ پاشا کو عمر قید ہو گئی ہے!" ریحانہ کے کہنے پر حرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"برے کام کا برا نتیجہ!" ریحانہ نے کہا تو حرا سر ہلا کر رہ گئی۔

اس دن پاشا غصے سے ہسپتال سے نکلا تو سیدھا ثاقب کے پاس گیا۔ بدقسمتی سے ثاقب فون پر اسی سپروائزر سے پاشا کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ ثاقب کی ساری گفتگو سننے کے بعد پاشا کو پتا چلا کہ اسے ٹریپ کیا گیا ہے۔ اتنے سالوں کی پرانی دوستی کا یہ صلہ دیا تھا ثاقب نے!

پاشا غم اور غصے سے پاگل ہو گیا۔ ثاقب اور اس کے درمیان ہونے والی ہاتھا پائی نے خونی واردات کا روپ دھار لیا۔ پاشا نے ثاقب کے پستول سے ہی اسے قتل کر دیا۔ پاشا کو پولیس نے پکڑ لیا۔

☆☆☆

آج تین سال بعد اس کے کیس کا فیصلہ سنایا گیا تھا۔ پاشا نے حرا کو بہت سے پیغام بھیجے مگر حرا اس سے ملنے کبھی بھی جیل نہیں گئی۔ آخری پیغام میں پاشا نے اس دن ہوئے حادثے کی معافی مانگی اور بچیوں کا خیال رکھنے کی درخواست کی۔ تب حرا نے اسے پہلا اور آخری پیغام بھیجا۔

"میری زندگی میں صرف "محبت" ایک حادثہ تھی۔ باقی جو کچھ بھی ہوا وہ میری مرضی اور رضا سے ہوا ہے! آخر۔۔۔ مجھے بھی تو محبت کرنے کی کچھ قیمت ادا کرنی ہی تھی نا۔۔۔! سو کر دی ادا۔۔۔! اب مجھے کسی بات کا خوف نہیں رہا۔ نہ تو کسی پاشا کے تین بولوں کا اور نہ زمانے کی ہوس زدہ نظروں کا! میں اپنے "حادثے" کے ساتھ، ایک محفوظ زندگی گزار رہی ہوں۔"

یہ ایک طمانچہ تھا، جو دور بیٹھے پاشا کے منہ پر پڑا اور اس کی اذیت اور تکلیف۔۔۔ اسے ساری زندگی برداشت کرنی تھی۔

ایک عورت ہو کر اتنی جرأت اور ہمت۔۔۔!!

☆☆☆

حرا نے اپنی ماں کے آنگن میں اتری رات کو دیکھا۔ جس کے دامن میں کئی ستارے جگمگا رہے تھے۔ حرا نے افسردگی سے اپنے چہرے کے زخم پر ہاتھ پھیرا اور خود کلامی کی۔

"میں شاید جلد باز تھی، تاریک رات سے گھبرا گئی مگر میں یہ بھول گئی تھی کہ قسمت کی سیاہی کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو۔ رب کی رحمت ستاروں کی طرح جگہ جگہ چمکتی ضرور ہے!"

اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر چہرے کو بھگو رہے تھے۔ شاید یہ آنسو محبت کے انجام پر تھے یا اپنے ہاتھوں سے لکھے اس "حادثے" پر جو اسے بہت کچھ عطا کر کے بھی، بہت کچھ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

کہ حادثے ہمیشہ بہت خاص اور قیمتی چیز اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔

☆

نازیہ زلق



تیز دھوپ میں بادلوں کا چھب دکھلانا موسم میں ایسی روانی پہلے تو کبھی نہ تھی۔ آج ایسا آگیا ہوا کہ بادل بن بلائے ہی "رحمت" برسانے آگئے۔ کیونکہ آج ہی وہ آپا جی اور بڑی امی سے نظر بچا کر اپنی بچپن کی سکھی گلشن سے ملنے اور اسے اپنی گلابی قمیص پہ سیاہ پھول کاڑھنے کو دینے آئی تھی کہ گلشن کی ماں نے "مینہ آگیا" کا ہوٹر بجاتے ہی چارپائیاں برآمدوں میں گھسیٹنا شروع کردیں۔ بدمزہ سا شربت جنت کے حلق میں سہم کر پھنس گیا۔

"ہیں... تے گئی۔" وہ سر پر ہاتھ مار، باہر کو دوڑی۔ تو گلشن چیخی۔

"جنت بچ کے... طفیل بھٹی کا کتا..." وہ سرپٹ دہلیز پار کر گئی۔

☼ ☼ ☼

مکمل ناول



مارچ کی ابتدائی تاریخیں چل رہی تھیں۔ موسم کسی شوخ حسینہ کے لبادے جیسا گھڑی گھڑی رنگ بدل رہا تھا۔ وہ کئی مہینوں بعد اس جانب آیا تھا۔۔۔ وجہ اکلوتی پھوپھی "صاحب جان" سے ملاقات تھی جو فالج کے باعث گاؤں کے دورے سرے پر واقع اس پتھریلی حویلی میں جانے سے معذور تھیں جہاں ان کا بچپن اور جوانی کا بیشتر حصہ گزرا۔ وہ مہینوں ادھر کا رخ نہ کرتا یہاں تک کہ صاحب جان اسے دیکھنے کو ترس جاتیں۔ ہر آتے جاتے کو سندیسے دینے لگتیں، مگر وہ ان گلیوں سے باغی تھا۔ ویسے بھی ان گلیوں میں "موت" پہرے پر بیٹھی اونگھتی رہتی، ہر آہٹ پہ چوکنا ہو کے جھپٹتی۔

وہ اپنی رائفل کو کندھے پر اعزاز کی طرح ٹانگے، بالوں میں ہاتھ چلاتا، تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سکھوں کے وقت سے قائم یہ گاؤں ابھی تک رام پور کے نام سے جانا جاتا۔ اونچے دالانوں اور محرابوں والی پختہ حویلیاں، اونچے مکانات، چوراہوں میں جگہ جگہ بدھا کی مورتیوں کے لیے بنے سنگھاسن۔۔۔ ہر نکڑ پر دیواروں میں بنائے گئے محرابی خانے اور ان کے اندر

پڑے بوسیدہ سنگی دیے۔ گاؤں کے سرے پر بنا چوپال اور قبرستان کو جاتے راستے پر موجود وہ برگد جو صدیوں سے یوں ہی چپ چاپ دم سادھے کھڑا ہر فانی شخص کو کندھوں پر رخصت ہوتے دیکھتا۔

وہ رک کے آسمان تکنے لگا جہاں بادل برسنے کو تیار کھڑا تھا۔ وہ چوکنا ہوا۔ گلی میں بے ہنگم قدموں کی تال پیدا ہوئی۔ وہ اپنی رائفل کو کندھے سے اتار کر سیدھے رخ کرتے ہوئے، دبے پاؤں گلی میں گھسا۔ نیم تاریک گلی سنسان سی تھی۔ بس پازیب کی ہلکی سی چھن چھن۔۔۔ اس نے گھوڑا چڑھایا۔ انگلی ٹریگر پر متوازن کی۔ نال سے چمٹی آنکھ کو سیاہ چادر کا پلو نظر آیا۔ وہ سیدھا ہوا۔ بادل زور سے گرجا۔ سیاہ چادر اب پوری رفتار سے اس کی جانب بڑھی تو۔۔۔ کیا وہ لڑکی ہے؟ ہاں وہ لڑکی ہی تھی، جو بھاگتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھی۔

وہ اس کی جانب آئی اور پازیب کی چھن چھن کرتے ہوئے آگے گزر گئی۔ وہ اس افراتفری پر حیران ہو تا مڑ کے دیکھنے لگا۔ وہ لڑکی "پکی حویلی" کی بیرونی دیواروں میں بنے خالی حصوں میں ایک کی طرف مڑ گئی تو وہ سیدھا ہوا اور۔۔۔ طفیل بھٹی کا کتا پورے "رام پور" کی تیزی لیے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ لمحہ ضائع کیے بنا مڑا اور بھاگنے لگا۔ بادلوں نے شاباشی دینے کے لیے دریاؤں سا پانی بہانا شروع کر دیا۔ وہ گرتا پڑتا "پکی حویلی" کی بیرونی دیوار میں بنے خالی حصے میں جا چھپا۔ کتا سیدھی گلی میں دیوانوں سا بھونکتا، بھاگتا رہا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکا، سانس درست کی۔ اٹھا تو نظر سامنے کھڑی سیاہ چادر میں لپٹی کینہ توز نظروں سے گھورتی لڑکی پر پڑی۔

"ہونہہ خوامخواہ کا ڈر۔۔۔ بھٹی کا کتا بس گرجتا ہے، برستا نہیں۔" خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا وہ اپنی "عریاں" ہوئی مردانگی پر لفظوں کی چادر بچھانے لگا۔ وہ طنزاً" مسکرائی۔

"گھبراہٹ۔۔۔ میرے علاوہ کسی نے نہیں دیکھا۔ ویسے! اس رائفل سے رنگ برنگا پانی نکلتا ہو گا ناں۔۔۔ میرے بھتیجے کے پاس بھی ہے۔۔۔ یہ کھلونا۔" وہ راج ہنس سی گردن اٹھائے مڑی۔ ہواؤں نے اپنی رتھ کو ایڑھ لگائی اور ہر رفتار کو مات ہوئی۔ سیاہ چادر سر سے ڈھلک گئی۔ کچھ پیتل سا چمکا تھا۔ سونے سا سنہری۔ وہ اپنی آستین موڑتا ساکت ہوا جب کہ وہ محتاط۔۔۔ رفت نے اپنی ہنسی میں کسی نئے سُر کا اضافہ کیا۔ وہ تیزی سے اس غار نما حصے سے خود کو جدا کرتی گئی۔ اس کی پازیب کی چھن چھن میں کسی دور دراز کی چراگاہ میں چارہ کاٹتی درانتی سے سبزے میں لہر پیدا کرتی دوشیزہ کے رسیلے لوک گانے جیسی الف لیلوی داستان چھپی تھی۔ رفت نے کسی سامع کی طرح اپنی سماعت اس داستان کی طرف موڑ دی۔



"میاں جی میں اج اک گل بتادوں' یہ خانوں کا موسیٰ مرے گا میرے ہاتھ سے۔۔۔ کل پھر اس نے چندو کو لوہے کی زنجیروں سے مارا ہے اور مجھے قسم ہے آپ کی پگڑی کی۔ وہ مجھے کہیں مل گیا تو پھر خان ڈھونڈتے ہی رہیں گے اسے۔ میں نے اس کی ناک اپنے ہاتھوں سے نہ کاٹی تے کی کہنا۔۔۔"

طارق چوہدری کی آواز ساری حویلی کے کونے چھانتی پھر رہی تھی۔ وہ آپا جی کے کمرے میں کھڑے اس غیظ و غضب سے بولتا کہ حویلی میں موجود ہر نفس اس کی آواز کے غضب کو پہنچ جاتا۔ کھلی راہداریوں سے پرے قدرے الگ تھلگ صحن کے حصے میں جہاں پیپل کے نیچے جھولے کے گرد جمع سب لڑکیوں نے اس آواز اور تقریری انداز کو سنتے ہی عجب کڑوے سے منہ بنالیے۔

"خدا کی مار۔۔۔ اس موسیٰ کے ذکر سے جانے کب جان چھوٹے گی ہماری سماعتوں کی۔" سب کی خاموشی کے برعکس شیریں نے تلخی سے تبصرہ کیا۔ جنت نے آہستہ ہوتے جھولے کو پاؤں کے دباؤ سے ذرا تیز کیا اور ہاتھ میں پکڑا بھٹہ کھانے لگی۔ اپریل کے دنوں میں ٹھنڈی ہوائیں چلتی تھیں تو وہ دنوں شاد رہتیں۔ مطمئن' اپنے آپ میں مگن' مگر جیسے ہی لو چلنا شروع ہوتی تو وہ بھی ہر وقت تپی رہتی۔ آج کل اس کی خوشی کے دن چل رہے تھے۔ پیپل کی جانے کس شاخ پر بیٹھی' پتوں میں چھپی کوئل کوک رہی تھی۔ وہ سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ گلہریاں پیپل سے حویلی کی منڈیروں کو پھلانگ رہی تھیں۔ لڑکیاں جوش و خروش سے موسیٰ خان کے لتے لے رہی تھیں۔ وہ بدمزہ ہو کے اٹھ آئی۔ ویسے بھی اس کی ہمزاد تو وہاں تھی ہی نہیں۔

"میرا شیر پتر تھے گھوم رہا ہے؟ ہیں۔۔۔"

میاں جی نے اس کا نیلا آنچل دیکھتے ہی اپنی بانہیں وا کردیں تو وہ جوتی گھسیٹتی آپا جی کے کمرے میں آئی۔ اب میاں جی سے لپٹ کر بیٹھی تھی اور ممانیاں بات بہ بات کمرے کے چکر کاٹ رہی تھیں کہ ادھر اس کے منہ سے کچھ نکلا اور ادھر ان کی شامت آئی۔

طارق' موسیٰ کو بھولے' اپنی سرخ آنکھیں اس پر گاڑے بیٹھا تھا۔ اس نے میاں جی سے نظر بچا کر اس کو منہ بھی چڑایا' مگر وہ ویسا ہی مطمئن بیٹھا رہا تو وہ اکتا کر اٹھ آئی۔ اب آخری ٹھکانہ چھت پر ہی تھا۔ اس نے اپنی کتاب اور پانی کا بڑا کٹورا لیا اور چھت پر آگئی۔

نیلماں کونے میں پیپل کے سائے میں بیٹھی رٹے لگا رہی تھی۔ اس نے کٹورا منڈیر پر رکھا اور دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی بیرونی باڑ کی جانب آئی۔ ساتھ والے گھر میں جھانک کر دیکھا۔ سارے میں خاموشی چھائی تھی۔ البتہ چھت پر بیٹھا گڈو کنچے کھیل رہا تھا۔

"یہ دشمنیاں بھی ناں۔۔۔ بچپن تنہا کردیتی ہیں۔" وہ سر جھٹک کے نیلماں کے پاس چلی آئی۔ ابھی اسے کتاب کھولے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ منڈیر پر گڈو کا سر نظر آیا۔

"جنت باجی۔۔۔ جنت باجی۔ ادھر آ' اک گل کرنی ہے۔" وہ سستی سے اٹھی۔

"کیا ہے؟"

"غضب ہوگیا جنت باجی۔ رام پور وچ قیامت آنے والی ہے۔"

"مت نہ مار۔ گل بتا۔"

"ادھر دیکھو۔" گڈو نے سر کے اشارے سے اپنے

گھر سے اگلے گھر کی چھت کی جانب اشارہ کیا۔ جنت نے لاپروائی سے دیکھا۔

"ارے یہ تو وہی ہے..... ہاہاہا تجھے پتا ہے اس دن طفیل بھٹی کے کتے نے اس گھبرو کی کیسی دوڑ لگوائی..... توبہ ایسی بزدلی۔ ویسے یہ ہے کون؟ صاحب جان کا کیا لگتا ہے؟" وہ آنکھیں سکیڑ کے منڈیر پر کہنیاں جمائے، سیاہ لباس میں ملبوس اس شاندار سے لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔

"موسیٰ خان ہے..... صاحب جان کا بھتیجا۔ تیرا بڑا پوچھ رہا تھا۔ وہ تو میں ہی اس کا شیدائی ہوں اور کوئی ہوتا ناں تے اس بات پر تین چار قتل تو ہو ہی چکے ہوتے۔"

"یہ..... یہ ہے موسیٰ خان؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ آنکھیں بھی پھیلائیں۔

"ہاں ناں..... جنت باجی تو کہاں ملی تھی اسے؟" جنت ہنسنے لگی۔

"یہ ہے موسیٰ، جس نے ہمارے شیروں کو شکار بھلایا ہوا ہے۔ ارے یہ تو طفیل کے کتے سے ڈر کے وہ بھاگا کہ مینوں وی شرم آگئی۔"

"سارا پنڈ جانتا ہے کہ موسیٰ اگر کسی سے ڈرتا ہے تے وہ طفیل دا کتا ہی ہے۔ تسی بتاؤ اسے کیا کہوں۔" تیرا سالہ گڈو جھنجلا کے بولا۔

"کیا کہتا ہے؟"

"پہلے پوچھ رہا تھا کہ یہ تمہارے کس مامے کی بیٹی ہے۔ میں بولا خالہ ثریا کی ہے۔ خالہ جی کے فوت ہونے پر ناناجی ادھر ہی لے آئے تھے۔ پھر بولا نام بتا۔ میں بولا جنت فاطمہ..... کہنے لگا جنت فاطمہ سے کہنا خان ذائزدراشم۔ اب بول اسے کیا کہوں۔"

"تو نے اسے کیا بولنا ہے، پہلے تو میں تجھے بولتی ہوں..... او بے غیرت۔ شرم نہیں آئی بہن کو دشمن کا پیغام لاکے دیتے ہوئے اور اسے بھی جاکے کہہ دے کہ اس نے جو بھی مجھے کہا ہے اس کا بدلہ میرے بھائی جلد ہی چکائیں گے۔ ہونہہ، کسی کی ماں بہن کو گالی دیتے شرم نہیں آتی۔ صاحب جان کی چھت پر ناں ہوتا تو اب تک کفن میں لپٹا، چارپائی پر پڑا ہوتا۔"

وہ جوش میں اتنا اونچا تو ضرور بولی کہ وہ بہ آسانی سن لے..... اور اس نے سن بھی لیا۔ سر جھٹک کے مسکرایا بھی۔ گڈو نے شرمندہ سا ہو کر موسیٰ کو دیکھا۔ نیلماں جلدی سے اٹھ کر آئی۔ پھر موسیٰ کو دیکھتے ہی زرد پڑتے رنگ کے ساتھ اسے نیچے لے جانے لگی۔ گڈو نے زبان بند رکھنے کی قسم کھائی اور ان دونوں نے کسی کو نہ بتانے کی۔ آٹا پیسنے والی چکی کی مخصوص ٹک ٹک نے برگد پر بیٹھے بگلوں کی قطار کے ساتھ مل کر ایک ساز طرب بجایا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو شرربار سا دیکھتے ہوئے مخالف سمتوں کو چل دیے۔



"او جگا ماریا.....
او جگا ماریا بوڑھ دی چھاویں
تے نو من ریت بجھ گئی جگیا
او ٹر پردیس گئیو....."

چاچے اسماعیل کی آواز اس کچی سڑک سے اٹھنے والی مٹی کے دوش پر سارے میں پھیل رہی تھی۔ چاچا تان لگاتا تو ساتھ ہی گھوڑے کی باگ کو ڈھیلا کر کے جھٹکا دیتا اور گھوڑا تانگے کو کھینچتا ہوا منزل کی طرف بڑھتا رہتا۔ وہ مٹی سے بچنے کے لیے ناک تک سیاہ چادر کھینچ کے بیٹھی تھی۔ ماتھے پر آیا پسینہ صاف کر کے چاچے سے بولی۔

"چاچا جی..... آج ہمیں مشرقی دروازے سے حویلی لے کر جاؤ۔ ان لوگوں کا تو بچپن یہیں گزرا ہے، مگر میں تے کبھی اس طرف گئی بھی نئیں۔" جنت کے کہنے پر سب لڑکیوں نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ رام پور کے دو دروازے تھے، مشرقی اور غربی۔ غربی جانب چوہدریوں کی حویلی اور گھات تھی جب کہ مشرقی جانب خانوں کی حویلی تھی۔ اسماعیل چاچا انہیں غربی دروازے سے ہی کالج لاتے لے جاتے تھے جو کہ قریبی حصے میں تھا۔

"نہ..... نہ دھیے، یہ گل نہ کرنا۔ زہر بھاویں چٹکی ہی

کیوں نہ ہووے' او زہر ہی ہوندا اے تے بے وقوفی بھاویں اک لمحے ہی دی ہووے او کسی دی گل دا نتیجہ بدل سکدی اے۔ میں اج تم لوگوں کو ادھر لے جاؤں تے کل کو چوہدریوں کو کیا منہ دکھاؤں۔ چوہدری ظفر تے میری سنگی (گردن) تے نوں (ناخن) رکھ کے تم لوگوں کو میرے نال بھیجیا ہے۔"

"اوہو چاچا جی۔۔۔ اتنی دوپہر کو چوپال خالی پڑا ہوگا تے گلیاں وی۔ تسی سانوں لے جاؤ ظفر بابا جی سے گل میں خود کرلوں گی۔ شیریں تو بھی کہہ دے ناں۔" وہ شیریں سے بولی۔ لہجے میں ازلی تمکنت تھی۔ جانے کیوں آج دل کر رہا تھا کہ وہ اس خوب صورت تصویر کو دوسرے رخ سے بھی دیکھے۔ چاچا اسماعیل نے گھوڑے کو ہنٹر لگایا اور وہ سرپٹ مشرقی دروازے کو مڑ گیا۔ اب سب لڑکیاں دل و جان سے متوجہ ہوئیں۔

چوپال واقعی خالی پڑا تھا۔ چاچے کی کچھ سانس بحال ہوئی۔ وہ ہلکی رفتار سے تانگہ چلا رہا تھا۔ نیلماں' شیریں اور بشریٰ یاد کر رہی تھیں۔

"وہ دیکھو کتنا بڑا ہو گیا۔۔۔ وہ دیکھو کتنا بدرنگ ہو گیا؟" جیسی یادیں۔

"او پیری پینیدا بابو جی۔۔۔ اج اے شاہی سواری ایدھر آئی اے۔ خیر تے ہے بابا جی۔" چائے خانے کے چھپر کے بانس سے تقریباً" جھولتا ہرمن سنگھ' اسماعیل کو دیکھتے ہی للکار کے بولا۔ چاچے اسماعیل کے ہاتھ کپکپائے' ماتھے تک ہاتھ لے جاکر سلام کیا۔ پشت کیے' چائے پیتے موسیٰ نے ذرا کی ذرا گردن گھما کے دیکھی۔ چائے خانے میں بجنے والا پشتو گانا کہیں دور سے مدھم سی' کان پڑی آواز جیسا لگنے لگا۔ وہ اٹھا۔ شیریں نے سہم کر چاچے کی قمیص کا دامن پیچھے سے پکڑ لیا۔

"تانگہ روک ذرا!" وہ آستین چڑھاتا' تانگے تک آیا۔ کوئی اندھا بھی ہوتا تو جنت پر نیزے سی گڑی اس کی نظروں کی نوک جانچ لیتا۔

"چاچا تانگہ مت روکنا۔" جنت نے نیلماں کے کہنی دبانے کے باوجود تمکنت و تحکم سے کہہ ڈالا۔ وہ بے ساختہ مسکرایا۔

"تانگہ نہ روکنے کا مطلب جانتا ہے؟" چاچے کے پسینے سے قمیص رنگ بدل گئی۔

"اگر روک ڈالا تو چھوٹی موٹی تے میں خود اٹھا ڈالوں۔۔۔" وہ آنکھ نہ جھپکتی تھی۔ مقابلے کی ٹھنی ہوئی تھی۔ ہرمن سنگھ کا "ٹمک" جوش مارنے لگا۔

"اے۔۔۔ بی بی۔۔۔" وہ انگلی اٹھا کر بولنے لگا۔

"تو چپ رہ۔۔۔ میں کمیوں کے منہ نئیں لگتی اور یہ انگلی بھی پیچھے رکھ ورنہ ساری زندگی چار انگلیوں سے گزارہ کرنا پڑے گا۔ تو چل چاچا۔" موسیٰ کا قہقہہ درختوں میں چھپے پرندے اڑا دینے والا تھا۔

"خان ذا' زار شم بی بی۔۔۔ خان ذا' زار شم۔" وہ ہاتھ سے جانے کا اشارہ کرنے لگا۔ تانگہ آگے بڑھا۔ جنت نے مڑ کر دیکھا' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھکا۔ وہ سیدھی ہوئی۔۔۔ مسکرا کے۔ لڑکیوں سے رازداری کے وعدے لے رہی تھی ۔۔ یہ لڑکیوں کے "راز" بھی ناں۔۔۔



آم کے باغ میں درختوں پر آیا بور اب چھوٹی چھوٹی کچی کیریوں میں بدل رہا تھا۔ فضا بھی ترش ہوئی تھی۔ کوئل کسی ریکارڈ کی طرح سارا سارا دن کوکتے نہ تھکتی۔ باغوں کے رکھوالے آوازیں لگاتے۔۔۔ ہن چھ' ہن چھ۔ ہررررر۔۔۔ ہرررررر۔ بچوں کے گال اور ٹھوڑیاں کچے آم کا پانی لگنے سے داغ دار ہو رہی تھیں اور لڑکیوں کی اوڑھنیاں سبز ہی نظر آتیں۔ وہ صبح سے باغ میں جانے کو مچل رہی تھی۔ میاں جی نے روک دیا تو اس بات پر اڑ گئی۔ "آج جاؤں گی ورنہ کچھ نہ کھاؤں گی۔" سہ پہر کو طارق ڈیرے سے آیا' ستون سے ٹیک لگائے' منہ پھلائے اسے بیٹھے دیکھا تو گاڑی نکال لایا۔ لڑکیوں نے جوتیاں پھینک' کھسے پھنسا پجارو میں خود کو بھر لیا۔ وہ کلثوم کے ہاتھ میں ٹوکری پکڑا کے اس سے آگے آگے نکل رہی تھی جب پھاٹک پر گڈو مل گیا۔

"وہ کہتا ہے، مجھ سے مل۔" وہ رو دینے کو تھا۔
"تو کیا بولا اسے؟" اس نے دماغ میں بھڑ بھڑ جلتی آگ کو منہ کا راستہ دکھایا۔
"میں شیدائی ہوں اس کا۔ کسی کو بتایا تے وہ بھی مارا جائے گا اور تو بھی۔"
"اس سے کہنا میں دشمن کی لاش بھی پھلانگ کے نہ گزروں، کجا کہ اس کے ساتھ قبر ہی بنالوں۔" وہ چٹیا لہراتی آگے بڑھ گئی۔



دل دریا سمندروں ڈونگے
تے کون دلاں دیاں جانے۔۔۔ ہو

آج باغ سے پھل اتر رہا تھا۔ مزارعے بھاگم بھاگ پھل اتار اور سمیٹ رہے تھے۔ میاں جی نے جنت کے کہنے پر تین درخت لڑکیوں کو دے رکھے تھے۔ آج وہ کنیزوں کے ساتھ اپنے درخت دیکھ رہی تھیں۔
جنت پریشان نہیں، مگر الجھی ہوئی تھی۔ موسیٰ نے گڈو کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ ہر دوسرے دن روتا ہوا اس کا کوئی پیغام لے آتا۔ جنت اب پھٹ پڑنے کے قریب تھی۔ نیلماں سدا کی ڈرپوک۔ وہ اسے خاموشی کے اسباق پڑھاتی رہتی جب کہ وہ اڑیل چودھرائن تھی۔ جو کہہ دیتی پھر اس کے واسطے سوئی کے ناکے سے بھی گزر جاتی۔
وہ ننگے پاؤں چلتے ہوئے باغ کے آخری کونے تک چلی آئی۔ آگے پکا نالہ تھا، پھر خانوں کا لیموں اور مالٹوں کا باغ۔ وہ آم کے درخت کا گھوم کر جائزہ لے رہی تھی جب کوئی شے ٹھک سے کمر پر لگی۔ وہ طیش سے مڑی۔ وہ ابن ڈھیٹ ایک لیموں کے پودے کے پاس پشت پر بازو باندھے مسکرا رہا تھا۔
"تو چاہتا کیا ہے؟" وہ سیاہ چادر کو گال پہ پھیلا کر پھنکاری۔
"تو کیا سننا چاہتی ہے؟" وہ گھوری، وہ مسکرایا۔
"اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ میں مرمٹا ہوں تجھ پر۔۔۔ تو اپنی یہ غلط فہمی دور کرلے۔۔۔ میں تو بس یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس سیاہ چادر کے پیچھے سونے سا کیا چمکتا ہے۔" وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔
"تو مرے گا۔" نجانے یہ تبصرہ تھا یا ڈراوا۔
"لے پھر۔۔۔ میں مر گیا۔" وہ رکی۔ پھر تیزی سے پلٹی۔ کچھ دیر اور رکتی تو "دشمن" کی جیت یقینی تھی۔
ایک کانٹا ایڑی میں گھستا اس کی راہ روک گیا۔ وہ کراہ کے نیچے بیٹھی۔ وہ لمحوں میں نالے کے اس پار آیا تھا۔ اس جگہ جہاں گائے بھینس گھس جانے پر تین چار قتل ہو جائیں۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اس کا کانٹا کھینچا۔
"یا تو تو پیدائشی سرپھرا ہے یا خودکشی کا ارادہ کیے بیٹھا ہے۔" وہ کہے بنا نہ رہ سکی۔
"تجھے کیا لگتا ہے؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ نگاہیں اس پر جمی تھیں۔
"کل جمعرات ہجویری شاہ کا میلہ ہے۔ سارے چوہدریوں کے سامنے آ کے ہری کانچ کی چوڑیاں مجھے دے جا۔۔۔ جہاں بلائے گا آؤں گی۔۔۔ میں وی تے دیکھوں، اس برف کی دھرتی پر سورج چمکتا کیسا لگتا ہے۔"
"لے پھر۔۔۔ بچالے چوہدریوں کو اب۔"
"نہ تیرا خون نکلے، نہ ان کا۔" اس کی مسکراہٹ سمٹی۔
"بڑی کم قیمت لگائی اپنے پانچ منٹ کی۔"
"کسی جان کو تلوار کی نوک پر سجادیا ہے اپنے پندرہ منٹ کے لیے۔" وہ تصحیح کرتے ہوئے مڑ گئی۔ وہ مسکرا کر اڑتا ہوا نالے کے دوسرے پار گیا تھا۔



"تجھے کیا لگتا ہے۔۔۔ وہ آئے گا؟" نیلماں لوگوں میں راستہ بناتی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ میلے میں زوروں کا رش تھا۔ آج پھر طارق ہی کام آیا تھا۔ باقی لڑکیاں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ ان کے ساتھ گڈو اور ظفر بھائی کا کامی تھا۔ طارق جنت کے پیچھے پیچھے تھا، ساتھ چار اسلحہ بردار بھی تھے۔ نیلماں پھر اس کے کان میں گھسی۔

"بتاناں..."

"وہ مرے گا کمینہ۔" دلکش سا مسکرائی تھی۔ نیلماں نے دہل کر دیکھا۔

"تو کیا چاہتی ہے؟"

"بس اس کی سنہری آنکھوں کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ جانتی ہے میں نے آنکھوں کا ایسا رنگ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ جیسے... جیسے پکی ہوئی گندم... یا پھر پیتل کا تھال... یا پھر..."

"جنت...! وہ قاتل ہے' دشمن ہے ہمارا۔ پھوپھا جی' شرجیل بھائی اور جانے کتنے مزارعے... تو کس راہ پر چلنا چاہ رہی ہے۔" نیلماں جیسے بے بس ہو گئی۔ وہ چپ چاپ چلتی رہی۔ ٹھیلوں پر پڑی چیزوں کو انہماک سے تکتی رہی۔

"اگر وہ آگیا... تو ملنے جائے گی اس سے؟"

"جاؤں گی۔" اس نے کندھے جھٹک کر کہا۔

"مطلب تو سب سوچ بیٹھی ہے۔"

"میرے سوچنے سے کچھ ہوتا تو تیرا یہ تایا زاد سرے سے غائب ہوتا۔" وہ طارق کے جلدی جلدی ان کے سر پر پہنچنے پر بولی۔ چوڑیوں کے اسٹال پر آکے وہ رکی تھی۔ ایک لڑکا تیزی سے اس جانب آیا اور چوڑیاں دکھانے لگا۔ وہ بے توجہی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ طارق اسے کبھی یہ دکھاتا تو کبھی وہ۔ لڑکا یکایک ایک سبز کانچ کا گچھا اس کے ہاتھ میں تقریباً" تھمائے ہوئے بولا۔

"باجی یہ دیکھیے۔ یہ رنگ تے بناہی تسادے ہتھ لئی ہے۔ پہن کے تاں دیکھو۔" اسی وقت ایک سفید گھوڑا ہنہناتا ہوا قریب سے لوگوں کو روندتا ہوا گزرا۔ عجب چیخ پکار مچ گئی۔ کوئی بولا۔

"او بچ کے... موسیٰ جان کا گھوڑا بھاگ گیا۔" وہ چونک کے پلٹی۔ وہ گولی کی رفتار سے ادھر آرہا تھا۔ دائیں جانب مڑتے مڑتے وہ ٹھک سے اس سے ٹکرایا۔ سب چونک کے دیکھنے لگے۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر تھا۔ عجب افراتفری میں بولا۔

"یہ چوڑیاں آپ کی ہیں؟" اس نے جنت کے ہاتھ میں پکڑی' سبز چوڑیاں اس کے سامنے کیں۔ وہ مبہوت سی رہ گئی۔ موسیٰ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوڑیاں اس پر دھریں اور ویسی ہی افراتفری سے گھوڑے کے پیچھے بھاگ لیا۔ سب لحموں میں ہوا تھا۔ سمجھ میں آنے پر وہ مسکرائی تھی... بے انتہا دلکش' چوڑیاں لے کر مڑی۔

"یہ کتنے کی ہیں؟"

"ہو گیا۔" لڑکے نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس نے چوڑیاں کسی متاع کی طرح سمیٹیں اور آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"جنت تو نہ جانا...!" نیلماں کا دل پہاڑ چڑھتی چیونٹی کے قدموں سا ڈگمگا رہا تھا۔

"تو نہ روک نا...!" جنت کا دل پہاڑ کے پار کی دنیا کو تسخیر کرلینے کے جوش میں اچھل رہا تھا۔ اس نے آنکھوں میں کاجل کی دھار پھیری اور نیم تاریکی میں اس منقش آئینے میں خود کو دیکھا۔

"ظفر پا جی کو پتا چل گیا تے چھوڑے گا نئیں کسی کو۔" جنت نے سیاہ چادر اوڑھی۔

"میں نے زبان دی تھی اسے۔" نیلماں کا بازو پکڑ کے دبے پاؤں باہر نکلی۔

"دل کے گناہ زبان پر نہ ڈال۔" پنکھوں کی کھڑکھڑاہٹ نے دبی دبی خاموشی کو ساز ہونے سے بچالیا۔ وہ پچھلے دروازے تک آئیں۔ تیرہویں کے چاند نے ہر شے پہ اپنا رنگ پھیر دیا تھا۔ سارے گاؤں میں کتے بھونکنے اور گیدڑوں کے غرانے کی آوازیں چکرا رہی تھیں۔ سوا بارہ کے قریب وہ برگد کے درخت کے پاس پہنچیں۔ قدموں کی چاپ سن کر وہ پلٹا۔ سیاہ شلوار قمیص' آستین موڑے' ماتھے کا پسینہ صاف کرتے وہ اس تک آیا۔

"پکی چوہدرائن نکلی تو۔"

"تجھے کیا لگتا تھا... چوہدرائن مکر جائے گی؟" وہ سیاہ چادر کا کونا دانت میں دبا کر بولی۔ وہ سر جھٹک کے مسکرایا۔

''آل تا کے ناں۔'' وہ برگد کے گرد بنے اینٹوں کے حصار کی طرف اشارہ کر کے بولا۔
''میں پنجابن، ہوں خان صاحب۔''
''آل تا کے ناں مطلب ادھر بیٹھو۔'' وہ وضاحت کرنے لگا وہ سنبھل کے بیٹھ گئی۔ وہ کچھ فاصلے پر بیٹھا۔
''اچھا۔ پھر زاد زار شم کا کیا مطلب ہوا؟'' وہ بغور اس دیکھنے لگا۔
''بچپن میں جب بھی میں کوہاٹ سے ادھر آتا تو صاحب جان سے کہانیاں سنتا کیونکہ مورے (میری ماں) ہم بہن بھائیوں کو صرف حدیث سناتی۔ کہانیاں صرف صاحب جان سناتی۔ ہر کہانی مجھے حیران کرتی۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شہزادی برسوں سے قلعے میں جادو سے سو رہی ہے اور شہزادے کے آنے پر ہر جادو آپوں آپ ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک دن میں نے صاحب جان سے پوچھ لیا بولی۔ ہر کہانی میں محبت ضرور ہوتی ہے۔ کسی بھی روپ میں۔ اور ہر محبت کی ایک پہیلی ضرور ہوتی ہے۔ پہیلی سمجھ لو کوئی طلسم یا منتر جو کہانی کو آگے بڑھاتا رہتا ہے۔ تو جنت فاطمہ تو سمجھ لے کہ ہماری محبت کی پہیلی اسی جملے میں ہے۔ مطلب بتا دیا تو طلسم ٹوٹ جائے گا۔''
''اگر میرا کوئی بھرا کسی خان زادی کے لیے محبت کا لفظ بولے تے تو کیا کرے گا۔''
''کوئی چوہدری کسی خان زادی کو اتنا چاہے تو۔ جتنا یہ خان زادہ اس چوہدرائن کو چاہتا ہے۔'' جنت اس کے یقین پر برف سی ہو گئی۔ چاند نے اس گندم سی آنکھوں والے کی بلائیں لی تھیں جس نے اس منہ زور لڑکی کو چپ لگا دی تھی۔
''ویسے پکی حویلی والے محبت نہیں کرتے۔''
''پکی حویلی والے محبت کے بغیر یہاں تک چلے آئیں ہیں خود سوچ۔ محبت ہو گئی تے قیامت ہو جائے گی۔'' دونوں نے کچھ لمحے رک کے اک دوجے کو دیکھا۔ آنکھوں میں ''ہے اتنی ہمت'' کی تحریر۔ پٹھان نے سینے میں سانس بھر کر پہل کر دی۔
''پھر کب ملے گی؟''
''شکل دیکھی ہے اپنی؟'' وہ ہونہہ والے انداز میں بولی۔
''پڑھتی وڑھتی بھی ہے یا بس زبان کی دھار تیز کرتی رہتی ہے؟'' وہ مسکرائی تو گویا وہ اسے جاننے جا رہا تھا۔
''کالج جاتی ہوں۔ اگلے مہینے چوداں پوری۔ تو بتا کچھ کرتا بھی ہے یا بس ہاتھ ہی چلاتا ہے غریبوں پہ۔''
''کچ نئیں کرتا بس ہاتھ ہی چلاتا ہوں متکبروں پہ۔'' موسیٰ کی مسکراہٹ پہ اس کا ماتھا شکن زدہ ہوا۔ غصے سے اٹھی۔
''ابھی دو منٹ ہیں تیرے پندرہ منٹ میں سے۔''
''تو تو پانچ منٹ کہہ رہا تھا اس دن۔''
''پھر کب ملے گی؟''
''چل رین دے۔ تو اور میں نئیں چل سکدے۔'' وہ کہہ کر چادر درست کرنے لگی۔ کچھ سونا سا پھر چمکا۔ موسیٰ جواب دینا بھول گیا۔ سر اٹھائے اسے دیکھتا رہا۔ وہ مڑی تو بے چینی سے اٹھا۔ کچھ قدم پر وہ رکی۔
''پرانی حویلی میں بدھ کو ملے تو یہ سیاہ رنگ نہ چڑھانا۔ وچارے چن کی ساری محنت ضائع کر دیتا ہے۔'' وہ لمحوں میں فیصلے کرتی آگے قدم بڑھا گئی اور وہ چنگیز خان کے پوتے کی نسل کا لڑکا' واپس وہیں بیٹھ گیا تھا۔ چاند اس کی مسکراہٹ پر متفکر ہوا۔



پراندے کو آخری بل دے کر اس نے خراشوں سے بھرے آئینے میں خود کو دیکھا۔ جیسے کوئی صندل سے تراشی مورت البتہ چہرے پر عمر سے میل کھاتا بانکپن نہ تھا۔ اک رگڑ سی تھی۔ وقت کی' حالات کی رگڑ۔ ہونٹوں کو گلابی ڈبیہ میں لپٹے رنگ سے مزید گلابی کر کے وہ چار چارپائیوں کے صحن میں چلی آئی۔ ابا اپنے صافے سے ماتھا رگڑتا نیم دراز سا حقہ پی رہا تھا' اماں اپلوں کو تندور میں ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ ابے نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔ وہ پائنتی پہ ٹک گئی۔

"کی (کیا) کہتا ہے وہ؟" ابے کا اشارہ وہ لمحوں میں سمجھی۔

"کہتا ہے میں زمین دار ہوں۔۔۔ فصل ہاتھ سے اگاتا اور ہاتھ سے کاٹتا ہوں' جو پک کے خود گر جائے اسے اپنے گودام میں نئیں رکھتا' تے دل میں کیسے رکھ سکتا ہوں۔ جس دن کوئی کھڑی فصل سی مل گئی ناں نے فیر چاہے او چوہدریوں کی کیوں نہ ہووے' اپنے ہاتھوں کاٹوں گا۔۔۔ میں وی سوچا چل کوئی گل نئیں۔ گل باز جان دیتا ہے اور رو کڑے وی نے خیر اس کریلے کو کیوں منہ لگاویں۔"

"لے اے کی گل ہوئی۔۔۔ سارا پیسہ تے اس شیر دے وھانے وچ ہے۔ زمینوں' مرغی فارم' مچھلی فارم اور باقی سارے کاروبار سب دی کمائی اپنی جیب میں رکھتا ہے۔ او مینوں تے سب پتہ ہے۔ اک قدم پیچھے چلتا ہوں اس کے۔ تو کسی طرح اسے بلالے ناں اس محلے تو سمجھ پورا رام پور کھلائے گی قسم ناں۔" وہ باپ تھا۔ جو بیٹی کو دن بدلنے کے نسخے بتا رہا تھا۔ اس محلے کا تقریباً" ہر گھر ہی ایسے باپ بھائیوں سے بھرا تھا جو پان سگریٹ' مرغ مسلم کھاتے اپنی بیٹیوں کے بل' چوہدریوں اور خانوں کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر رہے تھے۔ صندلی اٹھی۔

"ابا تو کہتا ہے تے اک واری فیر کوشش کر لیتی ہوں پر یہ موسیٰ وی ناں نک (ناک) سے نکسیر نکلوائے گا تو دیکھ لئیں۔" وہ بات مکمل کر کے دروازہ پار کر گئی۔



ولایت خان بنگش اور محمود اللہ چوہدری دشمنی کی وجہ بھی بھول چکے تھے مگر قتل پھر بھی ہوتے۔ جہاں جس کا وار چلتا وہ چلا جاتا پھر دوسرے کا وار چلتا تو وہ پہلے کا دوگنا ہوتا۔ نہ کسی نے گمان کیا نہ تدبیر مگر ان پتھر دلوں کے درمیان ایک بنفشی پھول کھل اٹھا تھا۔ خانوں اور چوہدریوں کے دو منہ زور ہر بدھ کو پرانی حویلی' میں زمین کھود کھود کر دشمنی کے بیج رام پور کی زمین کے سینے سے نکالتے۔۔۔ اگلے بدھ پھر زمین ویسے ہی بھری ہوتی مگر وہ دونوں نہ تھکتے۔ ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑتے' وہ دونوں بدھ کی ہر رات صرف پانچ منٹ ایک دوجے کو دیکھتے' کسی بات پہ لڑتے اور یہ جا وہ جا۔ رام پور میں کوئی نہ جانتا تھا کہ اس بار کی گندم کے ساتھ ان کے گھروں میں محبت کا اک راز بھی آیا ہے۔

آپا جی کیریوں کا اچار ڈال چکیں اور اب لیموں اور سبز مرچ کی باری تھی۔ سب ملازمائیں بھاگم بھاگ مختلف اشیاء اوپر نیچے لے جا رہی تھیں۔ آپا جی چھت پہ پیپل کے سائے کے نیچے چارپائی دھرے بیٹھی ملازموں کو ہدایات دے رہی تھیں۔ جنت آخری پیپر دے کر آئی تو کپڑے تبدیل کر کے اوپر چلی آئی۔ باقی سب لڑکیاں بھی آگئیں۔ وہ آپا جی کی چارپائی پر لیٹ گئی۔ سکھاں اونچی آواز میں تان لگائے بیٹھی تھی' ساتھ ہی ساتھ سارے مرتبان دھوپ میں رکھ رہی تھی۔

ہو بازار روکتے دے سروے
بازادو کے دے سروے
شاماں بیٹیاں تے مڑ آئیں گھر دے
ہو اک پھل موتیے دا مار کے جگا سوہنیے

وہ جھٹکے سے اٹھی۔ بیرونی منڈیر کی طرف آئی۔ وہ صاحب جان کی چھت پر کھڑا پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ وہ مسکرائی۔ جانے دل کو کیسے پتا چل جاتا تھا اس کی آمد کا۔ موسیٰ نے اشارے سے پرچے کے متعلق پوچھا۔ اس نے ہاتھ کھڑا کیا۔ ٹھیک ہو گیا۔ پھر ہاتھ سے کہا۔ جاؤ۔ اسے ترس آیا تھا' وہ سرد علاقے کا پٹھان گرمی میں خوار ہو رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑا بھٹا دکھانے لگا۔ جانتا تھا اسے بھٹا بہت پسند ہے۔ جواباً" اس نے اپنے پیچھے اشارہ کیا پھر کانوں کو ہاتھ لگایا۔ بابا معاف کر اور جا۔ موسیٰ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ یعنی میں کھالوں' وہ اپنی ہنسی دبا کے سہلانے لگی۔ کبھی کبھی وہ یوں ہی محبت دکھاتا اور کبھی بے انتہا کھڑوس ہو جاتا۔ جنت کو اس کو سمجھ نہ پائی۔ ہاں جنت نے بھی اسے رعایت نہ دی۔ کبھی میٹھا بول کے نہ دکھایا۔ پھر بھی وہ اسے چاہے جاتا۔۔۔ وہ صحیح کہتا تھا کہ چوہدری ایسی محبت کر ہی نہیں سکتا

تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ ہشاش بشاش تازہ دم ہو کے کمرے سے باہر نکلا۔ ولایت بنگش اپنے چھ بیٹوں اور چھ پوتیوں کے ہمراہ رام پور میں پتھریلی حویلی کے نام سے مشہور اس حویلی میں رہتے تھے۔ بہت بڑی حویلی کے چاروں طرف کمرے ہی کمرے تھے۔ دائیں طرف پتھر کی جالیوں سے ایک حصہ مخصوص کر کے وہاں کھلا باورچی خانہ بنایا گیا تھا۔ مردوں کے لیے لکڑی کے بڑے پڑے تھے۔ وہ آتے تو ملازمائیں وہ آگے کر دیتیں۔ کھا کے اٹھتے تو اٹھا کر برآمدوں میں سجا دیتیں۔

وہ پاؤں کی دھمک پیدا کرتا ہوا آیا اور گل شیر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ صندلی کھانا آگے رکھنے لگی۔ سات آٹھ لڑکے بیٹھے تیز تیز پشتو میں کوئی بات کر رہے تھے۔ موسیٰ کو جلدی تھی۔ آٹھ بج گئے تھے جبکہ ساڑھے نو پر اسے پرانی حویلی پہنچنا تھا۔ گل شیر اس کا چچازاد تو تھا ہی مگر وہ اس کا سب سے اچھا دوست بھی تھا۔ وہ اس کی آستین کھینچ کر متوجہ کر رہا تھا۔

"تو نے وہ چوہدریوں کی لڑکی دیکھی ہے؟ جس کا ذکر ارباز کر رہا ہے۔" موسیٰ کے ہاتھ رکے۔

"نشتہ... ذا' پریگدا روڑ ر۔" (نہیں۔ تم چھوڑو میرے بھائی) . اسے سخت برا لگا تھا۔

"نہیں چھوڑتا۔ دراصل وہ ظفر چوہدری کی سب سے چھوٹی بہن ہے۔ مجھے ثریا نے بتایا..." ابھی وہ بات کر ہی رہا تھا کہ چٹاخ کی آواز پر موسیٰ بے ساختہ اچھلا۔ اسے لگا یہ تھپڑ اسے لگا ہے مگر گلزار لالہ سرخ آنکھیں لیے گل شیر کو گریبان سے پکڑ کر اٹھا رہے تھے۔ وہاں بیٹھے سب ہی لڑکے ایک ساتھ اٹھے۔

"تیری مورے نے یہ نہیں بتایا کہ رزق کھاتے وقت رب کا نام لیتے ہیں' کفر کا ذکر نہیں کرتے' منہ پلید ہو جاتا ہے... پھر تو ان پلیدوں کا نام بھی کیسے لے رہا تھا رزق سامنے رکھ کے۔"

حیران سب ہوئے مگر موسیٰ کو یہ بات کوڑے کی طرح لگی۔ وہ لہولہان ہو گیا' اتنی نفرت... نوالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ سن سا وہیں بیٹھ گیا۔

"لوگوں کی دشمنیاں ہوتی ہوں گی مگر ہماری صرف نفرت۔ صرف نفرت۔ کوئی ان کا نام بھی نہ لے اس گھر میں... نام بھی نہ لے ورنہ سانس تک کے ٹکڑے کرے گا یہ بنگش اس کے۔" گلزار لالہ آگے بڑھ گئے۔ موسیٰ خان کوئی عورت ہوتا تو بین کر کر کے روتا۔ اس نے سر میں اٹھتی ٹیسوں کو آنکھیں میچ کر دبایا۔

✡ ✡ ✡

"موسیٰ... کیا آج پانی پہ نہیں جائے گا؟ شہبازی کو کہہ دوں۔"

"ہم م۔" وہ سر پاؤں لپیٹے' کھیس تانے سر شام ہی لیٹا تھا۔

"تو منہ کیوں چھپا رہا ہے۔ منہ تو گل شیر کو چھپانا چاہیے مگر دیکھ وہ تو سرمد کے ساتھ مل کے گامے سے تاش کی بازی لگا رہا ہے۔" گل باز نے اس بار کھینچ کر کھیس اتارا۔ موسیٰ کی نظریں گھڑی پہ ٹکیں۔ دس بج گئے تھے۔ وہ کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ سر میں شدید درد تھا۔

"لالہ او لالہ' نشتہ ستر گئی نم (آنکھیں بند نہ کر) میری بات سن۔" جمال اس کا چھوٹا بھائی تھا جبکہ خوش حال بڑا۔ وہ منجھلا تھا۔ خوش حال کوہاٹ میں ہوتا تھا۔ وہ جنگلات کے محکمے میں اعلا عہدے پر تھا۔ گاؤں کی دشمنیوں سے دور وہ آرام سے زندگی بسر کر رہا تھا جبکہ جمال ابھی سترہویں سال میں داخل ہوا تھا۔ وہ دشمنی سے خار کھاتا تھا۔ وہ صرف پشتو فلمیں دیکھنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر ثوبیہ خان کی۔ موسیٰ' ظہیر خان کا وہ بیٹا تھا جسے ولایت خان بنگش مرد سمجھتے اور اپنا دایاں بازو مانتے تھے۔ کچھ معاملوں میں وہ حد سے زیادہ سفاک تھا اور یہی سفاکیت اسے ولایت خان کی نظر میں ممتاز کرتی تھی۔

"کیا ہے؟" وہ کھیس کے اندر سے ہی بولا۔

"کچھ پیسہ دو... ام فلم دیکھے گی۔" وہ ابھی چھوٹا تھا

موورے کے ساتھ رہنے کی وجہ سے زبان زیادہ پشتو ہی تھی۔

"اس وقت؟"

"زمرد اپنے پیسہ سے فلم لائی ہے ثوبیہ خان کی۔ ام سے بولی پیسہ لاؤ اور دیکالو۔" وہ بابا زاد زمرد لالہ کی بات کررہا تھا۔ موسیٰ نے بے دلی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو ہاتھ لگا نکال کر اسے تھمایا۔ گل باز چہل قدمی کو نکل گیا موسیٰ پھر سے چادر اوڑھنے لگا۔ کروٹ بدل بدل کر تھک گیا، آنکھیں میچ میچ کر بھی دیکھ لیا مگر نیند نہ آئی۔

ساڑھے گیارہ بجے ہمت جواب دے گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ بستر پر لیٹے باقی پانچوں اسے دیکھنے لگا جو تیزی سے دروازے کی طرف کو بڑھا تھا۔

"او بھائی کدھر؟" کسی نے ہانک لگائی۔

"اک کام بھول گیا تھا۔۔۔" وہ سنسان گلیوں میں بھاگتے ہوئے ایک جگہ رکا۔ دیوار میں نصب دیا اکھاڑ کر پھر سے رفتار پکڑی۔ پیپل والی گلی میں دیے کو بمشکل سنبھالتا، پرانی حویلی کی چھت تک پہنچا۔ ہر بار کی طرح ہاتھوں پر زخم آگئے۔ پاؤں کی انگلیاں مڑیں سانس پھولی کئی مگر وہ پہنچ ہی گیا۔ وہ ہر بار کی طرح بوسیدہ سے گنبد پر پاؤں دھرے سمٹ کے بیٹھی تھی۔ سارے گاؤں میں ہُو کا عالم تھا۔ پیپل کے پتے گھڑی گھڑی تالیاں پیٹتے، ان دونوں کے حوصلے کو داد دیتے۔ وہ پیچھے سے دھمک پیدا کرتا ہوا آیا۔ سامنے والے گنبد پہ بیٹھ گیا۔

"بارہ تو بجے نہیں۔ چل تیرا وقت بدل دوں۔" وہ اس کے ردیے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ پھر ہتھیلی اس کی ناک پر جمائی اور باقی پنجہ چہرے پر پھیلایا پھر ہاتھ دائیں طرف گھما دیا۔ جنت نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ساڑھے گیارہ بجے تک صرف تیری غیرت دیکھنے بیٹھی رہی ہوں کہ کیسے کوئی لڑکی اپنا سب کچھ داؤ پر رکھ کے یہاں تک آئے اور آگے والا اپنی اوقات ہی دکھادے۔۔۔"

"جنت!"

"اور یہ بتانے بیٹھی تھی کہ اب کبھی ادھر آیا تے منہ توڑ دوں گی۔ اگر آج نہ بتاتی تے اگلے بدھ تو فیر آنا۔ ہن شکل غائب کر یہاں سے۔"

"بات تو سن لے۔" وہ واپس مڑی۔

"میری بات تو سن لے۔"

"دفع ہو یہاں سے۔"

"تو نہیں جانتی آج میں نے کیا محسوس کیا۔"

"مجھے کہانیاں نہ سنا۔" وہ تڑخی۔

"کہانیاں سنانے والا ہوتا ناں تو تو ابھی تک بیٹھی مجھ سے کہانیاں سن رہی ہوتی پوری بات تو سن لے۔۔۔"

"ہاں سنا۔" احسان کر ہی ڈالا۔ موسیٰ نے اسے ساری بات من و عن بتائی۔ سننے کے بعد بولی۔

"ہاں تو پھر؟" رعونت میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا۔

"مجھے لگا ہم خود کو دھوکا دے رہے ہیں۔ جب یہ لوگ دلوں کو اتنا ہی تنگ کیے بیٹھے ہیں تو مجھے کوئی حق نہیں کہ تجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹتا پھروں۔ مجھے لگا جتنی جلدی ہوسکے میں تجھے واپس کردوں چوہدریوں کو۔۔۔ جنت تجھے نہیں پتا مجھے کیسا لگا۔ میں مرنے کو ہوگیا۔۔۔ تو نہیں سمجھے گی۔"

"اچھا۔۔۔ تے ہن غیروں کے ڈر سے موسیٰ جنت کو چھوڑ دے گا۔" وہ پیپل کے پتوں میں آنکھیں گاڑ کے بولی۔ اسے دیکھ لیتی تو ہچکیاں گلا گھونٹ دیتیں۔ موسیٰ کیا جانے کہ جنت نے گزرے دو گھنٹے میں خود کو کیسا بنجر پایا ہے۔ موسیٰ کیا جانے کہ جنت نے انجانے خوف کو خود میں حلول ہوتے دیکھا ہے۔ موسیٰ نے تھک کر اسے دیکھا۔ کتنا کمزور ثابت ہورہا تھا وہ اس لڑکی کے سامنے۔

"یہ لے۔۔۔ جلدی میں یہی ہاتھ لگا تو میں نے سوچا خالی ہاتھ جانے سے بہتر ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا دیا اس کے سامنے کیا۔

"اگلے ہفتے کچھ اچھا لاؤں گا۔" جنت نے اونہہ والے انداز میں سر جھٹکا۔ جنت نے دوپٹے کے پلو سے ایک دھاگا نکالا تھا۔

"یہ لے۔۔۔ گلشن نے آج شام ہی بنا کر بھیجا تھا۔"

وہ کلائی پہ باندھنے والا خوب صورت سیاہ گندھا ہوا دھاگا تھا۔ موسیٰ پھر سے شرمندہ ہوا۔ دونوں ہر بار اک دوجے کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے۔ موسیٰ ہر بار ہی شرمندہ ہوتا کیوں کہ جنت اس کے لیے جو بھی لاتی وہ بہترین ہوتا۔

"اچھا اچھا تو یہ لے آیا میرے پرندوں کا باجرے والا اونے (وہ) لوٹ آیا تھا۔" موسیٰ کے گھورنے پر وہ گردن جھٹک کر اعلا کہ دنیا کے سر اور رام پور کے ہر صحن میں دھرے چولہے نے خود کو سرد ہوتے پایا۔ موسیٰ نے دھاگا جیب میں رکھا اور دیوار سے چھلانگ لگا دی۔ محبت نے آج بھی ہر فیصلہ اپنے ہی ہاتھ میں رکھا۔ بچاری تو بس عمل کرنے والوں میں سے ہوتے ہیں ناں۔۔۔



"جنتے۔۔۔ منڈا واقعی چاہتا ہے تجھے۔" نیلماں نے مان ہی لیا۔ جنت نے خود میں شہد جیسی میٹھی نہریں بہتی دیکھیں۔

"محبت نہ بھی کرتا ناں نیلماں۔۔۔ جنت تے اس کے حوصلے پر مرمٹی تھی۔ بس اک گل ہے۔۔۔ وہ ہنسا نہ کرے۔ ہنستا ہے تے اندر سے کوئی زور دے کر کہتا ہے۔۔۔ تو مرے گی کمینی!" وہ دونوں ہنسیں۔ بشریٰ نے ہاتھ والا پنکھا روک کے ان کے گلنار چہرے دیکھے۔ باہر سے ظفر پاءجی کے دھاڑنے کی آواز پر وہ باہر کو دوڑیں۔ وہ سفینہ بھرجائی کی چوٹی پکڑے انہیں دائیں بائیں جھلا رہے تھے۔

"کمینی ذات۔۔۔ میرے پتر کو ہاتھ لگایا تے میں نک نہ کاٹ دوں۔" جنت کے اندر نفرت اٹھی۔ ظفر پاءجی اپنے اکلوتے کاکے کے لیے ایسے ہی باؤلے تھے۔



موسیٰ پرانی حویلی آیا۔ کچھ مضمحل تھا۔ پرانی حویلی جنت کی پکی حویلی کا ہی ایک خستہ حصہ تھی جو کم آمدورفت کی وجہ سے پرانی حویلی کہلاتی تھی۔ پکی حویلی کی سیڑھیاں چڑھ کے اگر بائیں جاؤ تو پکی حویلی اور دائیں جاؤ تو پرانی حویلی۔۔۔ یہ اور بات کہ پرانی حویلی کا کوئی بھی رخ نہ کرتا۔

"جنت چل بھاگ چلتے ہیں۔ یہاں کچھ بھی نہیں بدلنے والا۔" جنت گنگ رہ گئی۔

"موسیٰ کیا تو میری اتنی سی عزت بھی نئیں کرتا کہ یہ گھٹیا ترین گل کرنے سے پہلے ذرا سوچ ہی لیتا۔۔۔ اتنی سی چاہ وی نئیں رکھتا میری کہ مجھے گھر میں بسانے کا سوچتا۔" موسیٰ چپ سا ہو گیا۔ تھک کے گنبد سے سر ٹکایا۔ وہ ناراضی سے پیپل کی اور دیکھتی رہی۔

"صاحب جان کہا کرتی تھیں۔۔۔ محبت بند گلیوں والا قلعہ ہے۔ ایک بار محصور ہو گئے تو پھر جتنا بھی بھاگ لو، جان انہیں دیواروں میں دینی پڑے گی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں بہت سوچنے لگا ہوں۔"

"وڈا سیانا نہ بن۔۔۔ اتنا سوچتا ہوتا تے پتا ہوتا ناں کہ مینوں اس گل سے کتنی تکلیف ہووے گی۔ پر تو ناں بڑا میسنا ہے۔ تو نے سوچا من گئی تے موجاں ادھر لے جاواں گا پٹھانوں میں کوہاٹ کی طرف جہاں نہ بولی سمجھ میں آئے گی، نہ کھانوں کی نہ مکانوں کی۔ تے آپوں آپ مرکھپ جائے گی۔ پر میں وی چوہدرائن ہوں چوہدرائن، کوئی کمی کمین نئیں۔۔۔ تیرے سر دی قسم مرجاواں گی، اس پیپل کی طرح ہر شے سہ لوں گی مگر تیرے نال کہیں نہ جاؤں گی جب تک جنج (بارات) نہ لے کر آئے۔۔۔ ایسی جنج جو چودی (چوبیس) گاؤں دیکھیں۔ کچھ آیا سمجھ میں۔" موسیٰ نے کانوں پر ہاتھ دھرے۔

"کتنا بولتی ہے تو۔" اسے صرف یہی بات قابل اعتراض لگی۔ جنت واقعی چپ ہو گئی۔

"میں سچی نال بڑا بولتی ہوں ناں۔" اپنے سر پہ چپت لگائی۔

"آپا جی کہتی ہیں اگلے گھر اتنا بولی تے اگلے نے جوتا اتار لینا ہے۔ ہیں موسیٰ واقعی؟"

"بڑا ہی کوئی بدنصیب ہو گا جسے سنہری کے بجائے سرخ رنگ پسند ہو گا۔" دونوں نے اک دوجے کو دیکھا اور سچی ہنسی پیپل کو دان کر دی۔

"ویسے میرے لالہ کہتے ہیں کہ عورت کو مارنے سے بہتر ہے کہ بندہ خود کو دو جوتے لگا لے کیونکہ چند دن بعد بھی تو یہی کرنا ہوتا ہے۔" جنت اتنا ہنسی کہ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ موسیٰ نے جیب سے کچھ نکال کر جنت کے سامنے کیا۔ وہ دنگ رہ گئی۔ وہ پیتل کی نفیس سی دو چوڑیاں تھیں جن پر راجستھانی کام انتہائی باریک سا تھا۔

"موسیٰ کی جنت۔"

"جنت کا موسیٰ۔" جنت نے جواباً" کہتے ہوئے پیپل کا پتا اس کے سامنے کیا۔ وہ مسکرایا۔ پتے پہ ان دونوں کا نام کڑھا ہوا تھا۔

"جنت پھر جیت گئی۔" جنت نے اسے گھورا۔ مگر وہ سنجیدہ تھا۔



آج بدھ نہیں ہفتہ تھا۔ جب ہی موسیٰ خان کے ہر کام میں سستی بھری تھی۔ جاتی گرمیوں کے گھٹن زدہ دن تھے۔ گرمی جاتے جاتے بھی زور دکھا رہی تھی۔ وہ سکون سے مچھلی فارم گیا۔ وہاں پانی کے انتظام کے لیے لگے ٹیوب ویلوں پر نہایا۔ ملازموں سے مچھلی گھر کے لیے لی اور جیپ گاؤں کے طرف دوڑا دی۔ صندلی اپنے گھر کے دروازے کے سامنے پانی کا چھڑکاؤ کر رہی تھی۔ کیونکہ اس کا ابا شام کو یہیں استراحت فرماتا۔ اسے دیکھ کر وہ ہوا میں اچھل اچھل کر روکنے لگی۔ وہ بمشکل رکا۔

"خان جی! کدی ساڈے ڈیرے دی چکر لگالیا کرو سرکار۔"

"کیوں۔۔۔؟ گل باز نئیں آتا کیا؟" تیوری چڑھا کے پوچھا۔

"آتا ہے بادشاہو۔ آتا ہے مگر دل آپ کی میزبانی چاہتا ہے، لیکن لگتا ہے کہ آپ کو کوئی چوہدرائن پسند آگئی ہے۔" موسیٰ نے کرنٹ کھا کر اسے دیکھا۔ وہ پراسرار سا مسکرائی۔ "ہرمن سنگھ۔۔۔ اگلے ہی لمحے وہ جست لگا کر جیپ سے اترا اور غرا کر صندلی کی طرف بڑھا۔ وہ خوف سے سپید پڑ گئی۔

"مجھے گل باز سمجھنے کی غلطی کبھی مت کرنا صندلی۔ اس بات کا طعنہ مجھے ولایت خان بخش بھی دے ناں تو میں نمٹ لوں اس کی پوری فوج سے۔ جتنا دھندا چل رہا ہے ناں اتنا ہی چلا۔ بڑی مچھلی کی ٹوہ میں کہیں جال ہی نہ گنوا بیٹھیں۔" سارا محلہ سانس روکے دیکھتا رہا اور موسیٰ خان اپنے بھیدی ہرمن سنگھ کے سرہانے جا پہنچا۔



"مجھے نئیں کھانا یہ سبز چارہ۔۔۔ کوئی ڈھنگ کا انسانوں والا کھانا پکایا کرو گھر میں۔" وہ گھر میں ساگ چکھے بنا چھوڑ آیا تھا اور جنت نے آتے ہی کٹورا سامنے کیا۔

"جنت کا موسیٰ۔" یہ ان دونوں کا دلار تھا، لاڈ تھا، مگر موسیٰ ساگ دیکھ کر سانس روک گیا۔

"موسیٰ کی جنت۔" اس نے اپنے باغ کے چار کچے سنگترے اس کے سامنے کیے۔ جنت نے چٹخارہ لیا۔ موسیٰ نے اس کا انداز دیکھا اور سرشار ہو گیا۔۔۔ اتنا کہ ساگ بھی کھانے لگا۔۔۔ یہ محبت کے مارے بھی ناں۔

"موسیٰ! یہ تمہاری ہماری لڑائی کیسے ہوئی تھی؟" جنت نے انگلی پر لگا کھٹا سنگترہ زبان سے چوسا۔

"ڈاہر یگدا (ہم چھوڑو۔)"

"کیا؟"

"مطلب تو کیا کرے گی جان کر۔" وہ ساگ سے نبرد آزما تھا۔

"تو بتا تو۔"

"وہی جو پنجاب میں اسی فیصد دشمنیوں کی وجہ ہوتی ہے۔ یعنی تیرے ظفر پا جی نے ہمارا پانی توڑا تھا۔ اس سال ہم نے سارا سرمایہ منجن (دھان) پر لگایا تھا۔ فصل تیار کھڑی تھی، پانی نہ ملتا تو ہم تباہ ہو جاتے مگر وہی ہوا چوہدریوں نے اپنا آپ دکھا دیا۔۔۔ بس پھر ہو گئی لڑائی شروع۔ ہم نے تمہارا، ہم نے ہمارا۔۔۔"

"پانی کہاں سے توڑا تھا؟"

"وہ کھوہ (کنواں) والی کھیت سے۔"
"صوفی صاحب کے گھر کے سامنے سے؟" وہ چونک کے بولی۔
"ہاں تب صوفی صاحب کی بڑی صاحبزادی کی مایوں تھی۔"
"اور ہم سب لڑکیاں ڈھولکی پر گئی تھیں اور جب واپسی کے لیے مڑیں تو میں بڑے نکے (نالے) پر کسی کو پانی توڑتے دیکھا تھا مگر وہ ظفر پاجی تو نہ تھے۔" وہ جیسے خواب میں بول رہی تھی۔ وہ منظر اسے ویسا ہی یاد تھا جس میں کچھ بھی چونکا دینے والا نہ تھا سوائے اس نیم تاریک وجود کا خود کو سرکنڈوں میں چھپانا۔ سب سے آخر میں چلتی جنت نے اس شخص کے اس فعل کو حیرت سے دیکھا مگر تب وہ آٹھ سال کی تھی اور اپنی امی کے دوپٹہ کھینچ کے رونے لگی تھی سب سمجھے وہ ڈر گئی ہے مگر وہ تو الجھ گئی تھی۔
"موسیٰ... موسیٰ وہ ظفر پاجی نہیں تھے۔" اس نے گویا دھماکا کیا۔
"سارے چوہدری یہی کہتے ہیں۔" اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔
"میں جھوٹ نئیں کہتی موسیٰ میں نے اس شخص کو خود دیکھا تھا وہ کوئی اور ہی تھا۔"
"اچھا۔ پھر کون تھا؟" موسیٰ نے کھانے سے ہاتھ کھینچا۔
"وہ... وہ... پتا نئیں پر وہ ظفر پاجی نہیں تھے۔"
"چل چھوڑ یہ ہیر را نجھا جنت فاطمہ... تیرا ساگ اچھا تھا۔" وہ اٹھنے لگا۔
"تجھے لگتا ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں۔" وہ تیز آواز میں بولی۔ وہ تڑخ گیا۔
"اگر تو سچ بھی کہہ رہی ہے تو پھر میں اس سچ کا کیا کروں؟" جنت کو اس سے اس بے نیازی کی توقع نہ تھی۔ وہ غصے میں پاگل ہی ہوگئی۔
"تو کچھ نہ کر... چل کے اپنے دا جان کے جوتے سیدھے کر اور میں یہاں ان کے مان بڑھاتی ہوں اور کیا ہونا ہے۔ کل کو آجائے کوئی چوہدری میرا دعوے دار بن کے پھر تو بھی آجانا بتاشے کھانے۔"
"میں آگ نہ لگادوں ان سارے چوہدریوں کو۔ اک بات میری یاد رکھ ان سب چوہدریوں کی موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے یہ تو پکی بات ہے مگر ذرا جو تیری طرف دیکھا بھی کسی چوہدری نے۔ قسم سے میں آری سے چھید دوں گا بے غیرتوں کو۔"
"تو گالی دے رہا ہے... مجھے میرے بھراؤں کو گالی دے رہا ہے موسیٰ۔ تیرے دل کی کالک ابھی بھی ویسی ہی شدید ہے..." پہلے وہ صدمے سے گنگ ہوئی پھر غصے میں پاگل۔
"تو مارے گا انہیں... ہاں تو مارے گا چوہدریوں کو۔ چل نکل یہاں سے۔ دفع ہو۔" اس نے موسیٰ کو پیچھے دھکیلا وہ چھت سے گرتے گرتے بچا تو دماغ اس کا بھی الٹ گیا۔
"تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔"
"تو نے مجھے اتنا بے غیرت سمجھا ہے کہ میرے سامنے میرے بھائیوں کو مارنے کی بات کرے اور میں بیٹھی تیری مردانگی پر واہ واہ کرتی رہوں۔ میں ہی خائن تھی جوان کو دھوکا دے کر تجھے سینچتی رہی۔ ابھی جا اور کبھی ادھر مت آنا ورنہ شور مچا کر سارا پنڈ اکٹھا کرلوں گی۔"
"صحیح... بڑے وقت پر اصلیت دکھا دی جنت فاطمہ نے۔ ورنہ میں اپنے ہی خون سے جنگ کرنے چلا تھا۔ کتنا نامرد تھا میں جو ایک عورت کے پیچھے ساری سدھ بدھ کھوئے جان ہتھیلی پہ سجائے ہر ہفتے دشمن کی کچھار میں آتا تھا۔ لعنت ہو مجھ پر... اور یاد رکھنا مجھے کوئی شوق نہیں ساری عمر یہ دیواریں پھلانگ کر لنگڑا ہونے کا۔ تف ہے مجھ پر۔" معاملہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگیا۔
"لعنت تجھ پر نہیں۔ لعنت ہو مجھ پر جو آدھی رات کو جان دینے والے رشتوں کی عزت گروی رکھ رکھ تجھ سے ملنے آتی رہی لعنت ہو تو مجھ پر۔ اب دفع ہو جا یہاں سے اور کبھی شکل مت دکھانا۔" موسیٰ کو ایک دھکا اور پڑا تھا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں جا رہا ہوں۔ اب آؤں گا بھی نہیں۔ اچھے بھلے نیلے سبز گھر کے شربت چھوڑ کے ان کھارے سیاہ پانیوں کا شوق چڑھا تھا مجھے۔ میں کہتا ہوں لعنت ہو مجھ پر اور میری زندگی کی سب سے غلطی پر بلکہ۔۔۔ گناہ پر۔" اشارہ آنکھوں کا تھا۔

"مجھے بھی گھر کی سنہری گندم چھوڑ کے ان اجلے بادلوں کو چکھنے کا لالچ ہوا تھا۔ اب بھگتا لیا ناں۔ میں کبھی پلٹ کے تجھے نہ دیکھوں گی موسیٰ اور تو بھی اپنے گناہ کو دہرانے کبھی ادھر مت آنا۔"

سرخ آنکھیں، بھنچے جبڑے، تنے اعصاب وہ شدید مشکل میں تھی۔ موسیٰ نے "دیکھ لیں گے" والے کینہ توز انداز میں اسے دیکھا اور دیوار سے چھلانگ لگا دی۔ وہ ضبط کرتی کرتی پڑتی سیڑھیوں تک آئی جہاں ہمیشہ کی طرح نیلماں اونگھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ بھی جلدی سے اٹھی۔

"مر گیا کمینہ۔" نیلماں نے "ہیں" والے انداز میں اسے دیکھا۔

☼ ☼ ☼

پہلے پانچ دن وہ بہت زعم لیے بڑبڑاتی پھری۔ خانوں کے آبا کی قبروں تک کو لات رسید کرنے والی حالت میں رہی۔ گھڑی گھڑی "اس" پر لعنت بھیج کے خوش و خرم رہنے کو ہر وہ کام کرتی رہی جو پچھلے چھ ماہ سے اس کی وجہ سے تاخیر کا شکار تھے۔ مثلاً" اس نے شیریں کی شادی پر پہننے کے لیے زرتار شرارہ، دررزن کے سر پر بیٹھ کے مکمل کروایا جو کہ آپا جی کو بالکل پسند نہ آیا۔ سردیوں کے نئے کپڑے بھی خرید لائی اور سینے کو بھی دے ڈالے، مگر چھٹے دن صبح اٹھتے ہی وہ معمولی سی بات پر چڑی کہ ایک ماہ بعد اس حویلی سے رخصت ہو جانے والی شیریں سے بھی الجھ پڑی۔

ساتویں دن سفینہ بھرجائی کے بھائی کا اٹلی سے بھیجا "ٹی سیٹ" توڑ بیٹھی اور ان کے بولنے سے پہلے ہی پھٹ پڑی۔

"اب آپ بھی کہہ لیں مجھے غلط۔ میں ہوں ہی

ایسی۔۔۔ آپ سب کی ناک میں دم کردینے والی۔۔۔ اے کاش اماں نہ مرتیں۔۔۔ اے کاش ابا مجھ سے یوں غافل نہ ہوتے۔۔۔ اے کاش میں بھی اپنے گھر والی ہوتی۔“

آپاجی کا تسبیح گھماتا ہاتھ کانپ اٹھا تھا۔ یہ خود ترسی جنت میں پہلے تو کبھی نہ دیکھی۔ رات بہوؤں کے سامنے ہاتھ جوڑ بیٹھیں۔ وہ الگ حق دق۔۔۔

”آپاجی ہمیں تو شیریں ' بشریٰ سے بڑھ کر ہے۔ ہم نے تو کبھی۔۔۔“ وہ جو سات دن ' زبان سے ہر کسی کو نیل و نیل کررہی تھی ' آٹھویں دن مردوں کی سی خاموشی تان کے بیٹھ گئی۔ صاحب جان کی حویلی سے کھیر آئی تھی۔ ساری لڑکیاں پیپل کے نیچے دھری چارپائیوں پر کھیر کے ساتھ مصروف ' صاحب جان کا احوال دریافت کررہی تھیں۔ آپاجی کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

”بہن کو دیکھے تو مدتیں ہوگئیں۔۔۔ سوچا تھا بھانجی کو تو دیکھ پاؤں گی تو وہ بھی فالج سے چارپائی کی ہوگئی۔۔۔ چلو رب دی رضا۔“

ولایت خان بنگش کی زوجہ کنیز ' آپاجی کی بڑی بہن تھیں۔ صاحب جان ' آپاجی کی بھانجی تھیں۔ شدید خاندانی دشمنی کے باوجود وہ خالہ سے کنارہ کشی نہ کرسکیں ' مگر اب وہ خود بیماری کا شکار تھیں تو آپاجی اکثر یوں ہی آہیں بھرتی رہتیں اور مردجان کے انجان بنے رہتے۔

”جنت پتر۔۔۔ ادھر آبالوں میں تیل ڈال دوں پھر نہا لینا۔ کل جمعرات ہے۔ اس واسطے کل ہرگز نہ نہانا۔۔۔ چل اٹھ شاواش۔“ آپاجی اسے پچکار رہی تھیں اور وہ جو بدھ کو بھولنے کے لیے سب جتن کررہی تھی ایک دم چیخ گئی۔

”نہ۔۔۔ مجھے نئیں لگوانا تیل۔ بال خراب بھی ہوگئے تو کیا ہے ' امیتوں کون سا نیلام گھر وچ بالوں سے ٹرک کھینچنا ہے۔“ لڑکیاں زور سے ہنس دیں۔ آپاجی تلملائیں۔

”آپا وڈی کی زبان تو دیکھو ' کیسے بات کو کاٹ کاٹ رکھتی ہے ' ذرا جو لحاظ کرجائے۔ دیدوں میں ذرا شرم نہ رہی اس کے۔“

”ہاں تے ٹھیک ہے ' میں ہی بے شرم ' بدلحاظ اور ساری کی ساری بری ہوں۔ کیا ضرورت ہے مجھ سے بات کرنے کی کسی کو۔ کوئی گل نہ کرے مجھ سے۔ میں ایسے ہی بھلی۔“

وہ زور و شور سے رونے لگی۔ لڑکیاں کھانا پینا چھوڑ ' بھاگ کے آئیں ' مگر وہ کمرہ بند ہوگئی۔ رات کو جب میاں جی نے دروازہ کھلوایا تب تک وہ شدید بخار میں مبتلا ' مرنے والی ہورہی تھی۔



”او موسیٰ۔۔۔ ادھر آ۔ او کیا ہوا ہے تجھے؟ کتنے دنوں سے دیکھ رہا ہوں ' ہر کسی کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ دتے کو تین بار مارا ہے تو نے اور فضل نائی بھی کہہ رہا تھا کہ تو خط بنوانے گیا تھا اور چھوٹی سی بات پر اس کی درگت بنا کے آگیا ہے۔ گھر میں شاہ زینہ کو بھی صبح بے وجہ ڈانٹ رہا تھا۔۔۔ خیر تو ہے؟ اتنی گرمی کیوں کھا رہا ہے؟“ ضمیر لالہ سخت لہجے میں دریافت کررہے تھے جس کا وہ عادی نہ تھا۔

”کچھ نہیں ہوا۔ کیا ہونا ہے مجھے۔ وہ تو دتا بھوری کو زنجیر سے ماررہا تھا تو میں نے منع کردیا بس۔۔۔ لالہ آج میں پانی پہ نہیں جاؤں گا تو اقبال اور گل باز کو بھیج دینا۔ ہرمن میرے ساتھ ایک یار کی مہندی پر جائے گا۔“

”وہ تو صحیح ہے ' مگر تو سچ بتا کہ معاملہ کیا ہے۔ تین بار تو تیرا ہاتھ ہی کٹا ہے کام کرتے ہوئے اور یہ بڑبڑاتے ہوئے دیواروں کو لاتیں کس کے نام پر رسید کرتا ہے؟“ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا جو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”دیکھ اگر چوہدریوں کا معاملہ ہے تو پھر خاموشی بے وقوفی ہے۔ جانتے ہو ناں کہ وہ کتنے سفاک اور گھاگ ہیں۔ پیچھے سے وار کرتے ہیں۔ اس لیے کہہ رہا ہوں اگر طارق نے کوئی چبھتی ہوئی بات کہہ دی ہے تو ہمیں بتا ' ہم خود دیکھ لیں گے ' خود سے کوئی قدم نہ اٹھانا۔“

”وہ کتنے سفاک ہیں اسی بات کا تو رونا ہے۔۔۔ میں خود دیکھ لوں گا اگر ضرورت پڑی تو آپ پریشان نہ ہوں۔“

ہرمن نے تاسف سے سر ہلایا۔ وہ چوہدرائن اس جوان کی جڑوں میں بیٹھ گئی ہے' یقیناً اس نے یہی سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

دو ہفتوں میں اس کی ساری اکڑ نکل گئی تھی۔ بخار تھا کہ جان نہ چھوڑتا۔ وہ تھی کہ چپ نہ ہوتی۔ آپا جی نے سب ڈاکٹر حکیم بلا ڈالے۔ رام پور کے گرد و نواح کا ہر مزار چراغ سے روشن کر ڈالا' مگر وہ دن بہ دن مایوس ہوتی گئی۔

"نیلماں اب اگر کبھی نظر آیا وہ مجھے تے میں کبھی پہچانوں بھی ناں اسے۔ اللہ کرے مرجائے کمینہ۔" وہ ہچکیوں میں کہتی۔

"کہتا تھا جنت رو کے دکھا۔ اب روتی ہوں تے دیکھنے ہی چلا آئے۔" نیلماں خاموشی سے سنے جاتی۔

"نیلماں' بھلا موسیٰ اوی جنت کو بھول سکتا ہے؟"

"چل غلطی میری ہی سہی پر کچھ کہے تو۔" جیسے جیسے دن گزر رہے تھے اس کی چپ طویل ہو رہی تھی۔

اس دن ظفر باجی کی تشویش بڑھی تو اسے شہر لے گئے۔ دو دن وہاں رہنے کے بعد وہ کچھ بہتر ہوئی تو واپس لے آئے۔ رام پور کے داخلی راستے پر بارات کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ نک سک تیار باراتی' ڈھول تاشے۔ وہ خالی خالی نظروں سے سب دیکھ رہی تھی۔

گاؤں کو مڑنے والی گاڑیاں ہولے ہولے رواں تھیں۔ ایک لمحے کو اسے دوسرے گاڑی کا شیشہ نظر آیا تھا اور وہ تھم گئی۔ موسیٰ ساتھ بیٹھے' گاڑی چلاتے لڑکے سے بات کر رہا تھا۔ چہرہ دوسری طرف تھا' مگر اس نے پہچان لیا۔ وہ جھلایا ہوا دکھتا تھا۔ ظفر باجی نے مقبول کو گاڑی آگے کرنے کو کہا اور گاڑی کو جھٹکا لگا۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی' مگر موسیٰ نے دیکھ لیا اسے لگا جیسے جنت کی آنکھوں میں پہچان کم تھی۔ اس نے زریاب کو گاڑی آہستہ کرنے کو کہا تاکہ چوہدریوں کی گاڑی گزر جائے۔ اک بے چینی تھی جس نے روم روم پہ قبضہ کیا تھا۔ ایسی بے چینی جو فیصلہ کن تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن نیلماں اسے کھینچ کھانچ کے چھت پر لائی تھی۔ جہاں سب لڑکیاں چار پائیوں پر بیٹھی مالٹے کھا رہی تھیں۔ سردیاں اب شدت پکڑ چکی تھیں۔ سارے رام پور پر کہر چھایا رہتا۔ وہ سیاہ شال کو خود پر لپیٹے سب کے ساتھ شریک ہو گئی۔ لڑکیاں اگلے ماہ ہونے والی شیریں کی شادی کے لیے خاص تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ ان کی باتوں سے اکتا کر گڈو کے گھر میں جھانکنے لگی۔ خالہ گندم دھو کے پھیلا رہی تھیں اور وہ یقیناً "سوہن حلوہ بنانے والی تھیں۔ جنت منڈیر پر ٹک گئی۔ ہتھیلی کو گال پر جمائے وہ خالہ کو دیکھتی رہی۔ بمشکل چالیس کی خالہ کو بیوہ ہوئے بھی چھ سال ہو چکے تھے۔ کیسے ظالموں نے دن دیہاڑے ان کے کارخانے میں گھس کر انہیں مارا تھا اور جواباً" انہوں نے جیل میں قید ان کے بندے کو مروا دیا پھر سب یوں ہی چلنے لگا۔ گولی دونوں طرف سے چلتی اور زد میں زیادہ تر مزارعے ہی آتے کبھی ادھر کے' کبھی ادھر کے۔

نظریں تھک گئیں تو یوں ہی زاویہ بدل ڈالا۔ صاحب جان کی منڈیر پر کہنیاں جمائے وہ جانے کب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے شال کو آدھے چہرے پر کیا۔ موسیٰ نے ابھی تک صرف اس کا آدھا چہرہ ہی دیکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ شال سیدھی کرتی بھی تو وہ پل بھر کے لیے ہی ہوتا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ چوکنا ہو گیا۔ دونوں ہاتھ فضا میں یوں اٹھائے جیسے "ہار" جانے والے اٹھاتے ہیں۔ وہ مڑنے لگی تو دونوں ہاتھوں سے کان چھوئے۔ وہ پھر بھی مڑ گئی۔ اس رات ہفتوں بعد جنت نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

بلے بلے نی قتل کرا دیویں گی
کلی ڈاء ایا گلی دے وچ چڑنہ

بشریٰ پلنگ کے تختے پر بے ہنگم ہاتھ مار مار کر گنگنا رہی تھی۔ شیریں' مقصوداں سے سر پر مساج کروا رہی تھی۔ نیلماں ریڈیو کی فریکوئنسی سیٹ کر رہی تھی اور

وہ چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی جب گڈو منقش دروازے کے ساتھ آن کھڑا ہوا۔ سب نے مڑ کر دیکھا سوائے جنت کے۔

"جنت باجی... جنت باجی ذرا ادھر آؤ۔ گل کرنی ہے۔" جنت یوں اٹھی جیسے اس لمحے کو پوروں پہ گن رہی ہو۔ شیریں مشکوک ہوئی۔

"گڈو ادھر آ ذرا۔"

"ٹیم نئیں ہے مجھے۔ بس جنت باجی سے ریاضی کا اک سوال سمجھنا تھا۔" شیریں دبک گئی مبادا اسی سے کچھ نہ پوچھ لے۔ ریاضی تو شادی کروانے سے بھی مشکل تھا۔ جنت اسے بازو سے پکڑ کر پیپل تلے لے آئی۔

"ہوں بتا... کیا کہنا ہے؟"

"وہ موسیٰ خان کہہ رہا تھا کہ وہ... بدھ کو آئے گا پرانی حویلی۔"

"کیا... بس یہی کہا؟" وہ حیران ہوئی' معافی تو مانگی نہیں۔

"ہاں بس اتنا ہی کہا۔ مرنے والا لگ رہا تھا قسمے رب دی... جنت باجی تو اس سے مل لینا نئیں تو رام پور کی ہر دیوار میں اس کا سر چھپا ہوگا۔"

"نئیں... سوچوں گی۔ تو جا اور ہاں کسی کو بتانا نئیں ورنہ تیرا موسیٰ تے پکا مرے گا۔" وہ منہ بسور کے چلا گیا۔ جنت کچھ سوچ کے مسکرائی تھی۔



چاند نے ہفتوں بعد مندی مندی آنکھیں کھولی تھیں۔ رام پور کی پوری فضا خنک زدہ ہو رہی تھی۔ چوپال میں بیٹھے ہرمن سنگھ نے تان لگائی۔

یا جاگدا پروردگار راتیں
یا جاگدا پہرے دار راتیں
یا جاگدا عشق دی رمز والا
وارث میاں سب سو جاندے
بس جاگدا یار دا یار راتیں

جنت کو اپنی پشت پر قدموں کی چاپ محسوس ہوئی۔

دل چاہا مڑ کے دیکھ لے' مگر وہ گردن اکڑا کے بیٹھی رہی۔ وہ سامنے منڈیر پر آن بیٹھا۔ ایک جھجک سی تھی جو دونوں کے رویوں میں تھی۔ ایک سرخوشی تھی جسے دبائے وہ دونوں الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔

"اگر اس بدھ بھی میں نہ آتا... تو تو مر جاتی۔" اس نے آدھے چہرے پہ ٹھنڈی بیماری دیکھ لی۔

"شکل دیکھی ہے اپنی؟" گردن کی اکڑ وہی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرایا۔ سر جھٹک کے بولا۔

"نئیں دیکھی... مدت ہوئی آئینہ کسی اور کی شکل دکھاتا ہے مجھے۔"

"اب جتنے بھی الفاظ بول لے موسیٰ خان بنگش' میں یہ کبھی نئیں بھولنے والی کہ تو نے مجھے اپنی زندگی کا گناہ کہا تھا۔"

"اور تو نے مجھے تین دھکے دیے تھے جنت فاطمہ چوہدری۔ الفاظ اتنا ذلیل نہیں کر سکتے۔" دونوں نے خاموشی سے الفاظ ڈھونڈے۔

"مجھے لگا... اب تو کبھی نئیں آئے گا ادھر۔"

"اور مجھے لگا... تیری زبان سے زیادہ کڑوا تیرا دل ہو گیا ہوگا میری طرف سے۔"

"تو سچ میں میرے بھائیوں کو مارے گا موسیٰ؟"

"او نئیں... وہ بس ایویں کہہ دیا تھا ورنہ تو جس دن پہلی بار تجھ سے ملا تھا اسی دن سوچ لیا تھا کہ یہ دشمنی بڑھاؤں گا نہیں' ہو سکے تو کم ہی کروں گا۔ تو بس یہ بتا کہ موسیٰ کو پھر کبھی ایسی سزا نہیں دے گی ناں؟ باقی جو سوچ کر آیا تھا... سب بھول گیا حالانکہ تین تین بار ایک لائن دہرائی تھی کل رات..."

جنت کی ہنسی نے فضا میں موجود دھند کے رتھ پر سوار ہو کر پورے رام پور کو اس بات کی رضا مندی پہنچا دی کہ اب مر کے بھی یہ ستم "خود" پر نہیں کرے گی۔



ہوائیں اپنے ساتھ خوشیاں لیے گھومتیں' آتے جاتے اس پر لٹاتیں۔ اس کی کھلکھلاہٹیں روشا

زمین پر امید بڑھا دیتیں۔ کوئی اندھا بھی ہوتا تو ان کی محبت دیکھ لیتا۔ کوئی بہرہ بھی ہوتا تو ان کی محبت سن لیتا۔ پھر بھی جنت اگر انگلیوں پر گنتی تو معلوم ہوتا کہ موسیٰ نے کبھی سیدھے لفظوں میں محبت تحفہ نہ کی تھی اور خود وہ الفاظ کے ہیر پھیر سے بھی دور رہا تھا۔ پھر بھی ان دونوں کے درمیان محبت ٹھاٹھیں مارتی تھی۔

"آپا جی مہندی لگا دو۔" وہ منڈیر سے جھانک کے بولی۔ مامیاں حیران رہ گئیں۔ یہ باؤلی ہو گئی ہے۔ اتنی ٹھنڈ میں مہندی......!

آپا جی اس کی بیماری کے بعد سے بہت محتاط ہو گئی تھیں۔ فوراً" ہاتھ پکڑ کر اس پر گول دائرہ بنانے لگیں۔ مہندی لگانے کے بعد بولیں۔

"ہم بھی تھوڑی دیر بعد جا کر اتار لینا میری دھی۔ اتنی ٹھنڈ میں سرسام ہو جاتا ہے اوپر سے شام ڈھل رہی ہے۔" وہ سر ہلانے لگی۔ اتنے میں ظفر باجی کامی کو مارتے ہوئے تخت تک لائے۔ اسے تخت پہ اچھال کے وہ جانوروں کی طرح زدوکوب کرنے لگے۔ کامی کے ناک منہ سے خون ابل پڑا۔ خواتین کی چیخیں نکل گئیں۔

"یہ ان دشمنوں سے یاریاں لگانے چلا ہے جن کا خون ہم اپنے کتوں کو پلائیں۔" کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا مگر جنت سن رہ گئی۔

"یہی ہاتھ پکڑا تھا ناں تو نے ضمیر دے پتر دا...... میں یہ ہتھ ہی کاٹ دوں گا۔" وہ اسے کھینچ کر دور لے گئے پھر جھانجویں سے اس کا ہاتھ رگڑنے لگے۔ اتنا کہ کامی کے ہاتھ سے خون نکل آیا۔ میاں جی نے ظفر باجی کو بمشکل سنبھالا اور سرفراز ماموں کامی کو مرہم پٹی کے لیے لے گئے۔

"بس مجھ سے برداشت نہیں ہوتا میاں جی۔ میرا بس نہیں چلتا کہ میں ان کے کلیجے نکال لوں۔" وہ کف اڑا رہے تھے۔ میاں جی انہیں مردان خانے لے گئے۔ خواتین ادھر ادھر ہو گئیں، مگر جنت ساکت رہی۔ اتنی نفرت۔ اف...... آج اس نے جان لیا کہ اس دن موسیٰ کو کیا لگا ہوگا۔ آپ ایک لمبے سفر پر نکلے ہوں، پاؤں چھالوں سے بھرے ہوں اور آدھے سفر میں جا کے آگے سے راستہ بند ملے تو آپ کیا کریں گے؟ وہ اٹھ کے چھت پر چلی آئی۔ موسیٰ آیا۔

"پھر مہندی لگالی۔ تجھے پتا ہے ناں مجھے زہر لگتی ہے اس کی بو۔" وہ اسے دیکھتی رہی۔ بولی۔

"موسیٰ...... چل بھاگ چلتے ہیں۔ کہیں بہت دور۔ تو چاہے تو مجھے کوہاٹ لے جا۔ میں رہ لوں گی۔ تو کہتا ہے ناں کہ مجھے تجھ سے محبت نہیں...... لے آج بولتی ہوں کہ محبت ہے۔ اب تو لے جا۔"

"جنت!" موسیٰ کا لہجہ سرسرایا۔ جان گیا کہ جنت کس لمحے سے گزر رہی ہے۔

"تو جذباتی ہو رہی ہے، کچھ لمحوں میں ٹھیک ہو جائے گی۔"

"آج میں نے جان لیا موسیٰ کہ ہم ریت پر انار اگا رہے تھے۔ ہم کبھی ایک نہیں ہو سکدے موسیٰ۔"

"مقتول بہت بڑی للکار ہوتا ہے...... وہ اپنا خون رشتوں کی رگوں میں چھوڑ کے جاتا ہے اور پھر...... وہ خون اس للکار کو کبھی مدھم نہیں پڑنے دیتا۔" وہ جیسے خود سے کہہ رہا تھا۔

"تو پھر تیرا خون کیسے ٹھنڈا ہو گیا؟ تجھے مجھ سے محبت کیسے ہو گئی موسیٰ؟"

"بس ہو گئی ناں...... بس ہو گئی۔" وہ جیسے کراہا۔

"اگر میرے بس میں ہوتا ناں تو میں اپنی رگیں چھیل کر یہ محبت بہا دوں خود میں سے...... پر یہ بس میں ہی نہیں۔"

"میرا کیا ہو گا کبھی یہ سوچا ہے موسیٰ خان؟"

"سوچا...... بہت سوچا، مگر میرے اندر کی ہر آواز جیسے گونگی ہو گئی۔ ایسا سناٹا چھایا کہ مجھے قبر سی ٹھنڈک کا احساس ہوا...... گولی چلانے والوں کو الفاظ کی ہمیشہ کمی رہی ہے۔ تو بس میری ہے جنت...... یہ وعدہ رہا۔" اور جنت ہر محبت کرنے والے کی طرح الفاظ پر بھروسا کر بیٹھی کیونکہ سامنے والے کی آنکھوں میں جھوٹ کی گنجائش نہ تھی۔



زندگی اسے صرف دے ہی رہی تھی اور وہ آنے والے کل سے بے خبر' وقتی خوشیاں 'سمیٹ سمیٹ' دامن سجاتی جارہی تھی۔

"جنت! منزل کو مڑتی آخری گلی۔" وہ واپس آتی مارچ کے خوشبو بھرے دنوں پر نثار ہوتے ہوئے بولا۔

"موسیٰ... کسی قفل زدہ قلعے کی اکلوتی کھڑکی۔" وہ بھی اترا کر بولی۔

"جنت... بند آنکھوں کے پیچھے چمکتے نور جیسی۔"

فضا میں تیرتی چاندنی نے سازِ عشق پر جھومنا شروع کیا۔ چاہنے والوں کو الفاظ غلام ملے۔

"موسیٰ... کسی ساحر کی آنکھوں کے سرور جیسا۔"

"جنت... جنون کو عشق کرتی اجازت۔"

"موسیٰ... موت اور عشق کے درمیان حد فاصل۔" مسکراہٹیں بار بار ان کا منہ چومتیں۔

"تو میرا عشق... اور ہم... اک دوجے کے دشمن۔" وہ کھلکھلا کے ہنسے اور تقدیر کی ہنسی کی جانچ سے محروم ہی رہے... ہمیشہ کی طرح۔



ہجویری شاہ کا میلہ گزر گیا۔ جنت کو اس بار پھر سبز کانچ کی چوڑیاں ملیں۔ میلے کے بعد آم کے باغوں پر پہرہ بڑھ گیا۔ خانوں اور چوہدریوں کی کئی بار جھڑپیں ہوئیں۔ جنت ہول اٹھتی' ہر بات آئی گئی ہو جاتی۔ وہ امتحانات سے فارغ ہوئی تو میاں جی نے لڑکیوں کے لیے بر دیکھنے کا اجازت نامہ آپا جی کو تھما دیا۔ باقیوں کے برعکس وہ بولائی بولائی پھرتی۔ طارق بڑی مامی کے کمرے میں گھسا رہتا' وہ مزید ہولتی۔ اس دن ساری دوپہر تپتی لو چلی تھی۔ سہ پہر بھی گھٹن لیے اتری۔

"لگتا ہے آندھی آئے گی یا پھر بارش۔" بشریٰ کے اپنے ہی اندازے تھے۔ وہ چیخ گئی۔

"اللہ نہ کرے... بدھ کو کوئی آندھی' کوئی بارش رام پور کا رخ نہ کرے۔ مر مر کے تو یہ دن آتا ہے۔" وہ بڑبڑا کے چھت کو جاتی سیڑھیوں پر آن بیٹھی۔ سارے گھر میں نیلماں کی سہمی آواز اس کا نام جپتی پھرتی۔ وہ وہیں سے ہانک لگانے لگی۔

"جنت... جنت' غضب ہو گیا۔"

"موسیٰ تے ٹھیک ہے ناں؟" ہائے' اس باوفا کی فکریں۔

"جنتے... میں نے ابھی ابھی طارق پا جی کو کسی سے بات کرتے سنا ہے... جنت یہ لوگ' یہ لوگ گل باز کو مارنے والے ہیں آج رات' جب وہ پانی پر جائے گا۔ طارق پا جی نے ظفر پا جی کو بتایا ہے کہ انہوں نے بندے منگوا لیے ہیں چوراسی چک سے۔" وہ بے ساختہ اٹھی۔ زرد رنگت اور چھوٹتے پسینوں کے ساتھ وہ چھت کو بھاگی تھی۔



"تو جنت بی بی! دن دیہاڑے اس پٹھان کو قتل کروانے کا پکا عہد باندھ چکی ہیں جو اس وقت بلاوا بھیجا... ویسے تو..."

"موسیٰ... گل باز... گل باز کو بچا لے۔"

"کیا ہوا جنت!" وہ بے یقین ہی رہا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔

"چوراسی چک سے بندے آ گئے ہیں۔ کھیتوں میں کہیں گھات لگی ہے آج پانی پہ نہ جانے دے اسے... طارق کی بات نیلماں نے خود سنی اور..." وہ درشتی سے مڑا اور جنت نے ہر پیمان توڑ کر اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا... اک ایسی زنجیر سے اسے باندھا جو وہ جھٹک بھی نہ پاتا... توڑنا تو دور کا خیال۔

"کچھ ہو گیا... مطلب کچھ بھی تے' مجھے چھوڑ تو نہیں دے گا؟" لرزتے لہجے میں یقین دہانی چاہی۔ موسیٰ بے بس ہوا۔ وہ کلف سی اکڑی ہوئی لڑکی' کیسے حالات کو لاچاری سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لب کھلے۔

"تو دعا کر... "کچھ" "نہ ہو" کوئی عہد نہ باندھا۔" جنت نے ہاتھ کھینچے اور وہ دیوار سے کود گیا۔ آج وہ "یہ مرے گا" کہنا بھول گئی' مگر تقدیر کچھ نہ بھولی تھی۔



عصر کا وقت ابدیت کی کوکھ میں جا سویا اور مغرب کا وقت طلوع ہوا۔ اک مدت سے رب کو بھولی جنت، سوکھے ہونٹوں کو مسلسل جنبش میں رکھے ہوئے التجائیں کر رہی تھی۔ آپاجی، ماسیوں کو خوشی خوشی بتا رہی تھیں کہ آج جنت نے پورے پانچ ماہ بعد نماز پڑھی ہے۔ اس نے شرمندگی سے مزید سر جھکا لیا۔

"میرے اللہ، وہ مجھے تجھ سا پیارا نہیں۔۔۔ مگر تو جانتا ہے ناں کہ میری سانسیں اکھڑ جائیں اگر اس کے نہ ہونے کا تصور بھی ہو۔ میں غلط کار و خطاکار، مگر تیری چاہت پھر بھی سب سے اوپر ہی ہے۔۔۔"

برآمدے میں بھاگتے قدموں نے جیسے بین مچا دیے ہوں۔ وہ چہرے پہ ہاتھ پھیر کے جائے نماز سے اٹھنے لگی۔ نیلماں اس کے کندھے پر جھک آئی۔

"جنت، تیری قسمت ہی خراب اے۔۔۔ تجھے خوشیاں راس ہی نہیں۔" وہ زار زار رونے لگی۔ جنت کی سانس رک گئی۔

"نیلو تجھے میری جنڈری دا واسطہ۔۔۔ کہہ دے موتی ٹھیک ہے۔ اسے تو کچھ نہیں ہوا ناں۔۔۔" نیلماں نے سر دائیں بائیں ہلایا۔

"سب الٹ ہو گیا۔ میاں جی لاہور گئے ہیں۔ انہوں نے گل باز کو مارنے کا سوچا۔ وہ تو کیا ہاتھ لگتا، الٹا تیری بدولت۔۔۔ موتی پکڑا گیا ہے پچھلی گلی سے۔ پرانی حویلی لے گئے ہیں اسے۔۔۔ طارق کہتا ہے تڑپا تڑپا کے مارے گا وہ خانوں کی "دستار" کو۔ جنت کچھ کر لے۔۔۔ کچھ کر لے۔" لمحہ لمحہ گھٹتی سانسوں کو بمشکل سینے میں دھکیل کے وہ اٹھی۔ پیپل تلے آپاجی تسبیح گھماتے ہوئے اسے آتے دیکھنے لگیں۔ وہ ان کے قدموں میں ڈھے گئی۔

"آپاجی۔۔۔ آپاجی، میاں جی کو بلائیں۔ اللہ کے واسطے میاں جی کو بلا لیں۔ میں مر رہی ہوں۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔ روکیں انہیں۔۔۔ مجھے بے رنگ نہ کریں۔۔۔ جنت کو بنجر نہ کریں۔۔۔" اس کی آواز بند ہو گئی۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے، ہاتھ بے جان، سرد ہو گئے۔ آپاجی کے واویلے نے حویلی میں موجود ہر نفس کو پیپل کی اور بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ کلہاڑیاں اور درانتیاں اکٹھی کرواتا طارق بھی ملازموں کو چھوڑ کر حویلی کے زنان خانے کو دوڑا تھا۔



موت رام پور کے چاروں کونے اسیر کیے منتظر بیٹھی تھی، مگر کسی کے کانپتے نیلے لب "حکم" کا رخ موڑے ہوئے تھے۔ حویلی کے مکین مگن سے اپنے اپنے بستروں میں دبکے تھے۔ وہ صحن میں اکڑوں بیٹھی تھی۔ نیلماں دائیں بائیں پھرتی، پھر اسے ہلا جلا کر دیکھتی۔ جانے کیوں اسے جنت پر لاش کا گمان ہوتا۔

"اسے درد ہو رہا ہے نیلماں۔۔۔ میرا بدن تو دیکھ، یہ نیلو نیل ہو گیا ہے اس کی تکلیف پر۔ تو بتا میں کیا کروں؟ تو نے کہا تھا کچھ کر۔۔۔ تو بتا کیا کروں، مجھے بڑا درد ہو رہا ہے نیلماں۔" وہ روئی تھی۔ نیلماں نے فیصلہ کرتے ہوئے اس کا بازو تھام کے اٹھایا۔

"میں تیری مدد کروں گی جنت۔۔۔ پر تو اک وعدہ کر۔۔۔"

"تو بول میں وعدہ کرتی ہوں کہ جو کہے گی، میں مانوں گی۔" وہ بول نہیں رہی تھی، وہ کراہ رہی تھی۔

"زبان دی ہے مجھے تو نے۔۔۔ آج کے بعد تو اس سے نہیں ملے گی!"

"نیلماں!" وہ ششدر رہ گئی۔

"تو پھر ملے گی، وہ پھر سے یہ درد سہے گا۔ جنت کبھی کبھی مجھے تجھ پر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اتنا چاہنے کے باوجود تو اسے ہر بدھ کو سولی پر ٹانگتی ہے۔ تو نے کبھی نہیں سوچا کہ وہ کیسے کیسے پل صراط گزر کے آتا ہے پرانی حویلی۔ یہ محبت آج نہیں تو کل اس کی جان ضرور لے گی۔ تو محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتی، ناں چھوڑ۔۔۔ پر ملنا چھوڑ دے۔"

"اس سے قیمتی جنت کے پاس کچھ نہیں نیلماں۔۔۔ میں نہیں ملوں گی اس سے۔ صرف اس بار بچا لے اس کو۔ وہ تو نہتا آیا تھا پرانی حویلی۔"

"چل میرے ساتھ۔" وہ نیلماں کے ساتھ گھسٹتی

پرانی حویلی کو کھلتے کواڑ تک گئی۔ دوسری طرف کسی کھنڈر ہوئے کمرے میں موسیٰ کی کراہیں گونجتی تھیں۔ کلہاڑیوں کے وار اس کے جسم کو چھلنی کرنے پر تلے تھے۔ اک دم کواڑ پر ہاتھوں کی ضربیں پڑیں۔

"پاجی... پاجی... ادھر حویلی میں کوئی آیا ہے۔ پاجی جلدی آؤ۔ مدد کرو۔" نیلماں اور جنت کی صداؤں نے ان کے ہاتھ روکے ادھر خواتین نے بنا تحقیق کے دبا دبا چیخ کے مردوں کے اوسان خطا کر دیے۔

"گامے... تو ادھر ہی رہ۔ تم لوگ آؤ ذرا پچھلی گلی چھانو۔" چوکنا کھڑے، گھبرائے ہوئے گامے کے سر پہ لگنے والا پتھر اس کا ذہن تاریک کر گیا۔ نیلماں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"جاؤ... مگر اپنا وعدہ یاد رکھنا۔" وہ اس ملگجے سے کمرے میں گھسی نیم تاریکی میں کچھ نہ دکھتا۔ صرف کراہیں سنائی دیتیں۔

"موسیٰ... موسیٰ!" وہ سوکھی، سرخ ہوتی گھاس پر اوندھے پڑے موسیٰ کو سیدھا کرنے لگی۔ دوپٹے سے چہرہ صاف کیا۔

"موسیٰ، اٹھ، بھاگ جا... موسیٰ نہ کر آنکھیں تو کھول۔" وہ حیران ہوا۔ پھر دیکھتے ہی آنکھیں خون رنگ ہو گئیں۔

"تو تو خائن نکلی۔ چوہدریوں کا بچھایا جال۔" اس نے جنت کی کلائی دبوچ لی۔ سبز چوڑیاں گھاس پر بکھریں۔

"مجھے ایسے نہ مار، موسیٰ۔"

"چل نہیں مارتا۔" وہ اٹھا۔ "پھر تو بھی رک ادھر۔ ابھی تیرے بھائی آتے ہیں تو ان کے سامنے یہ سب بول مجھ سے۔" وہ جنونی سا نظر آ رہا تھا۔

"مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا موسیٰ۔ مجھے جیتے جی مر جانے سے ڈر لگتا ہے۔ جو کہتا ہے سچ ہے۔ میں ہوں خائن... جال بھی۔ مگر تو بھاگ جا یہاں مر بھی گیا تو خانوں کو کانوں کان خبر نہ ہو گی اور یہ تجھے ادھر ہی کہیں دفن بھی کر دیں گے۔ تو سلامت رہ... تیری نفرت بھی سلامت رہے۔ تو بھاگ جا۔" وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں سلامت رہوں نہ رہوں بی بی... میری نفرت ضرور سلامت رہے گی۔ یاد رکھنا۔" وہ لمحوں میں جنت، موسیٰ کی جنت سے صرف بی بی ہوئی تھی۔ وہ خود کو گھسیٹنے لگا۔

چوہدریوں نے کونا کونا چھاننے کے بعد عورتوں کو گالیوں سے نوازا اور پرانی حویلی نے انہیں مایوس کر دیا۔ زخمی پڑے گامے کو ٹھڈے مارتے وہ پاگل ہو گئے۔

"چھڑا کے لے گئے اس کمینے کو۔ اب سارے ہوشیار رہو۔ خان اب بہت بپھریں گے۔" ظفر چوہدری نے کنپٹی مسلتے ہوئے سب سے کہا۔



ادھر موسیٰ خان نے ہرمن سنگھ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ اسے اس بات کو راز ہی رکھنا تھا اور بدلہ بھی اپنے طریقے سے لینا تھا۔

دن پر دن گزرتے گئے اور سال کی دکان تیار ہوتی گئی۔ جنت ٹھہر گئی بس۔ ان دنوں وہ کچھ بھی لگتی... بس جنت نہ لگتی۔

بالآخر طارق جیت گیا۔ بڑی مامی نے لپک جھپک اس کو سرخ زرتار دوپٹا اوڑھایا اور اپنی جڑاؤ انگوٹھی پر دھاگا باندھ کے اس کی انگلی میں سجا دی۔ جنت جیسے مر ہی گئی۔ ماموؤں کے چچا زاد، جو گاؤں کے دوسرے سرے پر چھوٹی حویلی میں تھے وہ خاندان بھر کے ساتھ مٹھائی لیے چلے آئے تو گھر میں شادی جیسی رونق ہو گئی۔ جنت سانس روکے اپنی کلائی میں بچی کچی چوڑیوں کو دیکھتی پھر گنتی اور پھر دیکھتی۔ نیلماں اسے پکڑ کے پنڈال میں لے آئی۔ بارہ تیرہ سال سے دبئی میں مقیم چوہدری شیراز جنت کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ساتھ بیٹھے اس کے باپ چوہدری یعقوب نے اس کا ہاتھ دبا کر متحمل رہنے کا مشورہ دیا۔ وہ بار بار مٹھیاں بھینچتا۔

"بھلا میں اتنے سال دبئی میں کیا کرتا رہا؟" جنت

نے سر اٹھا کر لکڑی کے منقش موڑھے پر بیٹھے اس شخص کی حرص کو دیکھا۔

"میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟" طارق نے برآمدے کے کونے میں رک کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔

"جسے جنت مل جائے اسے اور کیا چاہیے یارا۔" چوہدری شیراز نے اس کے کندھے پر دھپ لگا کر کہا۔

"ویسے آپس دی گل ہے گھر کی لڑکیوں کو بھی چیک کر لیتا تھا۔ آخر پٹھان بھی حسن یوسف کے حصے دار ہیں... کیا پتا...۔" الفاظ کے برعکس لہجہ بڑا میٹھا تھا۔ چوہدریوں کے وہاں چوٹ لگی جہاں نہیں لگنی چاہیے تھی۔ جنت کا رنگ زرد ہو گیا۔ ماحول ساکت تھا۔ کاشیاں شخص نے لمحوں میں معاملہ جانچا اور جنت نے سرکنڈوں کے پیچھے چھپتا آدھا چہرہ مکمل دیکھ لیا۔ دونوں کے راز مہلک تھے۔

طارق تیزی سے واپس مڑا۔ چوہدری یعقوب' میاں جی کو وضاحتیں دینے لگا۔ جنت کمرے میں دوڑی۔

"یہ وہی ہے... سو فیصد وہی ہے۔ پھر دبئی جانا۔ اس واقعے کی رات ہی۔ انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ سب اسے جہاز پر چڑھانے گئے ہیں مگر انہوں نے کہا کیا ہے یہ سب۔" وہ بڑبڑائے گئی۔

"جنت کیا ہو گیا ہے تجھے... کیا بول رہی ہے... نہ سر نہ پیر۔" نیلماں جھنجلا رہی تھی۔

"نیلماں... موسیٰ کو بلا دے۔ صرف آخری بار پھر کبھی اس سے چھپ کے نہ ملوں گی... اپنا وعدہ پورا کروں گی بس آخری بار بلا دے۔"

ادھر پرانی حویلی کے کھنڈر کمرے میں کھڑے طارق نے مشکوک سا چاروں اور دیکھا۔ گھوم کے دیکھا۔ پیروں تلے کچھ کچلا گیا۔ وہ زمین پر جھکا۔ گھاس میں اٹکے سبز کانچ کے ٹکڑے۔ سبز کانچ...

"یہ چوڑیاں آپ کی ہیں؟" دو زانو بیٹھا شخص بولا تھا۔ طارق سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ اٹھا۔

✲ ✲ ✲

"میاں جی... میاں جی ادھر آو تے دیکھو... تساں دی چہیتی نے کیا چن چڑھایا ہے ہماری ناک کے نیچے۔"

طارق کے واویلے پر سب باہر کی طرف دوڑے۔ پیپل کے سائے تلے پرانی حویلی کا کواڑ بند کرتے ہوئے وہ کف اڑانے لگا۔ چوہدری یعقوب کا خاندان بھی تماشائی ہو گیا۔ طارق نے سبز کانچ میاں جی کے پیروں میں دے مارا اور ظفر پاء جی نے جنت کا سبز چوڑیوں کا بازو دبوچا۔ سب حیران' رنگ فق' آنکھیں پھٹی...

ظفر پاء جی کے اندر ہر دم سوتا بھیڑیا ہڑبڑا کے جاگا اور انہوں نے جنت کی کلائی اس زور سے موڑی کہ پکی حویلی کے ہر گوشے نے اس کی کراہیں سنیں۔ اس کا بازو ٹوٹ چکا تھا۔ سر پھٹ چکا تھا۔ ناک' ہونٹ' سوج چکے تھے۔ چوہدری یعقوب کے اشارے پر شیراز' طارق کو کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔

"معاف کر دیں میاں جی۔ صرف یہی غلطی کی زندگی میں... صرف ایک غلطی معاف کر دیں۔ ماں کو گالی نہ دیں نہ ہی خالوں کو۔" آپا جی نے ظفر کو دھکا دے کر اسے خود میں سمیٹ لیا۔ میاں جی چارپائی پر ڈھے گئے۔ ظفر نے بندوق گولیوں سے بھری۔

"ہر غلطی دی معافی نہیں ہوتی جنت فاطمہ۔ تیری لاش چوپال میں پھینک کر آئیں گے ناں تے اگر کسی نے دفنایا فیر قبر پر معافی نامہ بھی تھوک آئیں گے۔"

"نہ ظفر نہ... معاف کر دے اسے۔ میں کل ہی بھیج دوں گی اس کے باپ کے گاؤں' کوئی تایا چاچا تے رکھے گا ناں اسے۔"

"او پیچھے ہو آپا جی۔ اس ذلت کے بعد وی تساں نوں اس ذلیل دے نال ہمدردی ہو رہی اے۔ اس دے باپ نوں میں خود پچھ لوں گا۔" آپا جی' میاں جی کو دیکھنے لگیں۔ وہ رخ موڑ گئیں۔

"میں کمرے میں جا رہا ہوں... ظفر مجھے باقی سب بتا دینا۔" نیلماں بھاگ کے آگے ہوئی۔

"میاں جی... معاف کر دیں اسے اللہ کا واسطہ...

یہ تو بس..." بڑی امی نے اسے بالوں سے پکڑ کر زمین پر دے مارا۔

"یہ کل کی چھوکریاں کیسے کیسے کھیل کھیل رہی ہیں اس حویلی میں... چل ظفر تو بہنوں والا ہے اور بہنوں والوں میں اتنی ہمت تو ہونی چاہیے کہ اوسٹرانڈ مچاتے حصوں کو خود سے کاٹ سکے۔" ظفر پاء جی نے بندوق اسے چھیدنے کو سیدھی کرلی۔ میاں جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ چوہدری یعقوب نے دھیما سا منع کیا بس۔

"میاں جی... میاں جی، طارق پاؤ جی نے چوپال میں گھس کے خانوں کے دو جوان پھڑکا دیے ہیں۔ سارے پنڈ میں قہر مچ گیا ہے۔" ملازم کی آواز اور میاں جی کا کہنا۔

"کون سے دو؟" جنت کی آنکھیں بند ہو گئیں۔



ڈھلتی سرخ لوبر ساتی شام میں وہ جاوید کے چھپر تلے بیٹھا، ہولے ہولے گرم قہوہ حلق میں اتار رہا تھا۔ زخم مندمل ہو چکے تھے مگر صرف کچھ زخم۔ ہرمن اسے شہر سے لائے بیچ دکھا رہا تھا جب انہیں لگا کسی نے ان کے سر پر کھڑے ہو کر فائر کھول دیا ہو۔ وہ بے ساختہ نیچے ہوئے۔ دو چار منٹ بعد وہ اپنی کونے میں پڑی رائفل تک پہنچا تب تک جوابی فائر ہوئے تھے۔ خاموشی پر وہ بھاگتے ہوئے باہر نکلا۔ اس کے پیچھے دھڑ دھڑ دکانوں کے شٹر گرے تھے۔ چوپال پر ہو کا عالم طاری ہوا صرف پٹھانوں کی پشتو للکاریں۔ وہ بھاگا۔

جلال زمین پر چت لیٹا خون میں لت پت تھا۔ گل باز نے اس کی چھلنی ہوئی قمیص ہاتھوں سے پھاڑی۔ موسیٰ کی سانسیں رک گئیں۔

"لالہ" ساڑھے سولہ سالا جلال نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اس کے تھامنے سے پہلے ہی اس کی آنکھیں بجھ گئیں، ہاتھ واپس زمین پر گرا۔ موسیٰ نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے خود کو جھکایا۔ ولایت خان اپنا ہاتھ ہوا میں لہرانے لگے۔ یعنی ختم۔ گل باز سوراخ گننے لگا۔

"چھبن... چھپن گولیاں..." موسیٰ نے آنکھیں میچیں۔ گل شیر بھی پہنچا۔ ساتھ کھڑے سرمد نے اس کا بازو لرزتے ہاتھوں سے تھاما۔ وہ اٹھارہ سالا سرمد کی طرف مڑا۔

"مجھے لگتا ہے کہ مجھے بھی گولی..." اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ موسیٰ نے کھینچ کے اس کی قمیص اتاری۔ بائیں پسلی کے پاس بنا گڑھا۔

"مورے کے پاس لے چلو لالہ۔" وہ جو بمشکل کراہیں چھپائے کھڑا تھا۔ بلبلا اٹھا۔

"گولی نکالو اس کی... گل شیر جیپ نکال۔" ولایت خان نے حکم دیا۔

"نہیں، بس مورے کے پاس چلو۔ جلال کو بھی اٹھالو۔ میں چوک میں مرنا نہیں چاہتا۔" اس کی سانسیں اکھڑ گئیں۔ موسیٰ نے ہرمن کی لائی شراب کی بوتل زخم پر انڈیلی۔ جلد ابلی گولی بھی نکل ہی جاتی اگر جان نہ نکلتی تو۔ گل باز رونے لگا اونچی آواز میں۔ جیپ سے خون رنگ آنکھیں لیے اترتے ضمیر لالہ نے تین چار طمانچے اس کے منہ پر مارے۔

"قتل پر رویا نہیں کرتے نامرد۔ قتل پر رویا نہیں کرتے۔" موسیٰ نے کھڑے ہو کر اپنی رائفل زمین پر ٹکائی۔ آنکھوں کو میچا۔ کیونکہ قتل رونے کے لیے نہیں ہوتے۔



رام پور پر جیسے کسی نے قہر پھیر دیا ہو۔ قبرستان سی خاموشی گلیوں میں بین ڈالتی پھرتی۔ چوپال ویران، دکانیں بند، بچے گھروں میں مقفل... صرف خان تھے جو گلیوں میں پاؤں کی دھمک پیدا کرتے ہوئے چلتے۔ پشتو للکاریں لگاتے اور رام پور کے ہر کونے، ہر نکڑ پر کھڑے ہو کر فائرنگ کرتے اور چوہدریوں کو یہ باور کرواتے کہ وہ اب بھی گیارہ موجود ہیں۔

میاں جی نے ظفر اور طارق کو اندرون سندھ اپنے کسی دوست کے ہاں بھیج دیا۔ چھوٹے ماموں اپنے

کسی دوست کے گھر چھپ رہے جو کہ جج تھے۔ میاں جی علاقے کے اثرورسوخ والے لوگوں سے رابطہ کرنے لگے تاکہ خانوں سے بات چیت ہوسکے۔

ابھی بھی اس واقعے کے پانچویں روز حسنہ خالہ آئی بیٹھی تھیں اور دبی دبی سرگوشیوں میں برآمدے میں بیٹھیں آپا جی سے باتیں کررہی تھیں۔

"اب تو ڈر لگتا ہے آپا جی۔۔۔ میں تے پہلے ہی سب کچھ لٹا بیٹھی ہوں صرف ایک پتر ہی بچا ہے۔ یہ ناں ہو کہ کسی دن وہ بھی۔۔۔ خانوں کے ہتھے چڑھ جائے۔" وہ سسکنے لگیں۔ جنت نے خود کو بمشکل کھڑا کیا۔ آپا جی نے اس کا بازو ماجو نائی سے بندھوا دیا تھا۔ گال اور گردن پر بھی مرہم لگایا تھا، کمر اور بازو بھی سینکوائے تھے مگر وہ تو جیسے مرنے کا تہیہ کرچکی تھی۔

"تسی میاں جی سے پوچھ لو کہ میں ادھر حویلی میں ہی رہ لوں کچھ عرصہ گذو۔ رات کو ڈر جاتا ہے فائرنگ کی آواز سے۔ آپا جی میرا تو اکلوتا پتر ہے ناں۔۔۔"

"بس کردیں خالہ۔۔۔" وہ بے ساختہ کہہ گئی۔ "وہ جو دو جوان قتل کیے ہیں ناں اس گھر کے پتروں نے ان کی بھی تو کوئی ماں ہوگی ناں۔ اب رونے سے بہتر تھا کہ پہلے دن ہی ان کے ہاتھوں سے کلہاڑیاں چھین لیتی تم عورتیں۔"

"آپا جی۔۔۔ اس کی کلف ابھی بھی نہیں ڈھلی؟ یہ سارا عذاب اس کے پلو سے کھنچتا ہی تو رام پور میں آیا ہے۔ اسے کہیں مجھے شکل نہ دکھائے اپنی۔ اس بار تے لوگ ہمارے منہ پر کہہ رہے ہیں کہ لڑائی عورت کی ہے۔"

"یہی تے ہوتا ہے ہر بار۔۔۔ تم دونوں خاندانوں کی عورتوں نے فلاں یہ کہہ رہا تھا اور فلاں نے یہ کہہ دیا، کرکر کے ہی مردوں کو قتلوں تک پہنچادیا ہے۔ اب تو کچھ عقل کرلو۔ میاں جی کو کہو۔۔۔ سیدھے سے معافی مانگ لیں۔ جیسے تیسے بھی ہوسکے ہرجانہ بھردیں۔۔۔ ختم کریں اس آکاس بیل جیسی دشمنی کو۔"

وہ ہانپ گئی دہلیز پہ ہاتھ رکھ کے سانس متوازن کرنے لگی۔ اس سے پہلے کہ خالہ کوئی جواب دیتیں۔

بڑی امی نے لپک کر اس کا بندھا ہوا بازو مروڑ دیا۔ وہ اونچی آواز میں پہلی بار روئی۔

"یہ تو نہیں تیرا غلیظ عشق بول رہا ہے۔" یہ امی کے ابتدائی الفاظ تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اس کی اور موسیٰ کی جو خود ساختہ گھڑی ہوئی داستانیں گلا پھاڑ پھاڑ کر سب ملازموں کو سنائیں تو وہ ڈھے سی گئی۔ چہرہ پھر سے زخمی ہوگیا۔ بازو پھر سے ٹوٹ گیا۔ وہ بولی تو بس اتنا۔۔۔

"وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا امی۔۔۔ ہن چوہدری اپنی فکر کریں۔" امی ایک بار پھر اس پہ پل پڑیں۔



پتھریلی حویلی کے ہر پتھر سے نوحے سنائی دیتے۔ گھڑی گھڑی کسی کونے سے ماں یا بہن کی سسکیاں سنائی دیتیں۔ مرد سر کندھوں میں گرائے گھر میں آتے اور لحظہ بھر رکنے کے بعد واپس ہو لیتے۔ ضمیر خان کی جھڑکیاں و دھمکیاں کچھ بھی ان عورتوں کے آنسو خشک نہ کرسکے۔

اندھیرا اترتے ہی ملازماؤں نے بھاگ بھاگ [illegible] روشنیاں روشن کیں مگر اندھیرا ایسے ہی دانت [illegible] رہا۔ جلال اور سعد کے قتل کے بعد موسیٰ پہلی بار گھر آیا۔ سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ بی بی جان سے ملا تو وہ رودیں۔ شمائل زنان خانے سے بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار روئی۔ ضمیر نے کچھ نہ کہا۔ زریاب وہاں سے اٹھ گیا۔ بے شک وہ ظہیر خان کی سب سے بڑی اولاد تھا مگر جو حیثیت موسیٰ کی تھی وہ اس کے حصے میں نہ آسکی۔ اس نے سرد بھاری آواز میں ماں کو پوچھا۔ شمائل نے بتایا کہ وہ دوا کے زیر اثر سو رہی ہیں۔ وہ کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔

"پھر کیا سوچا موسیٰ خان۔۔۔؟ کیا چوہدریوں کے بلوں سے باہر نکلنے تک ہم یوں ہی بیٹھے رہیں؟" ولایت خان بنگش نے اسے نظروں سے جانچتے ہوئے پوچھا۔ وہ سنجیدہ سا کھانا چھوڑ کر بیٹھ گیا۔

"چوہدریوں سے ونی کروالیں خان۔" وہ حتمی انداز میں بولا۔

"مطلب لوگ غلط نہیں کہہ رہے کہ اس بار لڑائی عورت کی ہے۔" گلزار لالہ نے پھنکار کر کہا ہاتھ مار کر کٹورا زمین پر گرا دیا۔

"تو اب خان بھائی مروا کر عورت گھر میں لائیں گے۔" ظہیر نے اسے گریبان سے تھاما۔ وہ چیخا۔

"میں کسی عورت کو نہیں جانتا۔۔۔ جس کو جانتا تھا اس کو مرے تو تین چاند ہو گئے (تین ماہ) اب صرف دشمنی ہی نبھے گی چوہدریوں سے۔ میں نے اپنا فیصلہ کر لیا ضمیر لالہ۔۔۔ گلزار لالہ اپنا فیصلہ کر لیں۔ اگر خون ہی چاہیے تو پھر سب سے پہلی گولی میری بندوق سے نکلے گی۔" سب اپنی اپنی جگہ ٹھٹک گئے۔۔۔ اتنی سفاکیت تھی اس کے لہجے میں۔ ولایت خان نے سرہلا کر فیصلے کی داد دی۔ وہ اپنے پوتے کو اندر تک پڑھ چکے تھے۔



"مجھے کوئی بھی لڑکی نہیں چاہیے۔ مجھے صرف۔۔۔ وہ چاہیے جو چوہدریوں کے دلوں پر پاؤں دھرے کھڑی ہے۔" اس کے جملے نے پنچایت میں موجود ہر شخص کو بغلیں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ میاں جی کی تلملاہٹ اسے سکون دے گئی۔

"جنت دا نام بھی نہیں لینا کسی نے۔"

"ٹھیک ہے پھر یہ فیصلہ بندوق سے ہی کر لیں گے۔"

وہ ساری پنچایت کے سامنے رائفل لہرا کر باہر نکل گیا۔ پنچایت کے سربراہ نذیر وڑائچ نے میاں جی کو سرہلا کر ہاں کہنے کا مشورہ دیا۔ محمود اللہ چوہدری کے کندھے جھک گئے۔

"وہ نواسی ہے میری۔۔۔ میں اس دے باپ کو کیا جواب دوں گا۔" ہولے سے نیم رضامندی دیتے ہوئے کہہ دیا۔

"گھر کی لڑکی ہے محمود اللہ۔۔۔ جو کہیں گے باپ کے سامنے ہی کہہ دے گی۔" نذیر وڑائچ نے نیا سرا تھمادیا۔ پنچایت برخاست ہونے تک سب معاملات ہلکی سی سرد مہری کے ساتھ بخوبی طے پا چکے تھے۔



"جنت۔۔۔ تو 'نہ' کہہ دے۔" نیلماں نے بہتی آنکھوں سمیت التجا کی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

"میاں جی خود بھریں اپنے لاڈلوں کا کیا۔"

"بشریٰ تے بڑا رو رہی ہو گی؟" اسے سولی چڑھتی بشریٰ کی فکر تھی۔

"اس دا بھرا قاتل ہے دو معصوموں کا۔۔۔ او تے ساری عمروی روئے تے کم ہے۔۔۔ تو نے تو بڑی چاہ سے اس سنگلاخ میدان میں باغیچہ بنایا تھا' تجھے اس کے اجڑ جانے کا غم مار دے گا قسم سے۔۔۔ انکار کر دے جنت۔"

"بھلا جنت' موسیٰ کو انکار کر سکتی ہے نیلماں؟" اس نے ٹوٹا ہوا بازو سینے سے لگا کر کہا۔ مامی کو بیٹے کی بخشش کا یقین ہوا تو آپا جی نے جنت کا بازو پھر سے بند ہوا دیا۔ مگر جنت کی کراہیں پھر بھی کم نہ ہوئیں مگر آج دوپہر سے وہ چپ ہو گئی تھی۔۔۔ مکمل چپ۔

"جنت تو سمجھتی نہیں۔۔۔ تیرا موسیٰ تو اس دن پرانی حویلی کے کھنڈر میں ہی مر گیا تھا۔۔۔ اب تو صرف سفاک دشمن ہو گا وہاں اس کی جگہ۔"

"چل دشمن ہی سہی۔۔۔ جنت روز دیکھ تو لیا کرے گی ناں اسے۔۔۔ سانس تو آسانی سے آئے گی ناں۔" وہ بدقت مسکرائی بھی۔ آپا جی ڈولتے قدموں سے اندر آئیں۔ خالہ اور چھوٹی ممانی بھی ساتھ تھیں۔ وہ سیدھی ہوئی۔ آپا جی نے ہاتھ میں پکڑا سرخ زرتار دوپٹا کانپتے ہاتھوں سے اسے اوڑھایا تو خالہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے پلنگ کے پاس ڈھے گئیں۔

"جنت تیرے دل نے تجھے اجاڑ دیا۔۔۔ تجھے سیاہ بخت کر دیا۔" آپا جی اسے لپٹا کر بے ساختہ چومنے لگیں۔ پلنگ سے نیچے جھولتی اس کی گندھی ہوئی چٹیا کو چومنے لگیں۔ جنت گھبرا گئی پھر رونے لگی۔

"مجھے معاف کردیں آپا جی۔۔۔" اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہ تھی۔ اب اس میں بات کرنے کی سکت نہ بچی تھی۔ بڑی امی بشریٰ کو چادر اوڑھا کر لے آئیں، جو ہچکیوں سے روتے ہوئے سب کے گلے لگ رہی تھی۔ میاں جی نے پیغام بھیج دیا تو سب عورتیں گھٹ گھٹ کر روتے ہوئے حویلی کے بیرونی دروازے تک آئیں۔ جنت نے جیپ میں بیٹھ کر آخری بار مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں نے نیلماں کے لیے پیغام چھوڑا تھا۔

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹادی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوادی ہم نے

اور نیلماں نے ہار مان لی۔

☆ ☆ ☆

جنت نے سر اٹھا کر پتھریلی راہداریوں والی، بھول بھلیوں جیسی حویلی کو دیکھا۔ جس کے مکین گاڑیوں کے دروازے دھڑ دھڑ بند کرتے ہوئے خود کہیں غائب سے ہوگئے۔ بشریٰ کی ہچکیاں ابھی بھی فضا میں اٹھتیں۔ جنت کو خود سے آٹھ ماہ چھوٹی بشریٰ کی قسمت پہ خود سے زیادہ رونا آیا۔

مسجد میں نکاح کے دوران گل باز کے نہ پہنچنے پر گل شیر کو بازو سے تھام کر آگے کردیا گیا تو بشریٰ کا نصیب وہی بن گیا۔۔۔ موسیٰ جانے کب آیا۔ حلف اٹھانے سے دو سیکنڈ پہلے مجید بھاگ کر شور مچا گیا۔

"خانوں کی پکی گندم کو آگ لگ گئی۔" حلف کہیں کونے میں ساکن ہی رہ گیا اور خان لڑکیاں لے کر حویلی آگئے۔ جنت نے لمحوں میں حساب لگالیا۔ کوئی آگ نہ تھی۔۔۔ اگر تھی بھی تو اتنی معمولی کہ ملازم ہی بجھادیتے۔ خان حلف دینے سے بچ گیا۔

"چلو نی اندر۔۔۔ تمہاری ڈولی اٹھانے کوئی بھائی نہ آسکا اب خان کیا اٹھائیں گے۔۔۔ چلو بھگتو اپنے بھائیوں کا کیا دھرا۔"

لحیم شحیم ملازمہ نے ان دونوں کو اندر دھکیلا۔ بشریٰ نے اس کا بازو تھام لیا۔ یہ حویلی، پکی حویلی، سے کئی گنا بڑی اور آراستہ تھی۔ کسی محل جیسی چکنی۔۔۔ حویلی کے قطار در قطار بنے کمروں میں سے خواتین کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ مرد کونے میں بنے باورچی خانے کے باہر چوکور تھڑے پر موڑھوں پہ بیٹھے شاید کھانا کھا رہے تھے۔ ملازمائیں رک رک کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔ جنت کو لگا کہ اب اسے رونا چاہیے۔

یکایک ایک کمرے کا دروازہ دھاڑ سے کھلا اور ایک ادھیڑ عمر عورت روتی ہوئی باہر نکلی پیچھے کتنی ہی عورتیں تھیں۔ اس عورت نے جھپٹ کر ان دونوں کی چادریں اتاریں۔ بشریٰ کے رونے میں روانی آگئی۔۔۔ جنت مزید سرد ہوگئی۔ سر سے چادر تو کبھی نہ اتری تھی اس کے۔

"قینچی لاؤ۔۔۔ ان کی حویلی تحفہ بھیجنا ہے۔" وہ عورت پھنکاری۔

"زلیخا۔۔۔ چھوڑ دے رحم کر۔" ایک بوڑھی سی آواز نے تنبیہہ کی۔ جواباً وہ عورت پشتو میں چیخنے لگی۔

جنت نے بڑھ کر چادر اٹھانا چاہی تو ملازمہ نے پاؤں سے چادر کو دور کردیا۔ جنت کی آنکھیں جلنے لگیں۔ دوسری ملازمہ قینچی لے آئی۔

"زبان کاٹوں کہ چوٹی؟" اس عورت نے جنت پہ آنکھیں گاڑتے ہوئے پوچھا۔ وہ چپ رہی۔ بدن باقاعدہ کپکپانے لگا۔

"بول کم ذات۔۔۔" اس عورت نے جنت کی ہنسلی پر دباؤ دے کر پیچھے دھکیلا اس کا بازو پھر ادھڑ گیا۔ اس کی کراہیں ہر ذی نفس نے سنیں۔

"اسے کچھ نہ کہو۔"

بشریٰ کی مردہ آواز۔۔۔

"کیا کاٹوں؟"

"زبان۔" جنت نے بمشکل کہا۔ وہ عورت پیچھے کھڑی عورتوں سے مخاطب ہوئی۔

"چوہدرائن ہے پوری۔۔۔ چوٹی کٹنے کا مطلب جانتی ہے۔" جنت کو کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر مردوں

میں دیکھا وہ کہیں نہ تھا۔ عورت نے جنت کو اسی بازو سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ باقاعدہ کراہی۔

"اسے کچھ نہ کو... اس کا بازو۔"

"چل ٹھیک ہے پہلے تیری چوٹی کاٹتے ہیں۔" بشریٰ کو دو ملازماؤں نے دبوچ لیا۔ جنت میں کرنٹ دوڑ گیا۔

"نہیں کرو۔ اللہ کا واسطہ۔ کوئی ہور ظلم کر لو پر یوں بے عزت مت کرو... چھوڑ دو اسے..."

وہ اپنی تکلیف بھلائے بشریٰ سے لپٹ گئی۔ عجب ہنگامہ مچ گیا۔ بشریٰ اپنی چوٹی چھڑا رہی تھی۔ بلبلا رہی تھی۔ اس کا رونا بین میں بدل گیا۔

"پہلے اسے پکڑو... چھوڑا سے۔" عورت نے حکم بدلا۔ وہ جیسے ان کا تڑپنا دیکھ رہی تھی۔ کرنا تو اس نے وہی تھا۔ جو وہ ٹھان چکی تھی۔ ملازماؤں نے اس کے بازو پیچھے کو موڑے۔ چوٹی پکڑ کر آگے کر دی۔

"نہ کرو اللہ کا واسطہ۔ ایسے ذلیل نہ کرو۔ کوئی روکو... موسیٰ... موسیٰ؟"

اس نے زور زور سے اسے پکارا۔ عورتیں تھمیں۔ پھر وہ بڑی مامی جیسی ظالم عورت نے جنت کو پے در پے طمانچے مارے۔

"نام کیسے لیا خان کا؟ تجھے لگتا ہے کہ اس حویلی میں وہی طریقے دہرائے جائیں گے جو ادھر دوسرے سرے کی حویلی میں دہرائے جاتے ہیں۔ آج کے بعد نام نہ لینا اس کا۔" قینچی نے اپنا منہ کھول دیا۔ جنت میں مزاحمت کا حوصلہ نہ رہا۔

"بی بی چھوڑ دیں انہیں۔" کوئی دروازے سے ابھی ابھی آیا۔ "خدارا کچھ تو رحم کریں۔ میں نے کہا چھوڑ دیں۔"

زریاب نے آگے بڑھ کر قینچی چھین لی۔

"کیوں خدا بن رہے ہیں آپ سب؟ مانا کہ ان کے بھائیوں نے ظلم کیا مگر اس سب میں ان کا کیا قصور کہ آپ لوگوں نے بنا ان کا خود سے رشتہ دیکھے ان کی چادریں چھین لیں... چوٹی تک کاٹنے کو آگئیں۔ بند کریں یہ ڈراما۔"

"اور تم۔" وہ مردوں کی طرف مڑا۔ "تم لوگ کب سے اتنے بے اختیار ہو گئے کہ گھر کی عورتوں کی آوازیں ان دیواروں سے باہر نکل گئیں۔ عورتوں کو ایسے فیصلوں کا اختیار کب سے دیا جانے لگا اس حویلی میں... آپ جائیں بی بی جان یہاں سے بس ختم کریں یہ سب۔" زریاب نے اپنی بڑی تائی کو درشت لہجے میں کہا تو وہ دل میں غضب بھرے واپس مڑیں۔ باقی خواتین بھی چلی گئیں۔

"رخسانہ... انہیں چھوڑ کے آؤ ان کے ٹھکانے پر۔" وہ بوڑھی سی آواز ایک بار پھر ابھری۔ بشریٰ نے روتے ہوئے جنت کی چادر اٹھائی۔ سر ڈھانپتے ہوئے جنت نے ستون سے ٹیک لگائے کھڑے موسیٰ خان کو دیکھا۔ بازو کا درد جان لیوا ہو گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جیسے اسے موسیٰ کے مرنے کا یقین اب آیا ہو۔ ملازماؤں نے تاسف سے صحن کے بیچوں بیچ لٹی پٹی بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا وہ پاؤں کی دھمک پیدا کرتا قریب سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔



وقت نے اپنی جھولی میں موجود ہر قہر جیسے ان پر الٹا دیا ہو۔ دن اتنے ویران ہو گئے کہ پر بہار دنوں کی یادیں بھی جنت فاطمہ چوہدری کی یادداشت سے مٹنے لگیں۔

انہیں پتھریلی حویلی آئے ہفتہ ہو گیا۔ جنت اپنا ٹوٹا بازو باندھے باندیوں کی طرح ان خوب صورت ترین سنگی مجسموں جیسی عورتوں کے سامنے کھڑی رہتی۔ اور وہ عورتیں تھیں کہ ان کا جی نہ بھرتا ان کو اذیت دے دے کر۔ وہ پشتو میں کچھ لانے کو کہتیں تو وہ دونوں بے بسی سے باورچی خانے آتیں۔ سمجھ کے مطابق کوئی چیز اٹھا کے لے جاتیں تو تو وہ لحیم شحیم ملازمہ چوٹی کو جھٹکا دے کر دوبارہ باورچی خانے بھیجتی... اور یوں وہ دونوں باورچی خانے کی ایک ایک شے باری باری لاتے مرنے کو ہو جاتیں۔ سارا باورچی خانہ الٹ جاتا مگر وہ نیلی و سبز آنکھوں والی برف سے سفید اور ملائی سے ملائم عورتیں مطمئن نہ ہو پاتیں۔

ان دونوں کو حویلی کے پچھواڑے میں بنے تاریک

بوسیدہ کمرے میں خشک گھاس پر سونا پڑتا۔۔۔ یہ اور بات کہ زندگی نے نیند نامی مسرت بھی ان سے ادھار دی گئی شے کی طرح واپس لے لی۔ جون کے گرم ترین دن اور رات بغیر پنکھے کی سہولت کے وہ دونوں ساری رات مچھروں کو اپنا خون چوس لینے کے لیے آزاد چھوڑ دیتیں۔ پانچویں روز رات کو جب وہ دونوں مخالف کونوں میں بیٹھی ٹوٹے کواڑوں سے جھانکتی چاندنی کو دیکھ رہی تھیں تو دروازے پر ارشاد کا ہیولہ آن ٹکا تھا۔ اس نے ہاتھ سے بشریٰ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سہم کر جنت کے قریب ہوگئی۔

"اٹھ بھئی ادھر بائیں رخ کے تیسرے حجرے میں تیرا سائیں بلا رہا ہے۔ قسمت بدل لے اپنی۔ چل شاواش جلدی کر۔"

بشریٰ نے جنت کا بازو کس کے پکڑ لیا۔ اب وہ اپنے مخصوص دھپ دھپ کرتے انداز میں آئی اور بشریٰ کو چوٹی سے گھسیٹتی لے گئی۔ اب جنت کا بازو ہولے ہولے جواب دے رہا تھا ساتھ ہی ساتھ ہمت بھی۔ اس نے تھک کر آنسوؤں کو باہر آنے دیا۔ موسیٰ اس دن کے بعد سے اسے نظر ہی نہ آیا تھا اور وہ جو کہتی تھی کہ چل جنت روز دیکھ تو لیا کرے گی اسے۔۔۔ اب تنہا بیٹھی دیواریں ٹٹول رہی تھی اور رام پور کے گیدڑوں کے بین اس کے کانوں میں خوف انڈیل رہے تھے۔

ساتویں دن کی دوپہر کو اس نے موسیٰ ولایت خان بنگش کی ماں کو دیکھا تھا۔ وہ اتنی خوب صورت عورت تھی کہ جنت بازو کی تکلیف بھول گئی۔ اتنی نرم تھی کہ اسے گئے دنوں کی اذیت میں کچھ کمی سی لگی۔ وہ بس اپنے کمرے میں ہی رہتیں۔ حویلی میں جتنا بھی تماشا ہوجاتا وہ باہر نکل کر نہ دیکھتیں۔ ارشاد نے ٹرے جب اسے یہ کہہ کر تھمائی کہ "ساس کو کھانا دے آ" تو جہاں باقی ملازمائیں دبا دبا ہنسیں، وہیں جنت کا سانس رک گیا۔ جلال خان مقتول کی تائی نے میرا یہ حال کردیا تو ماں کیا کرے گی۔

"یہ کون ہے؟" سر پر دوپٹہ جماتے ہوئے اس عورت نے شمائل ظہیر خان سے پوچھا۔

"جنت۔" شمائل کا بے تاثر سا یک لفظی جواب۔ ٹرے اس کے ہاتھ میں کپکپائی۔ خدیجہ نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور رخ موڑ کے شمائل سے پوچھا۔

"موسیٰ نہیں آیا؟" شمائل نے جانے کیا کہا کیونکہ وہ ٹرے رکھ کر تیزی سے باہر نکلی تھی۔ تو موسیٰ خان نے بے وقعت کرنا ماں سے سیکھا ہے۔ نہ لعنت نہ ملامت۔۔۔ بس تغافل۔ کیسا عذاب جیسا تغافل۔



صندلی کا بس نہ چلتا جنت کو تیزاب کے ٹب میں بھگو دے۔ پہلے دن ہی اسے سر تا پاؤں دیکھ کر بولی۔

"نہ آنکھ زمرد، نہ ہونٹ مرجان، نہ روپ کچے ناریل سا۔۔۔ تجھے دیکھ کر لگتا تے نئیں کہ تو نے دو جوان بندے سالم کھالیے۔ ڈائن۔" جنت نے تب سے اب تک گردن جھکا کر خود کو اس سے بے عزت ہوتے ہی پایا۔ وہ خوف زدہ ہوئی تھی۔ اگر کسی کو پتا چل جاتا کہ قتل کیوں ہوئے تو وہ اس کی روح تک میں سوئیاں چبھو دیتے۔

رات سب خان زادے کھانا کھا رہے تھے۔ برتنوں کی مخصوص آوازوں کے علاوہ کسی آواز کو ابھرنے کی جرأت نہ تھی۔ موسیٰ اور گل باز آج گھر آئے تھے ڈیرے سے۔ صندلی بھاگم بھاگ کٹوریاں ان کے آگے سجائے جاتی، آبخورے لبالب بھرے جاتی۔ بشریٰ گل شیر کے موڑھے کے ساتھ دبکی بیٹھی تھی کیونکہ اس کے دوپٹے کا پلو گل شیر کے موڑھے کے پائے تلے تھا۔ بشریٰ کو تھکان سے بچانے کی ایک سعی۔۔۔ جنت کو بشریٰ پر رشک آیا۔ وہ کٹوریاں ارشاد کے آگے کیے جاتی اور ارشاد انہیں بھرے جاتی۔ بی بی جان کے لیے ٹرے ایک ہاتھ سے انہیں پہنچا کر وہ لوٹی تو صندلی جان بوجھ کر اس سے ٹکرائی۔ جنت کراہی۔ ایک ہاتھ تھما پھر اگلے ہی لمحے پھر سے مصروف ہوگیا۔

وہ وہیں کھڑی رہی۔ صندلی آئی گئی پھر طیش سے اس پر الٹی۔

"اب ادھر کھڑی میری شکل کیا دیکھ رہی ہیں چوہدرائن صاحبہ... ادھر کو مڑیں ابھی بڑا کام ہے۔"

"میں اس لیے کھڑی ہوں کہ میری ٹوٹی ہوئی ہڈی کو دوبارہ اس کی جگہ سے کھسکانے کے لیے تمہیں تردد نہ کرنا پڑے۔" وہ بھی بلبلا کر بولی۔ اک لمحے کو سب نے سر اٹھا کر دیکھا۔ موسیٰ کو جانے کیا ہوا۔ اس نے آبخورہ صندلی کے پاؤں میں دے مارا۔ کٹوری الٹ دی موڑھے کو لات رسید کردی۔

"یہ لڑکی مجھے حویلی میں نظر نہ آئے... فصلوں پہ لگاؤ اسے۔ کٹوری میں بھی بال نکلتا ہے کبھی آبخورے میں تنکا۔ یہ جنگلوں کی باسی ادھر سبزیاں توڑتی ہی بھلی ہے۔ نظر نہ آئے یہ مجھے ادھر ارشاد۔"

"معافی چاہتی ہوں خان... غلطی ہوگئی۔ معاف کردیں۔"

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" وہ دھاڑا۔ رات دیر تک جب وہ کام نبٹاتی پھر رہی تھیں تو ولایت خان بنگش نے بستر لگاتی جنت کو دیکھ کر کہا۔

"یہ بچی بازو کو سیدھا کیوں نہیں کررہی۔" بی بی جان کے پاؤں دباتی بشریٰ نے موقع غنیمت جان کر بازو ٹوٹنے کا بتا دیا۔ اگلے دن دوپہر تک اس کے بازو کی ہڈی نے واپس اپنی جگہ لے لی تھی اور لکڑی کی تختیوں میں محفوظ اس کے بازو کا مستقل درد بس ہلکی سی ٹیس میں بدل چکا تھا۔

"تو ثریا کی بیٹی ہے ناں؟" بی بی جان نے سیاہ چادر کو اس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ جگ سے پانی انڈیلتا ہاتھ ساکت ہوا، پھر رواں...

"جی ہاں۔" خدیجہ نے تسبیح روک کر اسے دیکھا۔

آج خان زادیاں برآمدوں میں رونق افروز تھیں۔

"ہوں... ویسا ہی رنگ روپ، کجوری آنکھیں، یہ لمبی چوٹی... ہاہ مگر تیری قسمت... تیری ماں کی بارات میں بارہ پنڈوں (گاؤں) کے چوہدری آئے تھے۔ یہ تاریخی شتکا ہوا تھا۔ ہک ہاہ... چل خیر۔ میرا پوتا دی اس سلطنت کا شہزادہ ہے۔ آئی پر آگیا تو ملکہ بنادے گا۔ اللہ دلوں میں محبت ڈالنے والا ہے۔" وہ نامحسوس طریقے سے دعا دے رہی تھیں۔ جنت نے بشریٰ کا گلال چہرہ دیکھا تو گل شیر کی خاموش محبت کامیاب ٹھہری۔

"آپ کو رشتہ داریاں نکالنے کی ضرورت نہیں بی بی جان۔ چوہدریوں نے ہر بار ڈسا ہے ہمیں۔ ضروری نہیں کہ ہر وٹی ہوئی لڑکی آپ کی طرح سلطنت سنبھال بیٹھے۔" رومانہ تائی کی آواز پر وہ زرد ہوگئی۔ سردان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ بے تحاشا لاڈلا نہ سہی، مگر جوان بیٹا ضرور تھا۔ پھر موسیٰ خان رومانہ کی دوسرے نمبر کی بیٹی شاز مین سے منسوب تھا کم از کم ان کی نظر میں۔ خدیجہ شروع سے لاتعلق رہیں۔ ظہیر خان کی اولاد میں سے موسیٰ خان ہی فیصلے کا مالک تھا۔ اس حوالے سے انہیں جنت سے شدید نفرت محسوس ہوتی۔ شدید حالات میں بھی اک وقار تھا اس میں۔ جب کہ بشریٰ مرنجاں مرنج قسم کی تھی۔ گل شیر نے ماں کو پسندیدگی کا بتا کر اسے بیوی کا رتبہ دے ڈالا، مگر موسیٰ کا گریز بھانپتے ہوئے وہ شیر ہوگئیں۔ خدیجہ تو ویسے بھی کمرے تک ہی محدود تھیں۔ وہ جنت کو چھوٹی چھوٹی بات پر سزا دیتیں۔ جولائی کے شدید گرم دنوں میں وہ اسے ننگے پاؤں سرخ پتھریلی روشوں پر مسلسل چلنے کی سزا دیتیں۔ اس کا کھانا بند کردیتیں۔ رات باتھ روم میں بند کروادیتیں۔ اکثر بشریٰ بھی ساتھ ہوتی، مگر بشریٰ کی باتوں سے لگتا کہ اس کی جان جلد چھوٹنے والی ہے۔ گل شیر کوئی قدم اٹھانے ہی والا ہے۔

رومانہ نے ایک دن جنت کو بغور دیکھ لیا۔ "یہ کاجل کہاں سے لگایا؟" اس کی چادر کھینچ لی۔ چہرہ سختی سے اوپر اٹھا کر معائنہ کیا۔ کمرے میں سویا موسیٰ شور پر جاگا۔ سر اٹھا کر کھڑکی سے جھانکا۔

"غضب خدا کا... ونی آئی لڑکی، مردوں سے بھرا گھر اور اس کی آنکھ میں یہ خماری کی لکیر تو دیکھو۔ بتا مجھے کہاں سے لیا یہ کاجل۔" اس کی کلائی موڑ کے کمر پر ٹکائی رخ بالکل کھڑکی کی طرف مڑ گیا۔

"یہ ایسی ہی..." چٹاخ سے تھپڑ پڑا۔ چوٹی کو جھٹکا لگا۔

"جھوٹ بکتی ہے۔ بھلا ایسی دھار ہوتی ہے

آنکھوں میں۔ چل دھو کر آ میرے سامنے۔ آنکھوں کے اندر تک صابن لگا ابھی دیکھ صاف ہوتی ہے لکیر کہ نہیں چل۔"

اب وہ ایک ہاتھ سے ہاتھ والا نلکا چلاتی' ایک ہی ہاتھ سے منہ پر چھپاکے مارتی پھر اسی ہاتھ سے آنکھوں میں صابن لگاتی۔ اذیت دوہری' تہری ہو جاتی۔ چہرہ دھلا۔ سرخ آنکھوں اور سیاہ دھاری کے ساتھ وہ پھر سے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ موسیٰ کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ رومانہ نے پھر اس کی درگت بنائی واپس غسل خانے کو دھکیلا۔

آنکھوں میں پھر سے صابن گیا اور اس بار وہ بہتی آنکھوں سے واپس آئی دھار پھر بھی ویسی ہی تھی۔ رومانہ نے غصے سے اس کی گردن دبوچی اور اوپلوں کے دھوئیں سے تاریک ہوئے تندور میں گھسیڑ دی۔

"اب جب کوئی نقش نہ رہے گا ناں چہرے پر تب وہ لکیر بھی مٹ جائے گی۔"

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟ کیا کوئی دو گھڑی چین نہیں لے سکتا اس گھر میں۔ کیا تماشا لگا ہوا ہے یہاں۔۔۔ ہاں؟" موسیٰ قمیص پہنتا ہوا طیش میں باہر نکلا۔ رومانہ کا ہاتھ ڈھیلا ہوا تو جنت تڑپ کے دھوئیں سے دور ہوئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ وہ وہیں گرم تندور سے ٹیک لگا کر کھانسنے لگی۔ شدید کھانسی سے اس کا سانس الٹ گیا۔

"تم سب دفع ہو اپنے کاموں پر۔" ملازمائیں کھسکیں۔

"ویسے مورے۔۔۔۔" وہ قدم قدم چلتا رومانہ تک آیا۔ "چوہدریوں کا خون "وہ" ہے۔" اس نے بشریٰ کی طرف اشارہ کیا اور تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔ دریچے سے دیکھتی شمائل نے مسکرا کر ٹھنڈی سانس بھری۔ رومانہ تپ کے رہ گئیں۔ بشریٰ جنت کو اٹھا رہی تھی۔



شدید گرمی میں سب کے بستر بڑی چھت پر لگ گئے۔ مرد عموماً" ڈیرے پر ہی سوتے صرف اکا دکا اگر اپنی مرضی سے رکنا چاہتا تو ہی حویلی میں رکتا۔ جنت نے اپنے دوپٹے سے چہرے کا پسینہ صاف کیا اور دوپٹہ اتار کر گھاس پر رکھ دیا۔ بے خبر سوئی بشریٰ پر رشک کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے خشک ہوتے گلے کو بھی تر کیا' مگر شدید پیاس کا احساس ہر شے پر حاوی ہو رہا تھا۔ بالآخر وہ دوپٹہ اوڑھتی باہر نکلی۔ چھت سے باتوں اور ہنسی کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ وہ باورچی خانے میں نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے غسل خانے کی طرف آئی۔ قدم ہولے ہولے دھرے۔ کوئی دیکھ لیتا تو سزا کے طور پر ساری رات پیاسا ہی رکھتا۔ آخری کمرے سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے کوئی گھٹ گھٹ کر روتے ہوئے بول رہا ہو۔ دفعتاً" اسے لگا یہ خدیجہ خاتون کی آواز ہے۔ وہ لاشعوری طور پر ادھر متوجہ ہوئی۔ شعور نے قدم بھی اسی جانب موڑ دیے۔

"اب کیوں آئے ہو میرے پاس؟ اب جب میری گود سونی ہو گئی تو خود کو بہلاوا اپنا کر پیش کیوں کر رہے ہو' تب کیوں نہ آئے جب میں ہر شام تمہارے لوٹنے کا انتظار کانٹوں پر چل کے کرتی تھی۔" خدیجہ روتے ہوئے موسیٰ سے ہاتھ چھڑا رہی تھیں۔ موسیٰ کی پشت تھی' مگر اسے لگا وہ رو رہا ہے۔

"جب میں باقی آنکھوں کو آتے دیکھتی تو میری ممتا خود بخود نیم مردہ ہو جاتی' مگر تمہیں تو شوق تھا بندوقیں چلانے کا یا پھر کہانیاں سننے کا۔ تم ہفتوں گھر نہ آتے۔ ایسے میں' میں نے ایک اور اولاد کی دعا کی تھی۔ جو رد نہ ہوئی۔۔۔ مگر تم نے میری جلال نامی خوشی بھی چھین لی۔۔۔۔ موسیٰ تمہاری محبت نے مجھے ہمیشہ محرومیاں دیں۔ تمہاری پہلی محبت دشمنی تھی' بندوق تھی۔۔۔۔ اس محبت نے مجھ سے زریاب کے ساتھ موسیٰ بھی چھین لیا۔۔۔۔ اور دوسری محبت نے جلال چھین لیا۔۔۔۔ میں کہتی تھی وہ لڑکی اتنے بختوں والی ہوتی تو ماں باپ کے گھر راج کرتی۔" جنت کو کسی نے آگ میں ڈال دیا۔ جیسے وہ دہلیز تھام کے رہ گئی۔

"اب جب میں خالی ہو گئی تو میں تمہیں کیونکر یاد

آ گئی۔ اب جب تمہارے پاس سب ہے۔۔۔ بندوق بھی۔۔۔ اور "وہ" بھی۔"

"نہیں ہے کچھ۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے میری سانس رک جائے گی مورے۔۔۔ مجھے لگتا ہے میرا دماغ پھٹ جائے گا۔" وہ بچوں کی طرح روتے ہوئے خدیجہ کی گود میں منہ چھپا گیا۔ دیوار پار کھڑی جنت کو اس کی بات پر کسی تصدیق کی ضرورت نہ تھی۔ آنسوؤں کی قطاریں لگ گئیں۔

"میں دن بدن مر رہا ہوں۔۔۔ جینا چاہتا ہوں' مگر مجھے جلال کی آنکھوں میں جینے کی چاہت' جینے نہیں دیتی مورے۔۔۔ ہاں میں سنتا تھا کہانیاں۔ ایسی کہانیاں جس میں شہزادے کو قلعے میں قید شہزادی سے ہی محبت ہوتی تھی یا پھر کسی جادو کے زیر اثر سوتی شہزادی سے یا پھر۔۔۔ سوتیلی ماں کا ظلم سہتی شہزادی سے۔ حالانکہ دنیا بھری ہوئی ہے لڑکیوں سے۔ جوان ہوا' اسے دیکھا تو خود کو طلسماتی کہانی کا شہزادہ ہی سمجھا۔ پاگل تھا' یہ نہ سمجھ سکا اگر کہانیوں کی طرح زندگی بھی "سب اچھا ہے" کے اصول پر چلتی رہے تو لوگ اپنے بچوں کو شہزادوں کی کہانیاں نہ سنائیں بلکہ اپنی آپ بیتی ہی سنائیں۔ سچ میں پاگل ہی تو تھا۔۔۔"

"آپ کو یاد ہے مورے۔۔۔ جب ہم اسلام آباد گئے تھے زریاب کے کالج کے لیے تو ایک دن میں نے آپ کے کچھ پیسے چرا لیے تھے۔ بابا نے مجھے کچھ نہ کہا۔۔۔ صرف اتنا کہا کہ جو چیزیں میں نے ان پیسوں سے خریدی تھیں وہ زریاب اور جلال میں بانٹ دیں۔۔۔ مورے میں آج تک اس تکلیف کا اثر خود میں پاتا ہوں۔ جو چیز نہ ملے ہم چار دن میں رو دھو کر اسے بھول جاتے ہیں اور جو مل جائے اسے تو دو دن میں ہی بھول جاتے ہیں' مگر چیز مل کے بھی نہ ملے وہ چیز ایک مہلک ناسور بن جاتی ہے۔۔۔ سمجھیں دیمک بن جاتی ہے۔ آپ کہتی ہیں کہ سب کچھ تو ہے میرے پاس' مگر آپ نے یہ نہیں دیکھا مورے کہ میں نے خود کو بابا والی سزا دوبارہ دی ہے۔۔۔ میں ساری عمر اسے سامنے رکھوں گا' مگر اپنے بھائی کا اٹھا ہوا ہاتھ کبھی نہیں بھولوں گا۔۔۔ میں کبھی اسے اپنا نہیں پاؤں گا مورے۔۔۔

رہی بات آپ سے جلال کے چھن جانے کی تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے قاتلوں کی نسل میں کسی مرد کو نہیں چھوڑوں گا اور اس بات کی تصدیق بھی جلد ہی ہو جائے گی۔" وہ بات مکمل کر کے خدیجہ کی سنے بغیر دہلیز پار کر گیا۔ جنت کو یوں نظرانداز کیا گویا وہ کہیں موجود ہی نہ ہو۔ وہ خود سے کیے سارے وعدے توڑ کر آگے بڑھی۔

"موسیٰ!" وہ رکا' مگر مڑا نہیں۔ وہ اس کے سامنے آئی۔

"طارق نے ہمیشہ سے کہا ہے کہ اس نے گولیاں نہیں چلائیں وہ تو۔۔۔"

"ہونہہ' طارق چوہدری کی منگیتر کے دلائل تو سنو خان صاحب۔۔۔"

"اب تو سورج پچھم سے بھی نکال لائے تو موسیٰ خان پھر بھی یقین نہ کرے۔"

"موسیٰ اک بار سن تو لے۔۔۔" جنت نے ہاتھ بڑھا کر اسے آگے بڑھنے سے روکا۔ موسیٰ نے وہی ہاتھ زور سے تھاما۔

"ہوں ں ں۔۔۔ تو اس ہاتھ کی اس انگلی پر پہنی تھی اس چوہدری کے نام کی انگوٹھی۔۔۔" اس نے انگلی کو موڑا جنت کو تکلیف ہوئی۔ "اگر یہ انگلی ہی توڑ دوں تو کسی بل میں چھپے طارق چوہدری کو کتنی تکلیف ہو گی ناں؟"

"میری ہر تکلیف موسیٰ خان کو ہوتی ہے۔۔۔ طارق کو نئیں۔" جانے کس زعم میں اس نے یہ بات کہہ دی۔ موسیٰ نے جیسے مدتوں بعد اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑیں۔ پھر یکایک دیوانگی سے انگلی موڑ دی۔ درد کی لہر جنت کے خون میں دوڑتی سارے بدن میں چکر لگانے لگی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"میرے بھائیوں نے کچھ نہیں کیا موسیٰ۔۔۔ آنکھیں کھول کے دیکھو تو۔"

"وہ جس گوٹھ کے والی کے پاس چھپے بیٹھے ہیں ناں' وہ میرے باپ کے ماتحت کام کرتا رہا ہے اسلام آباد

میں۔ میرا ایک پیغام ملا نہیں اور تیرے "معصوم" بھائی نامعلوم قبروں میں منتقل ہوئے نہیں جنت فاطمہ چوہدری۔ تجھے کیا لگتا ہے کہ تو مجھے اتنی پیاری ہے کہ میں دو بھائی قتل کروا کے تجھے ونی کرواؤں اور پھر سب بھول بھال خوش باش ہو جاؤں۔۔۔ آج تو میرے سے بات کرنے کی جرأت کرلی تو نے آئندہ کبھی یوں روکا تو میں خدیجہ خاتون کی تربیت بھول جاؤں گا اور صرف جلال مقتول کا بھائی رہ جاؤں گا۔۔۔ اب جاؤ یہاں سے اور ہاں بھائیوں کے مرنے کی خبر سب سے پہلے تمہیں ہی ملے گی۔" وہ پاؤں کی دھمک پیدا کرتا ہوا آگے بڑھ گیا اور جنت نے دھندلی آنکھوں سے بے جان ہوئی انگلی کو جانچا۔



صندلی بالآخر اس پر مہربان ہو ہی گئی تھی۔ اب وہ اکثر چپکے چپکے اسے کھانے کو کچھ دے دیتی یا اس کے حصے کا کام بھی کر دیتی۔ جب گل باز گھر آتا تو اسے آگے پیچھے کر دیتی کیونکہ وہ جنت کو کچھ پراسرار سا دیکھتا۔ اس دن بھی جنت نے صندلی کی منت سماجت کے بعد گڈو کو ملنے بلایا تھا حالانکہ صندلی نے کتنا منع کیا تھا۔

اب جب جنت نے حویلی کے پھاٹک پر تماشا لگا ہوا دیکھا تو بھاگتی ہوئی ملازموں کے ہجوم میں آگھسی۔ ذرا سی دیر میں خاتون بی بی کے حکم پر ملازم گڈو کی کھال کھینچ لینے کے درپہ تھے۔ گڈو زرد سا زمین پر بیٹھا پٹ رہا تھا۔

"اس نے کیا کیا ہے۔۔۔ چھوڑو اسے۔" وہ ملازموں کو دھکیلنے لگی۔ بشریٰ بھی بھاگتی آئی۔

"ہم نے لڑکیاں ونی کروائی ہیں کوئی تعلق داری نہیں جوڑی تم لوگوں سے کہ جس کا دل چاہے وہ ہمارے زخم ادھیڑنے چلا آئے۔ اس لڑکے سے صرف ڈھائی سال بڑا تھا جلال جسے تمہارے بھائیوں نے۔۔۔" یہ نگینہ خاتون کی آواز تھی۔ ملازموں کے ہاتھ پھر سے رواں ہو گئے۔ جیپ سے اترتا موسیٰ ناسمجھی سے حالات کو دیکھنے لگا۔ وہ بپھر گئی۔

"نہیں کیے یہ قتل ہمارے بھائیوں نے۔۔۔ اور کیسے بتائیں۔ دینے (دین محمد) چھوڑ بچے کو۔۔۔ میں نے کہا چھوڑ۔ اب کوئی ہاتھ لگا کے دکھائے اس کو۔ ہن میں دیکھتی ہوں تم کیسوں کی جرأت۔ لگاؤ ہتھ۔"

وہ شیرنی کی طرح غرائی۔ ملازم پیچھے ہٹے۔ موسیٰ خان مسکرایا۔ عرصے بعد اس نے چوہدرائن کو دیکھا تھا۔ جنت نے گڈو کو ساتھ لگایا، مگر اگلے ہی لمحے نگینہ خاتون نے اسے جھٹکے سے پیچھے کھینچا۔ پیچھے کھڑے موسیٰ پر نظر پڑتے ہی چادر اٹھاتی، آنسو روکتی حویلی میں گھس گئی۔ پیچھے گڈو روتا ہوا حویلی سے نکلا تھا۔ اس کے کان میں ایک پیغام دیا گیا تھا جو آگے پہنچانا تھا۔



اس واقعے کی سزا جنت کو بھوکا رہنے کی صورت ملی۔ تین دن اس حویلی کے پتھریلے ٹھنڈے فرش پر بیٹھے اور تین راتیں گھاس پر کروٹیں بدلتے گزارے، مگر ہاتھ باندھ کے خان زادیوں سے معافی نامہ طلب نہ کیا۔ تیسرے دن جب خان کھانا کھا چکے تو صندلی نے سب سے پہلے جنت کی پلیٹ سجائی۔ پٹھانوں کے پسندیدہ موٹے ابلے ہوئے چاول اور بڑے گوشت کا قدرے پھیکا شوربا۔ جنت سے نوالہ نگلنا اتنا مشکل ہو گیا کہ ابکائی نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ گھٹنوں میں سر دیے وہ خود کو مضبوط رہنے کے اسباق پڑھاتی رہی کہ اک آواز آئی۔

"نہیں کھانا یہ سب۔۔۔ روٹی بناؤ فوراً" ساتھ انڈہ بھی بنا دو اور روز روز یہ موٹے چاول بنانا بند کرو۔۔۔ ورنہ اگلے سال سے میں یہ اگانا ہی بند کر دوں گا۔" موسیٰ اس چوکور صحن میں اس کے سامنے کرسی سنبھال کے بیٹھا۔ ملازمہ جنت کے قریب کھٹ پٹ کرنے لگی مگر وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ارشاد نے بستر لگانے کو کہا۔۔۔ وہ اٹھ گئی۔ پھر صندلی بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئی۔

"یہ لے۔۔۔ کھا لے، چھوڑ گیا ہے تیرے لیے، ورنہ موٹے چاولوں پر مرتا ہے وہ۔۔۔" وہ جو لپک کر ٹرے تک گئی تھی رک گئی۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔

"اسے کہنا... جو محبتوں پر پلتے ہیں ناں پھر ہمدردی سے کچھ نہیں بنتا ان کا۔ ہمدردی چاٹ لیتی ہے محبتوں کے عادی کو..." ٹرے کو ہاتھ سے دھکیل کر وہ خود کو گھسیٹتی پچھواڑے کے گھاس بھرے کمرے میں لے گئی۔

رات کے کسی پہر بشریٰ چار ابلے بھٹے لائی تھی جو گل شیر سے اس کے لیے منگوائے تھے۔ پھر اس رات جنت دوسری بار اونچی آواز سے روئی۔

"اسے یہ کیوں لگا کہ میں بھوکی مرجاؤں گی... اسے یہ کیوں نہیں لگا کہ میری سانسیں تو اس کے "ہونے" سے چل رہی ہیں۔ جس جنت کو کسی نیکی کا ابدی اجر کہتا تھا پھر اس جنت کو خود کے لیے سزا کیوں کرلیا اس موسیٰ نے، جس کا ہر ظلم بھی میرے اندر سے اسے اکھاڑنے میں ناکام ہوجاتا ہے... کیوں؟" بے تحاشا رونے اور بھٹے کھانے کے بعد وہ بے سدھ سوئی تھی۔

بھوک محبت سے بھی بڑی حقیقت ہے۔



چوہدری ظفر اور چوہدری طارق، اسلم جونیجو کے گوٹھ سے راتوں رات کہیں اور فرار ہوگئے... یہ خبر خانوں نے سنی اور تندور ہوگئے۔ مردوں کی اونچی آوازیں مردان خانے کی دیواروں سے باہر آئیں تو جنت نے شکر کا کلمہ پڑھا۔ موسیٰ خان نے جنت کو چوہدری دیوار میں پیوست کردیا۔

"اب دیکھ میں کیسے روندتا ہوں ان چوہدریوں کی لاشیں..."

"قتل نہیں کیے انہوں نے..." وہ بھی گوند ہوگئی۔

خدیجہ نے دل شکستگی سے اپنے تعلیم یافتہ اور روشن خیال بیٹے کو دیکھا۔ وہ پشتو میں خدیجہ خاتون کو کچھ کہہ کر باہر نکل گیا۔ خدیجہ متوازن چلتی اس تک آئیں۔

"کچھ نہیں کہے گا "تمہارے" بھائیوں کو... کچھ کہنا ہوتا تو اپنا منصوبہ تمہیں کبھی نہ بتاتا۔ تمہیں بتایا ہی اس لیے تھا کہ تم انہیں چوکنا کردو... اس لیے پریشان مت ہو۔" دھیرے سے کہتی آگے بڑھ گئیں۔



"نہ زرین... مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایسی باتیں نہ کیا کر میرے ساتھ۔" کھڑکی کے آگے سجی لوہے کی گرل کو صاف کرتے جنت کے ہاتھ شمائل کی بے زار آواز پر ساکت ہوئے۔

"دیکھی ہے تو... نگینہ چچی نے مہرماہ کو پورا تیار کر رکھا ہے... اس بار شاہ دل آیا نہیں اور انہوں نے پھنسایا نہیں... اور وہ پاگل ہے تیرے پیچھے۔ کیا فرق پڑتا ہے تایا زاد ہے ہمارا۔ بات کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"فرق پڑتا ہے زرین... نامحرم' بذات خود بہت بڑا فرق ہوتا ہے مگر ہم لڑکیوں کو یہ بات سمجھنے میں ہمیشہ دیر ہوجاتی ہے۔" شمائل کی آواز مضبوط تھی۔

"یہ محرم' نامحرم کیا ہے... محبت پاکیزہ ہونی چاہیے' باقی کسی بات سے فرق نہیں پڑتا۔"

"زرین! محبت کتنی ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو... اسے معاشرتی سوالوں کا سامنا ہمیشہ رہا ہے... کیوں؟ ویسے بھی میری بہن' یہ پیار' محبت یہ سب سننے میں ہی اچھا لگتا ہے ورنہ اصل زندگی میں یہ محبت اور ذلت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں... اگر شاہ دل جذبوں میں کھرا نکلا تو جیت لے گا تجھے' ورنہ میں اپنی راہ کیوں کھوٹی کرتی پھروں' جو لڑکیاں خود سے شہزادے ڈھونڈنے نکلتی ہیں ناں' ان کا نصیب محلوں کی خاک بننا ہی ہوتا ہے بس۔" زرین نے چپ سادھ لی' لیکن جنت کے اندر ایک شور سا مچ اٹھا۔ عدالت لگ گئی۔ دھڑا دھڑ دلائل اڈنے لگے۔ اس کی ساری زندگی کا "دھوکا" شمائل کے چند الفاظ نے "عیاں" کردیا۔

"اگر جنت فاطمہ چوہدری کا نصیب موسیٰ خان بنگش ہی لکھا جاچکا تھا تو پھر وہ کیوں اسی شخص کے لیے اتنا تردد کرتی رہی۔ کچھ نہ بھی کرتی تو مل تو جانا ہی تھا موسیٰ خان۔ وہ خود کو اتنا ارزاں نہ کرتی تو آج بشریٰ کی طرح "گھروالی" ہوتی۔ تو کیا غلط راہ چننے والیوں کے گھر نہیں ہوتے...؟ نہیں بالکل نہیں... بالکل بھی نہیں۔" وہ وہیں ڈھے گئی۔



سورج' زمین سے روٹھ کر دور جا کھڑا ہوا تو سرد ہوائیں سب کے بدن اپنی بے رخی سے ٹھٹھرا دینے کے درپے ہوگئیں۔ جنت نے موسیٰ کے لیے رونا چھوڑ دیا' مگر موسیٰ نے تو اسے دیکھنا تک چھوڑ دیا۔ وہ ہفتوں بعد حویلی کا رخ کرتا۔ کچھ دیر ٹھہرتا پھر واپس فصلوں پر چلا جاتا۔ محموداللہ چوہدری کے کھیت اجڑ گئے' مگر ولایت خان بنگش کے کھیت سونا اگانے لگے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دولت **سمیٹتا نہ تھکتا**... یہ دیکھے بنا کہ ان فصلوں کو اپنا خون دیتا ان کا پوتا' ہولے ہولے ختم ہو رہا ہے۔ اس کی سونے سی چمکتی آنکھیں اب سردیوں کی دھند سے نبرد آزما' نڈھال پڑے سورج سی دکھتیں۔

جب کبھی لاشعوری طور پر وہ شازمین یا مہرماہ کے کپڑوں میں لپٹی زندہ لاش سی اپنی جنت کو دیکھتا تو دنوں سو نہ پاتا۔ جب وہ اپلے دہکاتی اور آنکھوں کی سرمئی لکیر سے آنسو پھلانگ کر باہر نکلتے تو وہ دو دن تک کوئی شے حلق سے نہ اتارتا۔ ملازموں کو پیٹ ڈالتا۔ اپنا آپ زخمی کر بیٹھتا۔ محبت کی طرف مائل ہونے لگتا تو جلال کا فریادی ہاتھ' ان دونوں کے درمیان آکھڑا ہوتا۔ پھر اس ہاتھ سے جڑی نفرت اسے سب بھلا دیتی۔ اگر وہ جنت پہلے سی جنت نہ دکھتی... تو وہ موسیٰ بھی کوئی اور ہی تھا۔

وہ جو پکے نالے پر چارپائی ڈالے' آم کے درخت تلے' برف بن جانے کی چاہ میں پچھلے دو گھنٹوں سے بیٹھا تھا' دل کے غیر معمولی ہونے پر اٹھ گیا۔ ہرمن سنگھ ٹماٹروں کی گوڈی کرتا' "اک پھل موتیے دا مار کے" گنگنا رہا تھا سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

"میں ذرا حویلی تک ہو آؤں... شادا آگیا تو وہ پیٹی کینو دے دینا۔" وہ معمول سے ذرا زیادہ تیزی دکھا رہا تھا... جیپ کے چلانے میں بھی۔ نہر کے قریب چوہدری شیراز سے سامنا ہوگیا۔ اس نے سر ہلا کر موسیٰ کو سلام کیا۔ پھر زہرخند سا کچھ بڑبڑایا۔

"اس کے تو وارے نیارے ہوگئے ان دنوں... چوہدریوں کی جاگیر کا بیٹھے بٹھائے وارث بن گیا۔"

موسیٰ نے بے ساختہ یہ بات سوچی پھر سر جھٹک کر رفتار مزید بڑھا دی۔

حویلی کا صحن سنسان پڑا تھا۔ وہ نظر گھما کے اسے ڈھونڈتا رہا۔ دریچوں' دیوانوں' برآمدوں... کچھ نہ ملا۔ ماں کے کمرے میں گیا۔ رنگ فق تھا۔

"جنت... جنت کدھر ہے؟" خدیجہ حیران ہوئیں۔ کچھ کہنے کو منہ کھولا' مگر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ بھی پیچھے ہی نکلیں۔ وہ تقریباً" دوڑتا ہوا پچھلے صحن میں گیا۔ مجمع میں نظر دوڑائی۔ کراہیں اور چیخیں... موسیٰ کا سانس تک ساکت ہوگیا۔ گل باز نے اسے چوٹی سے تھام کر کنویں میں لٹکا رکھا تھا... یوں کہ نیلا کر دینے والی سردی میں اس کے پاؤں برف ہوئے پانی میں تھے۔ وہ مینڈک اس کے پائنچے میں لٹک رہے تھے کیوں وہ کنواں تقریباً" خشک ہونے کے قریب تھا۔ وہ تکلیف اور خوف سے چیخ مار کر بے دم ہو جاتی۔ موسیٰ کچھ بھی سوچ سکتا تھا' مگر اتنا ظلم نہیں۔ وہ گھٹنوں پر ویسے ہی جھکا جیسے جلال کے مرنے پر جھکا تھا۔ رکوع کی حالت میں جھکتے ہی اسے لگا جیسے جلال چلا گیا تھا ویسے جنت بھی... آنکھیں لہو رنگ ہوگئیں۔

خدیجہ نے زور زور سے پشتو میں گل باز کو روکا' مگر موسیٰ... ولایت خان بنگش کی طرف بڑھا جو کرسی پر جمے سب دیکھ رہے تھے۔ خواتین نے پلو دانتوں تلے دبا رکھے تھے۔ دو ملازماؤں نے بشریٰ کو تھام رکھا تھا' مگر پیار سے... وہ حویلی میں ایک اور شیر کا اضافہ کرنے والی تھی۔ ضمیر لالہ نے ولایت خان کی طرف بڑھتے موسیٰ کو دیکھ کر کہنا چاہا۔

"یہ لڑکی... اس نے بھگایا ان چوہوں کو جو نیچو کے بل سے... یہ لڑکی..." موسیٰ نے خاموشی سے ولایت خان کی سنگلاخ سی لاٹھی اٹھالی۔

"موسیٰ!" خدیجہ آگے بڑھیں۔ خواتین حق دق...

وہ کنویں کی منڈیر پر جھکا جنت کا بازو تھام رہا تھا۔ گل باز نے چوٹی نہ چھوڑی وہ نیلی ہوئی بے جان تھی۔ موسیٰ نے چادر اوڑھائی۔ گل باز نے موسیٰ کو دھکیلا ولایت خان کی لاٹھی نے برسنا شروع کر دیا۔ پٹھان گالی

نہیں دیتا' نہ ہی قسم کھاتا ہے' مگر موسیٰ نے اسے ہر گالی دی اور قسم اٹھا اٹھا کر دی۔ ضمیر اور گلزار آگے بڑھے تو وہ مزید بپھر گیا۔ گل باز کا پورا جسم جیسے مفلوج ہو گیا۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے' مگر موسیٰ نہ تھما جب تھک گیا تو ولایت خان کو دیکھا۔

"آپ کی خود غرضی نے مجھے یہ بنا دیا۔۔۔ ماں بہن کے سامنے' ماں بہن کی گالی دینے والا۔ اک چھوٹی سی بات کے لیے ہتھیار اٹھا لینے والا۔ چھوٹی سی بات۔۔۔ صرف یہی کہ اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دیں۔ اس کی دشمنی مجھ سے ہے۔۔۔ لڑنے کا حق صرف میرا ہے۔ گل باز کیا اس گھر کا کوئی بھی فرد اس کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کا حق بھی نہیں رکھتا۔۔۔ تو پھر اتنی چھوٹی سی بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ چھوڑ تو دیا ہے اسے۔ پھر کیوں ساری حویلی والے اس لڑکی کی چھوٹی سی خطا معاف کرنے کو تیار نہیں۔۔۔" وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ "اگر آج کے بعد کسی نے اسے سخت نظر سے دیکھا بھی تو قسم ہے مجھے ولایت خان بنگش کے نسب کی۔۔۔ میں اس کا فیصلہ بندوق سے کروں گا۔"

ہاں وہ اتنی ہی فیصلہ کن شخصیت رکھتا تھا۔ اس حویلی کے کچھ عیاش مردوں کو تو اپنی فصلوں کی ترتیب بھی یاد نہ تھی۔ کس موسم میں کیا کاشت کیا جاتا ہے کسی کو صحیح معلوم نہ تھا۔۔۔ تو ایسے میں موسیٰ خان کسی کی گردن بھی دبا دیتا تو وہ اسے اس کی محبت ہی سمجھتا۔ وہ سانس درست کرتا جنت تک گیا۔ بشریٰ اس سے لپٹ رہی تھی۔ وہ اس پر جھکا۔ دل چاہا سب کچھ بھول جائے اور جنت کے کندھے پر سر رکھ کے بچوں کی طرح روئے۔ اسے بتائے کہ اس کی روح میں تذبذب کی سوئیاں گڑی ہیں۔ وہ ایسا بدقسمت ہے کہ سامنے کھڑی منزل کو دیکھ کر خوش بھی نہ ہو پایا تھا کہ واپسی کا حکم مل گیا۔۔۔ وہ اسے بتائے۔۔۔ اسے بتائے کہ موسیٰ جنت کو کبھی چھوڑ ہی نہیں سکتا۔

وہ اس کے گال تھپتھپا رہا تھا' مگر جنت کی بات نے اسے پھر مخالف ہواؤں میں دھکیل دیا۔

"پیچھے ہٹو بزدل۔۔۔ جلال مقتول کے بھائی بنو۔" نفرت سے کہتی وہ اسے ہاتھ سے پیچھے کر رہی تھی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا پھر تیزی سے دور ہوتا گیا۔ شاید ان کا نصیب ہی یہ تھا۔

"کیوں کیا ایسا؟ کیسی چاہ سے بڑھا تھا وہ تمہاری طرف۔۔۔ پھر کیوں خان کو واپس کر دیا؟" بشریٰ کا ملال نہ جاتا۔

"تو یہ کہہ سکتی ہے بشریٰ۔۔۔ کیونکہ تو نے صرف "بٹا" ہوا موسیٰ ہی دیکھا ہے۔۔۔ "مکمل" تو میں نے دیکھا ہے اسے۔۔۔ یہ صرف وقتی جذبہ تھا بشریٰ' کل کو اسے پھر سے جلال ظہیر خان یاد آ جاتا اور وہ پھر سے دور چلا جاتا۔۔۔ مگر پھر میں یہ سب برداشت نہ کر پاتی۔ ویسے بھی میں کیوں ایک ونی ہوئی لاش بن کر ساری عمر اسے پوجتی رہوں اور میں کیوں نہ اس وقت کا انتظار کروں جب وہ "سچائی" کو پا کر میری طرف بڑھے گا۔ جب چوڈی (چوبیس) گاؤں دیکھیں کہ میں ہوں موسیٰ خان کی سلطنت کی ملکہ۔ اتنے بڑے سنگھاسن کے لیے یہ قربانی تو بہت چھوٹی ہے۔ مکمل موسیٰ کو پانے کے لیے یہ آگ کا دریا تو بہت کم تر ہے۔ تم نے اسے "مکمل" نہیں دیکھا ناں۔۔۔"



اگلی صبح جب وہ معمول کے مطابق تندور میں اپلوں کو ترتیب دے رہی تھی تب حویلی میں دبا دبا سا ہنگامہ اٹھا۔ مرد زور زور سے دروازے بند کرتے حویلی سے نکلے۔ عورتیں زنان خانے میں جمع چہ مگوئیاں کرنے لگیں۔ بشریٰ لپک جھپک اس تک پہنچی۔

"وہ۔۔۔ وہ موسیٰ کہیں چلا گیا۔" جنت کے ہاتھ تھمے۔

"مطلب؟" تیوری پر بل پڑے۔

"مطلب جب کل ادھر سے گیا تو پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ رات بھی ڈیرے نہیں آیا۔ صبح سے سارے کامے ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئے۔ وہ سچ میں کہیں چلا گیا ہے۔"

"آ جائے گا۔۔۔ کل جو ہنگامہ ہوا' اس کے بعد سوچا

ہو گا کچھ دن ان لوگوں کی شکل نہ ہی دیکھے۔۔۔ کچھ دنوں میں آجائے گا۔" اتنی مطمئن نہ تھی جتنا ظاہر کر رہی تھی۔ جنت کو سب کی نظریں چھیدتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"نیلماں سچ کہتی تھی۔۔۔ تیری محبت بڑی خود غرض ہے جنت فاطمہ۔ تو نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ وہ کس قیامت کو پار کر کے تیرے تک آیا تھا کل شام ہونہہ۔۔۔ مگر تجھے کیا۔۔۔ تجھے تو وہ "مکمل" چاہیے۔"

جنت نے بے یقینی سے بشریٰ کو دیکھا جو احتیاط سے قدم دھرتی برآمدے میں چلی گئی۔

"اللہ کوئی راہ دکھا دے۔۔۔ وہ روشنی جو چھپی ہے اسے ظاہر کر دے۔" وہ دل سے دعا مانگتی رہی۔



جب حویلی سے نکلے پانچواں ہفتہ ہو گیا تو اس نے سوچا کہ اب کوہاٹ چلا جائے مگر اسفندیار نے یہ کہہ کر روک لیا کہ وہ اس کی شادی میں شرکت کے بعد ہی کہیں جا سکے گا۔ وہ رک گیا۔ ویسے بھی وہ کاہلی کو خود پر جی بھر کر طاری کرنا چاہتا تھا۔

شادی کے مخصوص ہنگامے بھی اس کے سوئے جذبات کو نہ جگا سکے۔ مہندی کی رات اس نے چوہدری شیراز کو نشے میں دھت ڈھول کی تھاپ پر ڈولتے دیکھا تو اپنا وطن یاد آگیا۔ چوہدری شیراز تب تک ناچتا رہا جب تک گر نہ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈیاں ہوا میں اچھالتا اور سر دائیں بائیں مستی سے ہلاتا۔ جب سب اپنے بستروں میں چلے گئے تو وہ ہولے ہولے چلتا چوہدری شیراز تک گیا۔

"بڑا پیسے والا ہو گیا ہے چوہدری۔۔۔ لگتا ہے دبئی میں نوٹ چھاپنے کا کارخانہ لگایا تھا۔" اس کے قریب بیٹھ گیا۔ سر دیوار سے ٹکا لیا۔

"او نہیں، نہیں۔۔۔ کیہڑا کارخانہ بادشاہو۔ یہ تو بس محمود اللہ چوہدری کی بے وقوف اولاد کی نظر کرم اے۔۔۔" وہ بہکی آواز میں بولا۔

"چل تیرے تو عیش ہو گئے چوہدری۔۔۔ ہے ناں؟"

"او کھتے عیش بابو۔۔۔ عیش تے تب سی جب وہ کجوری آنکھوں والی ملتی۔۔۔ آہا۔۔۔ کیا اکھ (آنکھ) بنائی ہے رب نے سرمہ لگا کے۔" وہ سیدھا ہوا چوہدری شیراز واقعی کچھ زیادہ ہی مست ہو گیا تھا۔

"کی فائدہ ان خالی کاغذوں کا۔۔۔ ابا جی کو کہا وی تھا پر انہیں تو صرف زمینیں اور کالی و بھوری نظر آرہی تھیں۔۔۔ بولے ابھی تو یہ سنبھال، کل کو دو اور مار کر خانوں کے، یہ کڑی وی اٹھالیں گے۔ چلو جی۔۔۔" وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا مگر موسیٰ وہیں اٹک گیا۔

"قتل نہیں کیے میرے بھائیوں نے۔" ایک آواز گونجی۔

"چوہدریوں کو قتلوں کا کیا فائدہ ہوا۔" سوال اٹھا۔

"ہم نے پانی نہ توڑا تھا۔۔۔ اس گل کا نیاہ (حلف) دی دے سکتے ہیں۔" موسیٰ نے گھومتے سر سے فیصلہ کن انداز میں چوہدری شیراز کو دیکھا۔



خانوں کو جیسے کوئی سر راہ لوٹ گیا۔ وہ یوں چپ ہوئے جیسے بھری چوپال میں کسی نے ان کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو۔ جنت ان کے تیوروں سے کچھ پریشان ہوئی۔ اس کے لوٹ آنے کی دعائیں مانگتی۔ اتنی بے رونق تو وہ ان کے ظلم سہ کے نہ ہوئی تھی جتنی وہ "اس" کے نظروں سے اوجھل ہو جانے پر ہوئی۔ دعائیں سانسوں کی صورت اس سے جڑ گئیں۔ سارے ہولے ہولے اسے ختم ہوتا دیکھتے حیران ہوتے۔

اس رات بے تحاشا بادل برسا۔ پانی نے سارا کھر دھو دیا۔ وہ اپنے بستر میں دبکی، کچی پکی نیند میں تھی جب اس کا پاؤں ہلایا گیا۔ وہ چونک کر اٹھی۔

"جسے تو نے سرکنڈوں میں چھپتے دیکھا تھا۔۔۔ وہ کون تھا؟" وہ پنجوں کے بل بیٹھا، پوچھ رہا تھا۔ وہ جلدی سے دوپٹہ ڈھونڈنے لگی۔

"کچھ پوچھا ہے؟" وہ عالم بے یقینی میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"کھانے کو کچھ لاؤں؟"

"جو پوچھا ہے وہ بتا دے بس..." وہ تڑخا۔

"کیا پوچھا تھا؟" بے وقوفی کی انتہا۔

"ہمارا پانی کس نے توڑا تھا؟"

"اب کیا فائدہ... سب تباہی کی حد تک بدل گیا۔" وہ ڈھے جانے والے انداز میں زمین پر بیٹھا۔ خاموشی کے وقفے کے بعد خود ہی بولی۔

"چوہدری شیراز کو دیکھا تھا اس روز... پہچانا اس روز جب دو قتل مزید ہو گئے... اس دشمنی کے نام... مجھے مہلت ہی نہیں ملی... مہلت سے زیادہ اعتماد۔ سب گولیاں شمار کرتے رہے... اندھی دشمنی کو روز محشر تک طول دینے میں تیزی دکھاتے رہے... کھانا لاؤں۔"

وہ اسے گھور کر اٹھ گیا۔ جنت اطمینان سے لیٹ گئی... خوشیاں محدود بھی ہو جاتی ہیں۔ اطمینان کا معیار بھی بدل جاتا ہے...؟ ہاں شدید حالات سے دوچار لوگوں کے لیے اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔

اگلی صبح بشریٰ نے اسے جھنجوڑا۔

"موسیٰ تے ٹھیک ہے؟" ہڑبڑا کے بولی۔

"ہاں او تے ٹھیک ہے مگر... چوہدری شیراز قتل ہو گیا ہے گل باز دے ہتھوں (ہاتھوں)۔ سارے رام پور کے سامنے لاش چوہدری یعقوب کی حویلی میں پھینک کے آیا ہے گل باز۔ ارشاد کہہ رہی ہے جلال اور سرمد کے علاوہ نگینہ خاتون کا شوہر بھی اس نے قتل کیا اور تو اور... پانی بھی اس نے توڑا تھا۔ ہماری زمینوں پر قبضہ چاہتے تھے۔ جانتے جو تھے کہ دو جوان ہیں ہماری نسل میں... خان مار دیں گے تو زمینیں خود بخود ان کو مل جائیں گی۔ او تے شکر ہے موسیٰ کے سامنے بک گیا' نشے کی حالت وچ... ہائے جنتے! اٹھ کے دیکھ ہمارے تو نصیب ہی پلٹ گئے۔ وڈے خان بارہ پنڈوں کی پنچایت بلا رہے ہیں... لگتا ہے صلح ہو ہی جائے گی۔" وہ حق دق' بشریٰ کو یک ٹک دیکھے گئی۔ کیا وہ خواب دیکھ رہی تھی...؟

☆ ☆ ☆

قدرت نے رام پور کے گردونواح... میں حیرانی پھیر دی۔ بھلا ایسا بھی ہوتا ہے...؟ ساری عمر بے سمت گولیاں چلائی جا سکتی ہیں...؟ کوئی اتنا کائیاں کیسے ہو سکتا ہے؟ اور مقابل اتنا عقل کا اندھا؟ حیرانی در حیرانی...

چوہدری اور بنگش اپنی ساری طراری اور دلیری بھول بیٹھے۔ چوہدری یعقوب فرار ہو گیا۔ اس کے بھائی پسپا... قصاص دینے کا فیصلہ کر لیا۔ تقریباً" دو دہائیوں پر مشتمل یہ دشمنی' ان دو خاندانوں کی کمر توڑ گئی۔

بڑی پنچایت لگی۔ محمود اللہ چوہدری نے اپنے بچپن کے اکلوتے دوست ولایت خان بنگش کو بنا کسی حساب کتاب کے گلے لگا لیا۔ چوہدری یعقوب کے خاندان کو تاعمر علاقہ بدر کر دیا۔ زمینیں قصاص کے طور پر رکھ لیں۔ سارے علاقے سے بارود کی بو ناپید ہونے لگی۔ ظفر اور طارق بھی واپس وطن کو لوٹ آئے۔

موسیٰ خان بنگش اپنے آپ کو کوستے نہ تھکتا۔ اگر پہلے جنت کی سن لیتا... اب کیسے "واپس" لوٹوں؟ چوہدرائن سے کیا بھید... ساری عمر یہ طعنہ دے۔ وہ پنچایت کے بعد سے حویلی نہ گیا۔ سارے علاقے کو روندتا اس کا سیاہ گھوڑا' نڈھال ہو گیا۔ رات گئے حویلی آیا۔ خان مطمئن بیٹھے قہوہ پیتے جاتے اور پرانے قصے دہراتے جاتے۔

"خان کھانا لاؤں؟" صندلی نے جھک کر پوچھا۔

"نشتہ!" غصے اور غم میں وہ پشتو ہی بولتا۔ ورنہ پنجاب میں رہتے ہوئے وہ سب آدھے سے زیادہ پنجابی ہو چکے تھے۔ وہ گل باز کی وجہ سے مردوں کے ساتھ نہ بیٹھا۔ حالانکہ گل باز کئی بار معافی مانگ چکا تھا' مگر موسیٰ کے دل سے جیسے وہ کسک ہٹتی ہی نہ تھی۔ وہ دادی کے پاس آبیٹھا۔ جنت کہیں نہ تھی۔ بشریٰ' شازمین کے کمرے سے نکل رہی تھی۔

"آج سارا دن حویلی نہیں آیا میرا شیر؟" بی بی جان نے بال سنوارے۔

"جانے کیوں...؟ بس اک شرمندگی سی تھی۔ دل

اٹک اٹک جاتا۔ کیسے پل بھر میں مٹا ہے سب کچھ' ہماری زندگیوں سے۔ تقدیر نے کیسا ٹھٹھا لگایا ہے ہمارا۔"

"تو باقیوں کی طرح کیوں نہیں سوچتا موسیٰ خان۔"

"نہیں سوچ سکتا بی بی جان... اس دشمنی سے میرا تعلق ہی "الگ" تھا۔"

"وہ چلی گئی... اپنے میاں جی کے ساتھ۔ وہ آئے تھے آج دوپہر... دونوں کو چلنے کو کہا۔ بشریٰ نہ مانی... ظاہر سی بات ہے اس کے پاس تو جواز ہے رکنے کا' مگر... جنت چلی گئی۔ خدیجہ نے روکا تھا... بولی' دل نہیں مانتا... رہ بھی گئی تو کبھی خوش نہ رہ پاؤں گی... میں سمجھوتے کرنے والی ہوتی تو سوتیلی ماں سے کرلیتی... کم از کم گھر والی تو ہوتی... کوئی بدنصیب تو نہ کہتا اور نہ ہی... "سزا"۔" وہ حق دق سنتا رہا۔ تو گویا جنت نے موسیٰ کو "چھوڑ" دیا۔



پیپل کی چھاؤں تلے پھر سے محفلیں جمنے لگی تھیں۔ جنت خالی خالی سا سب کو دیکھے جاتی۔ زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلا تھا اس نے حویلی واپس آکر۔ صرف ایک مقصد کے لیے... اگر جیت گئی تو سر اٹھا کر رہے گی ہمیشہ' ہار گئی تو اسی حویلی میں مٹی ہو جائے گی۔ بڑی مامی سرد سا دیکھتیں' مگر چپ رہتیں۔ اگر بیٹے کو رد کرنے والی وہ تھی تو بیٹے کو قبر سے بچانے والی بھی وہی تھی۔ ظفر باجی کو دیکھ کر راستہ بدل لیتی اور طارق اسے دیکھ کر... میاں جی بہانے بہانے سے ساتھ لگاتے' پاس بٹھائے رکھتے اور وہ جو "کچھ دن" کے لیے آئی تھی ڈیڑھ مہینے سے بھٹکتی پھرتی تھی۔

ابھی بھی پیپل تلے سب نیلماں کے ساتھ ساتھ بشریٰ اور اس کے جہیز کا حساب کتاب لگانے بیٹھے تھے۔ وہ چارپائی کی پائنتی پر بیٹھی اپنے ناخن کھرچ رہی تھی۔ کنیزاں بھاگتی آئی۔

"چوہدری جی... چوہدری جی وہ موسیٰ خان آیا ہے پھاٹک پہ۔"

"او کم عقلے' اودھر بھاگی آئی ہے پہلے مردان خانے میں بٹھانا تھا اسے۔"

"نہیں' ضرورت نہیں..." جنت قطعیت سے بولی۔ "پوچھو اس سے کیا چاہیے۔"

سب نے اس کی اٹھی گردن کو دیکھا اور بھاؤ تاؤ والے انداز کو بھی۔ میاں جی متامل ہوئے تو بولی۔

"بے فکر رہیں میاں جی... کبھی نہیں چھوڑے گا مجھے۔ چاہے ایک ٹانگ پر کھڑا کروالو۔" بڑی مامی قہر آلود سا مسکرائیں۔ وہ ان سے بھی زیادہ قہر آلود ہوئی۔

سب کو سانپ سونگھ گیا۔ کنیزاں واپس بھاگی۔ وہ گنتی گننے لگی۔ انیس ہونے سے پہلے لوٹی۔

"کہتا ہے جنت چاہیے۔ واپس حویلی چلے اس کے ساتھ۔" جنت کی گردن مزید تنی۔ ترچھی نظروں سے مامی کو دیکھا۔

"کہو... جنت تب تک نہ آئے گی جب تک قبرستان والا برگد کا جنگل سبز ہے۔ اسے تاریک کردے اور لے جائے جنت کو۔" سارے حیران ہوگئے۔ وہ جنگل کئی ایکڑوں تک پھیلا تھا۔ اسے تاریک کرنا... ناممکن۔ پھر وہ پاگل ہی ہوتی ناں۔ کنیزاں واپس آئی۔

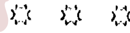
"کہتا ہے خان ذا' زار شم۔" جنت کے لب اندر کو دھنسے۔ سر خم کرکے آگے بڑھ گئی۔ جب مامی نے سب ملازماؤں کے سامنے اس کے خود ساختہ قصے فرانٹے سے سنا ہی رکھے تھے تو پھر وہ کیوں شرماتی اور ویسے بھی اب تو شرعی رشتہ تھا ان دونوں میں۔

بات سارے علاقے میں پھیل گئی۔ ونی ہوئی لڑکی کا اتنا سنگین مطالبہ... بھلا برگد کا جنگل کیسے تاریک ہو سکتا تھا؟ موسیٰ خان نے کلہاڑا پکڑ لیا تو جیسے کسی نے بارود کو تیلی دکھادی۔ ہر چوک' ہر نکڑ' چوپال' بیٹھک' غرض ہر قسم اور ہر طرح کے مجمع میں یہی بات زیر بحث آنے لگی۔ کئی منچلوں نے شرطیں لگالیں۔ پھیلتے پھیلتے بات کئی گاؤں اور قصبوں کو پھلانگ گئی۔

دونوں خاندان اس بار خاموش تماشائی بنے نتیجے پر نگاہیں گاڑے بیٹھے تھے۔ ایک ماہ میں دن کے بائیس

گھنٹے اس مرد کے ہاتھ چلے۔ برگد جیسا درخت ' دشمنی پر اتر آیا۔ وہ چھٹے دن مڑ کے صاف کیے گئے حصے کو دیکھتا تو وہ پھر سے سبز ہو چکا ہوتا۔ ہر من سارا دن سرہاتھوں میں گرائے ' برگد کی گرتی ٹہنیاں دیکھتا رہتا۔ اس کا دل شدت سے چاہتا کہ کاش... کاش وہ جنت فاطمہ چوہدری ہوتا۔

سارے بنگش بے نتھے بیلوں کی طرح بھاگتے پھرتے ' مگر الجھاؤ کا سرا نہ ملتا... جاگیر کا نظام تلپٹ ہوا جاتا... ہر گزرتے دن کے ساتھ۔ ہولے ہولے لوگ اس کامنی سی لڑکی کا مقصد سمجھنے لگے۔ وہ اپنا اور اپنے شوہر کا مقام لکیر کھینچ کے واضح کرنا چاہتی تھی۔ ایک وٹی ہوئی لڑکی سب کو بتانا چاہتی تھی کہ ڈور کس حد تک اس کے ہاتھ میں ہے ' مگر اس کے علاوہ وہ ایک اور بات بھی جانتی تھی جو صرف "تعمیل" کرتے اس شخص کو ہی معلوم تھی۔



ڈھائی مہینے بعد وہ جھلسی رنگت ' پھٹی ایڑیوں اور چھالے زدہ ہاتھوں سمیت پکی حویلی کا پھاٹک کھٹکھٹا رہا تھا۔ محلے والے دستک کی للکار سے باہر نکل آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجمع سا لگ گیا۔ گویا شرط پوری ہو گئی...! سارے رام پور اور اس کے اطراف میں کھلبلی سی مچ گئی۔ کھیتوں میں کام کرتے لوگ ' درانتیاں پھینک کر بھاگتے آئے۔ موسیٰ خان کا گھوڑا اس کی ٹانگوں پر سر مارنے لگا۔ وہ رش سے ہمیشہ ڈرتا تھا۔ دستک میں مزید جارحانہ پن اترا ' مگر حویلی والے مجمع سے متاثر ہوئے لگتے تھے۔ کافی دیر بعد پھاٹک کھلا۔ کنیزاں سامنے آئی۔

"بول جا کے بی بی کو... برگد ہو گیا تاریک۔ اب باہر آجائے۔" وہ خفا خفا سا نظر آرہا تھا۔ کنیزاں واپس مڑ گئی۔ لوٹی تو بولی۔

"کہتی ہے رات کو میاں جی بات کرلیں گے... فی الحال جنت نہیں ' یہ رکھو۔" اس نے ہاتھ میں تھامی مرہم آگے کردی۔ اس نے دہلیز تھامی... ضبط کیا گویا۔

"کہو چوہدرائن بنے... آکے خود بات کرے مجھ سے۔" لوگ ٹانگوں پر اپنا وزن بدلتے رہے۔ "ہاتھ ہو گیا بنگش کے ساتھ" سب کی متفقہ رائے۔ خانوں نے پھر سے دشمنی بنالینی ہے چوہدریوں سے... پیش گوئیاں۔ وہ کسی عظیم سلطنت کی ملکہ جیسی تمکنت سے چلتی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ ڈھائی ماہ میں اس کا سنہرا پن بڑھ گیا تھا۔ سیاہ لباس میں وہ بادلوں میں گھرے سورج سی دکھ رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔

"یہ کیا ہے؟" اشارہ ' مرہم کی طرف تھا۔

"تمہیں اسی میں خوش ہو جانا چاہیے۔ کم از کم یہ تمہارے لیے سزا ' تو نہیں ہے۔" جتاتا ہوا سرد لہجہ... وہ چونک گیا۔ بغور اسے دیکھا۔ وہ ڈٹ کے کھڑی رہی... لو اکھاڑ لو جو اکھاڑ سکتے ہو... ہم نہیں جاتے۔

موسیٰ نے لگام جھٹکی ' گھوڑا سیدھا ہوا۔ جست لگا کر گھوڑے پر بیٹھا۔ لوگوں میں مایوسی اتری... آہ ' دیہاتیوں کی تفریح۔ اگلے ہی پل ہجوم میں دبی دبی پرجوش چیخیں بلند ہوئیں کیونکہ وہ مغرور چوہدرائن ہوا میں معلق گھوڑے کے ساتھ جارہی تھی۔ اس کا دایاں بازو ' چھالے زدہ ہاتھوں میں تھا اور وہ بھاگتے گھوڑے کے سموں سے اٹھتے خوفناک گرد میں منہ دبے چیخ رہی تھی۔ ہجوم نے خوشی سے تالیاں پیٹیں اور خبر تھامے مختلف سمتوں کو بڑھ گئے۔



نہر کے سنگ چلتی آم کے درختوں میں گھری سڑک پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گھوڑے کے قدموں میں لگام کھینچ کر سستی لائی گئی۔ پھر ہاتھ میں موجود سنہری گڑیا کو سامنے بٹھایا گیا۔

"اللہ کرے تو رنڈوا ہو جائے موسیٰ خان..." وہ تڑخ تڑخ جاتی۔ سامنے بیٹھا قہقہہ لگاتا مرد زندگی سے بھی پیارا نہ ہوتا تو یقیناً "نہر میں کود کر مرنے کی کوشش بھی کی جاتی۔

"اف ف ف... اتنی بے عزتی۔" ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپا۔

"بے عزتی..... ؟ خود ہی تو کہا تھا کہ چووی (چوبیس) گاؤں دیکھیں۔"

"ہاں تے وہ میں نے جنج (بارات) لانے کو کہا تھا۔" آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

"وہ تو سب کرتے ہیں..... مطلب جنج تے تائی کی بیٹی کی بھی آئی تھی..... اس میں نیا تو کچھ نہ تھا۔ پھر شرط بھی تو ظالمانہ تھی۔ بس ذرا دماغ گھوم گیا پٹھان کا۔" وہ مطمئن ہی تھا۔

"تو جانتا ہے وہ شرط کیوں رکھی۔" آنکھیں باقاعدہ برسنے لگیں۔ وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ سخت تکلیف دیتے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ تھامے' گھوڑا چہل قدمی کے انداز میں ہولے ہولے چلتا۔

"چل مان لیا زمانے نے تجھے بھی اور مجھے بھی۔ یہ بھی جان لیا کہ تو ونی ہوئی بھیڑ بکری نہیں ہے..... ملکہ ہے میری سلطنت کی۔ تیری ماں' میری تائی سب نے جان لیا۔ طارق چوہدری' گل باز نے بھی مان لیا کہ میں تیرے لیے برگد ہی نہیں گلا بھی کاٹ سکتا ہوں پھر کیوں نہ آئی تو میرے کہنے پر؟"

"میاں جی رخصت کرنا چاہتے تھے مجھے نیلماں' شیریں کی طرح۔" آنسو پونچھے۔

"تو ہونا چاہتی تھی؟" وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

"تجھے نہیں لگتا میری گردن کی اکڑ نکل جاتی ہے اس حویلی میں۔"

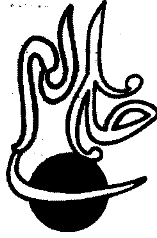
"اور تجھے یہ کیوں لگا کہ میں تجھے وہاں لے کے جاؤں گا؟ اب مزید نہیں جنت' میں صرف زندہ نہیں رہنا چاہتا..... میں جینا بھی چاہتا ہوں۔ ہم کوہاٹ ہی جائیں گے' مورے چلی گئی' شائل بھی..... اب ہم جائیں گے۔" وہ لگام تھامنے لگا۔ جنت رک گئی ہاتھ سامنے کیے۔

"بہت مشکل ہو گیا تھا ناں۔"

"اس وقت سے کم مشکل جب تو نے دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا مجھے۔" "ہوں....." وہ دلگیر لہجے میں بولی..... "حالانکہ دیکھنا تو اب چھوڑنا چاہیے جو تیرا حشر ہو گیا ہے۔" آخر میں وہ کھلکھلائی۔ موسیٰ نے غصہ ضبط کرتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اسے بازو سے پکڑ کر لٹکا دیا۔ اب ہنسنے کی باری موسیٰ خان کی تھی۔ حالانکہ کھلکھلاہٹیں تو نہر کی تہ تک میں تھیں..... ان دونوں کے لیے۔

☆

نمرہ احمد



تالیہ خواب میں فاتح کے سن ہاؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ فاتح تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ سکہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلیک میل کر کے سکہ نکلوا لیتی ہے، مگر سکہ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

فارض صاحب کے ذریعے فاتح کو حالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے حالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور اس منصوبے میں فاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ فاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اسرار کھلتا ہے۔ حالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

ساتویں قسط



اگر وہ اشعر محمود ہو تو وہ اس آفس میں سیف کہاں بنائے گی؟ سوچو تالیہ! انسان کی کمزوری وہ ہوتی ہے جس پہ وہ بھروسہ کرتا ہے۔ اشعر کس پہ بھروسہ کرتا ہے؟

''خوابوں کے لئے محنت کرنا پڑتی ہے۔ جان مارنی پڑتی ہے۔ لوگ مسئلوں کا آسان حل مانگتے ہیں اور جب وہ نہ ملے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو مایوسی بالکل نہیں پسند۔ ہمارے کچھ مسئلے ایسے ہوتے ہیں جن کو ٹھیک ہونے میں لمبا عرصہ لگتا، تو منفی لوگوں کی طرح اس عرصے کو مظلوم بن کے اپنے دکھوں کی کہانیاں سنانے کے بجائے انسان کو آگے کے بارے میں اچھا سوچنا چاہیے۔ اسے اتنا مثبت بننا چاہیے کہ اس سے مثبت شعائیں پھوٹنے لگیں۔ وہ جہاں جائے، ان مثبت اور خوش گوار روشنیوں کو بکھیرتا جائے۔''

آفس کے وسط میں کھڑی تالیہ نے آنکھیں کھولیں اور اب کے آفس کو دیکھا تو اس کی نظریں مختلف تھیں۔

(میں ایک آرکیٹیکٹ ہوں۔ مجھے اونچی عمارتیں بنانا اور بلندیوں سے دنیا کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔) وہ وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ آرکیٹیکٹ بھی تھا۔ اس نے یہ آفس خود ڈیزائن کیا تھا۔

تالیہ نے دیکھا۔ دیوار پہ ایک بک شیلف نصب تھا۔ اس نے بتی بجھائی۔ بلائنڈز بند کیے۔ کمرا تاریک ہو گیا۔ پھر اس نے ننھی ٹارچ نکالی، جس میں نیلی روشنی سی تھی۔ اس نے وہ روشنی شیلف پہ پھینکی۔ اوپری قطار میں چوتھے نمبر پہ رکھی کتاب کے اوپر نیچے نشانات نظر آ رہے تھے۔ (یہ ٹارچ اندھیرے میں وہ نشان بھی دکھا دیتی ہے جو روشنی میں نظر نہیں آتے۔) تالیہ نے مسکرا کے بتی جلائی اور اس کتاب کو ذرا سا باہر کھینچا۔ بک شیلف میں گڑگڑاہٹ ہوئی اور وہ میکانکی انداز میں بائیں طرف کو سرکنے لگا.......

''میں زندگی میں کبھی کسی چیز کو لے کر پچھتاتا یا گلٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ جو غلطیاں کی ہیں زندگی میں، ان کا مجھے احساس ہے، مگر میں ہمیشہ حل ڈھونڈتا ہوں۔ بجائے خود کو لعنت ملامت کرنے کے، ہم ہر روز رات کو اگر یہ تسلیم کر لیں کہ ہم انسان ہیں، غلطیاں ہم سے ہو جاتی ہیں، کوئی بات نہیں، ہم اس سے سبق سیکھیں گے اور اگلے دن کو ایک نئے دن کے طور پہ گزاریں گے تو نیند اچھی آئے گی۔''

بک شیلف سامنے سے ہٹ چکا تھا اور پیچھے دیوار میں ایک سلور سیف نصب تھا۔ تالیہ نے کان میں لگا آلہ دبایا۔ ''داتن۔ یہ گلین ریڈر ہے۔ بیس منٹ لگیں گے مجھے۔ اشعر کے آفس اور راہداری کے درمیان مزید diversion (افراتفری) کری ایٹ کرو۔ آگ، دھواں کچھ بھی۔''

''تالیہ... جلدی کرو... وقت کم ہے دیوانی لڑکی!'' داتن پریشانی سے کہہ رہی تھی......

''اور جتنے میرے ساتھ زندگی میں حادثے ہوئے، میں ان کو بھی ایک تجربہ سمجھتا ہوں۔ میری بیٹی آریانہ.... سب جانتے ہیں کہ وہ کھو گئی.... سب جانتے ہیں کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ میں چاہتا تو اس کا غم لے کر تارک الدنیا ہو جاتا.... خود کو بلیم کرتا.... دنیا بھر کو بلیم کرتا.... مگر میں نے اس کو ایک تجربے کے طور پہ لیا۔ اللہ کی چیز تھی، اللہ نے لے لی، لیکن کیا میں نے اس امانت کا شکر ادا کیا تھا؟ اور اب مجھے اپنے باقی دونوں بچوں کو کیسے پالنا ہے، ان کے لئے اللہ کا شکر گزار کیسے ہونا ہے، میں بس یہی سوچتا ہوں۔ مثبت رویہ وہ دیکھنے کا نام ہے جو آپ کے پاس بچ گیا ہے اور منفی رویہ ہر وقت اس کو سوچنے کا نام ہے جو کھو گیا ہے۔''

وہ کانوں میں ہیڈ فون لگائے سیف کے سامنے کھڑی مختلف سمتوں میں اس کا پہیہ گھما رہی تھی

ماسک تلے چہرے پہ پسینہ آرہا تھا۔ وہ آوازیں سن رہی تھی۔ کس حرکت پہ کہاں کلک ہوتا تھا۔ سیف کی دھات دھیرے دھیرے اسے راز بتا رہی تھی ساتھ ہی وہ کاغذ پہ مختلف نمبرز لکھتی جا رہی تھی۔ جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

"مجھے اپنے ملک کے لوگ مایوس اچھے نہیں لگتے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ مثبت بنیں۔ پرامید۔ اونچے خواب رکھنے والے۔ وسیع سوچ رکھنے والے۔ میں چاہتا ہوں لوگ شکر گزار بنیں۔ جو ہے اس کی قدر کریں۔ جو نہیں ہے' اس کو زیادہ نہ سوچا کریں۔"

واضح کلک کی آواز آئی۔ تالیہ نے گہری سانس لے کر پہیہ گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

اندر سامنے نیلے فولڈر والی فائل رکھی تھی۔ اس نے فولڈر نکالا' صفحے پلٹائے' تصدیق کی۔ پھر اپنے بیگ سے چند صفحے نکال کے فائل کے اندر لگائے' اور اصلی صفحات بیگ میں ڈال دیے۔

"وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو اونچے خواب دیکھتی ہیں' اور یاد رکھنا جیفری۔ اگر آپ کو آپ کا خواب ڈراتا نہیں ہے' تو وہ بڑا خواب ہے ہی نہیں۔"

باتھ روم کے روشن دان سے وہ نیچے اتری۔ وہاں دھواں بھرا تھا' مگر دروازہ کھلا تھا۔ اس نے ماسک اتارا۔ بال کھولے۔ گلابی شرٹ سیاہ لباس کے اوپر پہنی۔ ہیٹ سر پہ لیا' جوتے تبدیل کیے اور تیزی سے باہر کو دوڑی۔ دھوئیں کے باعث کھانسی اٹھنے لگی تھی۔ فائر الارم ہنوز بج رہا تھا۔ فائر بریگیڈ کا عملہ عمارت میں داخل ہو چکا تھا........

"اگر ہم دنیا کو بدلنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنا رویہ بدلنا ہو گا' اور ہم دیکھیں گے کہ دنیا خود بخود بدلنے لگی ہے۔ یہ سوچ اور وژن کی تبدیلی ہے جو میں ایک بہتر ایشیا میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" اسٹوڈیو میں بیٹھا شخص مسکرا کے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے روشنی پھوٹ رہی تھی اور اینکر سمیت سب محویت سے اسے سن رہے تھے۔

"تھینک یو وان فاتح آپ نے ہمیں اپنا قیمتی وقت دیا۔" اینکر نے کہہ کے کیمرے کی طرف رخ پھیرا۔ "ناظرین' مجھے امید ہے کہ آپ نے بھی میری طرح بہت کچھ سیکھا ہو گا اور...." انٹرویو ختم ہو چکا تھا۔

فاتح اب اپنی شرٹ پہ لگا مائیک اتار رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ چکی تھی۔ ذہن میں حالم اور فائل کا خیال بار بار آرہا تھا۔

☆☆☆

کوالالمپور پہ رات اتر رہی تھی۔ اونچی عمارتیں بتیوں سے جگمگانے لگی تھیں۔ ایسے میں تکون شیشوں سے ڈھکی عمارت کے ایک فلور پہ جہاں باریسن نیشنل کا آفس تھا' وان فاتح لفٹ سے اتر رہا تھا۔ عثمان اور گارڈز ہمراہ تھے۔ آفس کیبن روشن تھے اور ورکرز کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

اس کو دیکھتے ہی بہت سی گردنیں مڑیں۔ لوگ کھڑے ہوئے۔ سلام' دعا۔ وہ اتنے سالوں سے اس سلیبریٹی پروٹوکول کا عادی تھا۔ سب کو مسکرا کے جواب دیتا آفس کی جانب آگیا۔ ابھی دروازے کے قریب ہی تھا کہ جانے کس سمت سے ایک کیپ والا لڑکا نکل آیا۔ وہ پیروں میں پہیوں والے جوتے پہنے' مرمریں فرش پہ گویا skate کرتا تیزی سے سامنے آیا تھا۔ (ایسے میسنجر لڑکے اکثر پہیوں والے جوتے پہنے راہداریوں میں زن سے گزرتے دکھائی دیتے تھے۔)

"وان فاتح۔ کوریئر۔" ایک پیکج اس کی طرف بڑھایا اور ٹیبلیٹ اسکرین آگے کی۔ فاتح ہلکا سا مسکرا دیا اور ٹیبلیٹ اسکرین پہ انگوٹھا رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا یہ کس کی طرف سے ہو گا۔

آفس میں آتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے پیکج کھولا۔ اندر کاغذات رکھے

تھے۔ ترتیب سے۔ وہ جیسے جیسے صفحات پلٹتا گیا' آنکھوں میں خوشگوار حیرت بھرتی گئی۔ اسی اثناء میں فون بجا تو وہ چونکا۔ پھر نمبر دیکھ کے مسکرایا۔

''تمہارا میجک شو کامیاب رہا' حالم۔''

''کیا آپ متاثر ہوئے؟''

''بہت زیادہ۔ مگر ہر میجک شو کے بعد حاضرین کرتب کا راز جاننا چاہتے ہیں۔''

''مگر کیا آپ نے کسی جادوگر کو اسٹیج پہ کھڑے ہو کر اپنے راز بتاتے دیکھا ہے؟''

''بیک اسٹیج تو بتایا جا سکتا ہے نا!''

''آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟''

''یہ تم نے کہاں سے لیے؟''

''اشعر محمود کے آفس کے سیف سے۔ میں نے چند ردی کاغذ فائل کے اندر رکھ دیے ہیں' تاکہ ان کو فوراً شک نہ پڑے۔

اب آپ ان کاغذات کی حفاظت کیجیے گا۔''

''تم نے مجھے عثمان کے سامنے یہ سب کہنے کے لیے کہا' تمہارے خیال میں وہ اشعر کے لئے کام کرتا ہے۔''

''آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اشعر کے لئے کام کرتا ہے' اگر میں اتنے کم عرصے میں جان گیا ہوں تو آپ کیوں نہیں جانتے ہوں گے بھلا؟'' حالم لمحے بھر کو بھی نہیں چوک رہا تھا۔ ترنت جوابات دے رہا تھا۔

فاتح ہلکا سا ہنس دیا۔ ''یہاں کوئی کسی کا وفادار نہیں ہوتا' ہمیں صرف کام نکلوانا ہوتا ہے۔ کسی اور کو رکھوں گا تو وہ بھی بک جائے گا۔''

''وفاداری آج بھی اپنا وجود رکھتی ہے وان فاتح۔ کچھ لوگ وفاداری کے ایسے وعدے کر لیتے ہیں کہ اس کے لئے آگ میں بھی کود پڑتے ہیں۔ خیر....'' حالم نے گہری سانس لی۔ ''آپ کا کام ہو گیا۔ مجھے اجازت؟''

''اور تمہاری فیس؟''

''میں نے یہ فیس کے لئے نہیں کیا۔ سیاستدانوں سے کون پاگل پیسے لے گا؟ سیاستدانوں سے تو فیورز مانگے جاتے ہیں۔ آپ اب میرے مقروض ہیں۔ کبھی کوئی کام لے کر آؤں تو کر دیجیے گا۔ وہی میری فیس ہوگی۔''

فاتح نے ٹیک لگا لی اور فون کان سے لگائے مسکرا کے اس کو سننے گیا۔

''کبھی مجھ سے ملنے آؤ' حالم۔''

''میں آپ کی توقعات کے برعکس ہوں' سر! ایسی خواہش نہ کریں تو اچھا ہوگا۔'' اس کی آواز میں اداسی گھل گئی۔

''ہوں...ویسے حالم کا کیا مطلب ہے؟''

''خواب دیکھنے والا۔''

فاتح کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ محظوظ ہو رہا تھا۔ ''یعنی کہ وژنری!'' پھر جیسے یاد آیا۔ ''تم نے بتایا نہیں' یہ کام کس کا تھا؟''

چند لمحے کو خاموشی چھا گئی۔ ''آپ چور کا نام جاننا چاہتے ہیں؟'' حالم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اور میں یہ جانے بغیر فون نہیں رکھوں گا۔ میری ہٹ دھرمی سے سارا ملائیشیا واقف ہے۔''

''تو پھر سنیے۔ آپ کے گھر چوری....(وقفہ دیا)....تالیہ مراد نامی لڑکی نے کی تھی۔ وہ کوئی سوشلائیٹ ہے اور جس کا آپ کے گھر کچھ دنوں سے آنا جانا ہے۔''

فاتح نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سر اثبات میں ہلایا۔ ''یعنی میرا شک درست تھا۔ گڈ جاب' حالم۔''

''میں آپ کے لئے حاضر ہوں' وان فاتح۔ جہاں آپ کہیں' جب آپ کہیں۔'' اور کلک کے ساتھ فون بند ہو گیا۔

فاتح نے خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ فون پرے ڈالا اور صفحات اٹھا کے پھر سے دیکھنے

لگا۔ سارے دن کی کلفت دور ہو گئی تھی۔

تکون عمارت کے باہر.... تاریک پارکنگ میں وہ دونوں موجود تھیں۔ تالیہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھی فون کان سے ہٹا رہی تھی اور داتن ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے دھچکا لگا تھا۔

''یہ بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ تالیہ مراد چور ہے؟ تم ایسا کیسے کر سکتی ہو اپنے ساتھ؟''

''تو کیا کہتی؟'' وہ اداسی سے داتن کو دیکھ کے بولی۔ ''آپ کی بیوی چور ہے؟''

''ہمارے پاس ویڈیو ہے عصرہ کی۔''

''داتن' وہ کسی پہ بھی اعتبار نہیں کرتے۔ ان کا کوئی دوست نہیں۔ وہ کسی سے جلدی متاثر نہیں ہوتے۔ انہوں نے حالم کو تھینکس تک نہیں کہا کیونکہ وہ صرف اجنبیوں کو شکریہ کہتے ہیں۔ وہ حالم کو اجنبی نہیں سمجھتے۔ حالم نے ان کا اعتماد جیتا ہے۔ مجھے ان کو وہی بتانا تھا جو وہ سننا چاہتے تھے۔''

''مگر تم نے اپنا امیج ہی کیوں خراب کیا؟'' داتن صدمے میں تھی۔

''میں نے ان سے سچ بولا ہے۔ تالیہ نے ان کے گھر چوری کی تھی۔ بریسلیٹ چرایا تھا نا۔ میں نے پہلی دفعہ کسی سے اتنا بڑا سچ بولا ہے۔ اور میرا امیج تو ان پہ پہلے ہی خراب ہے۔'' وہ تلخی سے کہہ کے کار اسٹارٹ کرنے لگی۔ داتن ابھی تک صدمے سے چور اس کو دیکھ رہی تھی۔

''تم نے آج اپنی جان خطرے میں ڈالی' تم نے آج اندھا دھند کھائی میں چھلانگ لگائی' میں نے تمہیں کبھی ایسا نہیں کرتے دیکھا۔ تالیہ' ایسے مت کرو اس کے لیے۔ تمہارا دل بیمار پڑ گیا تو جسم کسی کام کا نہیں رہے گا۔''

''مجھے لگتا ہے میرا دل پہلے ہی بیمار پڑ چکا ہے' لیانہ صابری۔'' وہ بولی نہیں' بس دل میں کہا اور اسٹیئرنگ وہیل گھما دیا۔

کار آگے بڑھ گئی اور تکون عمارت پیچھے رات میں کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

وان فاتح کی رہائشگاہ کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ ایسے میں فاتح کے کمرے میں آؤ تو وہ ڈریسنگ روم میں کھڑا دکھائی دیتا تھا۔ وارڈروب کے دونوں پٹ کھلے تھے اور وہ ہینگر سے کپڑے اتار رہا تھا۔ دو جوڑے لیے' اور کمرے میں واپس آیا جہاں بیڈ پہ ایک چھوٹا سفری بیگ کھلا پڑا تھا۔ پھر ایک دم ٹھٹکا۔

عصرہ سامنے کرسی پہ آ بیٹھی تھی۔ خاموش۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے۔ اسے دیکھ کے جبراً مسکرائی۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

وہ آگے آیا اور بیگ میں کپڑے تہ کر کے رکھنے لگا۔ ''ملاکہ۔ کل چھٹی ہے نا۔''

''کیوں جا رہے ہو؟'' اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔

''سن باؤ (تین خزانوں) کے گھر کو بیچنے سے پہلے ایک آخری دن اس میں گزارنا چاہتا ہوں۔''

''ابھی کیسے بیچو گے؟ کاغذات تو ہیں ہی نہیں۔''

''کاغذات مل گئے ہیں۔'' وہ سر جھکائے بیگ میں سامان اڑس رہا تھا۔ عصرہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''کیا مطلب؟ کہاں سے ملے؟'' وہ تیزی سے بولی۔

''مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ میں نے اوریجنل ڈاکومنٹس کہیں اور رکھے تھے۔ یہاں صرف کلرڈ کاپیز تھیں۔'' اس کی نگاہیں جھکی تھیں اور وہ شیو کا سامان ایک خانے میں ڈال رہا تھا۔

''واٹ؟'' وہ شل رہ گئی۔ ''تو جو کاغذات یہاں تھے.... جو تالیہ نے چرائے تمہارے بقول' وہ صرف

فوٹو کاپی تھی؟''

''ہوں!'' اب ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔ جھک کے دراز کھولی اور جرابیں نکالیں۔ وہ بالکل بے نیاز لگ رہا تھا۔

عصرہ چند لمحے اسے دیکھے گئی۔ پھر اس نے لب بھینچ لیے۔ بازو سینے پہ لپیٹ لیے۔ ''تو صبح سے اتنا ہنگامہ کیوں مچایا ہوا تھا؟''

''کیونکہ وہ کاغذات اہم تھے۔'' وہ جرابیں لے کر واپس آیا اور ان کو بیگ میں ڈالا۔ ابھی تک عصرہ کو نہیں دیکھ رہا تھا۔

''اور میری نیلامی؟ میرے ڈونرز؟ وہ اہم نہیں تھے؟'' عصرہ کے اندر ابال سا اٹھنے لگا تھا۔ بے بسی ....غصہ....فرسٹریشن....وہ شدید کیفیات کا شکار تھی۔

''تم نے میری اس ڈونر کو بے عزت کیا جو کانگ ہو جیسے لوگوں کو مدعو کر رہی تھی' جس نے میرا پورٹریٹ بنایا' جو گھائل غزال خریدنے جا رہی ہے۔ میں پہلے دن سے تمہاری منت کر رہی ہوں کہ اس کے ساتھ سلوک اچھا رکھو' مجھے اس جیسے لوگوں کی ضرورت ہے مگر تم....!''

فاتح نے اکتا کے چہرہ اٹھایا۔ ''اس نے چوری تو بہرحال کی ہے' کاپیز ہی سہی۔''

''بس وان فاتح!'' عصرہ نے ہاتھ اٹھا کے سرخ چہرے کے ساتھ اسے روکا اور کھڑی ہوگئی۔ ''کبھی وہ چور ہے تو کبھی میرا بھائی۔ اور کبھی کہتے ہو فائل کھوئی ہی نہیں۔ وہ آج میرے آفس آئی تھی اور وہ شدید دکھی تھی۔'' فاتح کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ ''اس نے بدتمیزی کی تمہارے ساتھ؟''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے کہ اس نے کیا کیا۔ میں تمہارے ایک ایک معاملے میں تمہارا ساتھ دوں اور تم میرے کام کو خراب کرو۔ بس بہت ہو گیا۔ الیکشن لڑنا ہے' لڑو۔ ملاکہ والا گھر بیچنا ہے' بیچو۔ لیکن میرے دوستوں سے اب تم دور رہو گے۔ اتنے سالوں سے تمہارے جنون کے پیچھے ہم خوار ہو رہے ہیں۔ اب اور نہیں۔''

''تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ کاغذات مل گئے ہیں' نہ کہ غصہ کرنا چاہیے۔'' وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

عصرہ کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ ''کس بات پہ خوش ہوں؟ میرے بھائی پہ الزام لگایا تم نے؟ میری ڈونر کو بے عزت کیا تم نے؟ اس فائل کے پیچھے جو کھوئی بھی نہیں تھی۔ ایک بات میری سن لو فاتح۔ اگر آئندہ تم نے میرے دوستوں کے ساتھ یہ کیا تو....'' وہ انگلی اٹھا کے کہہ رہی تھی۔

''ایک بات میری بھی سن لو عصرہ...اگر مجھے کبھی پتہ چلا کہ تم نے اس کام میں اپنے بھائی یا اس لڑکی کی مدد کی ہے' تو یاد رکھنا' اس کے بعد ہم اس موڑ پہ آ جائیں گے جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوگی۔'' وہ ٹھنڈے انداز میں بولا' ایسے کہ نگاہیں اس کے اندر تک جھانک رہی تھیں۔

عصرہ نے انگلی گرا دی۔ مگر وہ ٹھنڈی نہیں پڑی تھی۔ غصے سے پیر پٹختی مڑی اور باہر نکل گئی۔ اسے پسینہ آ رہا تھا۔ جسم تپ رہا تھا۔ تیزی سے وہ کمرے میں واپس آئی۔ دروازہ بند کیا۔ پھر ڈریسنگ روم میں آئی۔ یہاں کا بھی دروازہ مقفل کیا اور کپکپاتے ہاتھوں سے کال ملائی۔

''ایش....فاتح کہہ رہا ہے اسے فائل مل گئی ہے؟'' پیشانی کو چھوتے ہوئے' وہ دبی آواز میں بولی تو شدید پریشان لگ رہی تھی۔

''ہاں کاکا....آبنگ نے یہی بات آگے پیچھے دوسرے لوگوں کے سامنے بھی دہرائی ہے کہ ان کو کسی انویسٹی گیٹر نے فائل واپس لا دی ہے مگر ڈونٹ وری...فائل میرے پاس ہی ہے۔'' اس کی مطمئن آواز سنائی دی تھی۔

''نہیں۔ میں فاتح کو جانتی ہوں۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اصل فائل کھوئی ہی نہیں تھی۔ وہ جھوٹ بول رہا

ہے۔ مگر اس کی شکل پہ لکھا ہے کہ اس کو واقعی فائل مل گئی ہے۔"

"ریلیکس کاکا۔ میں نے خود چیک کیا ہے' وہ میرے پاس ہی ہے۔"

"میں کیا کہہ رہی ہوں' اشعر' وہ فائل تمہارے نہیں' فاتح کے پاس ہے۔ وہ اسے تم سے نکلوا چکا ہے۔ شاید کسی انویسٹی گیٹر کے ذریعے۔ وہ وان فاتح ہے۔ وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اور اسے مجھ پہ بھی شک ہو رہا ہے۔"

"کاکا۔ ہم صبح بات کریں گے۔ میرے آفس میں پہلے ہی حالات خراب چل رہے ہیں۔ میں سارے دن کا تھکا آیا ہوں۔" وہ بے زار ہوا تو عصرہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"میں نے تمہارے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا اور تمہیں پرواہ ہی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔ اب تم الیکشن ہارو یا فاتح' مجھے پرواہ نہیں ہوگی۔ میں صرف اپنا فائدہ اور نقصان دیکھوں گی جیسے تم لوگ دیکھتے ہو۔" کہہ کے ٹھک سے فون بند کیا۔ اشعر شاید وضاحت دے رہا تھا مگر اس نے نہیں سنا۔

پھر وہ گھومی تو ڈریسر مرر سامنے آیا۔ وہ خاموش ڈریسنگ روم میں تنہا کھڑی تھی۔ قدم قدم چلتی ہوئی آئینے کے قریب آئی اور اپنا عکس دیکھا۔ انگلی کے پوروں سے آنکھوں کے کنارے کو چھوا۔

"آریانہ کے نین نقش مجھ سے ملتے تھے۔ ٹین ایج میں پہنچ کے وہ بھی ایسی ہی لگنے لگے گی۔ آج کے دن وہ کھوئی تھی۔ چھ سال پہلے۔ تیرہ سال کی ہو گئی ہو گی وہ۔" چند لمحے وہ خود کو دیکھتی رہی' پھر مسکرائی' جیسے چہرے کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

کریم اٹھائی اور نرمی سے چہرے پہ لگانے لگی۔ جلد چمکنے لگی تو وہ دل سے مسکرائی اور فون اٹھا لیا۔ اب وہ واپس کمرے میں آتے ہوئے آرام دہ انداز میں بات کر رہی تھی۔

"کیسی ہو تالیہ؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں مسز عصرہ؟"

تالیہ کی سنجیدہ مگر نرم آواز سنائی دی۔ عصرہ بڑی کرسی پہ بیٹھ گئی اور ٹانگ پہ ٹانگ جمائی' پھر بھورے بالوں کی ایک لٹ انگلی پہ لپیٹتے ہوئے گویا ہوئی۔

"میں فاتح کی طرف سے معذرت کرنا چاہتی تھی۔ وہ آج کل الیکشن کی وجہ سے ٹینس ہے۔ جلد خفا ہو جاتا ہے۔ جانے تمہیں کیا کیا کہہ بیٹھا۔"

"کوئی بات نہیں۔ ان کو تو قوم دو چار قتل بھی معاف کر دے گی۔" تالیہ کی اداس ہنسی گونجی۔

"مگر میں مداوا کرنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ ایسی کوئی بھی بات ہمارے درمیان آئے۔" عصرہ کی بادامی آنکھیں جیسے تانے بانے بُنتی دکھائی دے رہی تھیں۔

"مداوا مت کہیں.....درخواست سمجھ لیں۔ ایک چھوٹا سا کام آپ میرے لئے کر سکتی ہیں۔"

"شیور۔ بتاؤ' مجھے خوشی ہوگی۔" اور پھر تالیہ کی بات سن کے اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔

"بالکل' تالیہ۔ یہ میں کر سکتی ہوں۔ اور کل ہی کر سکتی ہوں۔"

کھڑکی سے باہر حبس آلود رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

حالم کا اونچا بنگلہ رات کے اس پہر خاموش پڑا تھا۔ تالیہ' داتن کو ڈراپ کر کے کار اندر لائی تو پورچ کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ کار سے نکلی' اور سوئچ بورڈ کی طرف آئی۔ مگر ٹھٹک کے رک گئی۔ سانس بھی روک لیا۔ پھر ایک دم گھومی۔

وہ پورچ کے ستون کے ساتھ کھڑا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے مسکراتا ہوا۔ سمیع۔

تالیہ کا دل بری طرح دھڑکا۔ ایک نظر گیٹ کو دیکھا جو چار فٹ کا جنگلہ نما تھا۔ کوئی بچہ بھی اس کو

پھلانگ لے۔ مگر پھر بھی یہ سمیع کی طرف سے ایک حماقت مندانہ قدم تھا۔ وہ اس کے گھر کے گیٹ کے اندر تک پہنچ چکا تھا۔

"کیوں آئے ہو؟" بھنویں اکٹھی کر کے وہ غصے سے بولی۔

سمیع نے ایک ہاتھ جیب سے نکالا' اور چھوٹی سی کھچڑی داڑھی کھجائی۔

"تم سے ملاقات کا دل چاہ رہا تھا۔ پورے دن تو تم بڑے لوگوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو۔ رات کو ہی فارغ ہو کے گھر آتی ہو۔"

"نکل جاؤ میرے گھر سے۔" اس نے بازو لمبا کر کے غصے سے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

اس کی رنگت گلابی پڑنے لگی۔ ایئر پورٹ.... وہ بیگ.... وہ تکلیف... سب ذہن میں تازہ ہو گیا۔ ایک اس آدمی سے اسے ڈر لگتا تھا۔ اس ڈر نے جیسے کبھی ساتھ چھوڑا ہی نہیں تھا۔

"یہ میرا اکاؤنٹ نمبر ہے۔" اس نے ایک پرچی تالیہ کی طرف بڑھائی۔

تالیہ برہمی سے اسے گھورتی رہی۔ اس نے پرچی نہیں تھامی تو سمیع نے اسے اس کی کار کی چھت پہ چپکا دیا۔ وہ sticky نوٹ تھا۔ فوراً چپک گیا۔

"تمہارے پاس دو دن ہیں۔ کل اور پرسوں۔ پھر میں وہ کروں گا جو تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ ان دو دنوں میں میرے وظیفے کی رقم کا تعین کر لو' میرا لائف ٹائم پلان تیار کر دو اور اس اکاؤنٹ میں پہلی قسط بھجوا دو۔" وہ چبا چبا کے کہہ رہا تھا۔ "اگر دو دن تک مجھے رقم نہ ملی تو تمہارا یہ تاش کے پتوں کا گھر (انگلی سے اونچے بنگلے کی طرف اشارہ کیا) نیچے آن گرے گا۔"

گھنٹی بجی تو دونوں نے چونک کے دیکھا۔ جنگلے نما گیٹ کے باہر نیم تاریکی میں کھڑا ایڈم نظر آ رہا تھا۔ سمیع نے کالر کھڑکا کے سیدھے کیے۔

"تمہارے مہمانوں کے سامنے تمہاری اصلیت کھولنے کا دل تو بہت چاہ رہا ہے مگر کیا کروں' مسلمان کی ایک زبان ہوتی ہے۔ اور دو دن تک اس زبان کو میں بند رکھوں گا۔ صرف دو دن ہیں تمہارے پاس' میڈم تالیہ۔" مسکراتی نظر اس پہ ڈالی اور گیٹ کی طرف چلا گیا۔ البتہ باہر نکلتے ہوئے اس نے سر سے پیر تک ایڈم کو دیکھا ضرور تھا۔

"آ جاؤ' ایڈم!" خفا کھڑی تالیہ نے وہیں سے پکارا۔ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ایڈم کے میسج کا جواب دے کر اسے گھر آنے کا کہا تھا۔

ایڈم ایک ناپسندیدہ نظر اس آدمی پہ ڈالتا اندر آیا۔ تالیہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔ وہیں کار کے ساتھ تاریک پورچ میں کھڑی رہی۔ بیگ کہنی پہ تھا اور بازو سینے پہ لپیٹ رکھے تھے۔

ایڈم ذرا فاصلے پہ رکا۔ سادہ پینٹ شرٹ میں ملبوس' ذرا دبتی رنگت والا ایڈم آنکھوں میں الجھنیں لیے ہوئے تھا۔

"بولو۔ کیوں آئے ہو؟" وہ خفا اور اکتائی ہوئی لگتی تھی۔

"کیا یہ آدمی آپ کو تنگ کر رہا تھا؟"

"اس کی فکر مت کرو۔ میں پولیس آفیسر ہوں' ان لوگوں سے نبٹ سکتی ہوں۔"

"یہی جاننے آیا ہوں۔ آپ واقعی پولیس آفیسر ہیں یا نہیں؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے ٹھنڈے انداز میں بولا تو تالیہ کے ماتھے پہ بل پڑے۔ اس نے ہتھیلی پھیلائی۔

"میرا سکہ؟"

"آپ نے تو کہا تھا' وہ سرکار کا ہے۔"

"مگر وہ واپس میرے ذریعے ہی جائے گا نا۔"

"نہیں پے تالیہ۔" اس نے غور سے تالیہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "میں وہ آپ کو نہیں دے سکتا۔ مجھے آپ پہ اعتبار نہیں رہا۔" تالیہ نے

مٹھی نیچے گرادی۔
''ایسا کیا کیا ہے میں نے جو تم مجھ پہ شک کر رہے ہو؟''
''آپ نے ابھی تک یقین دلانے کے لئے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔''
''میں تمہیں ایک بونس آفر کر رہی تھی' ایڈم۔'' وہ جھلا کے حیرت سے بولی۔
''آپ مجھے لالچ دے رہی تھیں مگر میرا دل نہیں مانتا۔ مجھے لگتا ہے آپ شروع دن سے اس سکے کے پیچھے تھیں۔ میرا نہیں خیال وان فاتح آپ سے واقف ہیں' ورنہ وہ گھر میں ہونے والی چوری کے بارے میں آپ سے سوال جواب کیوں کرتے؟''
تالیہ لمحے بھر کو خاموش ہوئی۔ ''وہ سب عصرہ اور اشعر کو دکھانے کے لئے تھا تاکہ اصل چور مطمئن رہے کہ فاتح کو اس پہ شک نہیں اور ہم اس کو پکڑ لیں!''
''یہ سب کہانیاں ہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ آنکھوں میں افسوس تھا۔ ''اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کی مدد کروں تو آپ کو مجھ سے سچ بولنا ہوگا۔ سچ بولنے سے معاملہ ماضی کا حصہ بن جاتا ہے اور جھوٹ اسے مستقبل کا حصہ بنا دیتا ہے۔
آپ کون ہیں؟ آپ کا مقصد کیا ہے اور میں آپ کی مدد کر کے درست کروں گا یا نہیں' مجھے صرف سچ بتائیں بے تالیہ۔''
تاریک پورچ میں کھڑی سنہرے بالوں والی لڑکی چند لمحے تندہی سے اسے دیکھتی رہی۔
''میرا نام تاشہ کمال ہے' اور میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔ اگر چاہتی تو پولیس بھیج کے وہ سکہ تم سے ریکور کر کے تمہیں چوری کے الزام میں جیل بھیج سکتی تھی مگر مجھے تم پہ ترس آیا اور میں نے سوچا کہ تمہیں واپس ملنا چاہیے۔ بہر حال کل تک سوچ لو۔ کس طرح واپس کرنا ہے تم نے وہ سکہ' یہ فیصلہ کر لو۔ اس کے بعد ہم دونوں ساتھ کام نہیں کریں گے۔''
''یعنی آپ مجھے پورا سچ نہیں بتائیں گی۔'' ایڈم زخمی لہجے میں بولا اور پھر شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھتا قدم قدم پیچھے ہٹتا گیا۔
''اب میں سچائی کی تلاش خود کروں گا' بے تالیہ۔'' وہ پیچھے ہٹ رہا تھا اور تالیہ خاموشی سے اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔
ایڈم چلا گیا اور وہ اسے روک بھی نہ سکی۔ آج کے لئے بہت سچ بول چکی وہ۔ اب مزید نہیں۔ اسے ایڈم کا کوئی اور حل سوچنا پڑے گا۔
''وہ تمہارے خواب میں تمہارے ساتھ خزانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کو خزانے کا راز بتا دو' تالیہ!'' دل نے کہا مگر اس نے سختی سے دل کو جھڑکا۔
'میں خزانہ کسی کے ساتھ شیئر نہیں کروں گی۔ میں ایڈم کو سچ نہیں بتا سکتی۔ اسے لالچ آ گیا اور اس نے سارا خزانہ خود حاصل کرنے کا سوچ لیا تو؟ اونہوں۔ خزانہ صرف میرا ہے۔ میرے بابا اور میرے گاؤں والوں کا ہے۔''
رات تاریک ہوتی گئی اور وہ اپنے کمرے میں بیڈ پہ آلتی پالتی کیے بیٹھی سوچتی رہی۔ ہاتھ میں سنہرا لاکٹ پکڑ رکھا تھا۔ بار بار خود کو جھڑکتی۔ اپنی ہی تردید کرتی۔ سکہ اس کا تھا۔ چابی اس کی تھی۔ وہ اس کو شیئر نہیں کرے گی۔
مگر کیا واقعی چابی اس کی تھی؟
اس نے سنہری لاکٹ کو دیکھا اور پھر اسے گردن میں پہنا۔ پیچھے ہک بند کرتے وقت وہ تیار تھی وہ اس کی یادوں کا پنجرہ تھا اور وہ اس میں کھو جانے کو تیار تھی.....
منظر ایک دم بدلا.... آنکھوں کے سامنے روشنی چھانے لگی۔ آگ کی سی روشنی.... جیسے بھڑکتے شعلے ہوں۔ وہ مدھم ہوئے تو اس نے خود کو ایک چھوٹے سے کمرے میں پایا۔

مراد انگیٹھی کے پاس بیٹھا ہے.... جھک کے لوہے کے چمٹے سے دہکتی چابی انگاروں کے اوپر سے اٹھاتا ہے... وہ ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے' پنجوں کے بل اس کے پاس بیٹھی دلچسپی سے اس کی حرکات دیکھ رہی ہے....

چابی سنہری دہک رہی ہے.... مراد اس کو احتیاط سے اٹھائے کھڑا ہوتا ہے پھر واپس ایک میز کی طرف آتا ہے... وہ بھی فوراً اٹھ کے پیچھے لپکتی ہے....

اب وہ دونوں میز کے مخالف سروں پہ کھڑے ہیں.... درمیان میں ایک پیالہ ہے جس میں پانی جیسا کوئی مائع ہے... مراد کو پسینے آرہے ہیں' وہ ایک ہاتھ سے پیشانی پونچھتا ہے' اور دوسرے سے .... چمٹا پیالے کے اوپر لاتا ہے... پھر چابی اندر گراتا ہے.... وہ ڈبکی کھاتی ہے اور ٹوٹ جاتی ہے....

تالیہ کے لب کھل جاتے ہیں.... وہ ہراساں سی آنکھیں اٹھاتی ہے....

''بابا... یہ تو ٹوٹ گئی....''

''اس کو ٹوٹنا ہی تھا' تالیہ.... پھر سے جڑنے کے لیے!''

''وہ کیسے؟''

''یہ چاند کی اکیسویں تک اس پانی میں پڑی رہے گی۔ پھر اس کو نکال کے جوڑا جائے گا۔ ابھی یہ اتنی گرم ہے کہ یہ میری روح تک کھا جائے گی۔'' وہ میز پہ دونوں ہاتھ رکھے' مسکرا کے اسے بتا رہا ہے۔

وہ درمیانی عمر کا آدمی ہے۔ دبلا پتلا' مگر چہرہ بے حد پُرکشش ہے۔ سیاہ بال کندھوں تک آتے ہیں۔ سر پہ رومال لپیٹ رکھا ہے۔ زبوں حالی' غربت کمرے کی ہر شے سے ٹپکتی ہے۔

''اور اسے کون جوڑے گا' بابا؟'' ننھی لڑکی کھوئے کھوئے انداز میں پوچھتی ہے....

''جو اس کا مالک ہوگا۔ یعنی میں۔ جو بھی اس کو ٹوٹنے کے بعد جوڑتا ہے' وہی چابی کا مالک ہوتا ہے۔ یہ خزانے کی کنجی ہے تالیہ۔ سوچو.... اگر ہم خزانے کا قفل کھول لیں تو اپنے لوگوں کے لیے کیا کچھ نہیں کر سکتے....''

''جب ہمارے پاس خزانہ آجائے گا تو کیا آپ کا خاندان ہمیں قبول کرلے گا' بابا؟ کیا وہ لوگ....''

مراد کی آنکھوں میں سرخی ابھرتی ہے۔ ''میں ان کا ذکر بھی نہیں سننا چاہتا' تالیہ!۔ وہ ظالم لوگ ہیں۔ انہوں نے کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے ہمارے گاؤں پہ؟ اب چلو یہاں سے۔ اور سنو' تم اس کمرے میں میری اجازت کے بغیر نہیں آؤ گی۔'' وہ انگلی اٹھا کے تنبیہ کرتا ہے اور ننھی لڑکی جھٹ سر ہلا دیتی ہے....

بوجھ بڑھ گیا تھا.... یادیں بھاری ہو رہی تھیں.... تالیہ نے کراہ کے لاکٹ نوچ ڈالا.... کوئی فلم سی بند ہوئی۔ روشنی چھٹ گئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔

وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھی تھی... تکیہ گود میں رکھے ہوئے۔ سب کچھ کتنا مختلف تھا اس کمرے اور اس کمرے میں.... کچھ غلط تھا ادھر.... کچھ عجیب سا.... کچھ ایسا جو اس کا دماغ پکڑ نہیں پا رہا تھا.... کیا معلوم داتن درست کہہ رہی ہو اور....؟

''اونہوں۔'' اس نے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔ ''ایسا ناممکن ہے۔ کبھی نہیں۔ یہ موٹی بھی نا!''

وہ چت لیٹ گئی اور آنکھیں بند کرلیں۔

''کیا مطلب ہوا حالم کا؟''

''کبھی مجھ سے ملنے آؤ' حالم!''

ذہن میں کسی کا محظوظ لہجہ گونجا تو وہ بند آنکھوں سے مسکرائی۔ ایک عجیب دن کا قدرے بہتر انجام ہوا تھا....

☆☆☆

اگلی صبح ابھی فجر قضا ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب وان فاتح کی رہائشگاہ پہ صبح کے ہنگامے

جاگ اٹھے۔ آسمان ابھی گہرا نیلا تھا اور پورچ میں بتیاں جلی تھیں۔ ملازمہ کار میں اس کا بیگ رکھ رہی تھی اور وہ ساتھ کھڑا موبائل پہ کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ نیلی جینز کے اوپر سفید ڈریس شرٹ پہنے' اس نے آستینیں کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں اور پاؤں میں جوگرز تھے۔ ہمیشہ کی طرح ینگ اور فریش۔

پھر موبائل جیب میں ڈال کے ڈرائیور سے چابی مانگی۔ "میں خود ڈرائیو کروں گا' تم گھر جاؤ۔"

"مگر سر... سیکیورٹی اسٹاف؟"

"کیا میں ایک دن کی چھٹی پہ نہیں جا سکتا؟" ذرا سا مسکرا کے پوچھا اور ڈرائیونگ ڈور کھولا۔

ڈرائیور فکر مند سا ہوا۔ "سر دو گھنٹے کا سفر ہے.... آپ مجھے ڈرائیو کرنے دیں۔"

اس سے پہلے کہ فاتح کچھ کہتا' اندر سے عصرہ آتی دکھائی دی۔ ساتھ ہی وہ دونوں بچوں کو باہر لا رہی تھی جو سوئے سوئے سے لگ رہے تھے مگر منہ دھلے اور بال بنے ہوئے تھے۔ فاتح نے اچنبھے سے ابرو اٹھائے۔

"یہ کیا؟"

عصرہ نے مسکرا کے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ "سن باؤ کے گھر میں آخری دن ہم سب کو ساتھ گزارنا چاہیے۔" پھر ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ "تم پچھلی کار میں سیکیورٹی گارڈز کے ہمراہ آؤ گے۔ جاؤ۔" پھر اس نے فاتح کو دیکھا جو ذرا حیران ہوا تھا۔ "تمہیں اعتراض ہے کیا؟"

فاتح کے چہرے پہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ "بالکل نہیں۔ اس سے اچھی بات کیا ہو گی کہ ہم سب ایک ساتھ جائیں۔" وہ خوش ہوا تھا۔ "مگر میں ساری فوج کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔" ابرو سے سیکیورٹی کی کار کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ تمہارے لیے نہیں ہیں فاتح۔ وہ ہمارے بچوں کی حفاظت کے لیے ہیں۔ اور مجھے شاید جلدی واپس آنا پڑے دوپہر تک' تو مجھے الگ کار چاہیے ہو گی۔" وہ سارے فیصلے کر چکی تھی۔ سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے فرنٹ سیٹ پہ استحقاق سے بیٹھی تھی۔

وان فاتح نے سمجھ کے سر ہلا دیا اور بیلٹ پہنتے ہوئے گردن موڑی۔ پیچھے جولیانہ اور سکندر بیٹھے تھے۔ وہ مسکرایا۔ "آج میں تمہارے دادا کا گھر آخری دفعہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ اور میں بہت خوش ہوں کہ تم لوگ میرے ساتھ ہو۔"

"ڈیڈ.... ہم وہ گھر کیوں بیچ رہے ہیں۔" سکندر اداس سا ہوا۔ گیارہ سالہ خوبصورت بچہ جو اپنی عمر سے زیادہ ذہین لگتا تھا۔

"ہم کون سا وہاں رہتے ہیں سکندر؟" جولیانہ نے ناک چڑھائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری تھی۔

"کتنے دنوں بعد ڈیڈ نے تمہارے لیے وقت نکالا ہے' کیا تم دونوں ان کو یونہی تنگ کرتے جاؤ گے؟" عصرہ نے نرمی سے ٹوکا تو سکندر نے سمجھداری سے سر ہلایا۔

"میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ ڈیڈ جو بھی کریں گے' صحیح کریں گے۔"

"ڈیڈ!" جولیانہ نے ابرو اکٹھے کیے چہرہ واپس موڑا۔ "اس گھر کو "سن باؤ" (تین خزانوں) والا گھر کیوں کہتے ہیں؟"

فاتح نے چابی اگنیشن میں گھمائی اور مسکرا کے اسٹیئرنگ وہیل پہ ہاتھ پھیرا۔ "یہ ایک دلچسپ کہانی ہے اور تمہیں پتا ہے تمہارے ڈیڈ کو تمہیں کہانیاں سنانا کتنا اچھا لگتا ہے' ہوں؟" وہ اب کار پیچھے موڑ رہا تھا۔ صبح کی سفیدی دور افق پہ پھیل رہی تھی اور کوالالمپور جاگنے لگا تھا۔

یہ ایڈم کی نوکری کا گیارہواں اور آخری دن تھا جو ساری دنیا کے لیے اسی رات بارہ بجے ختم ہو جاتا تھا مگر ان تین انسانوں کے لیے وہ کبھی نہ ختم ہونے والا

ن بننے جا رہا تھا....

☆☆☆

صبح کی سفیدی اب سنہرے پن میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اشعر محمود کی آفس بلڈنگ کے پینتیس فلورز مکمل طور پہ جاگ چکے تھے اور کام کے دھنی لوگ منہ اندھیرے ہی جاب پہ پہنچ چکے تھے۔

صبح اٹھنے والے.... تازہ ذہن کے ساتھ کام کرنے والے..... اپنی زندگیوں کے ایک ایک منٹ کو استعمال کرنے والے لوگ.... کامیابیاں پھر ایسے ہی تو نہیں ملا کرتیں.... برکتیں ایسے ہی تو گھروں پہ نازل نہیں ہوتیں... رزق ایسے ہی تو نہیں بڑھ جاتا۔ صبح اٹھنے والوں اور سورج نکلنے کے بعد اٹھنے والوں میں اتنا ہی فرق تھا جتنا کامیابی اور ناکامی میں۔

اشعر محمود اپنے آفس میں کھڑا تھا۔ بک شیلف سامنے سے ہٹا ہوا تھا اور دیوار میں نصب سیف کھلا پڑا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑے' بھنویں بھینچے' فائل کے صفحے پلٹا رہا تھا۔ جیسے جیسے اگلا صفحہ سامنے آتا گیا' اس کی رنگت تبدیل ہوتی گئی۔ آخر میں وہ مڑا اور پوری قوت سے فائل دیوار پہ دے ماری۔ صفحات ادھر ادھر بکھر گئے۔ خالی صفحات۔

ایک طرف ہاتھ باندھے کھڑا رملی کھنکھارا۔ ''سر.... میں نے خود چیک کیا تھا۔ جب مسز عصرہ نے فائل دی تھی تو اس میں اصلی ڈاکومنٹس تھے۔''

''اب اس میں صرف بلینک پیپرز ہیں۔ عثمان کی کال کے بعد میں نے صرف سیف کھول کے فائل کو دیکھا اور مطمئن ہو گیا کہ فائل پڑی ہے۔ اُف۔''

''کسی نے آگ کے دوران کل شاید کاغذات تبدیل کیے ہوں۔''

اشعر غصے سے اس کی طرف گھوما اور غرایا۔ ''سیف کی حالت دیکھو۔ ایک ضرب تک نہیں لگی اس پہ۔ کسی نے اسے کھولا تک نہیں۔ اندر زیورات ہیں' پیسے ہیں' ایک چیز بھی تمہیں ہلی۔ تم نے پیپرز دیکھے ہی نہیں تھے شاید۔'' اس نے سر پکڑ لیا۔ ''میں نے بھی دیکھے بغیر اندر ڈال دیے۔ میں جلدی میں تھا۔ اُف۔''

''سر.... کل مس تالیہ بنتِ مراد بھی تو آئی تھیں۔'' رملی چونکا۔

اشعر نے گھور کے اسے دیکھا۔ ''وہ سارا وقت میرے سامنے بیٹھی رہی تھی۔ اپنی غلطی اس کے سر مت ڈالو۔ ان خالی دماغ کی سوشلائیٹس کو ایوننگ ڈریسز اور فیشن سے فرصت نہیں ملتی جو اس طرح کا کچھ سوچیں۔ نان سینس۔'' بےزاری سے کہہ کے وہ اپنی سیٹ تک آیا۔ رملی چپ ہو گیا۔

''وان فاتح صرف ایک صورت میں سرینڈر کرے گا اگر اس کے پاس الیکشن لڑنے کے لئے پیسے نہ ہوں۔'' اشعر نے سیٹ کا رخ پیچھے شیشے کی دیوار کی جانب موڑ لیا جس کے پار اونچی اونچی عمارتیں اور نیچے سڑکوں پہ بہتا ٹریفک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ صبح کی کرنیں عمارتوں کے اطراف سے نکل کے سیدھی اس طرف آ رہی تھیں۔

''ہمیں کسی بھی طرح وان فاتح کو پیسے کی طرف سے بےفکر نہیں ہونے دینا۔ وہ کسی سے قرضہ نہیں لے گا' نہ کا کا سے کچھ مانگے گا۔ یہ گھر کروڑوں کی مالیت کا ہے۔ یہ گھر نہیں بکنا چاہیے۔'' پھر اس نے کرسی واپس موڑی۔ اب چہرے سے غصہ چھٹ چکا تھا اور اس کی جگہ گہری سوچ نے لے لی تھی۔

''مارکیٹ میں یہ خبر مشہور کر دو کہ وہ گھر haunted (آسیب زدہ) ہے۔ چونکہ وہ سن باؤ سے تعلق رکھتا ہے تو اس کی خریداری میں چینی زیادہ دلچسپی لیں گے۔ سن باؤ چینی مسلمان تھا۔ سو کسی ایسے آسیب یا نحوست کا ذکر کرنا جو چینیوں کو متاثر کرتی ہو۔''

رملی کی آنکھیں چمکیں۔ ''درست۔ ایسا ہی کرتا ہوں۔ مگر سر.... یہ چوری؟'' اس نے سیف کی طرف اشارہ کیا۔

"میرا نہیں خیال کوئی چوری ہوئی ہے بہرحال' سی سی ٹی وی فوٹیج چیک کرو' ایک ایک فریم دیکھو۔ کوئی بھی مشتبہ شخص نظر آئے تو رپورٹ کرو۔" وہ سختی سے تنبیہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ رلی نے جھٹ سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اشعر نے اس کی پشت کو سوچتی نگاہوں سے دیکھا۔ "کیا رلی مجھے دھوکہ دے رہا ہے؟ کہیں یہ فاتح کے ساتھ تو نہیں مل گیا؟" اس کا ذہن دوسرے نہج پہ سوچ رہا تھا۔

یہ ایسی دنیا ہے جہاں سایے کا بھی اعتبار نہیں۔

☆☆☆

سورج نکل آیا تھا۔ سڑک پہ ٹریفک رواں دواں تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا اس لیے رش کم تھا۔ فاتح کی کار ملاکہ کے قریب ہی تھی۔ چند منٹ کا سفر ابھی باقی تھا۔

وہ سن گلاسز لگائے' کہنیوں تک آستینیں موڑے اسٹیئرنگ پہ ہاتھ رکھے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کلائی میں پہنی بھوری گھڑی صاف نظر آرہی تھی۔ منہ میں کچھ چبا بھی رہا تھا۔ عصرہ باہر بھاگتے درختوں اور اونچے نیچے سرسبز ٹیلوں کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں بچے پیچھے بیٹھے اپنے اپنے آئی پیڈز پہ لگے تھے۔ غرض سفر خاموشی سے کٹ رہا تھا۔

تب ہی فاتح نے بیک ویو مرر پہ نظر ڈالی تو سکندر کے اسکرین پہ جھکے چہرے پہ غصہ دیکھا۔ فاتح نے سن گلاسز اتار کے پرے رکھے اور آئینے میں پیچھے دیکھتے اسے پکارا۔

"سکندر.... کیا تم انٹرنیٹ پہ کسی سے بحث کر رہے ہو؟"

سکندر نے چونک کے سر اٹھایا۔ عصرہ نے بھی مڑ کے دیکھا۔

"گیم کھیل رہا تھا۔" سکندر نے خفت سے ٹیب نیچے کر لیا۔

"میں تمہارا باپ ہوں' سکندر۔ مجھے معلوم ہے تم کچھ پڑھ رہے تھے۔"

سکندر نے ناک سکیڑی۔ "اوکے۔ میں کچھ کمنٹس پڑھ رہا تھا۔ میرے بھی کچھ فیورٹس ہیں' ڈیڈ اور مجھے برا لگتا ہے اگر لوگ ان کو برا کہیں۔" پھر اس کے چہرے پہ بے بسی بھرا غصہ در آیا۔

"ڈیڈ! لوگ اتنے بدتمیز اور پاگل کیوں ہوتے ہیں؟ کسی مشہور انسان (ایک چور نظر باپ کے کندھے پہ ڈالی) جس کو وہ جانتے تک نہیں ہوتے' اس کے خلاف اتنے برے برے کمنٹس کیسے لکھ دیتے ہیں؟"

"کس کے بارے میں کیا لکھا ہے لوگوں نے؟" وہ سامنے دیکھتے ہوئے موڑ کاٹتے ہوئے مطمئن سا پوچھ رہا تھا۔

سکندر نے ایک نظر گود میں رکھی اسکرین پہ ڈالی جس پہ وان فاتح کا ٹوئیٹر کھلا پڑا تھا۔ فاتح نے صبح مارٹن لوتھر کنگ کا کوئی قول پوسٹ کیا تھا اور اس پہ ہزاروں کمنٹس آئے ہوئے تھے۔ مثبت کمنٹس سکندر نے صرف پڑھ کے گزار دیے تھے مگر ہر منفی پہ اس کا دل دکھتا گیا تھا۔

'بکواس بند کرو' پہلے خود تو سیکھ لو۔

کرپٹ سیاستدان' ملک کو لوٹ کے کھا گئے ہو۔

تم سارے ملے ہوئے ہو۔

یہ وان فاتح حکومت میں آ کے وہی کرے گا جو صوفیہ رحمن کرتی آئی ہے۔ سب کرپٹ ہیں۔ آئی ہیٹ پالیٹکس۔'

سکندر نے چہرہ اٹھایا۔ باپ اس کے جواب کا منتظر تھا۔

"میرا ایک... ایک فیورٹ سیلیبریٹی ہے' اس کے سوشل میڈیا اکاؤنٹ پہ لوگ اس پہ تنقید کر رہے ہیں۔"

"اور اس سے تمہارا دل دکھ گیا؟"

"دُکھنا نہیں چاہیے کیا' ڈیڈ؟ لوگوں کو کیا پتا کہ آدمی کون ہے میرے لیے؟" اس کا گلا رندھ گیا۔

عصرہ نے اداسی سے سر جھکا۔ جولیا نہ باہر دیکھتی رہی۔ سب جانتے تھے سکندر کس کی بات کر رہا تھا۔

"سکندر...." وہ ڈرائیور کرتے ہوئے ....ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "جب رسول اللہ ﷺ پہ پہلی دفعہ وحی نازل ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جانتے ہو کیا حکم دیا تھا؟ کہ وہ دوسروں کو بھی نیکی کی طرف بلائیں۔ اور جانتے ہو تین سال تک آپ ﷺ نے دوسروں کو اچھے کام کرنے کا حکم کیسے دیا؟ خاموشی سے' پرائیوٹلی ـــ چھپ کے۔ کھلم کھلا علی الاعلان نہیں۔

صرف اپنوں کو بتایا اور وہ سب مانتے گئے کیونکہ وہ اپنے تھے۔ سمجھتے تھے۔ احترام کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی سچائی سے واقف تھے۔"

سکندر ابھی تک اداسی سے اسے دیکھ رہا تھا جو نرمی سے کہے جا رہا تھا۔

"تین سال بعد رسول اللہ ﷺ نے کھلم کھلا لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا۔ اور اسلام ہے کیا؟ اچھے کاموں کی طرف بلانا۔ اور برے کاموں سے روکنا۔ جب آپ ﷺ نے یہ کام شروع کیا تو لوگوں کے آئیڈیاز چیلنج ہوئے۔ وہ جو اتنے عرصے سے جس طریقے سے یہ زندگی گزار رہے تھے' وہ طریقہ سوالیہ نشان بن گیا۔ لوگ بھر گئے۔ دشمن بن گئے۔ رسول ﷺ کو اذیت دینے لگے۔

ابولہب کی بیوی نعوذ باللہ آپ ﷺ کو "مذمم" کہہ کے پکارنے لگی' یعنی کہ Condemned۔ جس کی مذمت کی جائے مگر جب رسول اللہ ﷺ نے یہ نام سنا تو انہوں نے کیا فرمایا؟"

سکندر نے مدد کے لئے بہن کو دیکھا جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی' پھر واپس چہرہ موڑا۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

"آپ ﷺ نے فرمایا' مذمم تو میرا نام ہے ہی نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ساری باتوں کو اس طرح اگنور کر دیا کہ یہ جب مجھے جانتی ہی نہیں ہے تو یہ جو کہہ لے' یہ مجھے نہیں کہہ رہی' مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟

اسی طرح بیٹے' جب بھی آپ کسی معاشرے میں reforms اور بہتری لانے کھڑے ہوتے ہو ....ان کو بتاتے ہو کہ ان کا حکومت کرنے کا طریقہ یا ادارے چلانے کا طریقہ غلط ہے ..... جب آپ جھوٹے کو جھوٹا اور چور کو چور کہتے ہو... تو لوگوں کے آئیڈیاز چیلنج ہوتے ہیں۔ لوگوں کو نہیں معلوم ہوتا کہ ان کو کس چیز کی ضرورت ہے یہاں تک کہ آپ ان کو ثابت کر کے نہ دکھا دیں۔ مگر اس عرصے میں ایک طبقہ جس کے مفاد اسی پرانے سسٹم کے ساتھ ہیں' وہ بلبلا اٹھتا ہے۔

یہ جو صحافی تمہارے اس فیورٹ سیلیبریٹی (سکندر نے پلکیں جھکا لیں) کے خلاف روز اخبار میں لکھتے ہیں' تمہیں کیا لگتا ہے' وہ اندر سے اپنے لکھے پہ خود بھی یقین رکھتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ان سب صحافیوں اور میڈیا والوں کو سب پتا ہوتا ہے کہ کون اچھا ہے' کون کم اچھا ہے اور کون برا ہے مگر ان کے حکومت کے ساتھ مفادات ہوتے ہیں۔ بیٹے کی نوکری' کاروباری ٹھیکے' سیاستدانوں سے دوستی ....عدالتوں میں کیسز.... یہ ان ہی وجوہات کی بنا پہ اچھے کو برا بنا کے پیش کرتے ہیں۔ سیاست میں یہ نہ دیکھا کرو کہ کیا کہا جا رہا ہے' یہ دیکھا کرو کہ کون کہہ رہا ہے۔"

"فاتح.... تم سیاستدانوں کو انبیائے کرام سے نہیں ملا سکتے۔" عصرہ نے قدرے خفگی سے ٹوکا تھا۔

"میں ملا بھی نہیں رہا' نہ ہی ملانا چاہیے۔ لیکن انبیاء کی زندگیوں میں ہمارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ مشکل میں کیا کرنا ہے' یہ ہمیں ان ہی کی زندگیوں

سے تو سیکھنا ہے۔ میں صرف یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جب بھی آپ کسی معاشرے کی اصلاح کے لئے یا کوئی بھی بڑا کام کرنے نکلیں گے' تو لوگ آپ کا مذاق اڑائیں گے۔ انبیاؑ کو بھی نہیں چھوڑا لوگوں نے تو ہم کیا ہیں اور تمہارا فیورٹ سیلیبرٹی کیا ہے۔ لوگ ہمیں نہیں بتا سکتے کہ ہمیں زندگی کیسے گزارنی ہے۔ اس لیے لوگوں کی باتوں کا اتنا اثر نہ لیا کرو۔"

"مگر ڈیڈ.... میرے اپنے فرینڈز جب فیس بک پہ میرے فیورٹ سیلیبریٹی کے خلاف کمنٹس کر رہے ہوتے ہیں تو میرا دل ان کا گلا مروڑ دینے کا چاہتا ہے۔"

"اور میرا دل چاہتا ہے میں ان سے دوستی ختم کر لوں۔" باہر دیکھتی جولیانہ اداسی سے بولی۔ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ "بڑے ہو جاؤ سکندر.... سیاستدانوں اور سیلیبریٹیز کے پیچھے آپس کی دوستیاں اور تعلقات نہیں خراب کیے جاتے۔ لیڈر کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ کون کون ان کے لیے لڑ کے ناراض ہوا بیٹھا ہے۔ اگر بحث کرنی ہے تو آئیڈیاز پہ کرو۔ اپنے فیورٹ سیاستدانوں کو 'انسان' سمجھ کے۔

انبیاؑ کے بارے میں بھی لوگ یہی کہتے تھے کہ وہ فرشتے کیوں نہیں ہیں۔ آج کے لیڈرز کے بارے میں بھی لوگ یہی چاہتے ہیں کہ وہ فرشتے ہوں۔ تم اپنے لیڈر کو انسان قبول کر لو۔ اس کی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ۔ مگر اس کے جرائم کے ساتھ نہیں۔

ذاتی خامیاں سب میں ہوتی ہیں لیکن اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ سیاستدان اپنے ملک کے لوگوں کو اپنی چوری کی وجہ سے نقصان پہنچا چکا ہے' اور سیاستدان بس اسی طرح ہی نقصان پہنچا سکتا ہے نا' تو تم اس سیاست دان کو قبول مت کرو۔ اس کو ڈیفینڈ مت کرو۔ باقی تمہیں کوئی بھی پرفیکٹ نہیں ملے گا۔ اگر تم اپنے لیڈر کو اس کی imperfections (کمی، خامیوں) کے ساتھ قبول کر لو اور اس کو فرشتہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کرو' تو تمہیں ہر وقت دوستوں سے لڑنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"مگر ڈیڈ.... دوست جب برے کمنٹس دیں تو میرا دل دکھتا ہے۔" سکندر بضد تھا۔

"پھر اپنے دل کو مضبوط کرو اور ہر ایک سے یہ توقع رکھنا چھوڑ دو کہ وہ تمہاری بات سمجھے گا۔ ہر بات ہر ایک کے لیے نہیں ہوتی۔ جیسے شروع کے تین سال رسول اللہ ﷺ نے ہر ایک کو نصیحت نہیں کی' اس لئے تم بھی ہر ایک سے الجھنا چھوڑ دو۔ کچھ وقت گزرتا ہے' معاشرے بدلتے ہیں' لوگ بدلتے ہیں اور خود ہی سمجھ جاتے ہیں کہ ان کے لیے کون سا لیڈر بہتر ہے اور جو نہیں سمجھتے وہ خود ہی پیچھے رہ جاتے ہیں۔"

"مگر ڈیڈ...."

"سکندر.... اللہ الحق ہے.... سچ کا خدا ہے۔ اگر تمہارا فیورٹ سیلیبریٹی سچا ہے تو اللہ ساری دنیا کو اس کی سچائی دکھا دے گا۔ سچ اپنے آپ کو خود ثابت کر لیتا ہے۔ لوگوں کی مخالفت کو وقار کے ساتھ اگنور کرنا ایک آرٹ ہے۔ اس کو جو سیکھ لیتا ہے' اللہ اس کو عزت دیتا ہے۔" وہ زور دے کر مگر نرمی سے کہہ رہا تھا۔

کار ملاکہ کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ ملاکہ ایک خوبصورت شہر تھا جو سمندر کنارے واقع تھا اور جہاں سیاحوں کی بہتات تھی۔ تاریخی طرز کا شہر جو لوگ پیدل گھوم پھر کے دیکھا کرتے تھے۔ بازار سے کار گزارتے ہوئے فاتح کے چہرے پہ مانوس مسکراہٹ بکھر گئی۔

بالآخر وہ اس ٹھنڈی میٹھی سڑک پہ آ گئے تھے جہاں قطار میں ایک جیسے گھر بنے تھے جن کو رینوویٹ کر کے کافی شاپس اور ریستوران بنا دیا گیا تھا۔ کبھی یہ چینی تاجروں کا مسکن ہوتے تھے۔ اور یہ رہا اس کا گھر.... اس نے کار سڑک کنارے پارک کی اور مسکراتے ہوئے بیلٹ کھولی' پھر باہر نکلا....

سامنے سڑک کے اوپر ایک گھر بنا تھا۔ سرخ

نگ کا گھر (جیسے پرانے لاہور کی گلیوں میں قدیم ہندوستانی طرز کے گھر ہیں جن کی کھڑکیاں سڑک پہ کھلتی ہیں)۔ ایسا ہی وہ دومنزلہ گھر تھا۔ وہ سڑک سے ہی شروع ہوتا تھا۔ نیچے دو کمروں کی کھڑکیاں' درمیان میں داخلی دروازہ۔ فاتح نے گردن اٹھائی۔ اوپر تین کمروں کی بالکونیاں بنی تھیں۔

خاموش پڑا خوبصورت گھر جس سے قدیم زمانوں کی مہک آتی تھی۔

"چلو آؤ.... میں تم لوگوں کو سن باؤ کی کہانی سناتا ہوں۔" وہ خوشگوار انداز میں کہتے ہوئے کار کی طرف مڑا جہاں بچے اور عصرہ باہر نکل رہے تھے مگر اگلے ہی لمحے فاتح کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

چند فٹ کے فاصلے پہ ایک سلور کار پارک تھی اور اس کے بونٹ سے ٹیک لگائے وہ کھڑی تھی۔ سر پہ سفید ہیٹ ترچھا رکھے' وہ مسکرا کے سینے پہ بازو لپیٹے ان کو دیکھ رہی تھی۔

"آنے کے لئے شکریہ' تالیہ۔" عصرہ سیدھی اس کی طرف گئی اور مسکرا کے اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر واپس گھومی اور فاتحانہ مسکراتی نگاہوں سے فاتح کو دیکھا۔

"تالیہ سن باؤ کا گھر دیکھنا چاہتی تھی تو میں نے اسے انوائیٹ کرلیا۔ امید ہے اس بہانے ہم اپنے تیلامی کے پراجیکٹ پہ بھی بات کرلیں گے۔" جتاتے انداز میں بات مکمل کی۔

وان فاتح نے لب بھینچ لیے۔ ابرو برہمی سے اکٹھے ہوئے۔ ایک خاموش' چبھتی ہوئی نظر اس لڑکی پہ ڈالی جو سادگی سے مسکرا رہی تھی' اور گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ جانے وہ اتنی بری کیوں لگتی تھی؟

☆☆☆

کوالالمپور کے اس متوسط طبقے کے علاقے میں صبح سست سی طلوع ہوئی تھی۔ کم از کم ایڈم کے لئے وہ سست ہی تھی۔ وہ ڈھیلا ڈھیلا سا کچن میں کرسی پہ بیٹھا تھا۔ ناشتہ میز پہ لگا تھا مگر وہ بمشکل چند لقمے زہر مار کر پایا تھا۔ پھر پلیٹ پرے دھکیل دی۔

ماں سامنے کھڑی بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ "نوکری کے لئے پریشان ہو' ایڈم؟"

ایڈم نے افسردہ نگاہیں اٹھائیں۔ "مجھے لگتا ہے میں ناکام انسان ہوں' ایبو۔"

"کیوں' ایڈم؟" اس نے پیار سے پوچھا۔ اور سامنے آبیٹھی۔ اسکارف لپیٹے سادہ سی عورت جس کی چھوٹی سی دنیا تھی۔

"سب مجھے دھوکا دے کر' ٹھکرا کے گزر جاتے ہیں۔ کسی کی نظر میں میری اہمیت ہی نہیں ہے۔"

"اہمیت تو خود بنائی جاتی ہے۔"

"کیسے؟ ذہانت' مہارت' ٹیلنٹ' دولت وغیرہ سے؟" وہ تلخی سے گویا ہوا۔

"نہیں۔ اپنے قدرتی اعتماد اور مثبت سوچ سے۔ جتنا تمہارے اندر سے مثبت شعائیں پھوٹیں گی' اتنا تم لوگوں میں محبوب ہوتے جاؤ گے۔"

"اور مثبت شعائیں کیسے پھوٹتی ہیں' ماں؟"

"جب تم سچ بولو اور دوسروں سے توقعات رکھنا چھوڑ دو۔ نہ روپے پیسے کی' نہ توجہ اور محبت کی۔ جو لوگوں کے پاس ہے' اس کا لالچ چھوڑ دو۔ لوگ تمہارے گرویدہ ہو جائیں گے۔ لوگوں کو اپنی محبت میں گرفتار کرنے کا ایک یہی کلیہ ہے۔"

"مجھے نہیں پتا۔" اس نے اداسی سے سر جھکا لیا۔ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہر کوئی مجھے بے وقوف بنا کے آگے نہ بڑھ جایا کرے۔"

"کس نے بنایا ہے تمہیں بے وقوف؟"

"یہ تالیہ نے۔ وہ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہیں۔" وہ خفگی سے تیز تیز بولنے لگا۔ "وہ کبھی کچھ کہتی ہیں' کبھی کچھ۔ کبھی وہ مجھے اچھی لگتی ہیں اور کبھی بالکل

ناقابلِ اعتبار۔"
"اس نے اس دن بھری محفل میں تمہاری حمایت کی تھی۔"
"کہا نا، کبھی اچھی بھی لگتی ہیں!" اس نے منہ بسورا۔
"تو بری کب اور کیوں لگتی ہے؟ کس بات نے تمہیں اس سے بدظن کیا؟"
ایڈم اس بات پہ چونکا۔ ذہن میں بجلی کی طرح کوئی خیال کوندا تھا۔ جیسے ایک پانی کی لہر سی آتی ہے اور سارے جالوں کو بہا لے جاتی ہے، پھر پیچھے ذہن بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ اس ایک لمحے میں ایڈم پہ آشکار ہوا کہ وہ اسے ناقابلِ اعتبار کب سے لگنے لگی تھی۔
"پمبو روا" وہ بڑبڑایا۔ ماں نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ "پمبو رو کون؟"
"اُف ایبو۔ تم کتابیں نہیں پڑھتیں کیا؟" وہ تیزی سے اٹھا۔ رستے میں جو کرسی میز آئی، اس سے اس نے ٹھوکر کھائی مگر رکا نہیں۔ سیدھا کمرے کی طرف بھاگا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔
بیڈ کے نیچے سے ننھا صندوق باہر کھینچا اور کھولا۔ اندر سے دھول مٹی سانس میں آئی مگر اس نے ناک پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اتنا پرجوش تھا کہ دمہ خراب ہونے کا ڈر بھی نہیں تھا۔ صندوق میں کتابیں بھری پڑی تھیں۔ وہ جلدی جلدی ان کو الٹ پلٹ کرتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک موٹی تاریخی کتاب نکالی اور جلدی جلدی صفحے پلٹائے۔
وہ تاریخی داستانوں پہ مبنی تھی اور اس میں ایک چھوٹا سا باب پمبو رو (شکار باز) نام کا تھا۔
مطلوبہ صفحہ کھولا تو ایڈم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سامنے بلیک اینڈ وائٹ میں اسی نشان کا اسکیچ بنا تھا جو اس نے کل بازار میں تالیہ کی گردن کی پشت پہ دیکھا تھا۔ پمبو رو گروہ کا خاص گول نشان۔

اس نے جلدی جلدی اس صفحے کو پڑھا۔ وہ شکار بازوں کا ایک قدیم گروہ تھا جو کسی خزانے کے پیچھے تھے۔ ان کو خزانہ ملا یا نہیں، خزانہ کیا تھا، وہاں کچھ نہیں لکھا تھا، بس ایک چابی کا ذکر تھا اور ساتھ میں ایک مبہم سا اسکیچ بھی۔
گول سکے کی طرح کی چابی جس کے ایک کونے میں ڈلی جڑی تھی۔ مزید کوئی تفصیل اس تاریخی کتاب میں درج نہیں تھی۔ یقیناً اس موضوع پہ دوسری کتابیں بھی موجود ہوں گی مگر ایڈم کے پاس ان کو پڑھنے کا وقت نہیں تھا۔ ساری کہانی ذہن میں کھلتی جا رہی تھی۔
چابی کے دو حصے تھے۔ سکہ اور یہ لمبی سی ڈلی۔ سکہ اس کے پاس تھا۔ تالیہ مراد وہ سکہ حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کی مدد سے خزانے کا قفل کھول سکے۔ خزانہ ملاکہ میں کہیں تھا کیونکہ شکار بازوں کا تعلق ملاکہ سے تھا۔
وہ کوئی پولیس آفیسر نہیں تھی۔ وہ صرف ایک ٹریژر ہنٹر (خزانے کو تلاش کرنے والی) تھی۔
وہ کتاب رکھ کے تیزی سے الماری کی طرف لپکا۔ اندر سے ڈبیا نکالی جس میں سکہ تھا۔
وہ ٹھنڈا پڑا تھا۔ سنہری دھات دمک رہی تھا، مگر آج اس میں کوئی ہندسے نہیں ابھرے تھے۔ اس نے سکہ الٹ پلٹ کے دیکھا۔ ایک کونے میں ننھا سا سوراخ تھا۔ یہیں سے ڈلی اندر جائے گی اور وہ چابی مکمل ہو جائے گی۔
اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اگلا سوال زیادہ پریشان کن تھا۔ کوئی بھی خزانہ جو کسی بھی ملک کے کھنڈرات یا زمین کے نیچے سے نکلتا ہے، وہ سرکار کی امانت ہوتا ہے۔ یہ خزانہ ریاست کا تھا۔ وہ اسے تالیہ مراد کو نہیں لینے دے گا۔ اسے وان فاتح کو خبر کرنی ہی ہوگی۔
اس نے جلدی سے ڈرائیور کا نمبر ملایا۔ وہ اس وقت بے چینی، فکر مندی اور جوش کے ملے جلے

تاثرات کے زیر اثر تھا۔

''ہیلو؟ ہاں سنو۔ وان فاتح اس وقت کہاں ہیں؟ آفس یا گھر؟''

''ہم تو ملاکہ میں ہیں' ایڈم۔ فاتح صاحب کے پرانے گھر۔''

''اوہ۔'' ایڈم کا جوش ٹھنڈا ہوا۔ ''کب تک آ جاؤ گے واپس؟''

''شاید شام تک۔ معلوم نہیں۔''

''اچھا سنو....وہ تالیہ مراد صاحبہ....وہ دوبارہ تو گھر نہیں آئیں؟ اور چوری کا کچھ پتا چلا؟''

''اس گھر میں تو نہیں' مگر ادھر ملاکہ میں وہ صاحب اور بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی ہیں۔ وہ لوگ اندر گھر دیکھ رہے ہیں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

ایڈم کرنٹ کھا کے جگہ سے اٹھا۔ ''چے تالیہ صاحب کے ساتھ ملاکہ میں ہیں؟'' پھر اسے یاد آیا۔ کتنی دفعہ کا سن رکھا نام۔

''سن باؤ کے گھر میں؟'' بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں مگر تم کیوں....''

لیکن ایڈم نے فون کاٹ دیا۔ اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ سن باؤ کا گھر...تین خزانوں والا گھر...کیا چے تالیہ وہاں خزانے کی تلاش میں گئی ہیں؟ کیا یہ ممکن تھا کہ خزانہ اسی گھر میں چھپا ہو؟ اوہ تو....اسے وان فاتح کو بتانا تھا۔

اس نے جلدی سے الماری کھولی' جو جوڑا ہاتھ آیا' کھینچ نکالا اور باتھ روم کی طرف بھاگا۔

آدھے گھنٹے بعد ایڈم ملاکہ جانے والی ایک بس میں سوار ہو رہا تھا۔ سکہ اس کے لباس کی اندرونی جیب میں محفوظ رکھا تھا۔

☆☆☆

وہ کوالالمپور کی ایک خوبصورت سوسائٹی تھی۔ ایک طرف مکان قطار سے بنے تھے اور ان کے آگے سڑک پہ ٹریفک بہہ رہا تھا۔ ایسے میں ایک گھر کا دروازہ لاک کر کے سمیع باہر نکلا' اور سڑک کنارے چلنے لگا۔ ٹراؤزر پہ رف سی شرٹ پہنے' وہ منہ میں کچھ چباتا' چھٹی والے دن گروسری لانے والے مردوں میں سے ایک لگ رہا تھا۔

اسے قریبی گروسری اسٹور پہ جانا تھا۔ جیسے ہی اسٹور سامنے آیا وہ اس کے دروازے کے قریب آیا مگر..راستے میں کوئی رکاوٹ کی طرح حائل ہوا تھا۔ یا شاید کسی پہاڑ کی طرح۔

وہ سیاہ کھلے بلاؤز اسکرٹ والی موٹی سی عورت تھی۔ سیاہ رنگت' اور گھونگریالے کندھوں تک آتے سیاہ بال۔ وہ اس کو گھورے جا رہی تھی۔ پُرتپش تیز نگاہوں سے۔

سمیع کی پیشانی پہ بل پڑے۔ ''کیا ہے؟ ہٹو سامنے سے۔''

''تالیہ کا پیچھا چھوڑ دو۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی۔ آنکھوں کی تپش کی نسبت الفاظ ٹھنڈے تھے۔

سمیع کے دونوں ابرو استہزائیہ انداز میں اٹھے اور لب مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔

''اوہ....تو تمہیں تالیہ نے بھیجا ہے۔''

''میں کہہ رہی ہوں' اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ وہ میری حفاظت میں ہے۔''

سمیع چند لمحے اسے دیکھتا رہا' پھر زور سے ہنس دیا۔ داتن اسی طرح اسے گھورے گئی۔

''تو تالیہ نے اپنی باڈی گارڈ بھیجی ہے اور کیا ہی اعلیٰ باڈی گارڈ بھیجی ہے۔ واہ۔ اپنی جان بچانے کے لئے دو کوس تک تو تم سے بھاگا نہیں جائے گا بی بی! اور تم آئی ہو مجھے دھمکانے۔ واہ۔'' وہ ہنستے ہوئے سر جھٹک رہا تھا۔

''تالیہ میری بیٹی ہے اور بہن بھی۔ اور دوست بھی۔ کبھی کبھی وہ میری ماں بھی بن جاتی ہے۔ وہ میرے لئے ایسی ہے کہ میں اس کے نزدیک تم جیسے کچرے کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لئے تمہیں مجھ

سے ڈرنا چاہیے' اور اس سے دور رہنا چاہیے کیونکہ میں ایک بہت خطرناک عورت ہوں۔''
سمیع نے طنزیہ مسکراتے ہوئے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ''اور تم کیا کرو گی؟''
''میں تمہارا سانس بھی روک سکتی ہوں' سمیع!''
وہ اسی طرح اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔
مگر سمیع ذرا نہیں ڈرا۔ اس موٹی عورت سے کون ڈر سکتا تھا جو ایک ہاتھ میں چاکلیٹس اور رنگ برنگے چپس کے پیکٹ اٹھائے ہوئے کھڑی تھی۔ اُف۔ بے چاری۔
''اگر تمہاری جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں اس کو ہاتھوں کی زبان میں سمجھاتا' لیکن تم عورت ہو' اور بےشک دو تین عورتوں کے برابر ہو' لیکن مجھے تم پہ ترس آ گیا ہے۔ سو.... تمہارے لئے.... اتنا ہی کافی ہے....''
یہ کہہ کے وہ گھوما اور سڑک سے گزرتی پولیس کی کار کو اشارہ کرتے ہوئے چلایا۔
''آفیسر.... آفیسر۔''
یہاں جگہ جگہ پولیس کی پٹرول کارز گھوم رہی ہوتی ہیں۔ پولیس اہلکار نے فوراً کار روکی اور اپنا پستول نکالتا باہر نکلا۔
''کیا ہوا' سر؟'' باوردی آفیسر تیزی سے اس کی طرف آ رہا تھا۔
سمیع نے خاموش کھڑی داتن کا بازو کہنی سے پکڑ لیا' اور چہرے پہ بے پناہ پریشانی طاری کر لی۔
''یہ عورت میرا بٹوہ چرا رہی تھی' پلیز اس کی تلاشی لیں' یہ....'' دکھی اور پریشان انداز میں اس نے بات شروع ہی کی تھی کہ....
''مسز لیانہ.... آپ....'' آفیسر پستول ہاتھ میں لئے قریب آیا اور لیانہ کا چہرہ دیکھ کے خوشگوار حیرت سے مسکرایا۔ ''کیسی ہیں آپ؟'' پھر سمیع کی طرف دیکھا۔ ''سب ٹھیک ہے' میم؟''
سمیع کے الفاظ منہ میں رہ گئے تھے۔ اس نے رک کے باری باری دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ موٹی عورت بالآخر مسکرائی۔ اور نرمی سے اپنی کہنی چھڑائی۔
''ہاں.... سب ٹھیک ہے.... یہ ہمارا دوست ہے.... سمیع.... سامنے والی اسٹریٹ میں مکان نمبر 26 اے میں رہتا ہے۔ تم آتے جاتے اس کو دیکھنا تو اس کا خیال رکھنا' ہوں۔''
''اوشیور۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ پرسوں زید کی برتھ ڈے پہ آ رہی ہیں نا آپ؟'' وہ مسکرا کے ادب سے پوچھ رہا تھا۔
''تمہارے بیٹے کی سالگرہ ہو اور میں نہ آؤں' ایسا ہو سکتا ہے' فیاض؟'' وہ ہاتھ جھلا کے بولی تو آفیسر ہلکا سا ہنس دیا' پھر خوش اخلاقی سے دونوں کو سلام کیا اور گن ہولسٹر میں اڑستا' کار کی طرف بڑھ گیا۔
داتن اب فرصت سے سمیع کی طرف گھومی جس کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔ وہ قدرے شل' قدرے چوکنا لگتا تھا۔
''اب میں دوبارہ وہ تمام الفاظ دہراؤں گی جو میں نے ابھی کہے۔ لیکن امید ہے اس دفعہ تم ان کو غور سے سنو گے۔'' وہ اس کو گھورتے ہوئے چبا چبا کے بولنے لگی۔
''تالیہ کا پیچھا چھوڑ دو۔ میں کہہ رہی ہوں سمیع! اس کا.... پیچھا چھوڑ دو۔'' وہ ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگی اور سمیع ایک ایک قدم پیچھے ہٹنے لگا۔
''وہ میری حفاظت میں ہے.... وہ میری بیٹی بھی ہے' بہن بھی اور دوست بھی.... اور کبھی کبھی....'' وہ قریب آ رہی تھی اور سمیع شل چہرے کے ساتھ پیچھے ہٹ رہا تھا۔
''وہ میری .... ماں بھی بن جاتی ہے۔ وہ میرے لئے ایسی ہے کہ اس کے نزدیک .... میں تم جیسے کچرے کو.... برداشت بھی نہیں کر سکتی....''
اسٹور کی بیرونی دیوار سے سمیع کی کمر ٹکرائی وہ مزید پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا.... نہ اس کے ہاتھ

تک پستول تک رینگ کر جانے کی سکت تھی۔

داتن مزید قریب آئی۔ وہ اس کے سیاہ چہرے کا ایک ایک نقش دیکھ سکتا تھا۔

"اس لئے .... تمہیں مجھ سے.... ڈرنا چاہیے.... اور تالیہ سے.... دور رہنا چاہیے.... کیونکہ.... میں.... ایک بہت.... خطرناک عورت ہوں.... اور میں تمہارا.... سانس بھی روک سکتی ہوں' سمیع!" اس کے بالکل قریب آکے وہ غرائی

وہ چپ' شل کھڑا رہا۔ پھر وہ مڑی اور اسٹور کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد سمیع نے نظر اٹھا کے دیکھا۔

بھاری بھر کم عورت اب کینڈیز اور بچوں والی جیلیز کے ریک کے ساتھ جا کھڑی ہوئی تھی اور مختلف پیکٹ اٹھا کے دیکھ رہی تھی۔ سمیع ہنوز ساکت کھڑا تھا۔

☆☆☆

ملاکہ پہ دوپہر پھیل رہی تھی۔ فضا نم آلود تھی۔ دور سمندر کی لہروں کا شور یہاں تک سنائی دے رہا تھا۔ بازار میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ ٹریفک' دکانداروں کا شور اور آوازیں۔ ایسے میں سرخ گھر کے اندر آؤ تو بڑے کمرے سے گزر کے صحن آتا تھا۔ وہاں تالیہ گردن اونچی اٹھائے کھڑی' بالائی منزل کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں بچے ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔

اندر ایک کمرے کا دروازہ بند کیے وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ فاتح دونوں ہاتھ کمر پہ جمائے سخت ناخوش لگ رہا تھا۔

"اس لڑکی کو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ہمارا فیملی ہالیڈے تھا۔"

"کون سی فیملی؟ جس کو تم اپنی سیاست کے پیچھے چھوڑنے پر تیار ہو گئے تھے؟ اگر صرف سیاست ہی میٹر کرتی ہے فاتح' تو میں بھی وہی کر رہی ہوں۔ وہ میرا بزنس انٹرسٹ ہے' اور جیسے میں تمہارے مفادات میں تمہارا ساتھ دیتی ہوں' تم بھی دو گے!"

"اس نے ہمارے گھر سے چوری کی ہے' عصرہ!؟" لیکن عصرہ نے درشتی سے بات کاٹی۔ "مگر تمہاری فائل تو کھوئی ہی نہیں ہے' فاتح۔ اور اگر کی بھی ہے تو کیا ہوا۔ کیا باریسن نیشنل میں کرپٹ سیاستدان نہیں ہیں جن کے ساتھ تم روز اٹھتے بیٹھتے ہو اور میں ان کی دعوتیں کرتی ہوں۔ جیسے ان چوروں کو میں برداشت کرتی ہوں' میری چور کلائنٹ کو تم کرو گے۔"

فاتح نے لب بھینچ لیے اور چہرہ موڑ لیا۔ اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

"ویسے بھی ابھی تم یہی کہہ رہے تھے نا کہ سیاستدانوں کے پیچھے دوستوں کو آپس کے تعلقات نہیں خراب کرنے چاہئیں۔" تلخی سے کہہ کے وہ تیز تیز آگے بڑھ گئی۔

تالیہ ابھی تک دالان میں کھڑی گردن اٹھائے گھر کے بالائی کمروں کو دیکھ رہی تھی جب دھیرے دھیرے سارے گھر والے اسی طرف آتے گئے۔ بچے' عصرہ اور پھر ان کے پیچھے فاتح بھی۔ وہ بٹنوں والی سفید شرٹ کی آستینیں موڑے جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے قدم اٹھاتا قریب آیا تو تالیہ نے گردن موڑی۔ وہ نارمل لگ رہا تھا۔ ٹھنڈا۔ پرسکون۔ بے نیاز۔ بزنس فیس۔

"اس گھر کو سن باؤ کا گھر کیوں کہتے ہیں' فاتح صاحب؟" وہ سادگی سے اسے دیکھ کے بولی تو فاتح نے رخ موڑ لیا اور آگے چلتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ صحن کے دوسرے کونے میں نصب اونچے چبوترے تک جا ٹھہرا جس کے اوپر ایک مجسمہ نصب تھا۔

"یہ وانگ لی کا مجسمہ ہے۔" اس نے مجسمے کی طرف اشارہ کیا۔

آج دھوپ نہیں تھی۔ موسم ٹھنڈا اور نم آلود تھا۔ ہر سو چھایا سی تھی۔ ایسے میں سرخ اینٹوں سے بنے صحن میں وہ سرمئی اونچا مجسمہ بہت حسین لگ رہا تھا۔ ایک چینی آدمی پورے قد سے کھڑا تھا۔ کمر پہ ہاتھ باندھے۔ لمبے بال' سر پہ ٹوپی' لمبی باریک مونچھیں.... اور کندھوں سے پیر تک کرتا چغہ۔ میان

گئی تلوار۔ چہرے پہ دوستانہ مسکراہٹ۔
تالیہ دھیرے دھیرے چلتی قریب آئی۔
''اور وانگ لی کو ''سن باؤ'' کیوں کہتے تھے ڈیڈ؟'' سکندر بھی باپ کے پاس آرکا۔
''سن باؤ.... یعنی تین خزانے یا تین نگینے، بدھ مت کے تین نگینے ہوتے ہیں' بدھا' دھرما' سنگھا۔ ان کو سن باؤ کہا جاتا ہے۔
وانگ لی ایک چینی غلام تھا' پندرھویں صدی میں اس نے اپنی ذہانت اور صلاحیت کے بل بوتے پہ کم عمری میں ہی محل میں اعلیٰ مقام حاصل کرلیا تھا۔ پھر چینی بادشاہ کا خاص سفیر مقرر ہوا' اور ایک بہت بڑا تاجر بن گیا۔'' وہ کمر پہ ہاتھ باندھے کھڑا' گردن اٹھا کے مجسمے کو دیکھتے ہوئے بتا رہا تھا۔ تالیہ کے آنے کی کلفت' بے زاری وہ سب بھول گیا تھا۔
''اس کو بادشاہ نے سن باؤ کا لقب عطا کیا تھا۔ وہ اکثر ملاکہ آتا تھا' ساری دنیا سے گھوم پھر کے سامانِ تجارت اور مختلف حکومتوں سے معاہدے کر کے وہ سمندر کے راستے ملاکہ آتا۔ اس نے اور دوسرے تاجروں نے یہاں ویئر ہاؤسز بنائے تھے۔ یہ گھر وانگ لی نے بنوایا تھا۔ یہاں وہ سامان وغیرہ رکھتا اور خود بھی رہا کرتا تھا۔ اپنے آخری قیام میں وہ کافی عرصہ ادھر رہا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا ایکسپلورر' تاجر اور ایڈمرل تھا۔ اس نے چینی حکومت کو دنیا کی بہترین سپر پاورز میں سے بنا دیا تھا۔ کہتے ہیں وہ کمال کا آدمی تھا۔''
''آپ کے والد نے وانگ لی کا گھر کیوں خریدا؟'' وہ فاتح کے چہرہ کو دیکھ رہی تھی جو ابھی تک اس مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔
جولیانہ درختوں کے پتوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی اور عصرہ اندر کمروں کی طرف چلی گئی تھی تاکہ گھر کی مرمت کے کام کا جائزہ لے سکے۔
''میں چھوٹا تھا تو ایک دفعہ یہاں آیا تھا۔ تب کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہ وانگ لی کا گھر ہے۔ میں بابا کے ساتھ سامنے کسی دکان پہ بیٹھا تھا' پھر ادھر آگیا۔ یہ مجسمہ.... تب یہ ٹوٹا پھوٹا تھا' عصرہ نے بعد میں اس کو ٹھیک کروایا' یہ مجسمہ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ عجیب کشش تھی اس میں۔ اب بھی ہے۔ مانوسیت۔ اپنائیت۔ جیسے کوئی دوست ہوتا ہے نا۔'' اس کی گردن اٹھی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔ ہاتھ ایسے کمر پہ باندھ رکھے تھے جیسے وانگ لی نے باندھے ہوئے تھے۔
''کس نے بنایا تھا یہ مجسمہ؟'' سکندر نے دلچسپی سے پوچھا۔
''شہزادی تاشہ نے!''
تالیہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔ ''شہزادی تاشہ کون تھی؟ یونو' میں نے بھی ایک دفعہ ایک تھیٹر شو میں تاشہ آگا پوا کا کردار کیا تھا۔''
''وہ آریانہ کو بہت پسند تھی۔'' سکندر فوراً بولا مگر فاتح نے چہرہ موڑ کے قدرے خفگی سے اسے دیکھا۔
''وہ کوئی روسی فیری ٹیل تھی جو دس سال پہلے لکھی گئی تھی۔ میں ملاکہ سلطنت کی شہزادی تاشہ کی بات کر رہا ہوں۔'' پھر دوبارہ سے مجسمے کو گردن اٹھا کے دیکھنے لگا۔
''تو کون تھی شہزادی تاشہ؟'' تالیہ کی نظریں بے اختیار دیوار کی جانب اٹھیں۔ شمالی دیوار جہاں اس نے وہ نظم لکھی دیکھی تھی۔ خواب کے برعکس وہ دیوار خستہ حال نہیں تھی۔ شاید مرمت میں درست کردی گئی تھی۔ وہاں کسی بھی قسم کی لکھائی کا نشان نہیں تھا۔
''شہزادی تاشہ فاتح کے پسندیدہ کرداروں میں سے ہے۔'' عصرہ باہر آتے ہوئے محظوظ انداز میں بولی۔ ''فاتح کسی عورت کی تب تک تعریف نہیں کرتا جب تک وہ اس کی شدید مستحق نہ ہو مگر شہزادی تاشہ سے وہ ہمیشہ متاثر رہا ہے۔''
وہ مسکرا کے پلٹا۔ ''میں اکثر تمہاری تعریف کرتا

ہوں۔"

عصرہ نے مسکرا کے شانے اچکائے اور پھر تالیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ "شہزادی تاشہ ملاکہ کی سب سے حسین شہزادی تھی۔ وہ سلطان کی بیٹی نہیں تھی' بلکہ بنداہارا کی بیٹی تھی۔"

"بنداہارا کیا ہوتا ہے' ماما؟"

"وہی جو تمہارے بابا بننا چاہتے ہیں۔ پردھان منتری۔ وزیر اعظم۔ اس زمانے میں سب سے طاقتور بادشاہ ہوتا تھا' اور اس کے بعد وزیر اعظم۔ مگر آج کے ملائیشیاء میں وزیر اعظم سب سے طاقتور ہوتا ہے اور اس کے بعد بادشاہ۔"

"تھینکس ٹو ڈیموکریسی!" وہ واپس جیبوں میں ہاتھ ڈالے آگے چلتا گیا۔

صحن کے دوسرے کونے میں درخت لگے تھے جو اس کے بابا نے لگوائے تھے۔ جولیانہ وہیں بیٹھی تھی۔ وہ جھک کے اس کو سرگوشی میں کچھ کہنے لگا اور وہ دبا دبا سا ہنسنے لگی۔ تالیہ نے ان سے نظر ہٹائی اور عصرہ کی طرف متوجہ ہوئی جو بتا رہی تھی۔

"شہزادی تاشہ کے بارے میں Malay annals (مالے کی داستانوں) میں کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن چند دوسری تاریخی کتابوں میں تھوڑا بہت ضرور لکھا ہے۔ وہ پردھان منتری کی بیٹی تھی۔ بے حد ذہین' عقلمند اور دانا۔ کہتے ہیں وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ عورتوں والے کام بھی' مردوں والے کام بھی۔ گھڑ سواری' تیر اندازی' تلوار زنی ہو' یا پھر کھانا پکانا' کڑھائی سلائی' لکھنا پڑھنا غرض تاشہ کسی ساحرہ کی طرح تھی۔

اسے کئی زبانوں پہ عبور حاصل تھا۔ وہ سیاسی سمجھ بوجھ بھی رکھتی تھی اور اپنے باپ اور سلطان تک کو سیاسی مشورے بھی دیتی تھی۔ ایک وقت میں وہ اتنی طاقتور تھی کہ مورخ لکھتے ہیں' وہ سارے محل کو چلا رہی تھی۔ کہتے ہیں سلطان بھی اس سے بہت متاثر تھا

اور اس کو اپنے لیے چاہتا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"معلوم نہیں۔ کہتے ہیں اس کی کہانی کا انجام المناک تھا۔ مگر وہ اکثر سن باؤ کے گھر آیا کرتی تھی۔ یہاں اسی آنگن میں۔ اسی نے یہ مجسمہ بنایا تھا۔ کہتے ہیں سن باؤ سے اس کی دوستی تھی۔ یا معلوم نہیں کیا تھا جو وہ اس گھر میں اکثر آتی تھی۔" عصرہ نے آخر میں گہری سانس لے کر شانے اچکا دیے۔

پھر گردن موڑی اور سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سن باؤ کا کمرہ تھا۔ وہ یہاں انگیٹھی کے پاس بیٹھا کرتا تھا اور وہ ادھر دالان میں کھڑی ہو کر مجسمہ بناتی تھی۔ بالکل ادھر جہاں تم کھڑی ہو۔"

تالیہ ایڑیوں پہ الٹی گھومی۔ اب اس کے سامنے سن باؤ کا کمرہ تھا اور اوپر.... اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ اوپر تین کمرے تھے جن کی بالکونیاں سڑک کی طرف بھی کھلتی تھیں اور ایک ایک کھڑکی ادھر صحن میں بھی کھلتی تھی۔

"اوپر کون رہتا تھا؟" وہ سوچتی نظروں سے بولی۔

"اوپر؟" عصرہ نے اچنبھے سے اوپر دیکھا۔ "شاید سامان وغیرہ رکھا جاتا ہو کیونکہ سن باؤ کا کوئی خاندان تو تھا نہیں۔ وہ غلام تھا۔ نا!" (غلام شادی سے معذور ہوتے تھے۔)

"اس جگہ سے کھڑے ہو کر سن باؤ کا کمرہ اتنا

صاف نہیں دکھائی نہیں دیتا جتنا اوپر والا کمرہ دکھائی دیتا ہے۔"

وہ اوپر دیکھتی بے خودی کے عالم میں کہے جا رہی تھی۔ "شاید کوئی سن باؤ کے ساتھ رہتا تھا یہاں۔ شہزادی ایک محل سرا سے ملنے نہیں آتی تھی۔ شاید وہ اس سے ملنے آتی تھی جو اوپر اس کمرے میں رہتا تھا...."

فاتح جو ابھی تک جولیانہ سے جھک کے کچھ کہہ رہا تھا' اس بات پہ چونک کے پلٹا اور سیدھا ہوا۔

"یہ میرا کمرہ ہے۔"

تالیہ اسے دیکھ کے اداسی سے مسکرائی۔ "شاید اس کمرے کے مکین کو بھی شہزادی تاشہ اتنی ہی پسند ہو جتنی آپ کو ہے۔" اور آگے بڑھ گئی۔

فاتح نے چند لمحے اس کی بات پہ غور کیا پھر بیٹی کی طرف واپس مڑ گیا۔ عصرہ سیل فون سے تصویریں بنا رہی تھی اور سکندر مجسمے کے قدموں میں بیٹھا اس پہ غور کر رہا تھا۔

تالیہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی صحن کے دوسرے کونے میں بنے کنویں تک آئی۔

قدیم طرز کا کنواں جو کسی زمانے میں سن باؤ کے زیر استعمال تھا۔ وہ کنویں کی منڈیر پہ رکی اور اندر جھانکا۔ پھر مڑ کے دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

تالیہ نے جیب سے لائٹ نکالی اور اس کی نیلی روشنی کنویں کے اندھیرے کی سمت پھینکی۔ کنویں کی ایک دیوار کے ساتھ دھبے سے لگے تھے جو نیچے گہرائی میں اتر رہے تھے۔ وہ مزید آگے ہوئی۔ وہ دیوار میں کھدے ننھے ننھے سے زینے تھے جن کی مدد سے نیچے اترا جا سکتا تھا۔

نیچے کیا تھا؟

تالیہ مراد مسکرائی اور لائٹ بند کی۔ اسے معلوم تھا خزانہ کہاں ہے۔ پھر وہ مڑی اور اعلانیہ انداز میں اونچا سا بولی۔

"تو ان کو.... میں یہ گھر خریدنا چاہتی ہوں۔"

"بازگشتِ دختر"

اس نے دیکھا۔

بھوری لکڑی سے بنا دو منزلہ گھر ہے۔

تازہ' بے روغن لکڑی... مخروطی چھتیں.... اوپر بالکونیاں ہیں' اندر ایک کھلا سا صحن ہے۔ ایک طرف کنواں ہے۔

بالائی منزل کے کمروں کی پچھلی کھڑکیاں صحن میں کھلتی دکھائی دے رہی ہیں۔

کونے والے کمرے کی کھڑکی میں کوئی کھڑا ہے.... کوئی ہیولہ سا۔

جیسے کوئی دراز قد' توانا مرد ہو۔

اور وہ نیچے دیکھ رہا ہے۔

جہاں صحن کے کونے میں ایک نسوانی وجود کھڑا ہے۔

اس نے مخملیں چغہ پہن رکھا ہے جو شاہزادیاں سفر میں پہنا کرتی تھیں....

اس کی کھڑکی کی طرف پشت ہے.... بالوں پہ ریشمی اوڑھنی لے رکھی ہے اور سر پہ جمے تاج کی پشت دکھائی دے رہی ہے۔

چغے کے آستینوں سے نکلتی سپید بانہوں میں سونے اور ہیرے کے کنگن ہیں۔

خوبصورت ہاتھوں میں زمرد اور یاقوت جڑی انگوٹھیاں ہیں۔

اور وہ ہاتھ مہارت سے مٹی اور گارے سے چبوترے پہ کچھ بنا رہے ہیں۔

انداز سے لگتا ہے کوئی مجسمہ ہے۔

اور وہ لڑکی.... وہ شاہزادی.... وہ مجسمہ بناتے ہوئے بار بار رکتی ہے۔

گردن ذرا سی موڑتی ہے

شکل ابھی بھی دکھائی نہیں دیتی.... بس ماتھے کے اوپر تاج کا کونہ کنپٹی سے جھلکتا ہے....

بار بار گردن موڑنے کی خواہش کے باوجود وہ واپس چہرہ پھیر جاتی ہے۔

جیسے واقف ہے اس بات سے .... کہ اوپر کھڑکی سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے....

پھر دفعتاً وہ سر جھکا کے ہلکا سا ہنستی ہے.... اور گردن موڑنے لگتی ہے....

اور کسی دھوئیں کی طرح خواب فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

"توانکو... میں یہ گھر خریدنا چاہتی ہوں۔"

یہ فقرہ لبوں سے نکالنے سے چند منٹ قبل تالیہ نے یہ خواب دیکھا تھا۔

جس وقت وہ دالان میں داخل ہوئی تھی' اور گردن اوپر اٹھائے بالائی منزل کو دیکھ رہی تھی' (اور اندر فاتح اور عصرہ تلخی سے اس کے بارے میں بات کر رہے تھے) اس وقت تالیہ کی نظروں کے سامنے وہ منظر کسی خواب کی طرح چلنے لگا تھا۔ قدیم زمانوں کی زردی لیے.... یہ گھر مختلف نظر آتا تھا تب.... اور وہ مجسمہ بناتی شہزادی جو اوپر کھڑے شخص کی نگاہوں سے واقف تھی.... وہ اس کے انداز کی شوخی اور ہلکی سی ہنسی... سپید جلد اور زیورات بتاتے تھے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوگی جتنا تاریخ کی کتابوں میں لکھا تھا....

وہ خواب سے چونکی تو خود کو سن باؤ کے گھر میں کھڑے پایا۔

فاتح اور بچے باہر آ گئے تھے اور اب فاتح مجسمے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ پھر گفتگو کا رخ شہزادی تاشہ کی طرف مڑ گیا اور عصرہ بتانے لگی کہ کس طرح وہ یہاں مجسمہ بناتی تھی....

مگر عصرہ نہیں جانتی تھی کہ تالیہ کو بعض دفعہ دوسرے لوگوں کے بارے میں بھی خواب یا وژن نظر آ جاتے ہیں۔ اس قدیم مکان میں چھ سو برس قبل شہزادی کس سے ملنے آتی تھی' .... وہ دیکھ چکی

تھی‘ اسی لئے جب اس نے مداخلت کر کے بتایا کہ شہزادی سن باؤ کے لیے نہیں ادھر آتی تھی تو یہ اندازہ نہیں تھا۔

یہ وجدان تھا۔

فاتح جولیانہ کے ساتھ مصروف ہو گیا اور عصرہ تصاویر بنانے لگی تو وہ کنویں تک آئی۔ اندر نیچے اترنے کے لئے نشان بنے تھے۔ پانی اب بھی کنویں میں موجود تھا۔ وہ مسکرائی اور پلٹی۔

”تو انکو.... میں یہ گھر خریدنا چاہتی ہوں۔“

اعلانیہ بلند سا بولی تو صحن میں موجود ہر شخص چونکا۔ فاتح جو جھک کے بیٹی سے بات کر رہا تھا‘ چند لمحے ساکت سا جھکا رہا پھر سیدھا ہوا اور اسے دیکھا تو چہرہ سنجیدہ تھا۔

”ایکسکیوزمی؟“

”میں.... یہ گھر.... (اطراف میں اشارہ کیا) خریدنا چاہتی ہوں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے مسکرائی۔

”اور تمہیں کس نے کہا تاشہ کہ میں یہ گھر بیچنا چاہتا ہوں؟“

”آپ نے کل صبح ہی اس گھر کو مارکیٹ پہ ڈال دیا تھا۔ ملاکہ کے تمام پراپرٹی ڈیلرز واقف ہیں تو میں کیوں نہیں ہوں گی؟“

”مگر میں تمہیں یہ گھر نہیں بیچ سکتا۔“ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پہ کیاری کے ساتھ کھڑا تھا۔ دونوں کے درمیان سرخ اینٹوں کا پکا صحن حائل تھا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ تم اس کو افورڈ نہیں کر سکتیں۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ استہزائیہ مسکراہٹ۔

”آپ کو کیوں لگا میں اس کو افورڈ نہیں کر سکتی؟“

”کیونکہ میرا نہیں خیال تمہارا بینک بیلنس اتنا ہے جتنا تم بتاتی ہو۔“

عصرہ جو موبائل اونچا کیے بالائی کمرے کی تصاویر اتار رہی تھی‘ اس بات پہ گردن موڑ کے تادیبی نظروں سے فاتح کو دیکھا جو تالیہ کی طرف متوجہ تھا۔

”واقعی!“ وہ سر کو خم دے کر سادگی سے مسکرائی۔ ”میرا بینک بیلنس واقعی اتنا نہیں جتنا بتاتی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے وقفہ دیا.... ”بلکہ.... اس سے کہیں زیادہ ہے‘ تو انکو!“

”یعنی اثاثے چھپاتی ہو تم.... پھر تو پورا ٹیکس بھی نہیں دیتی ہو گی۔ یہ دونوں جرائم ہیں۔ چچ۔ میری حکومت میں تم جیل جانے والے پہلے لوگوں میں سے ہو گی۔“ افسوس سے بولا اور پلٹ گیا۔

تالیہ اسے دیکھ کے رہ گئی۔ اب وہ اندر جا رہا تھا۔

”وہ مذاق کر رہا تھا۔“ عصرہ نے تصویر اتارتے ہوئے وضاحت دی تو وہ چونکی‘ پھر جبراً مسکرائی۔

”وان فاتح کے ساتھ گزارا کرنا بھی ایک آرٹ ہے‘ نہیں؟“

عصرہ ہنس دی اور سر جھٹکا۔ ”وہ بہت اچھا شوہر‘ باپ اور سیاستدان ہے۔“

”خدا کرے وہ اتنا ہی اچھا میزبان بھی بن جائے۔“ بولی نہیں‘ صرف دل میں سوچا۔

تبھی فون بجنے لگا۔ تالیہ نے دیکھا تو ایڈم کا نام جل بجھ رہا تھا۔

”کانگ ہو کا فون ہے۔ نیلامی کے بارے میں جاننا چاہتے ہوں گے۔ میں ذرا ان کو سن لوں۔“ مسکرا کے اس پینٹر کا نام لیا جس کے بارے میں عصرہ کو بتایا تھا کہ نیلامی پہ مدعو کر رکھا ہے اور فون کان سے لگائے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”ہاں بولو....“ گھر سے باہر نکلی تو سڑک پہ اِکا دُکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ اردگرد شاپس اور

ریستوران بنے تھے۔ ٹھنڈی سی چھایا میں گھری صاف ستھری سڑک جس پہ قدیم گھروں کو سرخ سفید پینٹ کر کے ڈولز ہاؤس کی طرح نیا بنا دیا گیا تھا۔ دکانوں کے آگے چھتریاں لگی تھیں جہاں لوگ کرسی میزوں پہ بیٹھے چائے قہوے پی رہے تھے۔ ایسے میں وہ فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے فون پہ ایڈم کو سنے گئی جو کہہ رہا تھا۔

''کیا ہم مل سکتے ہیں؟''

''ہاں مگر شام کو۔ میں ابھی گھر پہ نہیں ہوں۔''

''میں جانتا ہوں' آپ ملاکہ میں ہیں۔ میں بھی وہیں آرہا ہوں۔''

تالیہ چونکی۔ ''میری جاسوسی کرنے لگے ہو کیا؟''

''نہیں۔ ہاں۔ شاید۔ اچھا ہم کہاں مل سکتے ہیں۔''

''تم کیوں ملنا چاہتے ہو ایڈم؟''

''کیا آپ کو وہ سکہ نہیں چاہیے؟'' تالیہ اس سوال پہ خاموش ہو گئی۔ گاڑیاں پاس سے گزر رہی تھیں اور وہ فٹ پاتھ کنارے آگے چلتی جا رہی تھی۔

''سکہ ساتھ لا رہے ہو؟''

''جی.... کیونکہ خزانہ ملاکہ میں ہی ہے نا۔''

تالیہ مراد رک گئی۔ بالکل ساکت۔ شل۔

''خاموش کیوں ہو گئیں آپ چے تالیہ۔ چابی کا دوسرا حصہ آپ کے پاس ہے لیکن سکہ میرے پاس ہے۔ اور خزانہ ملاکہ میں۔ اتنا مشکل نہیں تھا گیس کرنا۔''

''مجھے نہیں پتا تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ سکہ سرکار کی امانت ہے۔'' اس نے کہنے کی کوشش کی۔

''ہم کہاں مل سکتے ہیں' چے تالیہ؟'' وہ بے چینی سے بولا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ بولی نہیں۔

''اگر آپ کو سکہ چاہیے تو آپ کو مجھ سے سچ بولنا ہوگا۔ سچ آپ کو آزاد کر دے گا چے تالیہ۔''

''وانگ لی کے کنویں پہ مجھ سے ملو۔''

''کون سا کنواں؟ جو وانگ لی کے گھر میں ہے؟ سن باؤ کا گھر؟''

''نہیں اسٹوپڈ۔ وہ تو فاتح صاحب کا گھر ہے۔ میں بوکیت چینہ پہاڑی کی بات کر رہی ہوں جہاں وانگ لی نے کنواں بنوایا تھا۔ جس کا پانی چھ سو سال سے خشک نہیں ہوا۔''

''پانچ سو ستاون سال' چے تالیہ۔ اور اس کو وانگ لی کا کنواں نہیں کہتے۔ یہ نام سیاحوں نے غلط العام کر رکھا ہے۔ وہ کنواں وانگ لی نے شہزادی ''یان سوفو'' کے لیے بنوایا تھا۔ اس کو ''یان سوفو'' کا کنواں کہتے ہیں۔''

''تمہیں اتنا کیسے معلوم ہے؟''

''کیا آپ کتابیں نہیں پڑھتیں' چے تالیہ؟'' وہ گہری سانس لے کر بولا تھا۔

''اب اس کا کیا کروں؟'' کال ختم کر کے وہ وہیں فٹ پاتھ کنارے کھڑی سوچتی رہی۔ پھر مڑی تو سامنے ایک دکان کے آگے تنی چھتری تلے کرسیاں میزیں بچھی تھیں۔ وہاں آمنے سامنے دو بوڑھے بیٹھے شطرنج کی بساط درمیان میں رکھے غور و فکر کر رہے تھے۔ وہ آگے آئی اور ان کے عین سر کے اوپر جھکی سوچتی نظروں سے بساط دیکھی۔

''اگر سیاہ والی فوج اپنے اس پیادے کو ایک قدم چلائے....'' دو انگلیوں سے پیادہ اٹھایا تو دونوں نے چونک کے گردنیں اٹھائیں۔ سفید ہیٹ والی لڑکی بورڈ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی....

''اور سفید فوج اپنے فیلے کے ذریعے اس سیاہ گھوڑے کو مار دے تو سیاہ رخ اس فیلے کو مار دے گا اور سفید پیادہ یوں چل جائے تو سیاہ ملکہ کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور یہ کر دیا سیاہ ملکہ نے سفید بادشاہ کو.... شہہ مات!'' اس نے جھکے جھکے دو تین گوٹ چلائے اور سیدھی ہو کے مسکرائی پھر سیاہ فوج کے بوڑھے مالک کو دیکھا جو ہکا بکا بیٹھا تھا۔

''ہر وقت دفاعی انداز میں کھیلنا اچھا نہیں

ہوتا۔ جب آپ کو لوگ کونے سے لگا دیں تو جارحانہ حکمتِ عملی اپنانی پڑتی ہے۔ پیادے کو ملکہ بننا پڑتا ہے۔ یو آر ویلکم' انکل۔'' ہیٹ کو ترچھا کرتے ہوئے سر جھکا کے تعظیماً بولی' اور مڑ گئی۔

سفید فوج کا مالک بوڑھا پریشان سا بساط کو دیکھ رہا تھا۔

''مگر.... میرا دوسرا سفید گھوڑا تو راستے میں حائل تھا۔ وہ.... کہاں گیا.....؟''

اور فٹ پاتھ پہ آگے بڑھتی تالیہ نے مٹھی میں دبایا سفید گھوڑا مسکرا کے فضا میں اچھال دیا۔

''ایمانداری سے بھی کوئی جیت سکتا ہے بھلا.... وہ بھی اس دنیا میں؟''

اب وہ واپس سرخ لکڑی کے روغن زدہ گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اسے عصرہ سے اجازت لے کر ہوٹل جانا تھا اور شام کو خزانے کے بارے میں اگلا لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔

یہ تو طے تھا کہ وہ خزانہ لیے بغیر ملاکہ سے واپس نہیں جائے گی۔

سن باؤ کے گھر کے دروازے کے سامنے وہ رکی اور گردن اوپر اٹھائی۔ بالائی کمروں کی بالکونیاں سڑک کی طرف کھلتی تھیں۔ اندر صحن میں ان کمروں کی کھڑکیاں تھیں جہاں سے شہزادی مجسمہ بناتے وقت اوپر موجود شخص کو دیکھتی تھی۔ مگر کیا وہ یہاں بالکونی میں بھی بیٹھتا ہو گا جب دور سے گھوڑے پہ شہزادی تاشہ آتی ہو گی؟

اس نے گردن موڑ کے شمال کی سمت دیکھا۔ ابھی تو یہاں دکانیں تھیں اور ان کے پیچھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ محض چند میل کے فاصلے پہ ملاکہ سلطنت کا محل واقع تھا۔ جو ملک آج ملائیشیا تھا' وہ کسی زمانے میں ایک بڑا سا ملک تھا جو ملاکہ سلطنت کہلاتی تھی۔ ملائیشیا کے آس پاس کی ریاستیں بھی اس میں شامل تھیں۔ سولہویں صدی میں جب ملاکہ پہ پرتگال نے قبضہ کیا تو اس محل کو جلا ڈالا۔ پھر ڈچ آئے۔ اور گزشتہ صدی میں انگریز۔ 1957 میں ملائیشیا کو آزادی ملی اور اب ملاکہ اس کی صرف ایک ریاست ہے۔ محل تو صدیوں پہلے جلا دیا گیا تھا مگر چند برس قبل ملائیشیا کی حکومت نے پرانی کتابوں اور نقشوں کی مدد سے محل کا خاکہ نکالا اور اسے ہو بہو ویسا ہی تعمیر کروایا۔ اب وہ ایک میوزیم تھا۔ کسی زمانے میں شہزادی تاشہ وہیں رہتی ہو گی۔

وہ بالکونی کو دیکھے گئی۔ جانے کون ہو گا یہاں جس کے لئے بنداہارا کی خوبصورت بیٹی آیا کرتی تھی؟ یقیناً کوئی جری مرد ہو گا۔ وہ جتنی حسین' طرحدار اور لائق تھی' کسی عام مرد کے لیے نہیں آتی ہو گی۔ پتہ نہیں کیا کہانی ہو گی اس کی۔ وہ سوگوار مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کبھی اس کی داستان نہیں جان پائے گی۔

ظاہر ہے وہ غلط تھی۔

☆☆☆

تالیہ الوداعی کلمات کہہ کے چلی گئی تو عصرہ اوپر آئی۔ بیرونی زینہ عبور کر کے بالکونی پار کی اور پہلے کمرے میں داخل ہوئی۔ توقع کے عین مطابق وہ وہیں موجود تھا۔

کمرہ سادہ تھا۔ ایک طرف سنگل پلنگ بچھا تھا۔ دوسری جانب الماری تھی۔ فاتح اس وقت دیوار کے سامنے کھڑا تھا جہاں کھڑکی تھی۔ عصرہ کی جانب پشت کیے' وہ نیچے صحن میں مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔

''بچے کھانا کھانے باہر جانا چاہتے ہیں۔ چلو گے؟'' اس نے نرمی سے پکارا۔

''ہوں!'' وہ بے توجہی سے نیچے دیکھتا رہا۔

''اس گھر کو بیچنا مشکل لگ رہا ہے کیا' فاتح؟''

وہ اس کے کندھے کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ نیچے صحن اور کنواں صاف دکھائی دیتا تھا۔

''نہیں تو۔ میں یہاں کم رہا ہوں۔ کبھی چھٹیوں میں آتے تو میں یہ کمرہ لے لیتا تھا۔ چار پانچ ماہ میں ایک آدھ دن کے لیے۔''

''مت ظاہر کرو کہ تمہیں اس کو بیچنے سے فرق نہیں پڑتا۔''

''واقعی نہیں پڑتا۔ بیچ ہی رہا ہوں' ڈھا نہیں رہا۔'' باہر دیکھتے ہوئے اس نے شانے اچکائے۔

''نئے مالک ڈھا دیں گے۔ کوئی کافی شاپ' کوئی ٹی ہاؤس بنا دیں گے اس کو۔''

فاتح نے جواب نہیں دیا۔ وہ نیچے دیکھتا رہا۔ سینے پہ بازو لپیٹے' اس کی سیاہ آنکھیں مجسمے پہ جمی تھیں۔ جینز کے اوپر سفید شرٹ پہنے' بال ماتھے پہ بکھیرے' وہ عام دنوں سے مختلف لگ رہا تھا۔

''فاتح..... ریستوران!'' اس نے یاد دلایا تو وہ گہری سانس لے کر اس کی جانب گھوما۔

''میں کچھ آرڈر کرلوں گا۔ تم جاؤ۔ موسم خراب لگ رہا ہے' تمہیں پھر واپس بھی جانا ہوگا۔''

عصرہ چند لمحے تفکر سے اسے دیکھے گئی۔

''ہاں' ہم لنچ کر کے واپس چلے جائیں گے' موسم اچھا نہیں ہے' لیکن تم..... تم کب آؤ گے؟''

''میں رات تک آؤں گا۔''

''اکیلے کیا کرو گے ادھر؟'' وہ قدرے تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔

فاتح نے مسکراتے ہوئے اطراف میں دیکھا۔ ''اکیلا کہاں ہوں؟ عنقریب اشعر مشہور کرنے والا ہے کہ اس گھر میں بھوت پریت بھی رہتے ہیں۔''

عصرہ کی آنکھیں حیرت سے پوری کھل گئیں۔ ''تمہیں کیسے معلوم؟''

''اور کس طرح کسی پراپرٹی کی قیمت گرائی جاتی ہے؟ تمہیں لگتا ہے میں اس کے طریقوں سے واقف نہیں ہوں؟'' ابرو اچکا کے مسکرایا۔ سینے پہ بازو لپیٹے وہ بے فکر لگ رہا تھا۔ عصرہ کی پیشانی پہ سلوٹیں پڑیں۔

''کیوں ایش کے بارے میں ایسے اندازے لگاتے ہو فاتح؟ پہلے تو تم ایسے نہیں تھے۔''

''مگر وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ دکھاوے کے ساتھ یہی مسئلہ ہوتا ہے۔ کبھی نہ کبھی کھل جاتا ہے۔'' شانے ذرا سے اچکائے گویا اسے پرواہ نہیں تھی۔

عصرہ نے ضبط سے گہری سانس لی۔

''خیر..... جو بھی کرو..... تمہاری سیاست' تم دونوں جانو۔ ہم لنچ کرتے ہی واپس نکل جائیں گے۔ تم کچھ آرڈر کرلینا۔''

''شیور!'' وہ بے پرواہ تھا' یا شاید قانع۔

عصرہ نے ایک الوداعی نظر اس پہ ڈالی اور باہر نکل گئی۔

کچھ دیر بعد جب وہ اور بچے کار میں بیٹھ رہے تھے' وان فاتح اوپر بالکونی میں کھڑا تھا۔ عینک لگائے' وہ جھک کے موبائل پہ ٹائپ کر رہا تھا۔ ابھی گلی میں لوگوں کی نظر اس پہ نہیں پڑی تھی ورنہ وہ تانتا بندھتا کہ خدا کی پناہ۔

''فاتح!'' کار کا دروازہ کھولتے وقت عصرہ نے اسے پکارا تو فاتح نے سر اٹھایا' پھر ان کو دیکھ کے مسکرایا اور عینک اتاری۔

''خدا حافظ!'' دایاں ہاتھ اٹھا کے الوداع کہا۔

سکندر نے ''خدا حافظ ڈیڈ!'' پکارا اور جولیانہ نے مسکرا کے ہاتھ ہلایا۔ وہ تینوں اندر بیٹھ گئے اور وہ مسکرا کے ان کو دیکھتا رہا۔ سکندر کی نظریں اسی پہ جمی تھیں۔ بار بار فکرمندی سے وہ باپ کو دیکھتا تھا جو ریلنگ پہ دونوں ہتھیلیاں رکھے' جھک کے ان کو دیکھ رہا تھا۔

''ماما..... ہمیں ڈیڈ کو چھوڑ کے نہیں جانا چاہیے۔'' کار آگے بڑھ گئی تو وہ بے چینی سے پیچھے مڑ کے ماں سے بولا۔

''بیٹا' تمہارے ڈیڈ 48 سال کے ہیں۔ بے فکر

رہو وہ راستہ نہیں بھولیں گے اور بالکل بھی نہیں کھوئیں گے۔ ان کو بھی کوئی space چاہیے۔" وہ جو سیل فون پہ لگی تھی' قدرے اکتا کے بولی تو سکندر گردن موڑ کے سڑک کنارے بھاگتے درختوں کو دیکھنے لگا۔
اس کا دل خراب ہو رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔
(کیا بڑے لوگ راستہ نہیں بھولتے؟)

☆☆☆

ملاکہ کا دارالحکومت ملاکہ شہر تھا جو سمندر کنارے واقع تھا۔ جس ہوٹل میں تالیہ نے کمرہ لیا تھا' اس کی کھڑکیاں ساحل کی طرف کھلتی تھیں۔ فرنچ ونڈو پہ پڑے سفید پردے ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے اور نیچے ٹھاٹھیں مارتا سمندر دکھائی دے رہا تھا۔

بیڈ پہ اس کا سامان بکھرا ہوا تھا اور وہ سامنے کھڑی تھی۔ ہاتھ میں ایک بیک پیک تھا۔ جیسے اسکول کالج جانے والے کندھوں پہ پہنتے ہیں۔ وہ کچھ چیزیں نکال نکال کے اس بیک پیک میں رکھ رہی تھی۔ رسی' ٹیپ' چند اوزار' پیسے' کریڈٹ کارڈز' گلوز۔ چھوٹے سے بیک پیک کو بھرنے کے بعد وہ روم فریج تک آئی اور اندر سے پانی کی ایک بوتل نکالی' ایک کولا کا کین اور اور چند چاکلیٹ بار۔
"اتنی کیلوریز؟ اونہوں۔" چاکلیٹ واپس رکھ دی۔ پانی اور کولا کو بیگ میں ڈال دیا۔ ایک تیز دھار خنجر رکھا۔ ٹیزر (کرنٹ لگا کے بے ہوش کرنے کا آلہ)' کالی مرچوں کا اسپرے' اور ایسے تمام لوازمات جو وہ کسی بھی واردات کے وقت اپنے ساتھ رکھتی تھی' اس میں ڈالے اور زپ بند کی۔ پھر اسے کندھوں پہ پہنا اور خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے۔
تبھی موبائل بجا۔
ایڈم کنویں پہ پہنچ چکا تھا۔ وہ اسے وہیں رکنے کا کہہ کے باہر نکل آئی۔ ذہن تیزی سے مختلف ممکنات کو سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

ملاکہ کے ساحل کا یہ حصہ الگ تھلگ سا تھا۔ یہاں اونچی چٹانیں تھیں' اور نیچے سمندر بہتا نظر آ رہا تھا۔ لہریں امڈ امڈ آتیں اور چٹانوں سے سر پٹخ کے واپس لوٹ جاتیں۔ یہاں اِکا دُکا لوگ نظر آتے تھے۔ دور تک ریت سنسان پڑی تھی۔
ایسے میں ایک چٹان کے اوپر وان فاتح کھڑا تھا۔ اس کی سفید شرٹ ہوا کے باعث پھڑ پھڑا رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے سمندر کو دیکھتے ہوئے سوگوار سا مسکرا رہا تھا۔
لہروں کے جھاگ میں شکلیں بن بن کے ابھرتیں' اور ابھر ابھر کے مٹتی تھیں۔ بہت سی یادیں گویا امڈی چلی آ رہی تھیں۔ چھ سال گزر گئے۔ چھ سال اور ایک دن۔ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ آریانہ کے ساتھ اس روز کیا ہوا تھا۔
سوائے وان فاتح کے....
اسے ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ آخری دن ان دونوں نے ملاکہ میں ساتھ گزارا تھا۔
ملاکہ آ کے سب سے پہلے وہی یاد آتی تھی۔
ملاکہ سے جاتے وقت سب سے آخر میں بھی وہی یاد آتی تھی۔
وہ ایک نم صبح تھی۔ سن باؤ کے گھر میں چھایا سی تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا تھا۔ ایسے میں صحن میں وہ بیٹھی تھی۔
ننھی آریانہ۔ اس مجسمے کے قریب پنجوں کے بل بیٹھے وہ اس کے پاؤں دیکھ رہی تھی۔ لمبے بال کمر پہ بکھرے تھے۔ وہ چینی نقوش والی گوری سی لڑکی تھی جس کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں۔
وہ اس کی پشت پہ آ کھڑا ہوا۔ آریانہ نے گردن موڑی تو دیکھا۔ فاتح مسکرا کے اسے دیکھ رہا تھا۔ ٹی شرٹ اور جینز پہنے' وہ چھٹی والے لاپرواہ

حلیے میں لگتا تھا۔
"کیا تمہیں بھی سن باؤ پسند ہے۔" وہ پنجوں کے بل اینٹوں والے فرش پہ بیٹھا۔ آریانہ نے واپس چہرہ مجسمے کی طرف موڑ لیا۔
"ڈیڈ... کیا یہ آدمی اصل میں تھا کوئی؟"
"ہاں بیٹا۔ اس کا نام وانگ لی تھا۔"
"اس کا مجسمہ کیوں بنایا شہزادی تاشہ نے؟"
"کیونکہ وہ شہزادی تھی۔ اور شہزادیاں اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہیں۔"
اوپر بادل زور سے گرجے اور یکایک موٹی موٹی بوندیں صحن میں گرنے لگیں۔
"کاش میں بھی شہزادی ہوتی۔"
وہ ہنس دیا۔
"تمہیں کیوں لگا کہ تم شہزادی نہیں ہو؟"
سرخ اینٹوں والا صحن بارش میں بھیگ رہا تھا اور وہ دونوں پنجوں کے بل ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔
"کیونکہ آپ بادشاہ نہیں ہیں۔" وہ ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے اداس نظر آتی تھی۔
"تاشہ کا باپ بھی بادشاہ نہیں تھا۔ بندا ہارا تھا۔"
"وہ کیا ہوتا ہے؟"
"پردھان منتری۔" (وزیر اعظم)
وہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔
"اگر آپ پردھان منتری بن جائیں تو میں خود بخود شہزادی بن جاؤں گی؟"
"ہاں۔" وہ کھڑا ہوا اور جھک کے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ آریانہ کسی اور سوچ میں لگتی تھی....
"مگر یہ تو چیٹنگ ہوئی۔ شہزادی تو بائی برتھ شہزادی ہوتی ہے۔ ایسے ہی کوئی تھوڑی شہزادی بن جاتا ہے۔" وہ بھیگی ہوئی بچی اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کیے سر اس کے کندھے پہ رکھے بولی۔ وہ اسے اٹھائے اندر برآمدے میں لا رہا تھا۔
"یہ چیٹنگ نہیں ہے۔" برآمدے میں آ کے وہ ٹھہرا اور آریانہ کو نیچے اتارا۔ وہ فرش پہ کھڑے ہوتے ہی حیرت سے سر اٹھا کے اسے دیکھنے لگی۔
"چیٹنگ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟"
"دھاندلی۔" وہ سنجیدگی سے بولا.... اور دونوں ہنس دیے۔
تبھی اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے نمبر دیکھا۔
"اندر جاؤ ماما کے پاس' اور اب بارش میں نہیں بھیگنا۔" وہ تابعداری سے اندر جانے لگی' پھر رکی۔
"کل ہم کیبل کار (چیئر لفٹ) پہ جائیں گے نا' ڈیڈ؟"
فاتح نے صرف سر ہلا دیا اور فون کان سے لگاتے ہوئے برآمدے کے دوسرے سرے تک چلتا آیا۔ چہرے پہ سنجیدگی چھا گئی تھی۔
"کہاں ہو' فاتح؟" مردانہ آواز' دوستانہ انداز میں سنائی دی۔
"میں چھٹی پہ ملاکہ آیا ہوا ہوں۔ کیوں؟" وہ اب برآمدے کے ستون کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ اوپر مخروطی چھت کے کناروں سے پانی ٹپ ٹپ کے نیچے گر رہا تھا۔ سامنے صحن بھیگتا دکھائی دے رہا تھا۔
"فاتح...." وہ کوئی سیاسی دوست تھا۔ تذبذب سے بولا۔ "صوفیہ صاحبہ ایک پیغام دینا چاہتی تھیں۔"
"پردھان منتری کی بیٹی صوفیہ رحمن صاحبہ؟" وہ استہزائیہ مسکرایا۔ (یہ ان دنوں کی بات ہے جب صوفیہ رحمن کے بابا ملک کے وزیر اعظم تھے۔)
"ہاں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر تم اور تمہارے ساتھ قریباً ۲۰ ممبر پارلیمنٹ...."
"میرا جواب ناں میں ہے۔"
"تم نے ابھی ان کی پیشکش سنی ہی نہیں ہے۔"
"اچھا ہے نہیں سنی' کیونکہ سن لوں گا تو اس پہ

گواہ بن جاؤں گا' اور اگلا جلسہ جہاں بھی کرنے جاؤں گا' وہاں لوگوں کے سامنے دہرادوں گا کہ صوفیہ رحمٰن کیسے لوگوں کو اپنے الائینس میں شامل ہونے کے لئے دھمکاتی ہیں۔"

"وہ ملک کی اگلی وزیرِ اعظم ہیں۔ان کی بات تو سن لو۔"

ایک دم بارش کی بوچھاڑ اتنی تیز ہوگئی کہ جیسے پہ گرتے قطروں کی تڑتڑاہٹ سے سارا آنگن گونج اٹھا۔

"میں ضرور سنتا اگر مجھے صوفیہ کے ساتھ بیک ڈور ڈیل کرنی ہوتی۔یہی کہنا چاہتی ہوگی نا وہ کہ میں بیس پچیس لوگوں کے ساتھ باریسن نیشنل چھوڑ کے اس کی پارٹی میں آجاؤں اور وہ مجھے وزیر بنا دے گی؟ ابھی الیکشن میں دو سال پڑے ہیں' وہ ابھی سے اپنی حکومت کے لئے جوڑ توڑ شروع کر رہی ہے۔" وہ ستون سے ٹیک لگائے کھڑا' موبائل کان سے لگائے' بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

"صوفیہ رحمٰن ایک خطرناک عورت ہے۔"

"صوفیہ رحمٰن ایک بزدل عورت ہے۔اور وہ شاید بھول گئی ہے مگر ہم دونوں یونیورسٹی میں ساتھ پڑھے ہیں۔اس کو کہنا' مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ کیسی تھی' اور یہ بھی کہ میں کیسا تھا۔اسے مجھے ایسی آفر دیتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔بی این کا ایک رکن بھی اس کی طرف نہیں جائے گا۔"

"تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا' وہ اس آفر کو قبول کر لیتا۔"

"تمہارے خیال میں ایسی آفرز مجھے پہلے کبھی نہیں دی گئیں؟ اگر مجھے دوسروں کے ساتھ سمجھوتے کر کے وزیراعظم بننا ہوتا تو کب کا بن چکا ہوتا۔میرا خواب ہے کہ میں اپنے ملک کا وزیراعظم بنوں اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔یہ ایک عظیم خواب ہے۔اپنے ملک کی اعلیٰ ترین سطح پہ نمائندگی۔لیکن مجھے اسٹرگل کر کے وزیراعظم بننا ہے۔اور ہاں صوفیہ سے کہنا' اس نے جو کرنا ہے کر لے۔اس کے باپا اور اس کو لوگوں کو خریدنے کی عادت ہوگئی ہے۔عادت بدلنے میں وقت لگے گا۔"

اس نے موبائل رکھا اور پھر گردن نکال کے آسمان کو دیکھا۔وہ سیاہ پڑتا برسے جا رہا تھا... جیسے رونے لگ گیا ہو.... زار و قطار.....

آج....وان فاتح چٹان کے اوپر کھڑا تھا۔ہاتھ جیبوں میں تھے اور سوگوار مسکراہٹ سے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔لہروں میں بنتے جھاگ میں دکھائی دیتا منظر بدل رہا تھا.....

وہ سرسبز اونچی پہاڑیاں تھیں جہاں اونچے کھمبوں کی مدد سے تاروں پہ لٹکتی کیبل کار (چیئرز لفٹ) نیچے آتی دکھائی دے رہی تھیں۔پہاڑی پہ ٹریک بھی بنا تھا جہاں ہائیکنگ کے شوقین لوگ چڑھتے اترتے دکھائی دیتے تھے۔مگر ایسے لوگوں کی تعداد کم تھی۔زیادہ لوگ اوپر کیبل کار (چیئرز لفٹ) پہ بیٹھ کے سفر کرنا پسند کرتے تھے۔عصرہ' اشعر اور سکندر کے ساتھ اوپر کیبل کار پہ چلی گئی تھی۔جبکہ آریانہ کے شوق فاتح جیسے تھے۔اسے فطرت کے قریب' جنگلوں اور پہاڑوں میں پیدل چلنے میں مزا آتا تھا۔

ٹریک پہ جانے سے پہلے آریانہ پاپ کارن کا اسٹال دیکھ کے مچل گئی۔"مجھے یہ کھانے ہیں۔"

"ابھی واپسی پہ کھانا تو کھاؤ گی نا' پھر یہ کیوں؟" وہ ہلکا سا خفا ہوا۔جواب میں اس نے پورا چہرہ اٹھایا اور بڑی بڑی آنکھیں جھپک کے اسے دیکھا۔بولی کچھ نہیں۔

"اچھا۔کھالو۔" فاتح نے گہری سانس لی اور جیب سے بٹوہ نکالا۔پھر آریانہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے پاپ کارن اسٹال تک لے آیا۔

اسے میٹھے پاپ کارن پسند تھے۔ کیریمل والے۔ پورا پیکٹ بھر کے لیا اور اپنی لمبی جیکٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ ''میں ان کو واپسی پہ کھاؤں گی۔''

''مگر یہ تب تک ٹھنڈے ہو جائیں گے' بے بی۔ پاپ کارن گرم کھائے جاتے ہیں۔''

''اس سے میری جیکٹ گرم ہو جائے گی نا۔'' کہنے کے ساتھ اس نے دو تین دفعہ پلکیں جھپکائیں۔ فاتح مسکرا دیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں سرسبز پہاڑی پہ اوپر چڑھ رہے تھے۔ اس نے جینز میٹیریل کی شرٹ پہن رکھی تھی اور آریانہ نے پتلی سی سفید جیکٹ۔ نیچے سفید فراک اور سفید ہی جرابیں تھیں۔ جوگرز بھی سفید۔ سر پہ ہیئر بینڈ لگائے وہ چھوٹی سی پری لگتی تھی۔

''میں نے صبح ماما سے کہا کہ جب آپ پردھان منتری بن جائیں گے تو میں شہزادی بن جاؤں گی۔''

''اور ماما نے کیا کہا؟'' وہ مسکراہٹ دبائے جوگرز کی مدد سے اوپر چڑھ رہا تھا۔

''انہوں نے کہا' صرف میں شہزادی کیوں بنوں گی؟ جولیانہ بھی بنے گی۔''

وہ ہنس دیا۔ عصرہ کو اس سے شکایت ہوتی تھی کہ وہ آریانہ اور جولیانہ میں فرق کرتا ہے۔ ایسی بات نہیں تھی۔ آریانہ بڑی تھی تو زیادہ قریب تھی۔

''ہاں' ظاہر ہے جولیانہ بھی بنے گی۔'' اس نے گردن اٹھا کے اوپر دیکھا۔ وہ سرسبز پہاڑیاں تھیں جہاں بادل نیچے تک اترے ہوئے تھے۔ ان کے سروں کے اوپر سے کیبل کار گزر رہی تھی۔ کتنا خوبصورت تھا اس کا ملک۔ وہ فخر سے مسکرایا۔

''آپ کو جنگل اور پہاڑ اچھے لگتے ہیں' ڈیڈ؟'' وہ اس کا ہاتھ پکڑے چلتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''بہت زیادہ۔ میں ہر سال صباح کے جنگلوں میں شکار کے لیے جایا کرتا تھا۔ اب کچھ عرصے سے نہیں جا سکا مگر دل چاہتا ہے۔ پارلیمان اور کوالالمپور کی مصروف زندگی سے بالکل کٹ کے کچھ دن پہاڑوں میں گزارنے کا۔''

''آپ کو ایسی جگہوں پہ کیوں مزہ آتا ہے؟''

''کیونکہ جو ملاح طوفانی بارش میں سمندر میں کشتی لے کر نہیں نکلتے' وہ کبھی اچھے ملاح نہیں بن سکتے۔ انسان کو ہر روز خود کو کسی چیلنج کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اس سے بہت کچھ سیکھ کے نکلے۔''

آریانہ کی سمجھ میں بات نہیں آئی مگر اس نے سر ہلا دیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ اوپر چڑھتے جا رہے تھے کہ عقب سے آواز آئی۔

''ان چے فاتح (مسٹر فاتح)۔ آریانہ!' وہ دونوں ایک ساتھ پلٹے۔

نیچے سے جولیانہ کی نینی چلتی آ رہی تھی۔ یہ ایک انڈین عورت تھی جو چند ماہ سے ان کے گھر ملازمت کر رہی تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال کرتی کیونکہ عصرہ ایک ورکنگ وومن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی بیوی بھی تھی۔ غرض اس عورت ثریا نے سارا گھر سنبھال رکھا تھا۔

''سر....'' وہ پھولتی سانس کے ساتھ قریب آئی۔ ''عصرہ بیگم آریانہ کو بلا رہی ہیں۔''

''کیوں؟''

''سکندر ضد کر رہا ہے کہ وہ آریانہ کے بغیر کچھ نہیں کھائے گا۔ سکندر کو بخار بھی ہو رہا ہے۔''

''چلو' ہم واپس چلتے ہیں۔''

''نہیں' سر۔ عصرہ بیگم نے کہا ہے کہ میں آپ کو ٹریک سے نہ روکوں۔ آپ عرصے بعد ہالیڈے پہ آئے ہیں۔ صرف آریانہ کو لے آؤں۔ آپ

ٹریک جاری رکھیں۔" وہ ہمدردی سے بولی تو آریانہ فوراً بولی۔

"آپ جائیں' ڈیڈ۔ میں سکندر کو سنبھال لوں گی۔" اس نے سمجھ داری سے کہا۔ تو اس نے مسکرا کے سر ہلا دیا۔ آریانہ کا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرا ہاتھ ثریا دیوی نے تھاما تو وہ اس کے ساتھ آگے بڑھی۔ فاتح نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ وہ مڑی اور اس کو دیکھ کے مسکرائی۔

"سی یو ....ڈیڈ!" اور پلکیں دو دفعہ جھپکائیں۔ وہ ہلکا سا ہنسا اور اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ثریا اسے لیے نیچے اترنے لگی اور وہ اوپر پہاڑی پہ چڑھنے لگا۔

وہ چند منٹ تک اوپر چڑھتا گیا اور پھر یکا یک رک گیا۔ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ سکندر تو ابھی ٹھیک تھا۔ اسے بخار کیوں ہو رہا ہے؟ وہ واپس پلٹ آیا۔ ٹریکنگ میں دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ وہ نیچے اترنے لگا۔ رفتار تیز تھی' اسے امید تھی کہ وہ جلد آریانہ اور ثریا سے جا ملے گا۔

مگر وہ اسے ٹریک پہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ نیچے اترتا آیا۔ بیچ راستے میں رک کے اس نے سیل فون نکالا اور عصرہ کو کال ملائی۔

"سکندر ٹھیک ہے۔ اسے کیا ہوتا ہے؟" وہ مطمئن لگ رہی تھی۔

وہ ایک عجیب سا لمحہ تھا۔ جیسے کوئی روح کھینچ لیتا ہے۔

"تم نے ثریا کو ہماری طرف نہیں بھیجا؟"

"نہیں۔ میں تو خود غصے میں بیٹھی ہوں۔ وہ آدھے گھنٹے سے غائب ہے۔ کیا وہ تمہاری طرف آئی ہے' فاتح؟" وہ پوچھ رہی تھی مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ فون رکھتا ایک دم نیچے بھاگا تھا۔

پہاڑیاں خاموش تھیں۔ سبزہ منہ بند رکھے ہوئے تھا۔

"آریانہ....آریانہ!" وہ چلاتے ہوئے نشیب میں اتر رہا تھا۔

اگلا ایک گھنٹہ کسی سلو موشن فلم کی طرح طے ہوا۔ وہ جیسے ہی ٹورسٹ اسپاٹ تک پہنچا.... عصرہ' اشعر اور بچے ادھر ہی آ گئے.... پل بھر میں سارے گینٹنگ ہائی لینڈ کو خبر ہو گئی کہ وان فاتح کی بیٹی غائب ہو گئی ہے.... کیمروں کے جلتے بجھتے فلیش.... موبائل اسکرینز کی روشنیاں.... پولیس کے سائرن.... لوگ چلا رہے تھے.... اس کے ساتھ دوڑ رہے تھے.... وہ بھی بھاگ رہا تھا.... دائیں بائیں.... حلق کے بل چلاتے ہوئے آریانہ کو آوازیں دے رہا تھا.... مگر آریانہ نہیں تھی....

وہ غائب ہو گئی تھی....

کسی نے کہا' ایک بچی کو چند ماسک والے افراد وین میں ڈال کے لے گئے ہیں....

وہ سڑک تک بھاگتا آیا.... ٹھنڈے موسم میں پسینہ پسینہ ہوئے.... مگر نہ کوئی وین تھی.... نہ اس کا نام و نشان.... پولیس آگے پیچھے بھاگی۔ کسی نے سی سی ٹی وی کا ریکارڈ کھولا مگر کیمرے میں وین نہیں تھی۔ نہ کیبل کار (چیئر لفٹ) کے کسی کیمرے نے ثریا اور آریانہ کو دیکھا تھا۔ پولیس وین کو ڈھونڈتی رہی اور بعد میں علم ہوا کہ وین کی ہوائی اڑانے والا بھی لاپتا ہے.... وہ صرف پولیس کا وقت ضائع کرنے کی کوشش تھی اور کامیاب رہی تھی.... کوئی وین نہیں تھی.... ساری ناکہ بندیاں بے سود تھیں....

چند منٹ میں کیبل کار (چیئر لفٹ) اسپاٹ جائے حادثہ بن گیا۔ خوف و ہراس کی فضا قائم تھی۔ رپورٹرز دھڑا دھڑ ٹی وی چینلز پہ بیان دے رہے تھے' کیمرہ مین تصاویر اتار رہے تھے۔ اشعر روتی ہوئی عصرہ کو ہوٹل لے گیا مگر وہ وہاں سے نہیں گیا۔

وہ [illegible] ہائی لینڈ کے ریستورانوں کی طرف آ گیا تھا۔ [illegible] کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ ایک ایک [illegible] رہا تھا۔ آریانہ... آریانہ... کیا وہ واقعی اس کا نام [illegible] رہا تھا یا گلا بیٹھ جانے کے باعث صرف لب ہل [illegible] تھے؟ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ ساری دنیا ختم ہو گئی تھی اور صرف ایک حقیقت باقی تھی۔

آریانہ نہیں تھی۔

رات سرکتی رہی۔ بارش نہیں ہوئی۔ آسمان بھی شل تھا جیسے۔ پولیس رپورٹ تیار کر چکی تھی۔ ریسکیو ٹیمیں ناکام لوٹ چکی تھیں۔ کسی کو آریانہ نہیں ملی۔ قوی امکان تھا کہ ثریا اب تک بچی کو لیے شہر سے دور جا چکی ہو گی۔ وہ اس وقت ایک پولیس آفیسر کے ساتھ وہیں کے مقامی ریستوران میں بیٹھا تھا۔ پولیس نے اسے باخبر کیا تھا کہ اغوا کار فون کریں گے۔ وہ چپ بیٹھا رہا۔ کھڑکی سے باہر سیاہ آسمان اور دور تک پھیلی پہاڑیاں دیکھتا رہا۔ اس کا دل کہتا تھا' آریانہ یہیں ہے۔ وہ انہی پہاڑوں میں ہے۔ وہ قریب ہے۔ بہت قریب۔

آدھی رات بیت گئی جب پولیس نے اسے گھر جا کے آرام کرنے کا کہا تو وہ بنا احتجاج کے اٹھ آیا۔ مگر وہ گھر نہیں گیا۔ وہ واپس اسی ٹریک کی طرف چلتا گیا۔ سرسبز پہاڑی پہ بنا راستہ جہاں اس نے آریانہ کا ہاتھ آخری دفعہ چھوڑا تھا۔

بچپن میں جب کوئی شے کھو جاتی تو اس کی ماں کہا کرتی تھی۔ چیزیں ہمیشہ وہیں ڈھونڈنی چاہئیں جہاں وہ کھوئی تھیں۔ وہ ہمیشہ وہیں سے ملتی ہیں۔

پولیس کے کسی سپاہی سے جو ٹارچ اس نے لی تھی وہ اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی روشنی اندھیری پہاڑی پہ ڈالتا وہ اسی جگہ واپس آیا۔ پھر وہاں سے نیچے اترنے لگا.... بالکل ایسے جیسے اس نے ثریا اور آریانہ کو اترتے دیکھا تھا۔ پولیس نے یہ سارا علاقہ چھان مارا تھا مگر وہ ایک گمشدہ بچی کو ڈھونڈ رہے تھے۔

وہ اپنی سات سالہ بیٹی کو نہیں ڈھونڈ رہے تھے۔

وہ ٹریک سے ہٹ آیا۔ ثریا فاتح کے مڑتے ہی بچی کو بہلا پھسلا کے اس طرف لے آئی ہو گی جہاں اس کی مدد کے لیے کوئی موجود ہو گا۔ وہ ان جھاڑیوں کی طرف آ گیا جہاں لوگ نہیں چلا کرتے تھے۔ ٹارچ کی روشنی آس پاس مسلسل ڈال رہا تھا البتہ اب وہ اسے پکار نہیں رہا تھا۔ اس کے انداز میں احتیاط تھی۔

دور ایک طرف روشنی میں کچھ چمکا۔ وہ تیزی سے قریب آیا۔ کیرمل لگا پاپ کارن۔

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ دوڑ کے اس کونے تک آیا۔ یہاں مٹی پہ نشانات تھے۔ گھاس مسلی ہوئی تھی۔ مزاحمت۔ زورزبردستی۔

وہ پہاڑی سے نیچے اترتا' ٹارچ کی روشنی ڈالتا گیا۔ وہاں کچا راستہ سا بنا تھا جس پہ ذرا ذرا دیر بعد پاپ کارن کا ٹکڑا گرا نظر آتا تھا۔ وہ تیز تیز دوڑنے لگا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اس کی فیری ٹیلز کی رسیا بیٹی.... جانے اس نے ہنسل اور گریٹل کی طرح بریڈ کرمب خود گرائے تھے یا جیب سے لڑھکتے گئے تھے.... اس کا دل بھر آ رہا تھا مگر وہ دوڑتا گیا۔ وہاں گھسیٹنے کے نشان تھے.... قدموں کے کھرے تھے.... اور وہ رک نہیں رہے تھے.... پولیس اور دوسرے لوگوں کو وین کے پیچھے لگا کے وہ دو افراد جو اس کی بیٹی کو اٹھائے ہوئے تھے' وہ اس راستے سے نکل گئے تھے۔ ثریا اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کا ساتھی بھی تھا۔

اس نے چند گھاٹیاں عبور کیں۔ کچھ پرنالے پھلانگے.... اور دوڑتا ہوا نیچے اترتا گیا۔

پاپ کارن اب ختم ہو چکے تھے۔ اونچی نیچی گھاٹیاں اندھیرے میں ڈوبی تھیں۔

"آریانہ!" وہ چیخا۔ ٹارچ چاروں اطراف میں ڈالی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ جنگل سا علاقہ خاموش پڑا تھا۔ ایک طرف سڑک دکھائی دیتی تھی۔ وہاں ایک کار کھڑی تھی۔ وہ دوڑ کے اس تک آیا۔ راستے میں باڑ وغیرہ لگی تھی مگر اس نے اسے پھلانگ لیا۔

کار لاکڈ تھی اور خالی تھی۔ اگر یہ اغوا کاروں کی کار تھی تو وہ واپس کیوں نہیں گئے؟ وہ ابھی تک پہاڑوں میں کیوں چھپے ہوئے تھے؟

وہ دوبارہ سے پہاڑی کی طرف آیا اور اسے پکارتے ہوئے نیچے اترنے لگا۔ "آریانہ۔ آریانہ۔" مگر اندھیرے میں ڈوبے پہاڑ خاموش رہے۔ وہ سب جانتے تھے مگر غم بانٹنے کے عادی نہ تھے۔ اسی لیے سخت اور اونچے تھے۔

نیچے ایک چھوٹا سا جھرنا بہہ رہا تھا۔ وہیں تھکا ہارا اس کے کنارے بیٹھ گیا۔ اردگرد حشرات الارض رینگ رہے ہیں یا کوئی جنگلی جانور اس طرف آسکتا ہے اسے پرواہ نہ تھی۔ وہ بس وہیں بیٹھا رہا۔

پھر رات کی سیاہی میں سورج کی کرنیں گھلنے لگیں اور پہاڑ روشن ہونے لگے تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور نڈھال قدموں سے واپس اوپر چڑھنے لگا۔

وہ جو پوری رات کی خواری اور ٹھوکروں کے باوجود نہیں ملی تھی...... وہ واپسی کے چند قدم اٹھانے پہ مل گئی۔

ایک درخت کی کھوہ میں..... وہ لیٹی ہوئی تھی۔

دور سے اسے دیکھ کے فاتح ٹھہر گیا۔ بالکل ساکت۔ جامد۔

اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ سفید اسکرٹ بلاؤز اور اوپر جیکٹ پہنے وہ لیٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ پہلو میں ڈھلکے ہوئے بازو کے ساتھ پاپ کارن بکھرے تھے۔ ساتھ ہی خون بہتا ہوا نظر آرہا تھا۔

وہ من من کے قدم اٹھاتا قریب آیا اور گھٹنوں کے بل آریانہ کے پاس بیٹھا۔ پھر آہستہ سے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

اس کا چہرہ صاف تھا۔ آنکھیں ذرا سی کھلی تھیں۔ مگر چہرے پہ ایک خراش بھی نہ تھی۔ سر کا پچھلا حصہ پچکا ہوا تھا۔ گردن سے نیچے جسم بری طرح مسخ ہو چکا تھا۔

مگر اس کا چہرہ صاف شفاف تھا۔ شہزادیوں جیسا۔

ہاں.... صرف وان فاتح جانتا تھا کہ اس روز.... آریانہ مر گئی تھی۔

صبح پھیل رہی تھی اور جب اس نے گردن جھکا کے دیکھا تو دور نیچے کھائی میں اسے دو لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک شریا کی تھی۔ دوسرے اس کے ساتھی کی تھی۔ ان کا منصوبہ بچی کو یرغمال بنانے کا تھا مگر پہاڑی سے اترتے ہوئے یا تو اغوا کار پھسلا تھا' یا شاید آریانہ مزاحمت کر رہی تھی.... اور یوں وہ تینوں بلندی سے نیچے گرے تھے۔ آریانہ شاید سو فٹ تک کسی چٹان پہ گری اور وہ دونوں مزید نیچے لڑھکتے گئے تھے۔ ان کی ہلاکت موقع پہ ہی ہو گئی تھی اور لاشوں کی حالت بری تھی۔

مگر.... فاتح نے پھر سے آریانہ کو دیکھا.... آریانہ کا چہرہ صاف اور نکھرا ہوا تھا۔ لب ہلکی مسکراہٹ میں ڈھلے ہوئے تھے۔ شاید وہ اس بات پہ خوش تھی کہ اس نے اغوا کار کو دھکا دیا ہے مگر۔ دھکا کھاتے ہی وہ آریانہ کو ساتھ لے کر گرا تھا۔ وہ تکلیف سے تڑپ تڑپ کے نہیں مری تھی۔ وہ اتنی تیزی سے نیچے آن گری تھی کہ یقیناً اس کی موت فوراً ہوئی تھی۔ چند سیکنڈز میں۔ مسکراہٹ کو لبوں سے جدا ہونے کا وقت بھی نہیں ملا تھا۔

اور پاپ کارن سے کیریمل کی خوشبو ابھی تک

آرہی تھی۔
وہ کبھی زندگی میں ایسے نہیں رویا تھا جیسے اس دھندلی صبح آریانہ کے سرہانے بیٹھ کے رویا تھا۔ وہ بار بار اس کا سفید چہرہ چومتا' پھر سر جھکائے رونے لگتا۔ ہاتھ خون آلود ہو گئے.... گردن آنسوؤں سے بھیگتی رہی اور وہ روتا رہا۔
کتنے گھنٹے' کتنے پہر وہ وہاں بیٹھا رہا' اسے یاد نہیں۔
پھر وہ اٹھا۔ ہاتھوں سے چہرہ صاف کیا اور قریب سے مٹی کھودنے لگا۔ اپنے ناخنوں سے مٹی کھود کھود کے گڑھا بنایا۔ پھر اپنی اوپری شرٹ اتاری۔ اس میں احتیاط سے بچی کے اعضاء کو لپیٹا۔ سر کے نیچے اس کا جسم ایسا قیمہ بنا ہوا تھا کہ ہاتھ لگانے پہ ہی اعضا بھربھری مٹی کی طرح بکھرنے لگتے تھے۔ اس حالت میں کوئی اس کی بچی کو نہیں دیکھے گا' یہ تو طے تھا۔
آنسو برابر آنکھوں سے بہہ رہے تھے مگر اب وہ بے آواز تھے۔ اس نے آریانہ کو گٹھڑی صورت قبر میں ڈالا۔ پھر نیچے اتر آیا۔ جھرنے کے پانی سے وضو کیا۔ گرم دل کو ٹھنڈی پھواریں مزید گھائل کرتی گئیں۔
واپس آکے.... قبر کے کنارے.... اس نے آریانہ کے لئے آخری نماز پڑھی۔
پھر بدقت ہمت مجتمع کی اور گڑھے کو مٹی سے بھرنے لگا۔ پتھر اٹھا کے اوپر رکھے۔ بھاری وزنی پتھر۔ قبر بند ہو گئی۔ آریانہ آرام دہ جگہ پہ پہنچ گئی تو وہ اٹھا۔ ایک نظر نیچے دیکھا جہاں دور کئی سوفٹ نیچے دو لاشیں پڑی تھیں۔ اسے ان سے نفرت بھی نہیں محسوس ہوئی۔ وہ جانتا تھا' ان کو صوفیہ نے بھیجا تھا۔ ان کو تو صرف آریانہ کو اغوا کرنا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ مر جائے۔
عصرہ کو اشعر گھر لے گیا تھا۔ وہ بھی اپنی کار میں سیدھا کے ایل آگیا۔ کسی سے ملے بغیر کمرے میں گیا۔ خون آلود شرٹ تو آریانہ کے ساتھ دفن ہو گئی تھی مگر نیچے والی شرٹ پہ بھی دھبے تھے۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور تازہ دم ہو کے باہر آیا۔ تو عصرہ سامنے آکھڑی ہوئی۔
وہ رو رہی تھی۔ اس سے پوچھ رہی تھی کہ آریانہ ملی یا نہیں۔
''میں وہاں گیا تھا۔ وہ نہیں ملی۔'' اس نے بس اتنا جواب دیا۔ عصرہ کے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے۔ وان فاتح اب بالکل سنجیدہ تھا۔ چپ۔ خاموش۔ یہ بھی ایک آرٹ تھا۔ اس نے سیکھ لیا تھا۔
اگلے چند دن تفتیش ہوتی رہی۔ سارے ملک میں سوگ سا تھا۔ صرف آریانہ کی وجہ سے نہیں' بلکہ ان دنوں ملائیشیاء کی حکومت اور باغی کیمونسٹ پارٹی کی عسکری لڑائیاں عروج پہ تھیں۔ بہرحال اس نے پولیس کو اس مشتبہ کار کی اطلاع دے دی تھی اور انہوں نے جلد ہی اس آدمی کو ٹریس کر لیا۔ اس کا تانا بانا صوفیہ رحمن کی ایک فیکٹری کے کسی ملازم سے ملتا تھا۔ نہ بھی ٹریس ہوتا تو سب کو معلوم تھا' یہ کسی اور کی نہیں' حکمران خاندان کی حرکت ہے۔ وہ جانتا تھا وہ آریانہ کو مارنا نہیں چاہتے تھے۔ اغوا کر کے پریشر ڈالنا مقصد تھا۔ جو ہوا وہ صرف ایک حادثہ تھا' مگر بہرحال وہی اس کے ذمے دار تھے۔
پولیس کو ان دونوں کی لاشیں بھی نہیں ملیں۔ شاید ان کو گدھ کھا گئے تھے۔ مگر ان کی گمشدگی اور ان کا صوفیہ رحمن سے تانا بانا مل جانا.... یہی ہنگامہ کھڑا کرنے کو بہت تھا۔
جس دن پولیس کی حتمی رپورٹ سامنے آئی' اس دن کیمونسٹ پارٹی کے مسلح ارکان نے فوج کے ساتھ جھڑپیں تیز کر دیں۔
اس صبح وہ عصرہ کے پاس آیا تو وہ بیڈ کے

کنارے اکڑوں بیٹھی کھانے کو تک رہی تھی جو اَن چھوا رکھا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھیں بے کیف تھیں۔ آج آریانہ کو کھوئے چوتھا دن تھا اور وہ صدیوں کی بیمار لگتی تھی۔ فاتح کو داخل ہوتے دیکھ کے اس نے چونک کے نظریں اٹھائیں۔ ان میں آس سی جاگی۔

''آریانہ؟''

اب وہ ''آریانہ ملی'' نہیں پوچھتی تھی۔ صرف ایک نام کافی ہوتا اور سارے سوال اسی میں شامل ہوتے۔ وہ ہر دفعہ نفی میں سر ہلاتا تھا۔ آج نہیں ہلایا۔ اس کے سامنے جا کر بیٹھا اور اس کے ہاتھ تھامے جو ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔

''عصرہ... جو میں کہہ رہا ہوں... اسے غور سے سنو۔ ہوسکتا ہے وہ ہمیں کبھی نہ ملے دوبارہ' مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ نہیں ہے۔ وہ ہے' کہیں نہ کہیں ہے۔'' اسے دیکھتے ہوئے وہ نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ عصرہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''اب ہمیں صبر کرنا ہے۔ اپنے باقی دونوں بچوں کو سنبھالنا ہے۔ ایک گھنٹے بعد رپورٹرز ہمارے گھر کے دروازے پہ موجود ہوں گے۔ ہم دونوں کو ساتھ باہر نکلنا ہے اور بڑے صبر اور حوصلے سے دنیا کو بتانا ہے کہ ہم اپنی بچی کے لئے پرامید ہیں۔ وہ کبھی نہ کبھی ہمیں مل جائے گی مگر اس وقت ہمیں ان نوجیوں کے درد کو سمجھنا ہے جو ان جھڑپوں میں شہید ہو رہے ہیں۔'' عصرہ ایک لفظ پہ چونک چونک گئی۔

''کیا وہ ہمیں مل جائے گی فاتح؟''

''ہوسکتا ہے وہ ہمیں کبھی نہ ملے لیکن مجھے یقین ہے وہ کسی اور کو مل جائے گی۔ کسی نے اسے سنبھال لیا ہوگا اور وہ وہاں خوش رہے گی۔'' وہ کچھ اور کہہ رہا تھا مگر عصرہ کو اس بات نے نئی امید دی تھی۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں صاف کیں۔

''وہ زندہ ہے۔ مجھے یقین ہے۔ وہ ہمیں مل جائے گی۔'' اس نے کہتے ہوئے ٹرے اپنے قریب کی تو آنکھیں پھر سے ابل پڑیں.... وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا وہ عصرہ کو وہ سب نہیں بتا سکتا جو اس نے دیکھا تھا۔ وہ سچ میں جھوٹ کی آمیزش نہیں کر سکتا تھا اور عصرہ سچ سننے کی تاب نہیں رکھتی تھی۔ سو اس وقت وان فاتح کو سچ چھپا دینا ہی بہتر لگا تھا۔ اسے لگا تھا' یہ جھوٹ نہیں ہوتا۔

مگر یہ کچھ تو ہوتا ہے نا۔

جھاگ میں ابھرتے ڈوبتے مناظر تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ فاتح چٹان پہ کھڑا... لہروں کو پتھروں سے سر پٹختے دیکھتا رہا... اس کی مسکراہٹ کی سوگواریت ہنوز قائم تھی۔

اگلا منظر جو پانی کی سطح پہ چمکنے لگا وہ اس کے بیڈروم کا تھا.... وہ سنگھار میز کے شیشے کے سامنے کھڑا تھا۔ باہر سے اشعر آواز دے رہا تھا۔

''آبنگ.... رپورٹرز پہنچ چکے ہیں۔''

وہ آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ بلیک پینٹ پہ سفید شرٹ پہنے ہوئے' جس کے کالر کھڑے اور کف کھلے تھے۔

''آ رہا ہوں۔'' اس نے جواباً کہا تو اشعر دروازے سے ہٹ گیا۔

فاتح نے کف کے بٹن بند کرنے شروع کیے....

(پہاڑی کے دامن میں سرخ مائع میں بھیگی لاش نظروں کے سامنے گھومنے لگی....)

اس نے دوسرے کف کا بٹن کاج میں ڈالا....

(وہ دوزانو بیٹھے' جھک کے اس کا سفید چہرہ چوم رہا تھا... آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔)

فاتح نے خشک آنکھوں سے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے شرٹ کا نچلا بٹن بند کیا۔

(وہ ہاتھوں سے' ناخنوں سے زمین کھود رہا تھا.... آنسو برابر مٹی پہ گر رہے تھے۔)

دو' تین...اس نے اوپری بٹن بند کیا اور ٹائی اٹھائی۔

(وہ گھڑی کو گڑھے کے اندر لٹا رہا تھا.... پھر مٹی میں اٹی آستین سے گیلی آنکھیں پونچھیں۔)

ٹائی کی گرہ باندھتے ہوئے وہ آئینے میں نظر آتی اپنی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

(وہ سینے پہ بازو باندھے' قبر کے سرہانے کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔)

اس نے کوٹ پہنا' شکنیں برابر کیں' اور پرفیوم اٹھایا۔

(وہ مٹی کی ڈھیری کے ساتھ اکڑوں بیٹھا تھا۔ ویران۔ خاموش۔ اب آنکھیں خشک تھیں۔ اب صرف دنیا میں خاموشی تھی۔)

پرفیوم چھڑکا' برش سے بال درست کیے' اور ایک آخری نظر خود پہ ڈالی۔ چہرہ خاموش تھا اور آنکھوں سے... آنکھوں سے جیسے کچھ چلا گیا تھا۔ کچھ ایسا جو اب کبھی لوٹ کے نہیں آتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ گھر کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ عصرہ اس کے ساتھ تھی۔ اسٹول سر پہ لیے' اس کی آنکھیں خشک مگر ویران تھیں۔ مائیک اور کیمرے ان کے سامنے تھے اور وان فاتح' تیز دھوپ کے باعث آنکھوں کی پتلیاں ذرا سکیڑے' کہہ رہا تھا....

''دنیا میں ہر مسئلہ اللہ کی طرف سے ہمارا امتحان ہوتا ہے۔ اور اللہ شاہد ہے' ہم اس امتحان میں ناکام نہیں ہوئے۔''

(وہ سبز پہاڑوں کے دامن میں پتھروں سے ڈھکی قبر کے سرہانے اکڑوں بیٹھا تھا۔ گیلی آنکھیں دور آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔)

''ہماری بیٹی پانچ دن پہلے کیبل کار (چیئر لفٹ) اسپاٹ پہ ہم سے بچھڑ گئی۔ پولیس تاحال اس کو ڈھونڈ نہیں سکی' لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ یہ کس کا کام ہے۔'' صحافیوں نے ایک دم سوالوں کی بوچھاڑ کی مگر اس نے ہاتھ اٹھا کے انہیں خاموش کرایا۔

(وہ ابھی تک مٹی اور پتھروں کی ڈھیری کے کنارے بیٹھا تھا۔ اردگرد پہاڑ تنہا اور خاموش کھڑے تھے۔)

''میں اپنی بیٹی کے اوپر سیاست کروں گا نہ کسی کو کرنے دوں گا۔ ہوسکتا ہے وہ ہمیں مل جائے۔ ہو سکتا ہے' وہ ہمیں کبھی نہ ملے' لیکن اس وقت ہمارا ملک ایک مشکل دور سے گزر رہا ہے۔''

(اس نے آہستہ سے قبر کے پتھروں کو چھوا۔ ان پہ نرمی سے ہاتھ پھیرا۔)

''اس وقت سارے ایوان کو اکٹھا ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ لڑائیوں کا وقت نہیں ہے۔ اگر ہم نے ان کیمونسٹ انتہا پسندوں کو شکست دینی ہے تو ہمیں اپنے ذاتی اختلافات بھلا کے ایک پیج پہ اکٹھا ہونا پڑے گا۔''

(اب وہ بکھرے ہوئے پاپ کارن چن رہا تھا۔ وہ جو آنکھوں سے کھویا تھا' وہ وہیں کھویا تھا۔)

''میں کل پارلیمنٹ جاؤں گا۔ باریسن نیشنل اور ہمارے چیئرمین کے ساتھ' ہم سب کل وزیراعظم آذر رحمن کے ساتھ بیٹھیں گے اور کیمونسٹ تنظیم کے ساتھ معاہدے کا ڈرافٹ تیار کریں گے۔'' مائیک اس کے چہرے کے آگے لہرا رہے تھے' اور کیمروں کے فلیش جل بجھ رہے تھے۔ وہ دائیں سے بائیں رپورٹرز کے چہروں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

(جو کھویا' وہ وہیں رہ گیا۔ پاپ کارن اس نے جیب میں ڈال دیے اور اب وہ اوپر چڑھ رہا تھا.... اوپر ایک لمبا سفر پڑا تھا جو اسے طے کرنا تھا)

''میں بھولوں گا نہیں یہ سب.... وزیراعظم کو

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وان فاتح کبھی نہیں بھولے گا جو اس کی بیٹی کے ساتھ ہوا.... لیکن اس وقت اگر ہم اکٹھے نہ ہوئے تو ہمارے فوجی مرتے رہیں گے۔ میں نے اپنا بچہ کھویا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اب مزید کوئی اپنا بچہ کھوئے۔" (وہ اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ جھاڑیاں' پتھر' گھاس۔ وہ ہر شے عبور کر رہا تھا۔ آنکھیں خشک تھیں۔)

"میں کسی کے خلاف کوئی کیس نہیں کرنے جا رہا۔ اس وقت میرا ملک کسی لڑائی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں نے.... آریانہ کے معاملے کو.... اللہ پہ چھوڑ دیا ہے۔ میں اس وقت صرف امن و امان کا سوچ رہا ہوں۔ آپ کے آنے کا شکریہ۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کے ذرا سا لہرایا' پھیکا سا مسکرایا اور وہ دونوں میاں بیوی پلٹ گئے.... دروازہ کھولا اور اندر چلے گئے جبکہ ان کے پیچھے کیمروں کے فلیش دھڑا دھڑ جلتے بجھتے رہے.... بالآخر دروازہ بند ہو گیا....

وہ ابھی تک چٹان کے اوپر کھڑا تھا.... جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ زخمی سا مسکراتے ہوئے۔ سفید شرٹ بار بار ہوا سے پھڑپھڑاتی اور اڑتی۔ وہ پاپ کارن کے ٹکڑے اس نے کسی تبرک کی طرح اپنے پاس سنبھال رکھے تھے۔ دو دانے اس کے والٹ میں ہوتے تھے۔ گزرتے ماہ و سال نے ان کو سکھا دیا تھا مگر وہ موجود تھے۔

دور ایک ملے نوجوان کسی بھورے بالوں والی فارنر لڑکی کے ساتھ ساحل پہ چلتا آ رہا تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مگن تھے۔ یکا یک لڑکے کی نظر چٹان پہ کھڑے فاتح پہ پڑی تو اس کا منہ کھل گیا۔

"یہ وان فاتح ہے۔" بے یقینی سے بولا تو لڑکی نے ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کے اس جانب دیکھا' پھر ناک سکیڑی۔

"تم لوگ اس آدمی کے لئے اتنے پاگل کیوں ہو؟ کیا اس لیے کہ وہ وجیہہ اور خوبصورت ہے؟"

نوجوان نے برا منہ بنا کے اسے دیکھا۔ "وہ ایک اچھا اور ایمان دار سیاست دان ہے۔"

"ہمارے ملک میں اس طرح کے بہت سے سیاست دان ہوتے ہیں جو اتنے ہی نیچرل اور ایماندار ہوتے ہیں۔ اس آدمی میں ایسا کیا ہے جو تم لوگ اس سے اتنی محبت کرتے ہو؟ میں تمہیں جج نہیں کر رہی' صرف پوچھ رہی ہوں۔"

"پہلے اتنی محبت نہیں کرتے تھے۔ یہ اچھا لگتا تھا بس۔ لیکن پھر...." وہ بے تابی سے دور کھڑے تنہا آدمی کو دیکھ کے بتانے لگا۔ "پھر اس کی بیٹی کھو گئی۔ کچھ کہتے ہیں وہ صرف کھوئی ہے۔ کچھ کہتے ہیں شاید وہ مر گئی ہو لیکن لاش وغیرہ نہ ملی ہو۔ مگر سارا ملک جانتا تھا کہ یہ صوفیہ رحمن اور ان کے والد نے کروایا ہے۔ اس وقت ملک میں ویسے ہی انتشار پھیلا تھا۔ اگر وان فاتح چاہتا تو حکومت گرانے کے لئے سڑکوں پہ آتا' لوگوں کو اکٹھا کرتا' مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ڈیوائیڈنگ فورس نہیں بنا۔ اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ خود کو "مظلوم" بنا کے نہیں پیش کیا۔ وہ سروائیور بن کے سامنے آیا۔ اس نے بیٹی کے نام پہ ووٹ نہیں مانگے۔ سیاست دان اپنے خاندان کی اموات یا حادثوں کو کیش کرواتے ہیں ساری دنیا میں' مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے ملک کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ پھر کمیونسٹ پارٹی سے مذاکرات ہو گئے اور ملائیشیا میں امن ہو گیا۔ اس وقت سے لوگ اس کی دل سے عزت کرنے لگے ہیں۔"

"تو مذاکرات کے بعد اس نے کیس کو فالو کیوں نہیں کیا؟"

"ایسا نہیں ہوتا ہیلن۔ جب آپ ایک دفعہ وقار کا مظاہرہ کرتے ہو تو پھر تھوکے کو نہیں چاٹتے۔ جب

معاملہ جانے دیا تو جانے دیا۔
بہرحال اس دن کے بعد وہ مزید مقبول ہوتا گیا۔" پھر موبائل نکال کے بے قراری سے بولا۔" آؤ سیلفی لیتے ہیں اس کے ساتھ۔"
لڑکی مسکرادی اور وہ دونوں تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ لڑکی کے پاس ڈی ایس ایل آر کیمرہ تھا۔ وہ برابر فاتح کی تصاویر اتار رہی تھی۔ وہ اب پلٹ گیا تھا اور تصاویر پشت کی آرہی تھیں مگر وہ بناتی گئی۔
"سر.... السلام علیکم۔" پرجوش سا نوجوان قریب آیا اور اسے پکارا تو وہ پلٹا۔ پھر اسے دیکھ کے مسکرایا اور ہاتھ ملایا۔
"میں کریم ذوالکفلی ہوں' سر!"
"اچھا.... کیا کرتے ہو تم' کریم؟"
"سر میں پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہوں۔ اور یہ میری دوست ہے ہیلن جو کینیڈا سے آئی ہے۔" وہ جذبات سے گلابی پڑتا کہہ رہا تھا۔
"کیا ہم سیلفی لے سکتے ہیں۔"
"شیور۔" اس نے سر کو خم دیا اور وہ دونوں اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ وان فاتح نے ہاتھ سامنے باندھ لیے اور اسکرین میں دیکھ کے مسکرایا۔ لڑکا تصاویر اتارتا گیا۔ پھر جب اس نے کیمرہ نیچے کرلیا تو فاتح اس کی طرف گھوما۔
"تو تم پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہو۔ کس چیز میں؟"
"کیمسٹری میں' سر۔" خوشی سے بتایا۔
"کریم تمہیں معلوم ہے ہمارے ملک کو اس وقت سب سے زیادہ ضرورت کس چیز کی ہے؟"
نوجوان نے پہلے لڑکی کو دیکھا' پھر فاتح کو' پھر ذہن میں اس کی ساری تقاریر اور انٹرویوز دہرائے' اور جلدی جلدی بتانے لگا۔
"دھاندلی کے بغیر صاف شفاف انتخابات کی۔ اور.... اور کرپشن سے پاک مضبوط اداروں کی۔ اور حکمرانوں کے احتساب کی۔"
فاتح ایک دم کھل کے ہنس دیا۔
"کریم!" محظوظ انداز میں اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔" میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں اس وقت تم جیسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی سیاست میں ضرورت ہے.....!" پھر اس کا کندھا تھپکا اور مسکرا کے آگے بڑھ گیا۔
وہ دونوں لاجواب سے.... دم بخود اس کو جاتے دیکھ رہے تھے۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ توانا اور مضبوط آدمی اب ریت پہ دور جاتا دکھائی دے رہا تھا۔
"اسی لیے ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔" لڑکی نے نوجوان کو کہتے سنا تو سر کو جنبش دی۔ الفاظ ختم ہو گئے تھے۔
ساحل پہ چند سیاحوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور اب وہ دوڑ دوڑ کے اس کے پاس آرہے تھے۔ فاتح مسکرا کے تصاویر بنوانے رک گیا تھا۔ دوپہر کا سورج اب ڈھل رہا تھا۔

☆☆☆

بوکیت چائینہ (چینی پہاڑی) ایک اونچی پہاڑی تھی جو سیاحوں کا مسکن تھی۔ یہاں صدیوں پہلے چینی شہزادی 'یان سوفو' کا محل ہوا کرتا تھا اور ایک کنواں بھی جو اس کے لئے سن باؤ نے کھدوایا تھا۔ شہزادی یان سوفو چینی بادشاہ کی بیٹی تھی جسے اس کے باپ نے کنیزوں اور خادموں کے ساتھ ملاکہ کے سلطان مرسل سے شادی کرنے بھیجا تھا۔ سلطان نے ان کے آتے ہی یہ پہاڑی اور اس کے محلات چینی لوگوں کے لئے مختص کر دیے تھے۔ شہزادی سلطان سے شادی کر کے ملکہ بن گئی جبکہ اس کی کنیزوں اور باقی دستے نے مقامی لوگوں سے شادی کی اور یہیں آباد ہو گئے۔
وہ کنواں وانگ لی نے شہزادی کے لیے کھدوایا تھا۔ جب شہزادی سلطان سے شادی کے

لیے آئی تو بادشاہ نے وانگ لی کو بطور خاص چین سے ملاکہ شہزادی کے ہمراہ روانہ کیا تھا۔ کنواں اب ایک سیاحتی مرکز تھا اور کہتے تھے' جو اس میں ایک دفعہ سکہ اچھالتا ہے' وہ دوبارہ ملاکہ دوبارہ ضرور آتا ہے۔

تالیہ نے البتہ سکہ نہیں اچھالا تھا۔ وہ کنویں کے کنارے خاموش کھڑی تھی۔ گھٹنوں تک آتی فراک نما قمیص پہ منی کوٹ پہن رکھا تھا۔ ارد گرد سیاح گھوم پھر کے تصاویر اتار رہے تھے اور دوسری متبرک اشیاء دیکھ رہے تھے۔

''چے تالیہ۔'' ایڈم کی آواز پہ وہ پرسکون سی پلٹی۔

وہ سادہ سا ملے لڑکا سامنے کھڑا تھا۔ عام سی پینٹ شرٹ پہنے' چہرے پہ سفر کی تھکان' آنکھوں میں سنجیدگی۔ تالیہ سے عمر میں چار پانچ سال چھوٹا ہی ہوگا۔ اسے اس پہ غصہ نہیں آیا۔ بس کندھے اچکا کے بولی۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''میرے پاس سکہ ہے۔ آپ کے پاس دوسرا ٹکڑا۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''تم مجھے سکہ دے دو۔ میں سرکار سے تمہیں بونس دلوادوں گی۔''

''یعنی آپ واقعی رائل ملائیشیا پولیس کی آفیسر تاشہ ہیں۔'' اس نے شک و شبہ سے آنکھوں کی پتلیاں سکیڑیں۔

''ہاں ایڈم اور وان فاتح کی حفاظت کے ساتھ ساتھ' مجھے اس خزانے کو بھی ڈھونڈنا ہے جس کی وجہ سے لوگ فاتح صاحب کے پیچھے پڑے ہیں۔'' وہ پراعتماد تھی۔ لہجہ بھی نرم تھا۔ ایڈم کا یقین ڈانواڈول ہونے لگا۔

''اور خزانہ کہاں جائے گا؟''

''سرکار کی امانت ہے تو ظاہر ہے سرکار کے پاس جائے گا۔ مگر خزانہ ڈھونڈنے پہ ہمیں انعام میں معاوضہ بھی ملے گا۔''

''تو مزید کوئی آفیسر کیوں نہیں ہے آپ کے ساتھ؟''

تالیہ کے ماتھے پہ سلوٹ پڑی۔ وہ دو قدم قریب آئی اور آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا۔

''اول تو مجھے کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہیں' اور دوم۔ مجھے کسی دوسرے پہ اعتبار نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ کوئی بھی آفیسر لالچ میں میری جان لے کر خزانے کے ساتھ فرار ہو سکتا ہے۔''

''اور آپ خود بھی تو یہ کام کر سکتی ہیں۔''

''اگر کر سکتی ہوتی تو اتنا بڑا کیس مجھے میرے سینئرز دیتے؟'' وہ ترکی بہ ترکی جوابات دے رہی تھی۔ ایڈم چپ ہو گیا۔ دونوں کنویں کے پاس آمنے سامنے کھڑے تھے اور ان کے اوپر آسمان پہ سورج ڈھلتا دکھائی دے رہا تھا۔

''میں سکہ دے دوں گا' مگر آپ مجھے خزانے کی جگہ پہ ساتھ لے جائیں گی۔ ہم دونوں خزانہ ایک ساتھ ڈھونڈیں گے۔ اور پھر سرکار کے حوالے کر دیں گے۔'' وہ سوچ کے بولا۔ ساتھ تھوک بھی نگلا۔ اندر کہیں وہ اس لڑکی کے رعب میں بھی تھا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے' میں خود سب کچھ کر لوں گی۔ بس تم مجھے سکہ دو۔''

''چے تالیہ.... اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ پہ اعتبار کروں تو آپ کو بھی مجھ پہ اعتبار کرنا ہوگا۔''

''مجھے تم پہ اعتبار ہے' ایڈم!'' تالیہ نے لہجہ نرم کیا۔ اسے احتیاط سے کام لینا تھا۔

''مجھے کیسے معلوم کہ آپ سکہ لے کر فرار نہیں ہو جائیں گی؟''

''میں کیا کروں جو تم میرا اعتبار کرو؟''

''آپ چابی کا دوسرا حصہ مجھے دے دیں۔''
تالیہ کا تو مانو سر ہی گھوم گیا''۔کیا مطلب؟ کیوں دے دوں؟ دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟''
''میں کچھ دیر ان دونوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں تاکہ یہ دیکھ لوں کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے پہ اعتبار ہے یا نہیں۔''
''اور تم جو چابی لے کر بھاگ جاؤ؟''
''سچ تالیہ' میں سچا انسان ہوں۔ دھوکا نہیں دوں گا آپ کو۔ لیکن اگر آپ مجھے چابی نہیں دے سکتیں تو میں کیسے یقین کروں کہ خزانے کا انعام مجھے دیں گی؟''
اس بات پہ وہ چپ ہوگئی۔
''میں ابھی اس سکے کے ساتھ تھانے جا رہا ہوں۔ لیکن اگر آپ مجھے چابی کا دوسرا حصہ تھما دیں تو میں کسی اور کے پاس نہیں جاؤں گا۔ آپ کی اگلی کال کا انتظار کروں گا۔ ہم اکٹھے خزانہ ڈھونڈنے جائیں گے۔''
''اگر تم کسی تھانے گئے تو میرا پراجیکٹ فیل ہو جائے گا۔ بہت سے لوگ انوالوڈ ہو جائیں گے۔ اوپر والے مجھ سے خفا ہوں گے۔ جاب کے بھی کچھ پروٹوکولز ہوتے ہیں' ایڈم۔'' وہ چڑ گئی۔ کیا چیز تھا یہ لڑکا؟ اسے گھمائے جا رہا تھا۔
''میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ چابی آپ نے مجھے دے دی تھی۔ مگر میرا اعتبار کمانے کے لیے آپ کو یہ کرنا ہوگا ورنہ سکہ میں نہیں دوں گا۔''
وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔ وہ سکہ چرا نہیں سکتی تھی۔ زبردستی چھین بھی نہیں سکتی تھی۔ ایڈم کو وہ سکہ اپنی رضامندی کے ساتھ تالیہ کو دینا تھا۔ اب وہ کیا کرے؟ ایڈم کو نہیں معلوم خزانہ فاتح کے گھر میں ہے۔ اور اس کا خواب.... اس کے مطابق وہ دونوں اکٹھے خزانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ یعنی اسے اب اپنے خواب کے آگے ہتھیار ڈالنے ہوں گے۔ اسے ایڈم کے ساتھ خزانہ شیئر کرنا ہوگا۔
''ٹھیک ہے۔ میں خزانے کی جگہ پہنچ کے تمہیں بلا لوں گی۔ تب تک تم اس چابی کو رکھ سکتے ہو۔'' اس نے پرس میں ہاتھ ڈالا اور سنہری زنجیر میں پروئی ڈلی نکال کے اس کی طرف بڑھائی۔ ''لیکن یاد رکھنا' اگر تم اس کو لے کر بھاگے تو میں تمہارا وہ حشر کروں گی تم یاد رکھو گے۔''
''میں دھوکے باز نہیں ہوں۔ امانت لوٹا دوں گا۔'' اس نے زنجیر تھام لی۔ تالیہ کا دل ڈوب کے ابھرا مگر اسے رسک لینا تھا۔
''مگر یاد رکھنا۔ تم دونوں حصوں کو آپس میں نہیں جوڑو گے۔ یہ کام میں خود کروں گی۔ سنا تم نے ایڈم؟ تم چابی کو نہیں جوڑو گے۔'' تنبیہ کرتے ہوئے اس نے بریسلیٹ چھوڑ دیا۔
''میں وعدہ کرتا ہوں' میں اسے نہیں جوڑوں گا۔'' اس نے احتیاط سے اسے اپنی جیب میں ڈال دیا۔
''تم مجھے جھوٹا کہتے ہو نا' ایڈم۔ چلو آج میں تمہاری کچی زبان پہ بھروسہ کر کے دیکھتی ہوں۔ رات کو میں تمہیں جہاں بلاؤں' وہیں آ جانا۔''
ایڈم نے سر کو خم دیا۔ وہ آگے بڑھنے لگی تو وہ بول اٹھا۔
''آپ یان سوفو کے کنویں میں کوئی سکہ نہیں اچھالیں گی؟ کہتے ہیں اگر دوبارہ ملاکہ آنا ہے تو سکہ اچھالنا ہوگا۔''
وہ رکے بغیر بے گانگی سے بولی۔ ''میں دوبارہ ملاکہ آنا ہی نہیں چاہتی۔ یہ کیس ختم ہو تو میں ریٹائرڈ ہو جاؤں گی۔ دور کسی جزیرے پہ گھر بناؤں گی۔ بس۔'' اور اس کے قریب سے گزر کے آگے بڑھ گئی۔
کار میں واپس بیٹھتے ہی اس نے موبائل نکالا اور اسکرین پہ چند بٹن دبائے۔

ایڈم کی جیب میں جو ننھا سا جی پی ایس ٹریسر اس نے ڈالا تھا' وہ آن ہو گیا تھا۔ وہ جہاں بھی جائے گا' تالیہ کو معلوم ہوتا رہے گا۔ وہ کسی تھانے یا کسی مشتبہ ایڈریس پہ جائے گا تو وہ جان جائے گی۔ اس سے زیادہ کچھ بھی اس کے ہاتھ میں نہ تھا۔ جو چابی اتنے برس بعد بھی گھوم پھر کے اس کے پاس آ گئی تھی' ایڈم اس کو اس سے نہیں چھین سکتا تھا۔

سوچوں میں گم اس نے کار اسٹارٹ کی۔

اس کا بیک پیک فرنٹ سیٹ پہ خاموش رکھا تھا۔ اندر کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ تالیہ نے رکھی ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

شام ڈھل گئی اور ملاکہ پہ رات اتر آئی۔

سن باؤ کے گھر والی گلی میں رات کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ بتیاں جگمگانے لگیں اور گاہکوں کا رش ریستورانوں کے برآمدوں میں بڑھتا گیا۔ ایسے میں سڑک کنارے ایک کیفے کے باہر تالیہ مراد اخبار چہرے کے سامنے پھیلائے بیٹھی تھی۔ بیک پیک ساتھ رکھا تھا اور بار بار اخبار کا کونا موڑ کے سن باؤ کے گھر کو دیکھتی تھی۔

گھر کا دروازہ بند تھا اور باہر فاتح کی کار کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی واپس آیا تھا اور تالیہ کو امید تھی کہ اب وہ کوالالمپور جانے کے لیے نکل جائے گا۔ صبح پارلیمان کا اجلاس تھا اور فاتح کو لازمی وہاں پہنچنا ہو گا۔

بالآخر دروازہ کھلا اور وان فاتح سفری بیگ سمیت باہر آتا دکھائی دیا۔ اسی سفید شرٹ کے آستین کہنیوں تک چڑھائے وہ عجلت میں لگ رہا تھا۔ پھر اس کی کار زن سے تالیہ کے ساتھ سے گزر گئی تو اس نے سکون کی سانس خارج کی۔

اب اسے تھوڑی دیر مزید انتظار کرنا تھا جب گلی میں رش ختم ہونے لگے.... اور وہ اندر جا سکے۔ آج واردات کی رات تھی۔ راستہ صاف تھا۔ اس نے اخبار نیچے کیا اور ویٹر کو آرڈر لکھوانے لگی۔ ہاٹ چاکلیٹ۔

وان فاتح ڈرائیو کرتے ہوئے چند گلیاں آگے آیا تھا کہ موبائل بجنے لگا۔ اس نے ڈیش بورڈ سے فون اٹھا کے دیکھا۔ ایڈم کا نمبر جل بجھ رہا تھا۔ جانے کس وقت ایڈم نے اپنا نمبر اس کے فون میں فیڈ کیا تھا۔ اب وہ ملازم نہیں رہا تھا تو یقیناً اگلی نوکری کی بات کرنا چاہتا ہو گا۔ اس سے نہیں ہوتے تھے یہ کام۔ بے زاری سے اس نے فون پرے ڈال دیا۔

وہ دوبارہ بجنے لگا۔ اب کے اس نے برہمی سے موبائل اٹھایا تو دیکھا' اس کا پیغام آیا ہوا تھا۔ فاتح نے کار کی رفتار آہستہ کی اور پیغام کھولا۔

''سر' میں ملاکہ میں ہوں۔ آپ کے گھر کے قریب۔ مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔ چے تالیہ کے بارے میں۔ پلیز مجھ سے مل لیں۔''

فاتح کی آنکھیں پرسوچ انداز میں چھوٹی ہوئیں۔ کال دوبارہ آنے لگی تو اس نے فون اٹھا لیا۔

''ہاں ایڈم.... بولو۔''

''سر.... میں جونکر اسٹریٹ پہ ہوں۔ کیا ہم مل سکتے ہیں؟'' وہ بے قراری سے بولا۔

''ایڈم مجھے لمبا سفر کرنا ہے' تم....''

''سر آپ مجھے اتنا تو جانتے ہیں نا کہ اس بات پہ یقین کر سکیں کہ میں آپ کو کسی بے کار کام کے لیے نہیں روکوں گا۔'' وہ جلدی جلدی کہہ رہا تھا فاتح نے گھڑی دیکھی۔

''میں جونکر اسٹریٹ کے کارنر تک آ رہا ہوں۔ میرے پہنچنے تک اگر تم پہنچ جاؤ تو ٹھیک' ورنہ میں آگے نکل جاؤں گا۔''

''میں ابھی آیا۔'' شاید وہ فوراً بھاگ اٹھا تھا۔

فاتح نے رفتار آہستہ کی اور گاڑی آگے بڑھادی۔
دس بجنے والے تھے.....
واپس سن باؤ کے گھر والی گلی میں آؤ تو تالیہ کا ہاٹ چاکلیٹ کا گلاس ان چھوا رکھا تھا اور چونکی نظریں سرخ گھر کے دروازے پہ جمی تھیں...
پھر اس نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑی ہوئی.....
چوک پہ فاتح نے کار ایک طرف روکی' پھر اے سی فل کھول دیا اور گھڑی دیکھی۔ وہ چند منٹ ایڈم کی بات سننے رک سکتا تھا۔ خیر ہے۔
مگر دو منٹ بھی نہیں گزرے جب فرنٹ ڈور پہ دستک ہوئی پھر ایڈم تیزی سے اندر بیٹھا۔
''سر' میں جانتا ہوں آپ سوچ رہے ہوں گے ا....''
''پہلے سانس لو' ایڈم۔'' اس نے آرام سے کہا تو ایڈم رکا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ خود پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ پھر وقت ضائع کیے بغیر وہ بولنے لگا۔ ''سر.... کیا آپ اس کو پہچانتے ہیں؟''
ایڈم نے جیب سے دونوں چیزیں نکال کے اس کے سامنے رکھیں۔ فاتح نے چونک کے دیکھا۔ ایک عصرہ کا بریسلیٹ تھا اور دوسرا سکہ۔ اس نے بھنویں اچنبھے سے اچکائیں۔
''یہ کیا ہے؟''
''سر! یہ مجھے چے تالیہ نے دیا ہے۔''
فاتح کے ماتھے پہ بل پڑے' اس نے بریسلیٹ اٹھایا اور الٹ پلٹ کے دیکھا۔ ''یہ عصرہ کا ہے۔''
''سر.... یہ اور سکہ ملا کر.... چابی بن جاتا ہے۔ یہ چابی....'' وہ ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ فاتح نے سکہ اٹھایا' اور اس کو ٹیڑھا کیا۔ سوراخ نظر آیا تو اس نے ڈلی کو اندر ڈال دیا۔ ہلکی سی کلک کی آواز آئی اور چابی مکمل ہوگئی۔ ایک لمحے کو وہ تیز چمکی اور پھر ٹھنڈی پڑ گئی۔
وہ لمحہ امر ہوگیا.....
''نہیں سر.... یہ جوڑنی نہیں تھی۔'' ایڈم فکر مند ہوا۔ ''چے تالیہ نے منع کیا تھا؟''
''مجھے مت بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ' یہ اس لڑکی کے پاس کیسے آیا؟''
وہ بھنویں بھینچے اس چابی کو الٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا۔ اس پہ ہندسے ابھر رہے تھے۔ 1437-
''آپ چے تالیہ کو تاشہ اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ ان کا اصل نام ہے؟ کیا وہ کوئی پولیس آفیسر ہیں؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔
''نہیں۔'' وہ چونکا۔ ''وہ ایک زمانے میں تھیٹر کی کوئی ایکسٹرا ایکٹرس ہوا کرتی تھی اور اس نام کا ایک کردار کرتی نظر آئی تھی۔''
ایڈم کا منہ کھل گیا۔
''تو وہ.... واقعی.... پولیس آفیسر نہیں ہیں؟''
فاتح نے بھنویں بھینچے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ''مجھے شروع سے بتاؤ یہ سب کیا چل رہا ہے۔''
کار سڑک کنارے کھڑی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف ترچھے ہوئے بیٹھے تھے۔
ایڈم نے تھوک نگل کے خشک گلا تر کیا اور بولنا شروع کیا۔
سچ سچ۔ سب کچھ۔

باقی آئندہ ماہ' اِن شاءاللہ

میکے کا مان

ناظمہ زیدی

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔" تالیوں اور دعاؤں کے شور میں کیک کاٹا تو اسجد نے اوپر لگے رنگین غباروں کو ہاتھ بڑھا کر پھوڑ ڈالا۔ رنگوں کی برسات میں سب نہا سے گئے۔ رنگین چھوٹی چھوٹی کترنیں فضا میں ادھر ادھر بکھر گئیں، اس کا ایک سالہ منا کلکاریاں مارنے لگا۔ دادو، چچا، چچی، اسجد اور فضا سب نے گفٹ دیے۔ اسے گفٹس کا کیا پتا، ہاں مگر فضا بہت خوش تھی، اس



کی خوشی خاک ہوئی' جب اس نے آتش فشاں بنی روزینہ باجی کو دیکھا۔ سب ایک دم استقبال کو آگے بڑھے۔

"آؤ آپا' آگے آؤ' رک کیوں گئیں۔"

"ارے بس۔۔۔ بس۔۔۔ رہنے دو۔" آپا نے سب کو پرے دھکیلا اور اماں کے گلے سے لگ کر پھپک پھپک کر رو دیں۔

"کیا ہوا چندا؟" اماں نے ان کے بال سنوارے۔

"اماں! دیکھا آپ نے' کیسے میرے اکلوتے بھتیجے کی سالگرہ اکیلے ہی اکیلے کرلی' مجھے بتانا بھی ضروری نہ سمجھا' ارے میں کیا نظر لگا دیتی۔" انہوں نے روتے ہوئے جواب دیا۔

اماں نے ایک شرربار نگاہ سب پر ڈالی اور روزی باجی کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

پھر کیسا کیک اور کہاں کا کھانا' سب وہیں کا وہیں دھرا رہ گیا۔

فضا نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا۔

"ارے آپا' میری پیاری آپا۔ بھلا آپ کے بغیر سالگرہ ہوسکتی تھی۔ صبح سے آپ کو فون کر رہا ہوں۔ مگر نمبر بند جا رہا ہے آپ کا۔" اسجد نے موبائل نکالا اور ان کے سامنے ڈائل کیا۔ نمبر بند ہونے کی اطلاع دی جا رہی تھی۔

"رات سے آپ کو میسج کر رہے ہیں کہ شاید غلطی سے فون پاور آف ہوگیا ہو' میسجز دیکھیں گی تو آجائیں گی۔" اسجد نے وضاحت کی۔

آپا کو یاد آیا کہ موبائل تو ان کے میاں نے پرسوں رات دیوار پہ مار کے توڑ دیا تھا' تو نمبر کہاں سے آن ہوتا۔ روزی آپا کچھ ٹھنڈی پڑیں۔

"ہاں۔۔۔ مگر گھر تو آسکتے تھے۔" آپا نے آنسو صاف کیے۔

"آپا مجھے کیا پتا کہ آپ کا موبائل خراب ہے' ورنہ میں گھر آجاتا۔" اسجد نے کہا۔

"مجھے پتا تھا' یہ نئی نئی یونی ورسٹی جانے والی لڑکیاں ایسے ہی لڑکوں کو پھانستی ہیں۔ اسی نے دور کیا ہے تمہیں ہم سے۔" آپا نے مزید گل افشانی کی۔

"نہیں آپا' فضا ایسی بالکل نہیں ہے' آجاؤ فضا۔" اسجد فضا کا آنچل دیکھ چکا تھا۔ فضا نروس سی اندر آئی۔

"سوری آپا!" فضا کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوچکے تھے۔ اس کی اور اسجد کی لو میرج تھی۔ سسرال کے حوالے سے بے پناہ خدشات تھے اس کے دل میں اور ڈر بھی۔

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ اب بس کرو' جاؤ روزی کے لیے کچھ کھانے کو لے کر آؤ۔"

اماں نے دونوں میاں' بیوی کی جان بخشی کی تو آپا پھیل کر اماں کے ساتھ لیٹ گئیں اور اماں کو دونوں بہوؤں کو قابو کرنے کے گر سکھانے لگیں۔



بڑی بھابھی تو اس ماحول کی عادی ہوچکی تھیں' مگر فضا نئی نئی آئی تھی اور دوسرے ان چاہی بہو کا لیبل بھی تھا' سو بے چاری سب کو راضی کرنے کے چکر میں بھاگی پھرتی۔ وہ پڑھی لکھی' صاف دل کی لڑکی تھی۔ اسجد سے بے حد محبت بھی کرتی تھی' سو چاہتی تھی کہ سب مل جل کر رہیں۔ بھابھی سے تو اس کی خاصی دوستی ہوچکی تھی۔ اماں بھی نارمل مزاج کی تھیں' عام طور پر کچھ نہ کہتیں' ہاں مگر جب جب روزی آپا آتیں' گھر کا ماحول خراب ہو جاتا۔ وہ معمولی باتوں کا بہانہ بنا کر رونا شروع کر دیتیں۔ دونوں بھائی اور بھابھیاں چور سی ہو جاتیں۔ بچے بھی اس ٹینشن زدہ ماحول میں سہمے سے رہتے۔

ابھی پچھلے اتوار کی بات ہے' آپا اپنے دونوں سپوتوں کے ہمراہ آئی ہوئی تھیں۔ آپا کی فطرت کے برعکس دونوں بچے بہت تمیزدار تھے۔ آرام سے کسی ممانی کے کمرے میں ٹی وی دیکھتے رہتے بلکہ حنا' ثنا (بڑے بھائی کی) اور منے کو بھی ساتھ لگائے رکھتے۔

کچن سے "ٹھاہ" کی آواز آئی۔ بڑی بھابھی جو

کپڑے دھو رہی تھیں اور فضا اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے لیٹی تھی' بھاگی ہوئی آئیں۔ دیکھا تو سامنے آپا' سلیم کے ہاتھ پر چھڑیاں برسا رہی ہیں' وہ سہا ہوا کھڑا ہے۔

"بول اب کرے گا چوری؟" وہ بے چارہ روتا اور نفی میں سر بھی ہلاتا جاتا۔

"کیا ہوا آپا؟ کیا چوری کرلیا؟"

بڑی بھابھی اور فضا حیران کہ کچن میں ایسا کیا تھا جو چوری کیا جاتا۔

"ارے روٹی چرا کر کھا رہا تھا' چل اماں کے پاس۔" وہ کان سے پکڑ کر اماں کی عدالت میں لے گئیں۔

اصل میں فضا امید سے تھی' ڈاکٹر نے اسے بیڈ ریسٹ کا بتایا تھا' کیونکہ منے کی پیدائش کے وقت بھی اس کے ہاں کافی پیچیدگی ہوگئی تھی اور وہ کمزور بھی بہت تھی۔ سو اس کے میاں نے پروین (کام والی) کے دس' بارہ سالہ بیٹے سلیم کو رکھ چھوڑا تھا جو اسکول سے آنے کے بعد چھوٹے موٹے کام نپٹا دیتا اور اتوار کا دن بھی ادھر ہی گزارتا' مگر برا وقت بتا کر تھوڑا ہی آتا ہے۔ فضا کو کمزوری محسوس ہوئی تو اس نے سلیم سے گلوکوز لانے کو کہا۔ اماں کی عدالت میں پیشی لگی تھی۔ فضا حسب روایت دروازے سے باہر کھڑی تھی۔ بھابھی ہی اس کی مدد کو آگے بڑھیں۔

"کوئی بات نہیں آپا! بچہ ہے' اگر روٹی لے بھی لی تو کیا ہوا؟"

بھابھی اور فضا' سلیم کو اپنے بچوں کی طرح ہی سمجھتیں' سو اسے ہدایت تھی کہ وہ فریج سے جو دل چاہے نکال کر کھالے۔

"ارے ایسے کیسے لی' جب میں بڑی کچن میں موجود تھی تو اسے چاہیے تھا کہ مجھ سے پوچھتا۔" آپا کسی صورت ماننے کو تیار نہ تھیں۔ "آج روٹی چرائی ہے' کل کو زیور چرائے گا۔" آپا نے ایک اور ڈر اماں کے دل میں ڈالا۔

"آپا کیوں چرائے گا' پروین برسوں سے یہاں کام کر رہی ہے۔"

"اسے ابھی کے ابھی نکالو' مجھے دوبارہ یہ لڑکا نظر نہ آئے۔"

بڑی بھابھی باہر نکلیں تو ان کی نظر زرد رنگت لیے کانپتی ہوئی فضا پر پڑی۔ اسے لے کر کمرے کی طرف چلیں۔

"جب میرے ہاں عقیل' شکیل ہونے والے تھے تو ساس نے گھر میں بھینس رکھ چھوڑی تھی کہ بی بی ان کا کام بھی نپٹاؤ۔"

آپا کی آواز کمرے سے باہر آرہی تھی اور فضا تھکے تھکے قدموں سے کمرے کی طرف چل پڑی۔



"اماں کو گزرے چھ ماہ ہوچکے تھے۔ بھابھیوں کا کڑا وقت اب ختم ہوا چاہتا تھا اور آپا کا اچھا۔ آج اتوار تھا اور آپا حسب روایت گھر میں موجود تھیں۔ کمروں میں اٹھا پٹخ جاری تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" آپا آگے بڑھیں اور رعب سے بولیں۔

"آپا! بچیوں کا پانچویں کا بورڈ کا امتحان ہے' وہاں تیاری میں مشکل ہوتی ہے سو یہ اماں کا کمرہ انہیں دے دیا ہے۔"

بھابھی نے پہلے کے برعکس خود اعتمادی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ آپا خاموشی سے اماں کا پلنگ نکالتے اور بچیوں کے بیڈ لگتے دیکھتی رہیں۔

"خیر ابھی بھائی آتے ہیں تو انہیں بتاتی ہوں۔ اب اتوار کے روز میں آؤں گی تو کہاں رہوں گی۔"

آپا یہ سوچتی رہیں اور کچن کے کام نپٹاتی رہیں۔ آپا لاکھ سخت سہی' مگر یہ بھی سچ ہے جب بھی آتیں' کھانا بناتیں' کچن کے فالتو کام بھی نپٹا جاتیں۔ وہ یخنی چڑھانے کے لیے برتن ڈھونڈ رہی تھیں۔ جب انہوں نے اپنے پیچھے فضا کی آواز سنی۔

"آپا' پلاؤ مت بنائیے گا' اسجد فرائیڈ رائس کا کہہ

رہے تھے' انہیں میرے ہاتھ کے رائس بہت پسند ہیں۔" فضا نے آتے ہی کام سنبھال لیا۔

"اچھا چلو' میں میٹھا بنالیتی ہوں۔" آپا کی مسکان بہت پھیکی تھی۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" فضا نے لاتعلقی سے کاندھے اچکائے اور جلدی جلدی کام کرنے لگی۔

آپا نے میٹھا بنایا تو ساتھ ہی رول کا مسالا بھی تیار ہونے رکھ دیا۔ میٹھا تیار ہونے تک آپا رول بھی بنا چکی تھیں۔ اسی دوران فضا اپنا اور اسجد کا کھانا لے کر کمرے میں چلی گئی کہ اسجد کی طبیعت خراب ہے تو وہ اندر اے سی میں ہی کھانا کھائیں گے۔

آپا سب کام ختم کرکے باہر نکلیں تو دیکھا کہ کمروں کے دروازے بند اور لاؤنج سنسان پڑا تھا۔

آج سے پہلے تک اتوار کے روز سب اکٹھے کھانا کھاتے' پھر اماں کے کمرے میں محفل لگتی۔ آپا اماں کو یاد کرکے روتی رہتیں اور بھائی دلجوئی میں لگے رہتے۔ دوپہر اسی طرح گزرتی' شام میں آپا سب کے لیے چائے بناتیں اور ایک بار پھر اماں کی یاد میں آنسو بہائے جاتے کہ اماں کو چائے بہت پسند تھی۔

آپا گرم تپتے لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ پنکھے کی گرم ہوا تھپڑ کی طرح منہ پر لگتی تھی۔ اتنے میں اسجد اپنا چارجنگ پہ لگا موبائل لینے باہر نکلا تو آپا نے اسے پکارا۔

"اسجد! تمہیں پتا ہے جب تم چھوٹے سے تھے تو بیمار ہوگئے' پھر میں نے تمہیں....."

"ہاں آپا پتا ہے۔ شام کو بات کریں گے۔ بہت تھکا ہوا ہوں۔ آپ بھی لیٹ جایئے بچیوں کے کمرے میں۔"

یہ کہہ کر اسجد دوبارہ ٹھنڈے ٹھار کمرے میں بند ہوگیا۔ آپا اٹھ کر اماں کے کمرے کی طرف چل پڑیں۔

"پھوپھو پلیز' لائٹ بند کردیں' ہمیں نیند نہیں آتی۔"

دونوں بچیاں بیک وقت چلائیں' وہ دروازہ بند کرکے چپکے سے باہر آگئیں اور بھلا ان کے منے منے سے بیڈوں پہ جگہ ہی کہاں تھی۔ وہ لاؤنج کا دروازہ بند کرکے باہر صحن میں آبیٹھیں۔ درخت کے نیچے اماں کا تخت پڑا تھا۔ جابجا پتے اور پرندوں کی گندگی پڑی تھی۔ دھندلی آنکھوں سے اسے صاف کیا اور اس پہ جا بیٹھیں۔ ٹھنڈا ہوا چلنے لگی تو ان کی آنکھ لگ گئی۔

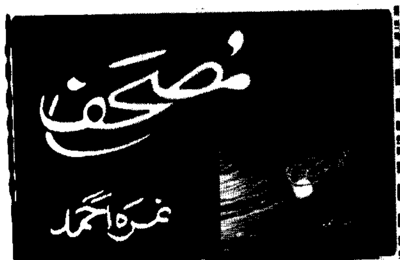
"اماں! اماں! اٹھو نا اماں!" انہوں نے آنکھیں کھولیں تو عقیل ان کا کندھا ہلا رہا تھا۔

"اماں گھر چلو' بھوک لگی ہے۔" عقیل نے کہا تو وہ جلدی سے چپل پہن اور دوپٹا ٹھیک کرکے چلنے کو تیار ہوگئیں۔

عقیل اور شکیل ٹیوشن جاتے تھے اور ٹیوشن سے فارغ ہوکر وہ نانی کے گھر کھانا کھانے آتے۔ آج دونوں آئے تو اماں کو تخت پہ لیٹے دیکھ ساری کہانی سمجھ گئے۔

عقیل نے شکیل کو رکشے پہ گھر روانہ کیا اور ماں کو لے کر بائیک پہ بیٹھ گیا۔ اماں بھی بغیر ایک لفظ کہے موٹر سائیکل پر جا بیٹھیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات گردش کررہی تھی کہ اگر اماں کی زندگی میں وہ بھاوجوں کو محکوم بنا کر رکھنے کے بجائے دوست بنا کر رکھتیں تو شاید آج حالات کچھ اور ہوتے۔ بائیک ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوئی تو انہوں نے عقیل کا کندھا پکڑلیا۔ ان کے جوان ہوتے بیٹے' ان کا غرور ان کا فخر تھے۔ آپا نے گردن موڑ کر نم آنکھوں سے اماں کے لحہ بہ لحہ چھوٹے اور دور ہوتے گھر کو دیکھا۔ "کہ میکے کا مان آج ختم ہوا۔"







رنگوں کی بارشوں میں بھی سادہ ہی رہ گیا
دل کا اک اپنا ڈھنگ تھا، ویسا ہی رہ گیا

منظر سبھی بکھر گئے پہلی کرن کے ساتھ
میں اپنے خوابِ عمر میں تنہا ہی رہ گیا

دشتِ ہوس میں فرصتِ تعمیر بھی گئی
دل میں بس اک دیار کا نقشہ ہی رہ گیا

تھا دُور جیسے جھومتے باغوں کا ایک شہر
میں فاصلوں کی ریت پہ چلتا ہی رہ گیا

دُھندلے سے حرف چہرے پہ اس نے نہیں پڑھے
اک نامہ اس کے نام کا لکھا ہی رہ گیا

افتخار بخاری

اہلِ دل اور بھی ہیں

کیا ہوا اگر میرے یاروں کی زبانیں چپ ہیں
میرے شاہد، میرے یاروں کے سوا اور بھی ہیں

اہلِ دل اور بھی ہیں، اہلِ وفا اور بھی ہیں
ایک ہم ہی نہیں دُنیا سے خفا اور بھی ہیں

ہم ہی پہ ختم نہیں مسلکِ شوریدہ سری
چاکِ دل اور بھی ہیں، چاکِ قبا اور بھی ہیں

سر سلامت ہے تو کیا سنگِ ملامت کی کمی
جان باقی ہے تو پیکانِ قضا اور بھی ہیں

منصفِ شہر کی وحدت پہ نہ حرف آجائے
لوگ کہتے ہیں کہ اربابِ جفا اور بھی ہیں

ساحر لدھیانوی

شگفتہ چاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

" اے ابوذر! جب تو شوربا پکائے تو اس میں پانی زیادہ رکھ اور اپنے ہمسائے کی خبر گیری کر۔"
(یعنی انہیں سالن میں سے تحفہ بھیج)
(صحیح مسلم)

حضرت علیؓ کی تعریف

حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا۔

" حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی نے ان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ کہا تھا۔

" ابا جان! انہیں (حضرت موسیٰ علیہ السلام کو) اجرت پر ملازم رکھ لیں۔ جس سے اجرت پر کام لیں ان میں سے بہتر وہ ہے جو قوی اور امین ہو۔"

پھر حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

" ایسے قوی اور امین آپؓ ہیں۔"

حضرت معاذ بن جبلؓ نے فرمایا

تین کام ایسے ہیں جو انہیں کرے گا، وہ اپنے آپ کو نفرت اور بیزاری کے لیے پیش کرے گا۔ یعنی لوگ اس سے بیزار ہو کر نفرت کریں گے۔

1۔ بغیر تعجب کی بات کے ہنسنا۔
2۔ بغیر جاگے رات بھر سونا۔
3۔ اور بغیر بھوک کے کھانا۔

تنگ نظر قوم

مولانا محمد علی جوہر کہتے تھے۔

" یقیناً ہندو جاتی سارے عالم میں اپنی تنگ نظری میں نمایاں ہے۔ دنیا بھر میں کسی قوم نے اس تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ خود اپنے ہی فرقوں کو اچھوت سمجھا ہو۔"

عائشہ۔ کراچی

پہلا ایڈیشن

جرمنی کے عظیم فلسفی شوپنہار کی ماں اوسط درجے کی ناول نگار تھی۔ شوپنہار کو اپنی ماں کے عامیانہ سے ناول قطعی پسند نہیں تھے۔ دوسری طرف اس کی ماں بھی خالص فلسفے کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی تھی۔ ایک دن ماں اور بیٹے میں اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ماں شوپنہار کی سنجیدہ تحریروں کی واضح مخالفت کرنے لگی۔ شوپنہار برہم ہو گیا۔

" ماں!" اس نے وثوق سے کہا۔" جب تمہارے ناولوں کا نام و نشان نہیں رہے گا، میری کتاب اس وقت بھی موجود ہو گی۔"

" ظاہر ہے۔" ماں نے جواب دیا۔" تمہاری کتاب کا پہلا ایڈیشن کبھی ختم نہیں ہو گا۔"

ماں پر رحم

اگر اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام کی قوم میں سے کسی پر رحم کرتا تو وہ ایک بچے کی ماں ہوتی۔

نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو برس تک تبلیغ کرتے رہے لیکن قوم نے ان کی ایک نہ سنی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا اور ان پر پانی کا عذاب بھیجا۔ جب پانی چڑھا تو ایک بچے کی ماں خوفزدہ ہو کر پہاڑ پر چڑھ گئی۔ جب پانی وہاں بھی پہنچ گیا تو پہاڑ پر مزید چڑھی۔

پانی وہاں بھی پہنچ گیا تو ماں نے اپنے بچے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا۔ پانی اسے اپنے ساتھ بہا کرلے گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس دن کسی پر رحم کرتا تو وہ بچے کی ماں ہوتی۔

ہاتھوں کی چند دلچسپ حرکات

ہر مصافحہ کرتے وقت جو لوگ دوسروں کے ہاتھوں کو زور سے دباتے کے عادی ہوتے ہیں، وہ عام طور پر روزمرہ زندگی میں طاقت، زور، زبردستی اور سخت گیری کے عادی ہوتے ہیں۔

ہر جس انسان کے ساتھ مصافحہ کے دوران گرفت مضبوط محسوس ہو، وہ گرم جوش اور خوش اخلاق ہوتا ہے۔

ہر مصافحے کے دوران جو لوگ اپنے مدمقابل کا ہاتھ پوری طرح تھامے بغیر انگلیوں کے لمس سے ہی ہر مرحلہ طے کر دیتے ہیں، وہ یا تو خود کو کم تر سمجھتے ہیں یا لاتعلق رہنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ خود پسند اور انا پرست ہوتے ہیں۔

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ گلستان جوہر

شائستگی

گاڑی چلاتے ہوئے ایک خاتون کو ٹریفک سارجنٹ نے اشارے سے روکا اور قریب آکر پوچھا۔

"محترمہ! آپ کا کب تک گھر سے باہر رہنے کا ارادہ ہے؟"

"کیا مطلب! یہ سوال تم کیوں کر رہے ہو؟" خاتون نے برہم ہو کر پوچھا۔

"خاتون! میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جب آپ گھر چلی جائیں گی تو کم از کم چھ ہزار دوسری گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگ اس سڑک کو استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔" کانسٹیبل نے شائستگی سے جواب دیا۔

صدف عمران۔ کے ڈی اے سوسائٹی

اقوال زریں

- خود نوشت سوانح عمری دوسروں کے بارے میں سچ لکھنے کا فن ہے۔

(فلپ گیلارڈ)

- لکڑی کا ٹکڑا اگر دس برس تک بھی پانی میں پڑا رہے تو مگرمچھ نہیں بن سکتا۔

(افریقی کہاوت)

- کامیابی کا دارومدار آپ کی محنت یا دوسروں کی جہالت پر ہے۔

(روسی کہاوت)

ندا طارق۔ فیصل آباد

صاحب کردار

لاس اینجلس میں پولیس نے چھبیس سالہ جیمز جیرالڈ کو گرفتار کر لیا۔ اس نے ایک سپاہی کو لوٹا تھا۔ ایک کیفے اور ایک بار میں ڈاکا ڈالا تھا۔ ایک سیلز مین پر گولی چلائی تھی اور ایک راہ گیر کے ساتھ مار پیٹ کی تھی۔ پوچھ گچھ پر پتا چلا کہ اس کا پیشہ گھر گھر جا کر مقدس آیات سنا کر بائبل فروخت کرنا ہے۔

مختصر مختصر

★ میں اس مہینے صرف اور صرف اپنی آمدنی میں گزارا کروں گا خواہ اس کے لیے مجھے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔

★ شادی کے بعد اسے پتا چلا کہ حقیقت میں مسرت بھری زندگی کسے کہتے ہیں لیکن اس وقت تک بہت تاخیر ہو چکی تھی۔

★ وہ اتنا احمق ہے کہ اس کی صحبت میں بیٹھ کر دوسرے بھی خود کو احمق سمجھنے لگتے ہیں۔

★ دونوں گاڑی میں جا رہے تھے جب لڑکے نے شادی کی درخواست کی۔ لڑکی نے ہاں کی تو وہ دونوں اسپتال میں تھے۔

★ دیکھیے۔ میرے ساتھ مختصر بات کیجیے۔ میں

چند لفظوں میں اپنا مدعا بیان کر دینے کا عادی ہوں۔

★ ٹھیک ہے جناب! میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ میں بھی شادی شدہ ہوں۔

نادیہ یاسر۔ کراچی

اقوال عامری (محمد عامر موڈی سرکار)

• پہلے لوگ جھوٹ بولتے تھے، دھوکا دیتے تھے، بے وفائی کرتے تھے۔ اب صرف موقف تبدیل کر لیتے ہیں۔

• جو آپ کی بات پر فوراً یقین کر لے وہ دوست ہو ہی نہیں سکتا۔ دوست تو وہ کمینہ جو دس سوال اور کرے گا آپ کی سچائی چیک کرنے کے لیے۔

★ سامنے والے کو جواب دے سکتے ہوں لیکن لحاظ، مروت کی وجہ سے نہ دے پائیں تو جواب پھانس کی طرح دل میں چبھتا رہتا ہے۔

★ جب بچہ اپنا ٹوٹا کھلونا لاتا ہے تو اس یقین کے ساتھ کہ آپ اس کو جوڑ دیں گے۔ جب بھی دعا کریں، اس یقین سے کریں جیسے ایک معصوم بچے کو یقین ہوتا ہے۔

★ علاقے میں ٹیوشن پڑھانے کا فائدہ۔ پان والا سب سے پہلے آپ کو سگریٹ دیتا ہے۔ کیونکہ جتنی دیر آپ اس کی دکان پر کھڑے رہیں گے، پرانے اسٹوڈنٹ دور رہیں گے۔

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

اشتہار

ایک اخبار میں اشتہار دیا گیا۔

"ایک خوش شکل، کروڑپتی، اعلا تعلیم یافتہ نوجوان کے لیے رشتہ درکار ہے۔ ذات پات اور جہیز کی کوئی پابندی نہیں، البتہ لڑکی کا فلم کی ہیروئن سے مشابہت رکھنا ضروری ہے۔"

اشتہار میں جس فلم کی ہیروئن کا حوالہ دیا گیا تھا، وہ فلم ان دنوں مقامی سینما ہال میں پہلے ہفتے میں ہی دم توڑ رہی تھی مگر اشتہار شائع ہونے کے بعد وہ فلم شہر میں پورے بارہ ہفتے چلی۔

فطری دانش

مسلمانوں نے مدائن فتح کیا تو اسلامی لشکر کے سپہ سالار نے آتش کدۂ نوبہار سرد کرنے کے لیے ایک فوجی دستہ بھیجا۔ روایت تھی کہ یہ آتش کدہ زرتشت کے زمانے سے مسلسل روشن چلا آرہا تھا۔ فوجی دستے نے آتش کدے کے مرکزی دروازے پر زرتشت کا یہ قول دیکھا۔

"بادشاہ کے دربار میں اسی شخص کو حاضری دینا چاہیے جس کے پاس علم، حوصلہ اور دولت ہو۔"

فوجی دستے میں ایک بدو بھی تھا۔ اس نے زرتشت کے قول کے نیچے کوئلے سے لکھ دیا۔

"جس کے پاس ان تینوں میں سے ایک وصف بھی ہو، اسے بادشاہ کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

پروردگار

عربی کی ایک حکایت ہے کہ حضرت موسیٰ مصر سے مدینہ گئے تو انہیں بخار نے آلیا اور اس کے بعد بھوک ستانے لگی۔ حضرت موسیٰ نے دعا کی۔

"اے میرے رب! میں مسافر ہوں، مریض بھی ہوں اور میرے پاس کچھ بھی نہیں۔"

اللہ جل شانہ نے فرمایا۔ "اے موسیٰ! کیا تو جانتا ہے کہ غریب کون ہوتا ہے، مریض کون ہوتا ہے اور بغیر مال والا کون ہوتا ہے؟"

حضرت موسیٰ نے عرض کی۔ "اے رب! مجھے اس کا علم نہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"غریب وہ ہے جس کا میری طرح کا حبیب نہ ہو، مریض وہ ہے جس کا میری طرح کا طبیب نہ ہو اور بغیر مال والا وہ ہے جس کا میری طرح کا کارساز نہ ہو۔"

صائمہ نجمی۔ کراچی

خالد جیلانی



فائزہ بھٹی ــــــــــ پتوکی

مانا کہ مل کے مٹی میں بے آبرو ہوا
لیکن کسی کی آنکھ کا تارا رہا ہوں میں

ہما فاروق ــــــــــ گوجرانوالہ

مقامِ عاشقی دنیا نے سمجھا ہی نہیں ورنہ
جہاں تک تیرا غم ہوتا وہیں تک زندگی ہوتی
تمہاری آرزو کیوں دل کے ویرانے میں آ پہنچی
بہاروں میں پلی ہوتی ستاروں میں رہی ہوتی

سحرش مصطفیٰ ــــــــــ میانوالی

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اجڑے اور پھر نہ بسے، دل وہ نرالی بستی ہے

عظمیٰ شفیق ــــــــــ جڑانوالہ

ایک ٹوٹا ہوا شیشہ ہوں مجھے مت چھونا
میں ذرا ٹھیس لگے گی تو بکھر جاؤں گا

سعدیہ نازلی دعا ــــــــــ کسووال

یہ زخم ہیں ان دلوں کی یادیں
جب آپ سے دوستی بڑی تھی

گڑیا راجپوت ــــــــــ موڑ کھنڈا

تند خو ہے کب سنے وہ دل کی بات
اور بھی برہم کو برہم کیا کریں

رضوانہ شکیل راؤ ــــــــــ لودھراں

نہ گئی تیری بے رخی نہ گئی
ہم تیری آرزو بھی کھو بیٹھے

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ــــــــــ گلستان جوہر

ایک پل کا جینا بھی قیامت تھا ندیم
اور دعا طویل عمر کی ملتی رہی

فاخرہ بتول ــــــــــ موڑہ دھمیال

ہم کو بے کار لیے پھرتے ہو بازاروں میں
ہم نہ یوسف ہیں نہ یوسف کے خریداروں میں

عائشہ اسلام ــــــــــ قائم پور

نسخۂ مرہم اکسیر بتانے والے
تو میرا زخم تو پہلے مجھے واپس کر دے
آنکھ سے دل نے کہا رنگ جہاں شوق سے دیکھ
میرے دیکھے ہوئے سپنے مجھے واپس کر دے

فرحت اشرف گھمن ــــــــــ سید والا

نئے مکاں میں نئے دوستوں سے ملتا ہوں
پرانے گھر میں پرانی کتاب ہے بھائی
سزا کے طور پہ آنکھوں کو نوچ لو لیکن
ذرا سنبھل کے محبت کا خواب ہے بھائی

نور عبد السلام ــــــــــ نواب شاہ

میں سو رہا تھا اور میری خواب گاہ میں
اک اژدہا چراغ کی لو کو نگل گیا

اقراء عزیز ــــــــــ دریا خان

جس کی قربت کو ترستا تھا زمانہ کل تک
آج وہ شخص اکیلا سرِ بازار ملا

آسیہ فرید ــــــــــ ملتان

اس تعلق کو کیا کہے کوئی
خوش بھی ہم سے نہیں خفا بھی نہیں

سیدہ ندا اکرم شاہ ــــــــــ غازیوال

اس نے مجبور کر دیا ورنہ
ہم کو خود پر تھا اختیار بہت
ہم ہی اپنا سمجھ رہے تھے اسے
ہو گئے، ہم ہی شرمسار بہت

گل مینا خان ــــــــــ مانسہرہ

شاعران کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

امت الصبور

آنچلوں کی ڈائری

نورینہ حنیف کی ڈائری سے

یہ جانتے ہوئے بھی کہ دلیل و وکیل بے اثر ہے، ہر دور میں کچھ باضمیر، زندہ لوگ ظلم، جبر اور ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہے ہیں۔ ان ہی جذبوں کی عکاس عرفان صدیقی کی یہ غزل قارئین کی نذر۔

گو تمنائے جاں ضروری ہے
بت کدے میں اذاں ضروری ہے

جانتا تھا مگر وکیل و دلیل
کوششِ رائیگاں ضروری ہے

مدعی سے تو خیر کیا ڈرنا
منصفوں سے اماں ضروری ہے

جانتے تھے کہ کون کیا ہے مگر
خاطرِ دوستاں ضروری ہے

ہونٹ سل بھی گئے پر کرتے رہے
بات جتنی جہاں ضروری ہے

سنگ و آہن کے شہر میں عرفان
کیا یہ آہ و فغاں ضروری ہے

حمدہ واجد کی ڈائری سے

کچھ کہانیاں انجام تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ کچھ باتیں ان کہی رہ جاتی ہیں۔ کچھ امیدیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ اور کچھ سفر ایسے موڑ پر تمام ہوتے ہیں جہاں آگے پیچھے کوئی راہ نہیں ہوتی۔ ذوالفقار احمد تابش نے اس غزل میں ان ہی جذبوں کو زبان دی ہے۔

کہانی ختم ہوئی، داستاں تمام ہوئی
جہاں پہ سوچا نہیں تھا، وہاں تمام ہوئی

یہاں سے آگے نہ پیچھے کہیں بھی کچھ بھی نہیں
ہماری راہ بھی آ کر کہاں تمام ہوئی

سوائے درد کے اب کچھ بچا نہیں دل میں
بس اک امید تھی، وہ بے گماں تمام ہوئی

خبر کرے کوئی جا کر مرے مسیحا کو
جسے بچانا تھا اس کو، وہ جاں تمام ہوئی

وہ گفتگو جو تھی ہم میں، وہ ناتمام رہی
جو عاشقی تھی ہماری، یہاں تمام ہوئی

ثنا بنگہ چیمہ کی ڈائری سے

احمد نوید کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے، اس توقع کے ساتھ کہ قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

ہے اور نہیں کا آئینہ مجھ کو تھما دیا گیا
یعنی میرے وجود کو کھیل بنا دیا گیا

میرا سوال تھا میں کون ہوں اور جواب میں
مجھ کو ہنسا دیا گیا، مجھ کو رلا دیا گیا

میرے جنوں کو بھی بہت خواہشِ سیر و جستجو
مجھ کو مجھ ہی سے باندھ کر مجھ میں بٹھا دیا گیا

میں نے کہا زندگی؟ درد دیا گیا مجھے
میں نے کہا آگہی؟ زہر پلا دیا گیا

خواب تھا میرا عشق بھی، خواب تھا تیرا حسن بھی
خواب میں یعنی ایک اور خواب دکھا دیا گیا

ذاکرہ سہیل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

وہ نظر سے دور تو ہیں مگر یہ عجیب صورت حال ہے
ہر وقت پیش نظر بھی ہیں یہ فراق ہے نہ وصال ہے

نہ وہ ہم سے کم نہ ہم ان سے کم، وہ ادھر خفا، ہم ادھر خفا
نہ انہیں ہمارا خیال ہے نہ ہمیں دماغ سوال ہے

یہ تمہاری کج ادائیاں کوئی اور سہہ کر تو دکھائے
یہ جو ہم میں تم میں نباہ ہے، مرے حوصلے کا کمال ہے

جو گزر رہی ہے گزار دو، برا کہو نہ گلہ کرو
جو تمہارا خیال ہے دوستو، وہی سارے شہر کا حال ہے

وہ کہاں سے لاؤں روشنی جو کسی کے شہر میں لٹ گئی
وہ آئینوں کا شہر بھی لٹ گیا، مجھے اس کا ملال ہے

تیرے مشورے کے خلوص پہ مجھے ترک عاشقی بھی قبول ہے
مگر اک بات ہے ہم نشیں، میری زندگی کا سوال ہے

عابدہ گل کی ڈائری سے

یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ امید ہے آپ سب کو ضرور پسند آئے گی۔

کبھی رک گئے، کبھی چل دیے، کبھی چلتے چلتے بھٹک گئے
یونہی ساری عمر گزار دی، یونہی زندگی کے ستم سہے

کبھی نیند میں کبھی ہوش میں تو جہاں ملا تجھے دیکھ کر
نہ نظر ملی نہ زباں ملی، یونہی سر جھکا کے گزر گئے

کبھی زلف پر کبھی چشم پر، کبھی تیرے حسین وجود پر
جو پسند تھے میری کتاب میں، وہ شعر سارے بکھر گئے

مجھے یاد ہے کبھی ایک تھے مگر آج ہم ہیں جدا جدا
وہ جدا ہوئے تو سنور گئے، ہم جدا ہوئے تو بکھر گئے

کبھی عرش پر کبھی فرش پر، کبھی ان کے در، کبھی دربدر
غم عاشقی تیرا شکریہ، ہم کہاں کہاں سے گزر گئے



باوقار شخصیت

صبا فیصل سے ملاقات

شاہین رشید



ایک وقت تھا کہ جب کوئی مڈل ایج کی خاتون "ماں" کا رول کرتی تھی تو بالوں میں سفیدی لگا دی جاتی تھی تاکہ ماں نظر آئے۔ مگر اب ایسا نہیں ہے... کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ نوجوان بچوں کی مائیں اتنی ہی عمر کی ہوتی ہیں جتنی وہ دکھائی جاتی ہیں۔ آج کل جو خواتین "ماں" کے رول کر رہی ہیں ان میں ایک خوب صورت اور حسین چہرہ "صبا فیصل" بھی ہیں... آج آپ کی ان سے تفصیلی ملاقات کرواتے ہیں۔

"جی کیسی ہیں آپ؟"

"الحمدللہ۔"

"آپ کو ڈراموں میں ماں کے رول میں تو دیکھتے ہی رہتے ہیں لیکن "محبت نفرت' ہے تم سے" میں دادی کے رول میں دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو خود کیسا لگ رہا ہے؟"

"بہت اچھا... بہت مزہ آ رہا ہے... اگرچہ میں دادی نانی ہوں مگر جوان بچوں کی نہیں... تو جب میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں جوان ہوں گے تب میں بھی ایسی ہی لگوں گی۔"

"خلیل الرحمٰن قمر ایک بہترین رائٹر ہیں... کیا آپ اس لیے ان کے تقریباً" ہر ڈرامے میں ہوتی ہیں؟"

"میں نہیں... مجھے بک کیا جاتا ہے ان کے ڈراموں میں اور مجھے ان کے ڈراموں میں کام کر کے بہت اچھا لگتا ہے... کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ وہ آج کے دور کے بہترین ڈراما رائٹر ہیں۔ ان کے ڈائیلاگ بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ ان سے اچھا تو کوئی اور رائٹر ہو ہی نہیں سکتا۔"

"دیگر رائٹرز ناراض نہیں ہو جائیں گے کیا؟"

"ارے نہیں... دل آزاری مقصد نہیں ہے۔ سب ہی بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ بس کوئی تجربے میں زیادہ ہوتا ہے کوئی کم... اور ہر ایک اپنے انداز میں سوچ کر لکھتا ہے۔"

"ویسے خواتین رائٹرز میں آپ کو کون بے حد پسند ہیں؟"

"ویسے تو سب ہی اپنے حساب سے اچھا لکھ رہی ہیں... لیکن پھر بھی مجھے فرحت اشتیاق' عمیرہ احمد اور فائزہ افتخار بہت پسند ہیں۔"

"اتنے ڈراموں میں کام کر کے اب تو آپ خود بھی ڈراما نگار بن سکتی ہیں؟"

"جی بالکل... بن سکتی ہوں اور اپنا ایک آئیڈیا لکھ کر ایک پروڈکشن ہاؤس کو دیا تھا... مگر وہ آئیڈیا کوئی

وہاں سے لے اُڑا' لہٰذا پھر مزید لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔"

"ارے آپ جیسے بڑے آرٹسٹوں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے؟"

"جی.... سب کے ساتھ ہوتا ہے۔"

"ڈراموں کے بارے میں کیا کہیں گی.... کیسا کام ہو رہا ہے؟"

"کام اب بھی بہت اچھا ہو رہا ہے کام پہلے بھی بہت اچھا تھا۔ اگر کہیں کہ اب اچھا اور پہلے بہت اچھا ہوتا تھا تو غلط نہ ہو گا۔ چونکہ چینل ایک تھا لکھنے والے بھی زیادہ نہیں تھے اور ہر لکھنے والا اپنی بہترین تحریر کے ساتھ آتا تھا.... پھر ڈرامے بھی روز نہیں ہوتے تھے۔ ایک آرٹسٹ ایک سہ ماہی کے لیے بک ہوتا تھا.... چونکہ اور چینلز نہیں تھے تو اسی ایک چینل کو سب دیکھتے تھے۔ اب ماشاء اللہ ڈرامے بھی بہت بن رہے ہیں اور چینل بھی کافی آ گئے ہیں۔"

"معاوضوں میں بھی بہت فرق آیا ہے؟"

"جی.... جی بہت فرق ہے.... وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اب بہت اچھے معاوضے ملتے ہیں۔ اور سب ہی اپنے کام سے اور معاوضوں سے مطمئن ہیں۔"

"آپ کے بچے ہیں اس فیلڈ میں؟ آپ نے ان کی حوصلہ افزائی کی اس فیلڈ میں آنے کے لیے؟"

"بات حوصلہ افزائی کی نہیں ہوتی' شوق اور ٹیلنٹ کی ہوتی ہے.... جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میرے تین بچے ہیں۔ بیٹی سعدیہ ماشاء اللہ سے شادی شدہ ہے اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔

جبکہ ارسلان کا گلوکاری کی طرف رجحان ہے اور دوسرے بیٹے سلمان کا اداکاری کی طرف.... تو ساری بات ٹیلنٹ کی ہے اور ظاہر ہے کہ میں اتنے عرصے سے کام کر رہی ہوں تو کچھ جراثیم تو ان میں بھی آئے ہوں گے۔ سعدیہ نے بس ایک ہی سیریل کیا ہے۔"

"آپ کے نام کا کچھ فائدہ تو آپ کے بچوں کو ہوا ہو گا؟"

"مگر میرے بچے تو کہتے ہیں کہ ہمیں آپ کی اولاد ہونے کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا ہے۔ اگر ہم اچھا کام کریں تو آپ کی تعریف کہ کس ماں کے بیٹے ہیں اور برا کریں گے تو کہیں گے کہ ماں تو اتنی اچھی پرفارمر اور تم.... یعنی کوئی ہمیں خود سے ہمارے حوالے سے کچھ نہیں سمجھے گا.... خیر یہ باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ بچے اچھا کام کر رہے ہیں۔"

"آپ نے اپنی کمائی کسی مصرف میں لگانے کے لیے بزنس شروع کیا پھر اسے بند کر دیا.... شاید گمان یہ تھا کہ آپ پروڈکشن ہاؤس بنائیں گی؟"

"ہاں.... میں نے بزنس شروع کیا تھا جو اچھا خاصا کامیاب بھی ہوا مگر چونکہ مجھے اداکاری بھی کرنی تھی اور اپنی فیکٹری بھی چلانی تھی تو دونوں طرف توجہ نہیں دے پا رہی تھی.... پھر کام بھی کچھ گڑبڑ ہونے لگا کہ جب تک خود توجہ نہ دو' دوسرا نہیں دیتا حالانکہ ڈریس ڈیزائننگ کے لیے پڑھے لکھے لوگوں کو ہائر کیا تھا.... خیر.... جب دو چار جگہوں سے شکایت آئی تو میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ بزنس نقصان میں جائے' اسے بند کر دینا ہی بہتر ہے۔"

"تو کیا پروڈکشن کی طرف اسی وجہ سے نہیں آئیں کہ توجہ نہیں دے سکیں گی؟"

"نہیں.... نہیں اس لیے پروڈکشن سائیڈ پہ نہیں آئی کہ میری نظر میں یہ کام کافی مشکل ہے.... لیکن میرے بیٹوں کی خواہش ہے کہ وہ میرے نام سے پروڈکشن ہاؤس کھولیں.... تو جب انہوں نے سوچا ہے تو کھولیں گے بھی۔"

"اور آپ کی ساری توجہ اداکاری کی طرف ہی رہے گی مستقبل میں بھی؟"

"بالکل جی.... ساری توجہ اداکاری کی طرف ہے۔ کبھی خیال آتا ہے کہ کام کم کر دوں.... مگر جب دو دن گھر میں بیکار بیٹھ جاؤں تو نہ صرف بوریت ہونے لگتی ہے بلکہ زندگی بے مقصد سی لگنے لگتی ہے۔ کام تو گھٹی

میں پڑ گیا ہے... اس لیے کم کام کر سکتی ہوں مگر چھوڑنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"عزت، شہرت اور پیسہ جب تینوں چیزیں ایک ساتھ ملیں تو انہیں چھوڑنا حماقت ہے؟"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے... اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ وہ واحد کام ہے، جس میں تینوں چیزیں ایک ساتھ ملتی ہیں۔ تو جہاں اتنی پذیرائی ہو... عزت ہو، معقول آمدنی ہو... واقعی اس فیلڈ کو چھوڑنا حماقت ہے۔"

"معاوضہ اپنی مرضی کا لیتی ہیں... یا پروڈکشن ہاؤس کے اپنے ریٹ ہیں؟"

"پروڈکشن ہاؤس کے کیا ریٹ ہیں مجھے نہیں معلوم... لیکن میں اپنے کام کا معاوضہ اپنی مرضی سے لیتی ہوں... میں نے اپنا ایک معیار بنالیا ہے اور میں اسی معیار کو لے کر چلتی ہوں اور اسی حساب سے فیس بھی لیتی ہوں مطلب معاوضہ بھی لیتی ہوں۔"

"آپ صرف کردار دیکھتی ہیں یا پہلے اسکرپٹ کا مطالعہ کرتی ہیں یا رائٹر اور ڈائریکٹر کو بھی دیکھتی ہیں کہ وہ کون ہیں؟"

"کسی بھی ڈرامے کی کامیابی اس کے اسکرپٹ میں پوشیدہ ہوتی ہے... پھر رائٹر بھی دیکھتی ہوں اور سب سے اہم کام ڈائریکٹر کا ہوتا ہے کہ وہ اسکرپٹ کو لے کر کس طرح چلتا ہے۔ تو بس ان ساری باتوں کو دیکھ کر چلنا پڑتا ہے... کام بہت ہے مگر جو کام کروا رہا ہے اس کو ضرور دیکھنا ہوتا ہے تاکہ ہمارے ناظرین مایوس نہ ہوں۔"

"آپ نے "محبت تم سے نفرت ہے" میں بہت ہی بزرگ دادی کا کردار کیا... اور اتنا اچھا کیا کہ مجھے لگتا ہے کہ آئندہ آپ کو ایسے ہی رول ملیں گے؟"

ہنستے ہوئے "ایسا نہیں ہے کیونکہ کسی بھی رول کو لینا نہ لینا میرے اختیار میں ہوتا ہے... اگر مجھے مسلسل ایسے رول ملنے لگے تو ظاہر ہے کہ مجھے اس بارے میں سوچنا پڑے گا... مگر میرا یہ نظریہ ہے کہ آرٹسٹ کو ہر طرح کے کردار کرنے چاہئیں... تاکہ پتا



تو چلے کہ اس کے اندر کتنی قابلیت ہے... تو "دادی" کے رول میں مجھے جو پذیرائی مل رہی ہے اس کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔"

"میں نے ایک آدھ سیریل میں آپ کو کامیڈی رول میں بھی دیکھا ہے... آپ کو پسند ہے کامیڈی رول کرنا؟"

"ہاں... ہاں... کیوں نہیں... مجھے بہت مزہ آتا ہے ہلکے پھلکے کامیڈی رول کر کے اور زیادہ نہیں چند ایک میں ہی کام کیا ہے۔"

"فلم کا رسپانس کیسا رہا تھا جو آپ نے کی تھی؟"

"میں ہوں شاہد آفریدی" اس میں میں نے نیوز کاسٹر کا کردار کیا تھا... بس خبریں پڑھی تھیں... رسپانس تو تب ملے گا جب میری دو فلمیں "رنگریزا" اور "رہبرا" ریلیز ہوں گی کیونکہ ان دونوں فلموں میں میرے کردار بہت اچھے ہیں۔"

"ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے تو یہ بتائیے کہ ہر کامیاب "عورت" کے پیچھے کس کا ہاتھ ہوتا ہے؟"

ہنستے ہوئے... "میرے پیچھے میرے میاں صاحب

کا ہاتھ ہے۔ سچ میں اگر وہ میرے ساتھ تعاون نہ کرتے۔ میرا ساتھ نہ دیتے تو میں کبھی بھی ایک کامیاب فنکارہ نہ بن پاتی۔ اب بھی دیکھیں کہ میں زیادہ تر کراچی میں رہتی ہوں اور "فیصل" (میاں) لاہور میں... لیکن وہ مجھے کچھ نہیں کہتے... حقیقت ہے کہ میں ان کے بغیر کچھ بھی نہیں۔"

"اس فیلڈ میں ماشاء اللہ کافی نئے چہرے آگئے ہیں کچھ کہیں گی ان کے بارے میں؟"

"جو بھی بچے اس فیلڈ میں آئے ہیں بہت اچھے اور بہت باصلاحیت ہیں اور ہم سینئرز کا بھی بہت احترام کرتے ہیں۔ عزت و پیار سے بات کرتے ہیں... اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم بچوں سے اچھا سلوک کریں گے ان کی حوصلہ افزائی کریں گے تو یقیناً" وہ بھی ہمیں اچھا رسپانس دیں گے۔ نئے آنے والے سب بچے ہمارے بچوں کی طرح ہی ہیں۔"

"آپ کے بچے بھی اس فیلڈ میں... آپ بھی... میاں صاحب کیوں نہیں آتے اس فیلڈ میں؟"

"انہیں شوق نہیں ہے... ان کا اپنا کام ہے جس میں وہ مصروف رہتے ہیں۔"

"ہر وقت میک اپ ' ہر وقت گیٹ اپ... دل گھبراتا نہیں آپ کا؟"

"یہ ہماری مجبوری ہے۔ لیکن جب میں گھر پہ ہوتی ہوں یا سیٹ پہ نہیں ہوتی تو بالکل بھی میک اپ نہیں کرتی اور کوشش کرتی ہوں کہ جو فارغ وقت ہے وہ گھر میں اپنی فیملی کے ساتھ گزاروں۔"

"آپ پنجابی ہیں۔ اتنی اچھی اردو کیسے بول لیتی ہیں؟"

"سچ بتاؤں... اظہر لودھی ' عبید اللہ بیگ اور قریش پور مرحوم کی بدولت میری اردو بہت اچھی ہوئی۔ لفظوں کی ادائیگی کیسے کرنی ہے انہوں نے ہی مجھے بتائی اور ان ہی کی بدولت میری اردو بہت اچھی ہوگئی۔"

"نیوز کاسٹر کی حیثیت سے آپ کو کافی شہرت ملی... پھر اداکاری کی طرف کس نے اکسایا؟"

"مجھے میری طبیعت اور شوق نے اکسایا... کیونکہ جب ایک کام سے بور ہو جاتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا کام کروں... اناؤنسمنٹ اور نیوز پڑھنے کے دوران سوچا کہ اس کام میں کوئی ورائٹی نہیں ہے۔ پھر ہر کوئی مجھے اس حوالے سے پہچاننے لگا... تو پھر سوچا کہ کچھ "نیا" ہو جائے۔ اداکاری کے لیے آڈیشن دیا اور کامیاب ہوگئی اور بس۔"

"اس کام سے تو بور نہیں ہوتیں؟"

"نہیں... اس سے بور نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کام میں ورائٹی بہت ہے۔ ہر طرح کے ہر ایج کے رول کرنے کا موقع ملتا ہے اور مزہ آتا ہے۔ اور ہاں آپ نے پوچھا کہ کس نے اکسایا تو جیسا کہ میں نے کہا کہ میرے شوق نے اکسایا مگر ساتھ ساتھ یاور حیات صاحب اور عظمیٰ گیلانی آپا نے بھی اکسایا تو بس آ گئی۔"

"جس دور میں آپ آئیں گو کہ بہت پرانا دور نہیں ہے مگر لڑکیوں کو اتنی آسانی سے اجازت نہیں ملتی تھی اور آپ بھی لڑکی ہی تھیں؟"

ہنستے ہوئے... "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے ٹی وی پہ کام شروع کیا تو میرے بھائی مجھ سے ناراض ہوگئے تھے۔ بلکہ نیوز جب تک پڑھتی تھی انہوں نے کچھ نہیں کہا لیکن جب ڈراموں میں کام شروع کیا تب انہوں نے برا منایا کہ ہمارے ملک میں ڈراما آرٹسٹوں کی کوئی عزت نہیں ہے۔ تمہاری ایک بیٹی بھی ہے۔ تمہیں اس کا رشتہ کرنے میں مشکل ہوگی... مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے اپنی بیٹی کے لیے کوئی مشکل پیش نہیں آئی... کیونکہ میں نے کبھی معیار اور حدود پہ کمپرومائز نہیں کیا... آج جو میری عزت ہے وہ نصیبوں والوں کو ہی ملتی ہے۔"

"چلیں جی... اللہ آپ کی عزت میں مزید اضافہ کرے... اب اجازت دیں۔"

خبریں وبریں

واصفہ سہیل



خواہش

راحت فتح علی خان نے جو کہ بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں اپنی ذاتی فلم "کمپنی" بنانے کا اعلان کیا ہے۔ جس کے تحت راحت فتح علی خان سال میں دو فلمیں پروڈیوس کریں گے۔ راحت فتح علی خان کا کہنا ہے کہ وہ موسیقی پر بھی فلم بنانے کے خواہش مند ہیں' انہوں نے پاکستان فلم انڈسٹری کی بحالی اور بین الاقوامی سینما مارکیٹ تک رسائی کے لیے فلم سازی کا فیصلہ کیا ہے۔ (اس نیک کام کے بجائے کچھ اور کر لیتے تو بہتر تھا۔) راحت فتح علی خان اس سلسلے میں کچھ عرصے سے اپنی دو فلموں کے اسکرپٹ پر کام کر رہے ہیں (اتنی فرصت مل جاتی ہے کہ ....؟) راحت فتح علی خاں اپنی فلموں میں معروف بھارتی فنکاروں کو بھی کاسٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ (یہ بات .... !پاکستانی سینما کی بحالی' انٹرنیشنل مارکیٹ اور فنکار بھارتی .... واہ .... کیا بات ہے جی۔) راحت فتح علی خان اپنی پہلی فلم سلمان خان کے ساتھ کرنے کے خواہش مند ہیں (سلمان کا معاوضہ) وہ اپنی فلموں کو بین الاقوامی معیار کا بنانا چاہتے ہیں (اس لیے اداکار بھارتی ....؟)

چھاپ

ماورا حسین نے حال ہی میں ونی کے موضوع پر بننے والی ڈراما سیریل "سمی" میں حسب معمول روتا دھوتا مظلوم لڑکی کا کردار ادا کیا۔ اس بارے میں ماورا کا کہنا ہے کہ ابتدا ہی سے مجھے روتے دھوتے کردار مل رہے ہیں۔ حالانکہ میں ذاتی طور پر ایکشن' کامیڈی اور رومانٹک کردار کرنا چاہتی ہوں (ایکشن اور آپ ....؟ماورا اچھی کامیڈی ہے یہ۔)

کافی عرصے سے ماورا کی پاکستانی فلم میں کام کرنے کی خبر گرم ہے لیکن فلم ہے کہ آہی نہیں رہی (بھئی شوٹ پہ) اس بارے میں ماورا کا کہنا ہے کہ "کچھ تکنیکی مسائل فلم کی راہ میں اب تک رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ (فلم کی یا آپ کی ....؟) پھر اس کا اسکرپٹ بھی ابھی لکھا



جارہا ہے۔ (ہیں ۔۔۔ ابھی اسکرپٹ ۔۔۔ ؟ لکھا ہی نہیں گیا اور ۔۔۔ ؟) ماورا نے مزید کہا کہ ”ان کے خیال میں فلم کا اعلان کچھ جلد بازی میں یا قبل از وقت کر دیا گیا تھا۔“ (کچھ پہلے ۔۔۔ بھئی بہت ہی ۔۔۔)

شوق

شوبز کی دنیا میں ایک نیا اور خوب صورت اضافہ ہانیہ عامر ہیں ' ہانیہ عامر ٹی وی پر اپنے اب تک ادا کیے کرداروں اور وہاں ہونے والے تجربات کے حوالے سے کہتی ہیں کہ میں جب اپنا پہلا ڈراما کر رہی تھی تو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ (خوشی تھی یا خوف ؟) یہ ایک روایتی سا روتا دھوتا کردار تھا۔ مگر اس کے بعد میں نے طے کر لیا کہ اگر اب مجھے اس طرح کا کردار ملا تو میں انکار کر دوں گی۔ (پھر کیا ۔۔۔ بھئی انکار اور کیا ۔۔۔) پھر میں نے اپنے دوسرے ڈرامے تتلی میں ایسا کردار قبول کیا جو بہت دلچسپ نوعیت کا تھا۔ (ہیں ! بھئی ہمارے خیال میں تو اتنی مرتبہ ۔۔۔ چلو آپ کو دلچسپ لگا تو) آج کل ہانیہ عامر ایک اور روتے دھوتے کردار میں آرہی ہیں۔ جس کے متعلق وہ کہتی ہیں کہ ”مجھے جینے دو“ میں اداکاری کرتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب کچھ اصل زندگی میں میرے ساتھ ہو رہا ہو۔“ (اسے کہتے ہیں کردار کو اپنے اوپر طاری کر لینا۔)

اِدھر اُدھر سے

☆ کامیابی آخر ہے کیا ؟ دولت مند ہونا تو کامیابی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ ہیروئن کے اسمگلروں سے زیادہ دولت مند بھلا کون ہو سکتا ہے ! شہرت کو اگر کامیابی مان لیا جائے سنی لیونی ایک کامیاب خاتون ہوئیں کیا طاقت ور ہونا کامیابی ہے اگر ہاں تو اپنے علاقے کا ہر جاگیردار کامیاب گردانا جائے گا۔ میری پہلی الجھن تو یہ ہے کہ کامیابی کی تعریف کے ۔۔۔ بغیر ہم لوگ کامیابی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ گویا ایک ایسی دوڑ میں شامل ہیں جس میں کسی کو اختتامی نشان کا پتا ہی نہیں۔

(یاسر پیرزادہ ۔۔۔ ذرا ہٹ کے)



☆ ”نوجوانوں کی خوب صورتی تو قدرت سے سرزد ہونے والا حادثہ ہوتی ہے لیکن بڑھاپے میں خوب صورت دکھائی دینے والے لوگ آرٹ کا نمونہ ہوتے ہیں۔“

(امیتابھ کی نواسی نویا نویلی کا امیتابھ پر تبصرہ)

☆ یہ دن بھی دیکھنے کو ملنا تھا کہ طرح طرح کے نقال اور بھانڈ جمہوریت کی اعلا اقدار کے حوالے دے دے کر جیسے کسی 'لٹی پٹی اور بدحال سی جمہوریت کو بیچ چوک پر برہنہ کر کے اس پر سنگ باری کریں اور اپنی اذیت پسندی (Sadism) کی تشفی میں شرم بھی محسوس نہ کریں۔

(انگیخت ۔ امتیاز عالم)

☆ زبان بندی روز مارتی ہے اور ایسا مرنا گھٹ گھٹ کر جینے کو کہتے ہیں جن کو کتاب عشق کے باب سمجھ میں نہیں آتے ' وہ عقل کی باتیں اے آر وائی 'بول نیوز اور سما ٹی وی سے سیکھ سکتے ہیں۔ یقین کریں مائیں کروڑوں برس کے بعد عامر لیاقت ' عارف بھٹی اور مبشر لقمان جیسے دانش ور جنتی ہیں۔

(اے ۔ وحید مراد)

آپ کا باورچی خانہ

ثوبیہ عزیز مغل

عورت کا ذوق اور سلیقہ اس کے گھر کے اہم حصے باورچی خانے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مجھے کھانے پکانے کا شوق ہے، مگر وقت کی کمی آڑے آتی ہے۔ پھر بھی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ کوکنگ کو ٹائم دے سکوں (مابدولت اسکول ٹیچر ہیں اور شام کو ٹیوشن اور پھر چھ سالہ بچی کو بھی ٹائم دینا تو جناب کھانا پکانے کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے) پھر بھی میری دلچسپی کچن میں' آپ کو اس سوالنامے کے جواب پڑھ کر پتا چل ہی جائے گی۔

س:۔کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج:۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اسٹریس اور پریشانی میں کھانا نہیں پکانا چاہیے کیونکہ پھر کھانا کبھی بھی اچھا نہیں بنتا۔ کھانا پکاتے وقت خوش گوار ماحول، ترو تازہ طبیعت اور کھانے والوں کی صحت کو مدنظر رکھنا اہم عوامل ہیں۔

س:۔کھانے کا وقت ہے۔ اچانک مہمان آجائیں تو کسی ایسی ڈش کی ترکیب جو فوری تیار کر کے پیش کر سکیں؟

ج:۔ جناب! اس کا فوری حل ہے...... چکن جو ہر گھر میں فریج میں موجود ہوتا ہے۔ چٹ پٹے چکن کی ترکیب حاضر خدمت ہے۔

اجزا:۔

چکن	آدھا کلو
پیاز	دو عدد (درمیانی)
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
ٹماٹر	تین عدد (بڑے)
ہری مرچیں	چھ سے سات عدد (درمیانی)
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
گرم مسالا (پسا ہوا)	حسب ضرورت
خشک دھنیا (پسا ہوا)	حسب ضرورت
قصوری میتھی	ایک چمچہ
نمک، ہلدی، سرخ مرچ	حسب ضرورت
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

دیگچی میں تیل ڈال کر چکن ڈال دیں اور باقی تمام اجزا کو بلینڈر میں ڈال کر پیس کر لیں۔ جب چکن کڑکڑانے لگے تو سارا مسالا نکال کر چکن میں ڈال کر بھونیں اور پھر میتھی ڈال کر دو منٹ دم پر رکھیں اور سرو کریں۔ چپاتی اور نان کے ساتھ......

س:۔ کچن عورت کے سلیقے کا آئینہ ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟

ج:۔ میرے خیال سے کوکنگ کے دوران بھی ہم کچن کا خاص خیال رکھ سکتے ہیں کہ کھانا پکانے اور آٹا گوندھنے اور سبزی وغیرہ کاٹنے کے دوران زیادہ پھیلاوا نہ کریں۔ سب کچھ ساتھ ساتھ سمیٹتے جائیں۔ چولہے کی صفائی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ میں گیلے کپڑے پر بیکنگ سوڈا لگا کر چولہا، فریج اور اوون صاف کرتی ہوں۔ تفصیلی صفائی ہفتے کے ہفتے کرنا ضروری سمجھتی ہوں اور دل لگا کر کرتی ہوں۔ باقاعدہ میوزک لگا کر (ہاہاہا)

س:۔ صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں؟ کسی ایسی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں؟

ج:۔ ناشتے میں اسٹرونگ چائے تو میں خود اپنے ہاتھ کی بناتی ہوں کہ کسی کے ہاتھ کی بنی چائے پسند نہیں۔ بیٹی کو ناشتے میں البتہ دودھ، جوس یا ملک شیک بنا کر دیتی ہوں اور ساتھ پراٹھا یا پراٹھا نہ ہو تو

سینڈوچ بنا کر دیتی ہوں۔ چھٹی والے دن بیٹی (عینی) کی اسپیشل فرمائش پہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے دودھ اور انڈے کے مکسچر میں چینی مکس کر کے بھگو دیتی ہوں اور پھر آئل میں تل لیتی ہوں۔ میری بچی بہت شوق سے کھاتی ہے اور میں بھی۔

س: ۔ آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟

ج: ۔ (آہم) دلچسپ سوال...... تو جناب جب بھی راولپنڈی شاپنگ کرنے جاؤں تو راجا بازار کی چاٹ یا گجریلا اور اگر کمرشل (صدر) جائیں تو میسور والوں کے چاول ضرور کھاتے ہیں۔ ویسے مجھے تو گول گپے اور املی اور آلو بخارے کا شربت وہیں ٹھیلے کے پاس کھڑے ہو کر کھانے پینے میں مزہ آتا ہے۔

س: ۔ ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟

ج: ۔ جی یہ بہت ضروری ہے کہ کوکنگ کرتے وقت موسم کو مدنظر رکھا جائے، سردیوں میں گرما گرم سوپ...... گاجر کا حلوہ یا ڈرائی فروٹس کی ٹوکری سے نت نئی ڈشز بنانا اچھا لگتا ہے۔

اور گرمیوں میں میری کوشش ہوتی ہے کہ ہر کھانے میں سلاد یا چٹنی ضرور ہو۔ کیونکہ یہ گرمی سے ہونے والی کمزوری کو دور کرتے ہیں۔ چٹنی ہرا دھنیا، پودینہ، انار دانہ، کالی مرچ، نمک، ہری مرچ اور اگر کیریاں (کچے آم) دستیاب ہوں تو ان سب کو پیس کر بنائی جائے اور تھوڑا سا دہی شامل کیا جائے تو یہ جسم کو ٹھنڈک و تقویت پہنچاتی ہے بلکہ بلڈ پریشر اور شوگر سے بھی بچاتی ہے۔

س: ۔ کھانا پکانے میں کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج: ۔ جی یہ بہت ضروری ہے کہ کھانا محنت اور محبت سے بنایا جائے تو کھانا بنانے والے اور کھانا کھانے والے دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ کھانا بنانے والے کی محنت ضائع نہیں جاتی اور کھانا کھانے والے کی محبت بھی حاصل ہوتی ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ اپنی بیٹی کو اچھی چیز بنا کر کھلاؤں جو صاف ہو، غذائیت بھری ہو، ذائقے دار ہو اور بہت مسالے دار یا مرغن نہ ہو تو اس کے لیے محنت تو درکار ہوتی ہی ہے ناں۔

کچن کی ٹپ:

پکوڑے خستہ تلنے کے لیے بیسن گھولتے وقت ایک انڈا بھی پھینٹ کر ڈال دیں۔ پکوڑے خستہ اور عمدہ بنیں گے۔



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

پالک پنیر

اجزا :

پالک	آدھا کلو
ٹھنڈا پانی	حسب ضرورت
تیل	ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ٹماٹر	تین عدد (ٹکڑے کاٹ لیں)
ہری مرچ	چار عدد
ثابت زیرہ	ایک چمچہ
لہسن پیسٹ	ایک چمچہ
سرخ مرچ سفوف	ایک چمچہ
پنیر	200 گرام (چوکور کاٹ لیں)
گرم مسالہ	ایک یا دو چمچے
فریش کریم	50 گرام

ترکیب :

سب سے پہلے پالک کو پانی سے دھولیں۔ اب ایک پیالے میں ابلا ہوا پانی اور نمک ڈال کر اس میں دو منٹ کے لیے پالک ڈال دیں۔ دو منٹ بعد پالک کو گرم پانی میں سے نکال کر ٹھنڈے پانی میں ڈبو دیں۔ چند منٹ بعد پالک کو چھان کر علیحدہ ٹوکری میں رکھ دیں تاکہ اضافی پانی نکل جائے۔

اب ٹماٹر' ہری مرچ اور پالک کو گرائنڈر میں پیس لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کریں اور اس میں زیرہ کڑکڑا لیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو لہسن پیسٹ' سرخ مرچ ڈال کر ایک منٹ بھونیں۔

اب اس میں گرائنڈ کیا ہوا پالک پیسٹ شامل کریں اور چمچ چلاتی رہیں۔

جب اس مرکب میں ابال آنے لگے تو پنیر کے چوکور ٹکڑے' گرم مسالا اور نمک شامل کرکے اچھی طرح ملاتی جائیں یہاں تک کہ تمام اجزاء یکجان ہو جائیں۔

آخر میں فریش کریم ڈال کر مکس کرلیں۔

اسے گرما گرم چاول یا چپاتی کے ساتھ نوش کیجئے۔

کھوپرا لڈو

چار افراد کے لیے اجزا :

دودھ	آدھا کپ
چینی	آدھا کپ
خشک کھوپرا	ڈیڑھ کپ
الائچی	چار عدد (سفوف بنالیں)

ترکیب :

ایک ساس پین میں دودھ اور چینی ڈال کر پانچ سے دس منٹ تک ابالیں' یہاں تک کہ چینی پگھل جائے۔ اب اس میں پسا ہوا خشک کھوپرا شامل کریں۔

دس سے پندرہ منٹ چمچ چلاتی رہیں تاکہ خشک کھوپرا' دودھ اور چینی کا شیرہ اچھی طرح مل جائے۔

اب پسی ہوئی الائچی شامل کر کے ملائیں' یہاں تک کہ مرکب یکجان ہو جائے۔ جب مرکب گاڑھا ہو جائے تو چولہا بند کردیں اور اسے ایک پیالے میں نکال کر رکھ لیں۔ مرکب ہلکا گرم ہو تو لڈو بنانا شروع کریں' لڈو کا سائز آپ کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ ایک علیحدہ پیالے میں خشک باریک کھوپرا نکال کر رکھ لیں اور لڈو پر اس کی تہہ چڑھا کر پلیٹ میں سجاتی جائیں۔

مزیدار کھوپرا لڈو تیار ہیں۔

چائنیز فرائیڈ رائس

ضروری اشیاء :

چاول	آدھا کلو (ابال کر چھان لیں)
ہری پیاز	ایک کپ (چوپ کی ہوئی)
شملہ مرچ	ایک عدد (باریک کاٹ لیں)
گاجر	ایک عدد (باریک کاٹ لیں)
بند گوبھی	ایک کپ (چوپ کی ہوئی)

انڈے	2عدد
سیاہ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سویا سوس	دو کھانے کے چمچے
چکن پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ایک چوتھائی کپ

ترکیب :

کڑاہی میں تیل گرم کرکے انڈے ڈال کر چمچے سے چلاتے ہوئے فرائی کریں۔ اس میں گاجر، چکن، بند گوبھی اور شملہ مرچ ڈال کر دو منٹ تیز آنچ پر پکائیں۔ چاول، سویا ساس، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر اور چکن پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح مکس کر دیں۔ ہری پیاز ڈال کر ایک منٹ پکائیں اور چولہے سے اتار لیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

چکن کھٹا مسالا

ضروری اشیاء :

مرغی کا گوشت	آدھا کلو
پیاز	آدھا کپ (باریک چوپ کرلیں)
دہی	آدھا کپ
مونگ پھلی پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
ناریل پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک لہسن کا پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	چوتھائی چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	چوتھائی چائے کا چمچہ
املی کا پیسٹ	تین کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ساس پین میں تیل گرم کرکے پیاز سوتے کرلیں۔ اس کے بعد اس میں گوشت ڈال کر فرائی کرلیں۔ لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، ادرک، لہسن پیسٹ، مونگ پھلی پیسٹ، ناریل پیسٹ، دہی اور نمک شامل کرکے بھون لیں۔ تھوڑا پانی ڈال کر گوشت کو گلالیں۔ جب گوشت گل جائے تو اس میں املی کا پیسٹ اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر پانچ منٹ تک درمیانی آنچ پر پکائیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ مزیدار۔۔۔ چکن کھٹا مسالا پیش کریں۔

حیدر آبادی دالچہ

ضروری اشیاء :

چنے کی دال	آدھا پاؤ
پیاز	ایک عدد (باریک کاٹ لیں)
لہسن	ایک جوا (چھلا ہوا)
گوشت	ایک پاؤ (چھوٹے ٹکڑے کرلیں)
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	ایک چھٹانک
کدو / لوکی	ایک پاؤ
املی	ایک چھٹانک
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر	آدھا پاؤ

سب سے پہلے دال کو ابال لیں۔ اس کے بعد علیحدہ برتن میں گوشت، پیاز، نمک، لال مرچ، لہسن اور تیل ڈال کر گلنے کے لیے چولہے پر چڑھادیں۔ جب گوشت اچھی طرح سے گل جائے تو کدو کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے (ایک انچ لمبے) کاٹ کر اسی گوشت میں ڈال دیں اور پھر بھونیں۔ اب تھوڑا سا پانی ڈالیں اور کدو کو گلائیں۔ اس کے بعد اس میں گلی ہوئی چنے کی دال ڈالیں اور املی کا کھٹا (املی کو تھوڑے سے پانی میں آدھے گھنٹہ پہلے بھگوئیں۔ بعد میں یہ پانی چنے کی دال میں ڈالیں، یہ پانی املی کا کھٹا کہلاتا ہے) بھی ڈالیں۔ اگر املی پسند نہ ہو تو آدھا پاؤ ٹماٹر کاٹ کر ڈال دیں۔ گرم مسالا ڈال کر دس منٹ پکائیں۔ حیدر آبادی دالچہ تیار ہے۔ یہ بگھارے چاول یا سادہ چاول کے ساتھ بہت مزہ دیتا ہے۔

✲

عنوان

نفسیاتی اُزدواجی اُلجھنیں

حنا کوثر......کراچی

سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں۔ زندگی کی کتاب میں صرف دکھ ہی دکھ ہیں۔ ہوش سنبھالا تو صرف باپ اور پھوپھی کو دیکھا۔ بابا اکثر بیمار رہتے تھے۔ کبھی کام مل جاتا تو گھر میں کچھ پیسے آجاتے۔ پھوپھی سلائی جانتی تھیں۔ وہ کپڑے سی کر کچھ کر لیتی تھیں۔ پھوپھی بیوہ تھیں۔ شادی کے صرف ایک سال بعد ان کے شوہر ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ سسرال والوں نے عدت بھی نہ کرنے دی۔ گھر سے نکال دیا۔ بابا انہیں اپنے گھر لے آئے۔ بابا سے میں نے جب بھی ماں کے بارے میں سوال کیا، انہوں نے یہی بتایا کہ تمہاری ماں مر چکی ہے۔ ننھیال والے ہوں گے، لیکن میں نے آج تک ان کی شکل نہیں دیکھی۔ پھوپھی نے مجھے سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا تھا، میری پڑھائی کا خرچ وہی دیتی تھیں۔ پھوپھی کا کہنا تھا کہ لڑکیوں کو تعلیم ضرور حاصل کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں۔ میں آٹھویں کلاس میں تھی کہ بابا نے پھوپھی سے دوسری شادی کی بات کی۔ پہلے تو پھوپھی نے انکار کیا۔ پھر ابا کے سمجھانے پر راضی ہو گئیں۔ پھوپھی کی شادی ہو گئی تو میری پڑھائی کے اخراجات کا مسئلہ ہوا۔ پھوپھی سے تھوڑا بہت سلائی سیکھ لی تھی، لیکن ہاتھ میں ان جیسی صفائی نہ تھی۔ تھوڑا بہت کام مل جاتا، لیکن کتابیں، کاپیاں آنے جانے کا، بس کا کرایہ، یہ سب اخراجات پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ بابا اب بیمار رہنے لگے تھے۔ وہ ہفتوں کام پر نہ جاتے۔ مجبوراً پڑھائی کو خیر باد کہنا پڑا۔

پھوپھی اپنے گھر میں خوش تھیں۔ کبھی کبھی ملنے بھی آتی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں باقاعدہ سلائی کا کورس کر لوں تو مجھے گارمنٹ فیکٹری میں جاب مل سکتی ہے۔ کورس کے اخراجات وہ اٹھائیں گی۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا۔ مجھے فیکٹری میں ملازمت مل گئی اس طرح جیسے تیسے گھر کا خرچ چلنے لگا۔ ابا کی بیماری بڑھتی جا رہی تھی وہ میری طرف سے بہت پریشان تھے۔ بار بار کہتے میری آنکھیں بند ہونے کے بعد تم کہاں جاؤ گی۔ کئی جگہ انہوں نے شادی کی بات چلائی، لیکن کہیں بھی بات نہ بن سکی۔ لوگ آتے، پسند کرتے، لیکن نہ جانے کیوں بات آگے نہ بڑھتی۔ ایک دن پھوپھی میرے بابا سے رشتہ کے متعلق بات کر رہی تھیں تو مجھے پہلی بار پتا چلا کہ کون سی بات میرے رشتے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ میری ماں زندہ تھی۔ وہ میرے غریب باپ کے ساتھ گزارا نہ کر سکی۔ اس لیے میرے باپ کو چھوڑ کر اس نے کسی اور کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ یہ سب کچھ جان کر مجھے بہت شدید دھچکا لگا تھا۔ میری ماں نے ایک بار بھی پلٹ کر میری خبر نہ لی تھی۔ میں نے بابا پر کچھ ظاہر نہ کیا، لیکن اب میں بہت خاموش اور گم صم رہنے لگی تھی پھر پھوپھی نے ایک جگہ میرے رشتے کی بات چلائی۔ ان کے گھر سے ان کی بڑی بھابھی آئی تھیں۔ ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ابا بھی لڑکے کو دیکھنے گئے تھے مناسب شکل و صورت کا مالک تھا۔ کسی آفس میں کام کرتا تھا۔ متوسط درجے کے لوگ تھے۔ گھر ذاتی تھا جو ان کی والدہ کے نام تھا۔ بظاہر کوئی خامی نہیں تھی۔ بابا نے ہاں کر دی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ان کی بھابھی نے میری تصویر مانگی تھی نہ اس لڑکے نے مجھے دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ شادی ایک ماہ بعد رکھی گئی تھی۔ اس دوران بھی اس نے کبھی فون کیا نہ مجھے دیکھنے کی کوشش کی۔

شادی والے دن پہلی بار میں نے اپنی ماں کو دیکھا پھوپھی نے انہیں فون کیا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے مجھ سے ملنے آئی تھیں گھنٹہ بھر میرے پاس رہیں۔ خالی خالی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہیں۔ سپاٹ چہرہ لیے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا یہ میری ماں ہے نہ گلے لگایا نہ دعا دی۔ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر جانے کے لیے اٹھ گئیں۔ باہر جانے سے پہلے انہوں نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے بس یہی تحفہ انہوں نے مجھے دیا تھا۔

میں رخصت ہو کر اپنے شوہر کے گھر آ گئی۔ ان کی بڑی بھابھی نے ہی ساری رسمیں کیں۔ جس کے ساتھ زندگی بھر کا

بندھن تھا۔ وہ تو خاموش ہی تھا۔ بھابھی مجھے کمرے میں بٹھا کر چلی گئیں۔ بھابھی کا رویہ بھی عجیب سا تھا۔ بظاہر ہنس رہی تھیں، لیکن لگتا تھا جیسے ابھی رو پڑیں گی۔ دو گھنٹے بعد جب شوہر صاحب تشریف لائے تو میری آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ ان کا رویہ بھی بہت سرد تھا۔

لگتا تھا بابا کو جیسے میری شادی کا ہی انتظار تھا۔ وہ شادی کے ایک ماہ بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔

بعد میں آنے والے دن بھی شوہر کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہ لا سکے۔ بس ضرورت کے تحت وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ورنہ خاموش رہتے۔ بھابھی مجھے گھر کا کوئی کام کرنے نہیں دیتیں۔ میرے شوہر کے بھی سارے کام وہی کرتی تھیں۔ صبح سویرے اٹھ کر میرے شوہر کے لیے ناشتا بناتیں۔ ان کے کپڑے دھونا، ان کی پسند کے کھانے بنانا...... حیرت تو مجھے جیٹھ صاحب پر ہوتی تھی۔ انہوں نے کبھی بیوی پر کوئی روک ٹوک نہیں کی تھی۔ میرے شوہر گھنٹوں بھابھی سے باتیں کرتے رہتے۔ ان کے ساتھ کیرم کھیلتے۔ جیٹھ خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہتے۔ ایک آدھ بار میں نے شوہر کے کام کرنے کی کوشش کی۔ وہ آفس سے آئے تو میں ان کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ شوہر صاحب نے پیالی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ انہیں بھابھی کے ہاتھ کی ہی چائے پسند ہے۔ آئندہ میں زحمت نہ کروں۔ کچن میں بھابھی مجھے قدم بھی نہیں رکھنے دیتی تھیں۔ اس ماحول میں میرا دم گھٹنے لگا تھا تب ہی مجھ پر اللہ کا کرم ہوا۔ میں امید سے ہوگئی۔ یہ خبر سنتے ہی بھابھی کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ماں نہیں بن سکتی تھیں۔ ایک دن میں نے انہیں روتے دیکھا۔ میرے شوہر انہیں گلے لگا کر تسلی دے رہے تھے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پہلی بار میں نے زبان کھولی اور احتجاج کیا اور اس کے جواب میں شوہر سے مار کھائی۔ اس کے بعد میں نے چپ سادھ لی۔ میرا بیٹا پیدا ہوا تو شوہر نے اسے بھابھی کی گود میں ڈال کر کہا کہ یہ ان کا بیٹا ہے پھر یکے بعد دیگرے میں چار بچوں کی ماں بن گئی۔ دو بیٹے، دو بیٹیاں' شوہر کا رویہ بدستور تھا۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ ایک رات میرے جیٹھ سوئے تو پھر نہ اٹھے سب نے ان کے متعلق بہت کچھ کہا۔ ان کو شک تھا کہ میرے جیٹھ کو مارا گیا ہے۔ وہ طبعی موت نہیں مرے۔ مجھے بھی یقین تھا کہ انہیں کوئی چیز کھلائی گئی ہے، لیکن میں نے زبان نہ کھولی۔ شوہر صاحب تو موقع کے انتظار میں تھے۔ عدت ختم ہونے کا بھی انتظار نہ کیا اور بھابھی سے شادی کر لی۔ دوسری شادی کے بعد شوہر سے جو میرا رہا سہا تعلق تھا' وہ بھی ختم ہو گیا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے۔ میرا چھوٹا بیٹا فہد غصے کا بہت تیز تھا۔ ایک دن بھابھی نے میرے بیٹے کو مارا تو میں خاموش نہ رہ سکی۔ جواب میں بھابھی نے میرے سر پر بیلن دے مارا۔ خون کی دھار بہہ نکلی۔ فہد یہ دیکھ کر غصے سے پاگل ہو گیا اس نے بھابھی پر ہاتھ اٹھا دیا۔ ایسا لگا جیسے قیامت آگئی۔ میرے شوہر شام کو آفس سے آئے تو بھابھی صاحبہ نے رو رو کر بتایا کہ فہد نے ان پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ میرے شوہر غصے سے پاگل ہو گئے انہوں نے بیلٹ سے فہد کی پٹائی کی میں نے روکنا چاہا تو انہوں نے مجھے بھی مارا اور تین بار طلاق کہہ کر ہمیشہ کے لیے قصہ ختم کر دیا۔ اب یہ گھر میرے لیے پرایا تھا بچوں کو انہوں نے رکھ لیا میکے کے نام پر بس ایک پھوپھی تھیں۔ وہ بھرے پرے سسرال میں رہتی تھیں۔ عدت تک میں ان کے گھر میں رہی۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کروں کہاں جاؤں۔ میں اپنے بچے بھی لینا چاہتی ہوں۔

ج: اچھی بہن! تمام واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے شوہر کا پہلے سے اپنی بھابھی کے ساتھ تعلق تھا۔ انہوں نے آپ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ آپ کا اپنا کوئی سگا رشتہ دار نہیں تھا، نہ بھائی بہن تھے انہیں معلوم تھا آپ احتجاج کریں گی نہ زبان کھولیں گی۔

کراچی میں بے سہارا عورتوں کے لیے بہت سے فلاحی ادارے کام کر رہے ہیں۔ آپ ایدھی کے ادارے میں پناہ لے سکتی ہیں۔ آپ کے شوہر تو آپ کو بچے نہیں دیں گے البتہ عدالت کے ذریعے بچے لیے جا سکتے ہیں، لیکن جب آپ کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے نہ ہی آمدنی کا کوئی ذریعہ ہے تو ایسی صورت میں آپ بچوں کے اخراجات کیسے پورے کریں گی بہتر یہی ہے کہ آپ صبر کر لیں۔ بچوں کو شوہر کے پاس رہنے دیں۔ آپ کو زیادہ دیر صبر نہیں کرنا پڑے گا۔ اللہ نے چاہا تو بچے بڑے ہو کر آپ کے پاس ہی آئیں گے۔

☆

بیوٹی بکس

امت الصبور



عالیہ وحید...... پشاور

س: میرا مسئلہ بڑھا ہوا پیٹ ہے، جس کے بارے میں پریشان ہونا فطری بات ہے۔ پہلے تو احساس نہیں تھا، میٹرک کے بعد یہ آہستہ آہستہ بڑھ گیا ہے۔ بہت کچھ کیا ہے۔ کھانا کم کیا ہے، رسی بھی کودتی ہوں، لیکن افاقہ نہیں ہوا۔

ج: عالیہ! سب سے پہلے آپ قبض پر توجہ دیں۔ قبض کے لیے سب سے بہترین نسخہ یہ ہے کہ صبح سویرے نہار منہ دو گلاس پانی پی لیں۔ اس کے علاوہ امرود اور دوسرے پھل باقاعدگی سے استعمال کریں۔

قبض دور ہو گا تو پیٹ خود بخود کم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ پیٹ کم کرنے کے لیے ایک آزمودہ نسخہ لکھ رہی ہوں جس نے بھی اس پر عمل کیا ہے، اسے فائدہ ہوا ہے۔ گہرا سانس لے کر پیٹ کو اندر کی طرف کریں اور ایک سے دس تک گنیں، پھر گہرا سانس منہ کے ذریعے خارج کریں۔ یہ عمل چلتے پھرتے، کھانا پکاتے، ٹی وی دیکھتے کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے۔ دن میں کم از کم سو بار یہ عمل کریں۔ جلد ہی نتائج برآمد ہوں گے۔

چہرے کی تازگی اور دلکشی کے لیے بیسن میں عرق گلاب ملا کر گاڑھا پیسٹ بنالیں اور سارا دن اسی سے منہ دھوئیں۔ ہر روز نیا پیسٹ استعمال کریں۔ ایک ہفتہ بعد آپ کا چہرہ اتنا نکھر جائے گا کہ آپ خود حیران رہ جائیں گی۔

اسماء شفیع ......کراچی

س: میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال پہلے بہت گھنے تھے، لیکن ٹائیفائڈ بخار سے بال سارے اتر گئے اب بھی لمبے ہیں، لیکن پتلے کمزور ہیں۔ جب بالوں کی بہتری کے لیے کوئی چیز استعمال کرتی ہوں اور بھی خراب ہو جاتے ہیں۔ زیادہ اترنے لگتے ہیں۔

ج: اسماء بہن پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آپ کے بال ٹھیک ہو جائیں گے۔ ٹائی فائڈ کے بعد عموماً بال گر جاتے ہیں، لیکن اگر صحیح غذائیں استعمال کی جائیں تو بہت جلد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ چونکہ آپ بیمار رہی ہیں، اس لیے آپ کو اپنی غذا پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

آج کل سیب کا موسم ہے، جتنا ممکن ہو سکے۔ چھلکوں سمیت سیب کھائیں۔ صبح شام دودھ پئیں۔ کچی سبزیاں اور پھل کھائیں۔ اس سے آپ کی اور آپ کے بالوں کی صحت بہتر ہو گی۔

بالوں میں تیل لگانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ تیل انگلیوں کی پوروں سے نرمی سے لگائیں کیونکہ بالوں کی جڑیں کمزور ہو چکی ہیں۔ سختی سے لگانے سے بال ٹوٹ جائیں گے۔

آپ ڈاکٹر کے مشورے سے ملٹی وٹامن اور آئرن کی ٹیبلٹ استعمال کر سکتی ہیں اس سے آپ کے بال جلد بہتر ہو جائیں گے۔

☆